سالگرہ نمبر
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اپریل 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
PDFBOOKSFREE.PK
ناهید سلطانہ اختر
عنیزہ سید، نمرہ احمد، انجم انصار
عذرا بیگ، اقبال بانو
اور دیگر مصنفات کی خوب صورت تحریروں سے آراستہ
PVL
AKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول
مدیرہ
انجم انصار
معاون
آمنہ حماد

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 15

خصوصی گوشہ

ڈائری سے انتخاب — عذرا رسول 268

سلسلے وار ناول

عکس — عمیرہ احمد 18
زندگی — ناہید سلطانہ اختر 60
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں — شیریں حیدر 100

مکمل ناول

پھر کوئی خواب بنو — عذرا بیگ 172
حجاب زیانِ جاں — عنیزہ سید 234

ناولٹ

ابلیس — نمرہ احمد 143
کانچ سی لڑکی — انجم انصار 205

افسانے

پہلا قدم — اقبال بانو 51
آئینوں کی بستی میں — عطیہ عمر 93
بات تو سمجھ کی ہے — سکینہ فرخ 137
دوسرا آپشن — نوشین ناز اختر 223
شادی میرے شہزادے کی — عظمیٰ آفاق سعید 285

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مستقل عنوانات

دین کی باتیں — ادارہ 16
بہنوں کی محفل — مدیرہ 270
پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید 296
میرا انتخاب — آمنہ حماد 299
جلترنگ — انجم انصار 301
میں اکثر گنگناتی ہوں — صغریٰ زیدی 304
خوش ذائقہ — پاکیزہ بہنیں 306
سندیسے — پاکیزہ بہنیں 307
روحانی مشورے — ادارہ 309
ہومیو کلینک 310

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528
MEMBER APNS
CPNE
جلد 40 • شمارہ 01 • اپریل 2012 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے.....!

قارئین کرام! آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ کے فضل وکرم سے پاکیزہ ڈائجسٹ چالیسویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔ بلاشبہ یہ اپنی اشاعت کے اتنے برس مکمل کر چکا ہے۔ ایک ننھا منا پودا آج ایک تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے اور اس کی گھنی شاخیں تو اتنی دور دور تک پھیل چکی ہیں جس کا اندازہ تک نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ یقینا اس خواب کی خوب صورت تعبیر ہے کہ پاکیزہ خوب صورت اور فکر انگیز تحریروں کا ایسا گلدستہ ہو جس کی خوشبو سے ہر عمر کی خواتین مسحور ہو سکیں اور بلا جھجک اپنے گھر میں سب کے سامنے اس کا مطالعہ کر سکیں اور اس کو پڑھ کر انہیں آگاہی حاصل ہو۔ بفضل خدا پاکیزہ کی تحریریں حقیقتاً پاکیزہ ہوتی ہیں۔ ہمارے افسانوں اور ناولوں میں نہ صرف لڑکیوں کو اعلیٰ تربیت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے بلکہ مسائل سے نمٹنے کے احسن طریقے بھی بتائے جاتے ہیں۔ ہمارے افسانے ہوں یا ناول، شاعری ہو یا خطوط ہمارا مقصد ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ ہمارے قارئین کو آگاہی حاصل ہو۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ پاکیزہ گاؤں گوٹھوں میں بھی بے حد شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اس کی بے شمار قارئین ایسی بھی ہیں جو ٹوٹی پھوٹی اردو پڑھنا جانتی ہیں۔ جن کے ہاں اخبار بھی نہیں آتا جو ٹی وی کی سہولت سے بھی محروم ہیں۔ اس لیے ہم ایسی تحریریں بھی شائع کرتے ہیں جن کو پڑھ کر وہ اپنی زندگی کو بامقصد بنا سکیں اور اپنی زندگی کے حوالے سے کبھی منفی قدم نہ اٹھائیں۔ جب افراد کی سوچ مثبت ہوگی، وہاں کے معاشرے میں مثبت اقدار خود پیدا ہوں گی۔ میری تمنا ہے کہ پاکیزہ کی ہر قاری اتنی باشعور ضرور ہو جائے کہ وہ اچھے برے، سچ جھوٹ، حرام وحلال کی پرکھ تو کر سکے کہ لاعلمی، جہالت اور نادانیوں نے ہمیں بہت پیچھے دھکیل رکھا ہے اور ہمیں پاکیزگی کی مشعل لے کر بہت آگے جانا ہے بہت آگے..... (انشاء اللہ)

مدیرہ

انجم انصار

اور بے شک ضرور انہیں میں گمراہ کروں گا اور ضرور انہیں امیدیں دلاؤں گا اور یقیناً ضرور میں انہیں سکھاؤں گا تا کہ وہ جانوروں کے کان کاٹیں اور بے شک یقیناً میں انہیں سکھاؤں گا تا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی (صورت) کو (میری تعلیم کے موافق) بدل ڈالیں اور جس نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا تو بے شک اس نے صریح گھاٹا اٹھایا (۱۱۹) شیطان انہیں (اچھے اچھے) وعدے دے (دے کر برے کام کرا لیتا) ہے اور انہیں امید دلاتا ہے حالانکہ شیطان جو کچھ ان سے وعدہ کرتا ہے وہ دھوکا ہے (۱۲۰) یہ لوگ (ایسے ہیں کہ) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ اس سے (کبھی) رہائی نہ پائیں گے (۱۲۱) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے عنقریب ہم انہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (یہ) اللہ کا وعدہ ہے (جو نہایت) سچا (ہے) اور اللہ سے زیادہ کون (اپنی) بات میں سچا (ہو سکتا) ہے (۱۲۲) اے مسلمانو نہ تمہاری آرزوئیں (ٹھیک) ہیں اور نہ اہل کتاب کی خواہشیں (بجا) ہیں (بلکہ) جو شخص کچھ برا کام کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور اللہ کے سوا کسی کو (اپنا) کوئی کارساز اور مددگار نہ پائے گا (۱۲۳) اور جو مرد یا عورت (کوئی ایسا فعل) کرے گی (جو) نیک کاموں میں سے (ہو) اور وہ (کرنے والا) مسلمان (بھی) ہو تو وہی (ان برگزیدہ لوگوں میں ہوگا جو) جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر نقیر برابر (بھی) ظلم نہ کیا جائے گا (۱۲۴)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۱۹ تا ۱۲۴)

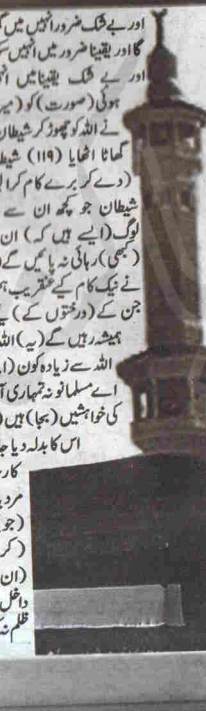

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

الحدیث، محمد ﷺ

۱۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

"زمین میں میرا نام محمد ﷺ اور آسمان میں احمد ﷺ ہے۔ اسی طرح توریت میں محمد ﷺ اور انجیل میں احمد ﷺ ہے۔"

۲۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ "اے ابوذرؓ انبیا میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ اور سب سے آخر میں محمد ﷺ ہیں۔ (ترمذی)

۳۔ حدیث قدسی ہے کہ اے محمد ﷺ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو کائنات کا وجود نہ ہوتا۔

۴۔ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا فرمایا تو آپؑ کو ابو محمد ﷺ کی کنیت سے بلایا آپؑ نے عرض کی اللہ تعالیٰ! میری یہ کنیت کیسے ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اپنا سر اٹھاؤ۔ آپؑ نے اوپر دیکھا تو عرش پر نور محمدی ﷺ جلوہ گر تھا۔ حضرت آدمؑ نے پوچھا۔ باری تعالیٰ! یہ کس کا نور ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ محمد ﷺ کا نور ہے یہ تیری اولاد میں سے ہوں گے۔ ان کا نام آسمان میں احمد ﷺ ہے اور زمین پر محمد ﷺ ہے۔ اگر میں انہیں نہ پیدا کرتا تو نہ تمہیں پیدا کرتا اور نہ زمین و آسمان کو پیدا فرماتا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی ﷺ سے اقتباس

قسط ۹

عکس

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثلِ شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بھوت مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کر لی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لو میرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کراتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ ایک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آزرہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک [illegible] ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے۔ عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میگنفک چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔ عکس، شیر دل کے گھر ڈنر پر آتی ہے تو اس کی ملاقات شہر بانو سے ہوتی ہے۔ ڈی سی خیر دین کو نوکری سے نکال دیتا ہے اور اس کا ذمے دار چڑیا اپنے آپ کو سمجھتی ہے۔ خیر دین کی تھانے سے رہائی کے بعد خیر دین، چڑیا اور حلیمہ کو لے کر گاؤں چلا جاتا ہے۔ گاؤں میں جب سب کو خیر دین کی نوکری ختم ہونے کا پتا چلتا ہے تو ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ چڑیا کے اسکول کا نتیجہ جب خیر دین دیکھتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتا ہے، باربی ڈول اپنی ممی کو بتاتی ہے کہ پاپا نے اسکول آکر سسٹر ایگنس سے چڑیا کو اسکول سے نکالنے کا کہا ہے۔ فاطمہ ایبک کو ڈیبیٹ کے لیے اسٹیج پر جاتا دیکھ کر نروس ہو جاتی ہے۔ فاطمہ کو دیکھ کر ایبک یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے پہلے کہاں دیکھ چکا ہے فاطمہ کے نروس ہونے سے نوین نے پہلی پوزیشن لی لیکن ٹرافی ایبک اور اکبر نے لی۔ ڈی سی کی بیوی اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کیوں چاہتا ہے کہ چڑیا اسکول چھوڑ دے، ڈی سی اپنا ٹرانسفر کرا لیتا ہے اور باربی ڈول کے اسکول اپنی بیوی کے ساتھ سرٹیفکیٹ لینے جاتا ہے۔ باربی ڈول اسکول سے جانے سے پہلے ایک بار چڑیا سے ملنا اور اس کو اپنے جانے کے بارے میں بتانا چاہتی ہے لیکن مل نہیں پاتی، خیر دین گاؤں سے جانے کا اور زمین بیچنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بھائی زمین اپنے نام کرا لیتے ہیں۔ خیر دین شہر واپس آتا ہے تو چڑیا کو واپس اسکول میں داخل کراتا ہے خیر دین نے ڈاکٹر فرح کے شوہر کو فون کیا تو پتا چلا کہ فرح کی ڈیتھ ہو گئی ہے لیکن عابد چڑیا کی فیس دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شیر دل پروفیشنل کورس کے لیے سنگاپور جا رہا تھا تو شہر بانو نے امریکا جانے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ شیر دل ٹرانسفر ہو کر عکس کی جگہ آیا تھا۔ وہ پہلا سرکاری گھر تھا جو شہر بانو کو خوش کر گیا۔ ڈپٹی کمشنر کے کہنے پر میونسپلٹی کے اہلکار خیر دین کی ریڑھی کا سامان پھینک دیتے ہیں اور اسے اس علاقے میں ریڑھی لگانے سے منع کر دیتے ہیں۔ باربی ڈول اسکول کے آخری دن چڑیا سے ملنے اپنی ممی کے ساتھ جاتی ہے۔ شیر دل اور عکس لاہور میٹنگ اٹینڈ کرنے جاتے ہیں، مثال اور شہر بانو بھی شیر دل کے ساتھ تھیں وہ دونوں اگلی رات کی فلائٹ سے امریکا جانے والی تھیں۔ خیر دین حلیمہ کی دوبارہ شادی کر دیتا ہے اور وہ کویت چلی جاتی ہے۔ خیر دین سسٹر ایگنس کو سچائی بتا کر چڑیا کا ایڈمیشن دوبارہ کرا دیتا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

اس آئینے نے کئی سال پہلے کی طرح آج بھی اس کی نظر کو خود سے ہٹنے نہیں دیا...... گزر جانے نہیں دیا۔ وہ آئینے کے سامنے رک گئی۔ وقت نے اس آئینے پر اپنے نشانات بڑھا دیے تھے۔ ہلکی سی بوسیدگی، چند داغ، کئی نئی لکیریں، آب و تاب کھوتی چمک، بجھی ہوئی رنگت۔ وقت نے ایسے ہی بہت سارے نشان اس کے اپنے وجود اور اس کے چہرے پر چھوڑے تھے جس کا عکس آئینے میں دیکھنے پر شناخت کرتے ہوئے اسے چند لمحے لگے تھے۔

وہ آئینے میں خود کو دن میں کئی بار دیکھتی تھی...... لیکن اس آئینے میں نظر آنے والا عکس اس نے کئی سال بعد دیکھا تھا۔

ایک نظر اس نے خود کو دیکھا پھر اپنے عقب میں نمودار ہونے والے مرد کو۔ آئینے میں دونوں کی نظریں لمحے بھر کے لیے ایک دوسرے سے ملی تھیں پھر دونوں ہی نے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا لی تھیں۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے ایک دوسرے سے اسی طرح آنکھیں چراتے ہوئے ہی پھر رہے تھے۔ آئینے میں ایک لمحے کے لیے جیسے ان کی زندگی جھلکی تھی۔ وہ زندگی جو

وہ ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے تھے...... کئی سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ...... اور ایک دوسرے سے کئی صدیوں کے فاصلے پر...... ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار...... اور اس محبت کو کائی کی طرح اپنے وجود سے نوچتے ہوئے۔

وہ اس کے پاس سے گزر کر کھلے ہوئے اندرونی دروازے سے اندر چلا گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر اس آئینے کو اور اس گھر کو دیکھا...... زندگی میں اس گھر سے زیادہ نفرت اسے کبھی کسی دوسری جگہ سے نہیں ہوئی تھی۔ نفرت شاید ایک بہت معمولی لفظ تھا اپنے ان احساسات کو بیان کرنے کے لیے جو وہ اس گھر کے لیے رکھتی تھی، وہاں کی ایک ایک چیز کے لیے رکھتی تھی، اگر کوئی اسے کبھی کہتا کہ دنیا میں وہ کون سی ایک جگہ ہے جسے وہ آگ لگا کر بھسم کر دینا چاہتی تھی تو وہ اس گھر کا نام دیتی...... اور اس تمام نفرت کے باوجود وہ وہاں آنے اور وہاں رہنے پر مجبور تھی کیونکہ وہ اس گھر کی ''ملکہ'' تھی۔

☆☆☆

''ایک گھر میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کے محل میں ایک سے زیادہ ہوتی ہوں گی اور تم بادشاہ نہیں ہو۔'' شہر بانو نے اطمینان سے شیر دل سے کہا۔

''تم imagine کرو۔'' شیر دل اس کی بات پر مسکرایا لیکن اس نے پھر بھی اپنے سوال کے جواب کے لیے اصرار کیا تھا۔

''تم اپنے گھر میں میری جگہ ایک اور عورت لے آؤ گے؟ اپنی زندگی میں سے مجھے نکال کر کسی دوسری عورت کو شامل کر لو گے؟ یہ impossible ہے۔'' شہر بانو نے اسی انداز میں کہا۔ شیر دل اسی انداز میں مسکرا دیا تھا۔ شہر بانو اب بھی اس کے سینے پر بچوں کی طرح سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ شیر دل نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کے حصار کو توڑتے ہوئے ایک ہاتھ سے بہت نرمی سے اس کے بالوں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔

''ایک بات کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔'' شہر بانو نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد یک دم اس سے کہا۔ شیر دل ٹھٹکا۔

''کس بات کی؟'' اس نے شہر بانو کے بالوں کو سمیٹنا جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مردوں کو بیویوں سے آخر یہ سوال کرنے کا شوق کیوں ہوتا ہے؟'' شیر دل بے اختیار ہنسا تھا۔

''اپنے آپشنز چیک کرتے رہنا کوئی غلط بات تو نہیں۔'' اس نے برجستگی سے کہا۔

''مذاق نہیں کر رہی میں۔'' شہر بانو سنجیدہ تھی۔ ''ویسے اگر تم شادی کرتے دوسری...... تو کس سے کرتے؟'' شہر بانو کو پتا نہیں کیا خیال آیا تھا۔

''Hmm......'' شیر دل نے بے اختیار گہری سانس لی۔

''interesting question۔'' وہ ایک لمحے کے لیے سوچنے لگا تھا یا کم از کم شہر بانو کو لگا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ شیر دل کو اس سوال کا جواب سوچنے کی ضرورت تک نہیں تھی۔

''عکس سے؟'' شیر دل کے ذہن کی اسکرین پر اس کا چہرہ آیا اور شہر بانو کی زبان پر اس کا نام۔

شیر دل اس عجیب اور بے وقت کی غیر متوقع ٹیلی پیتھی پر جیسے دم بخود ہوا تھا اور اس کی خاموشی نے شہر بانو کو عجیب انداز میں مضطرب کیا تھا۔ شیر دل کے سینے پر سر ٹکائے اس نے یک دم چہرہ سیدھا کر لیا تھا۔ بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز شیر دل جانتا تھا وہ کیا کرنے والی تھی۔

''That's quite a silly statement'' اس نے شہر بانو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

''statement نہیں ہے it's just a wild guess۔'' شہر بانو نے شیر دل کی آنکھوں اور چہرے کو پھر کسی مائیکرو اسکوپ کی طرح پڑھنے کی کوشش کی۔

''تم کو سونا نہیں ہے؟'' شیر دل نے اسی طرح اس کو موضوع سے ہٹانے کی کوشش کی تھی جس طرح وہ ہمیشہ کرتا تھا

لیکن آج وہ ہمیشہ کی طرح کامیاب نہیں ہوا تھا۔

"تم بتاؤ نا۔" شہر بانو نے اصرار کیا۔ وہ اب شیر دل کے سینے پر اپنی کہنیاں ٹکائے ہوئے تھی۔

"دنیا کے سمجھدار مرد ایک شادی کرتے ہیں...... بے وقوف دو کرتے ہیں...... اور خوش قسمت ایک بھی نہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تم سمجھدار ہو لیکن خوش قسمت نہیں لیکن......" شیر دل نے اس کو بات مکمل کرنے نہیں دی۔

"یار میں نے بہت غلط سوال کرلیا تم سے...... چھوڑو اب اسے...... ہر مرد کو بڑی fantasy ہوتی ہے دوسری شادی کی...... اور کوئی بات نہیں۔" شیر دل ایک بار پھر اسے الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم ویسے عکس کو بہت پسند کرتے ہو؟" شہر بانو نے اس کی کوشش پر پانی ڈالا۔

"کوئی بھی کرسکتا ہے۔" شیر دل نے نظر ملائے بغیر وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی مرد۔" شہر بانو نے جیسے اسے کچھ جتایا۔

"ہاں کوئی بھی مرد۔" شیر دل نے اس کے اندازے اور مشاہدے کو جھٹلایا نہیں تھا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ شیر دل نے جیسے اس کی سوچوں کو پڑھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب نہیں ہوا۔ وہ ایک عورت کی سوچ تھی۔ شہر بانو نے مزید بحث کیے بغیر اس کے سینے پر دوبارہ سر ٹکا دیا۔ شیر دل نے اس مائیکرواسکوپ کے سامنے سے ہٹ جانے پر جیسے شکر ادا کیا تھا۔

جہاز کی سیٹ پر بیٹھے ایک فلم دیکھتے ہوئے پتا نہیں شہر بانو کو شیر دل اور اپنی یہ گفتگو کیوں یاد آئی تھی۔ کوئی خدشہ...... کوئی خوف...... کوئی سائرن نہیں بجا تھا۔ شیر دل پر اسے ایسا ہی اندھا اعتماد تھا۔ ان دونوں کو دور ہوئے صرف چند گھنٹے گزرے تھے۔ اور وہ ان تمام گھنٹوں میں شیر دل کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ کچھ کھا رہا ہوگا۔ شیر دل کی روٹین اس کی فنگر ٹپس پر تھی اور سیکڑوں میل دور اور ہزاروں فٹ کی بلندی پر بھی شیر دل جیسے اس کے سامنے چل پھر رہا تھا۔ وہ شادی کے اتنے سالوں بعد بھی شیر دل کے بارے میں جیسے جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادی تھی بالکل اسی طرح جیسے وہ شیر دل سے شادی سے پہلے اس کے بارے میں سوچتی تھی۔

"ممی، پاپا کہاں ہیں؟" اس کی سوچوں کا تسلسل مثال کے سوال پر ٹوٹا تھا۔ اس کے برابر کی سیٹ پر وہ ابھی ابھی نیند سے ہڑبڑا کر اٹھی تھی اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی شیر دل کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ شہر بانو نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہ مثال کی پرانی عادت تھی، وہ نیند سے جاگتے ہی سب سے پہلے شیر دل کو ڈھونڈتی تھی۔ یہ اس کی بھی عادت تھی، وہ بھی اپنے باپ کی زندگی میں اس کے ساتھ رہتے ہوئے آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلا سوال اپنے باپ کے بارے میں ہی کرتی تھی۔ مثال کو تھپکتے ہوئے اس نے پچھلے کئی گھنٹوں میں بلاشبہ کوئی دسویں بار مثال کو شیر دل کا محل وقوع بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی اور یہ بھی کہ وہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آسکا۔

"Can you tell him that Misal is missing him?" مثال نے اس کی بات سننے کے بعد یک دم اس سے کہا۔

"I would defnitely do that" شہر بانو نے اسے مزید تھپکا۔

"Mummy is also missing him" شہر بانو نے بھی اس کے ساتھ شیئرنگ کی۔

"لیکن آپ میرے جتنا تو miss نہیں کرتیں انہیں۔" مثال نے فوراً اعتراض کیا۔ شہر بانو مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی مثال باپ کے بارے میں اسی طرح پوزیسو تھی جس طرح باپ اس کے بارے میں تھا۔

"ہاں تمہارے جتنا تو miss نہیں کرتی میں تمہارے پاپا کو۔" شہر بانو نے جیسے اسے یقین دلایا۔ مثال بے اختیار کچھ مطمئن ہوگئی۔

"سو جاؤ۔" شہر بانو نے اسے دوبارہ سلانے کے لیے سیٹ کی پشت سے ٹکایا۔ مثال نے مطمئن انداز میں اس کا

ہاتھ پکڑے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ شہر بانو اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ اب تک اس کی اور شیر دل کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا...... واحد اثاثہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہوتا۔ چار سال سے وہ ان دونوں کی زندگی کو بانٹنے والا واحد ساتھی تھا...... لیکن اس سال وہ اپنی فیملی میں مزید اضافہ کرنے کی پلاننگ کر رہے تھے۔ مثال کے بہن یا بھائی کے دنیا میں آنے کا اس سے زیادہ موزوں وقت کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

عکس مراد علی کے لیے ٹی وی اسکرین پر بار بار گزرنے والے اس ticker کے چلنے کا اس سے زیادہ غیر موزوں، تکلیف دہ اور خطرناک وقت کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ شیر دل کو بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھے برق رفتاری سے ایک کے بعد ایک کال ملاتے اور متعلقہ افراد سے بات کرتے ہوئے بھی اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور احساس تھا۔ رات کے پچھلے پہر بھی ٹی وی پر آنے والی ایک ایسی خبر کا حصہ ہونا ذاتی حیثیت میں جتنا تکلیف دہ تھا پروفیشنلی عکس کے لیے اس سے زیادہ نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹی وی اسکرین کے نیچے چلنے والے tickers میں سے صرف عکس مراد علی کے حوالے سے چلنے والی خبر غائب ہوگئی تھی...... لیکن شیر دل کو اندازہ تھا کہ تب تک بھی عکس کے لیے خفت اور رسوائی کا کافی سامان اکٹھا ہوچکا تھا۔

"Thank you" شیر دل کی کال ریسیو کرتے ہی اس نے ہیلو کے بجائے اسے کہا۔

"جواد سے بات ہوئی ہے تمہاری؟" شیر دل نے اس کے Thank you کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...... فون بند ہے اس کا۔" شیر دل کو اس کی آواز تھکی ہوئی اور بھاری محسوس ہوئی۔ وہ اگلا سوال کرتے کرتے ٹھٹک گیا۔ پتا نہیں اسے کیوں یہ احساس ہوا کہ وہ شاید روئی تھی...... یا پھر رو رہی تھی۔

"تم تو ٹھیک ہو؟" شیر دل بے اختیار ٹینس ہوا تھا۔

"ہاں۔" وہ کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر نہیں کرسکا۔

"تم اب سو جاؤ۔" اس نے بے اختیار عکس سے کہا۔

"اوکے۔" وہ جیسے خود بھی اس وقت بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خدا حافظ کہہ کر فون بند کردینے کے بعد دوبارہ سونے کے لیے بستر پر لیٹ جانے کے بعد بھی شیر دل دوبارہ نہیں سو سکا۔ اسے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ فجر کے قریب وہ بالآخر نہیں رہ سکا۔ اس نے سیل فون پر اسے میسج کیا۔ "awake?" چند سیکنڈ کے بعد اس کے سیل پر ایک blank message آیا۔ ایک گہری سانس لے کر شیر دل نے اسے کال کی۔

"پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہونے والا اور نہ ہی ساری رات اس طرح بیٹھے رہنے سے یہ پریشانی ختم ہوگی۔" عکس نے پہلی بیل پر کال ریسیو کی اور شیر دل نے بغیر کسی ہیلو ہائے کے اس سے کہا۔

"جواد کے والد سے کچھ دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔" عکس نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔

"پھر؟" شیر دل ٹھٹکا۔

"وہ کہہ رہے ہیں ان کے political career کو نقصان پہنچانے کے لیے سازش کی گئی ہے۔ جواد نہ تو شراب پیے ہوئے تھا نہ ہی اس کی گاڑی میں شراب تھی۔ وہ کسی دوست سے ملنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی پر دیر ہوگئی اور کسی نے میڈیا اور پولیس کے ذریعے اسے trap کرنے کے لیے انتظام کیا ہوا تھا اور......" شیر دل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم نے ان سے کیا کہا؟" وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر شیر دل نے اس کی تھکی ہوئی آواز سنی۔

"کچھ نہیں، میں انہیں کیا کہتی؟ لیکن ہوسکتا ہے یہ سب سچ ہو...... آج کل یہی سب کچھ تو ہو رہا ہے۔" شیر دل نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"تم بے وقوف ہو یا بننا چاہ رہی ہو؟" بہت دیر تک دوسری طرف خاموشی رہی پھر شیر دل نے اسے کہتے سنا۔

''بننا چاہ رہی ہوں۔'' اس بار شیر دل کر کچھ بول نہیں سکا تھا۔

''سلیپنگ پلز ہیں؟'' کچھ دیر بعد شیر دل نے بالآخر کہا۔

''ہاں۔'' دوسری طرف سے عکس نے کہا۔

''کھا کر سو جاؤ۔'' اپنے وال کلاک پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔

''اوکے۔'' عکس نے ایک بار پھر ہتھیار ڈالے۔

''ایک کھانا پوری بوتل مت کھا لینا۔'' شیر دل اس صورتِ حال میں بھی کہے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ شیر دل نے اس کی ایسی شکست خوردہ ہنسی پہلے نہیں سنی تھی۔ وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''عکس تم اب صرف سوؤ گی...... تم نے سنا۔'' اس نے بالآخر بڑے تحکمانہ انداز میں اس سے کہا۔ ''میں کل آ کر ملتا ہوں تم سے۔'' عکس کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ ایک بار پھر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ اتنے سالوں سے عکس کو اتنے قریب سے جاننے کے باوجود اس نے کبھی اسے اس طرح اداس اور اپ سیٹ نہیں دیکھا تھا جس طرح اس نے فون پر کچھ دیر پہلے بات کرتے ہوئے اسے محسوس کیا تھا اور شیر دل کو اس چیز نے پریشان کیا تھا۔ عکس اور اس ساری صورتِ حال کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے بالآخر نیند آ گئی تھی۔

اگلی صبح وہ بہت دیر سے جاگا تھا اور بڑی ہڑبڑاہٹ اور عجلت کے عالم میں آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے اپنے فون پر عکس کا میسج دیکھا۔

''I am alright۔'' اسکرین پر چمکتے ہوئے اس چھوٹے سے ٹیکسٹ میسج کو شیر دل بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ ایک چھوٹے سے جملے نے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد کروا دیا تھا۔ اس کے اور عکس کے درمیان دوستی کا آغاز اسی ایک جملے سے ہوا تھا۔

''No matter how hard you have been hit, you are always alright.'' اس نے عکس کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ جواب بہت دیر تک نہیں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ریفرنس بوجھ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ریفرنس واقعی بوجھ گئی تھی۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا ان دونوں کے درمیان کہ وہ ایک دوسرے کا ریفرنس نہ سمجھ پائے ہوں۔ اشارے کنایوں میں کی جانے والی بات کو بھی سیکنڈز میں ڈی کوڈ کرتے تھے اور یہ تب بھی تھا جب وہ دونوں اکیڈمی میں ایک دوسرے سے رسمی علیک سلیک ہی رکھتے تھے۔

عکس نے ہاتھ میں پکڑا اسیل فون واپس ٹیبل پر رکھ کر پرائیویٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے وفد کے اس نمائندے کی بات پر توجہ دینے کی کوشش کی جو اس کے سامنے اس کے آفس میں بیٹھا ایک کے بعد ایک مطالبہ اس فہرست میں سے پڑھ کر پیش کر رہا تھا جس کی ایک کاپی اس کے سامنے میز پر بھی پڑی ہوئی تھی اور جس پر موجود 25 کے 25 مطالبات اسے زبانی یاد تھے۔ اس کے باوجود وہ میکانیکی انداز میں بظاہر بے حد دلچسپی کے ساتھ لیکن سنجیدہ ان مطالبات کو سن رہی تھی۔ پچھلی ساری رات جاگتے رہنے کے بعد وہ صبح صرف دو گھنٹے کی نیند لینے کے بعد اپنے مقررہ وقت پر آفس میں تھی اور صبح سے ایک کے بعد ایک اپائنٹمنٹ بھگتاتے ہوئے...... وہ ذہنی طور پر اب بھی پچھلی رات میں پھنسی ہوئی تھی...... اور اس ذہنی حالت کے ساتھ شیر دل کی طرف سے ملنے والا وہ ٹیکسٹ...... دائیں ہاتھ سے وقفے وقفے سے سامنے پڑے ایک کاغذ پر نوٹس لیتے ہوئے وہ اس نمائندے کی بات سن رہی تھی۔ کاغذ پر وہ پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی جن پر اسے اس نمائندے کے خاموش ہونے کے بعد بات کرنی تھی اور سوچ وہ شیر دل کے بارے میں رہی تھی۔ شیر دل، جواد غنی حمید اور بہت سے دوسرے چہرے...... سارے چہرے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے...... سوائے ایک چہرے کے۔

☆☆☆

''میرا نام ایبک ہے۔'' فاطمہ چند لمحوں کے لیے فریز ہو گئی تھی۔ کنگ ایڈورڈ میں یہ اس کا پانچواں دن تھا جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ اس دن پہلی بار کالج آیا تھا...... یا پھر...... وہ اپنے آپ میں اتنی مگن تھی کہ اس نے ایبک کو نوٹس ہی نہیں کیا تھا اور نوٹس تب کیا تھا جب وہ کاریڈور میں آ کر اس کے بالمقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ فاطمہ اگر ہل نہیں سکی تھی تو یہ غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ ایک نام ایسا تھا اس کی زندگی میں جو کبھی بھی کہیں بھی اسے اسی طرح نروس...... اسی طرح فریز کر سکتا تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ فاطمہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر اس نے مسکرانے کی بھی کوشش کی۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس کے بالمقابل کھڑا تھا۔

''میں نے آپ کو پریشان کر دیا شاید؟'' وہ اب معذرت کر رہا تھا۔ فاطمہ کو جیسے ذرا سی شرمندگی ہوئی۔ اس کی ذہنی کیفیت اس کے چہرے پر کیوں آ گئی تھی۔

''نہیں تو۔'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنا تفصیلی تعارف دے رہا تھا۔ فاطمہ کو حیرت ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ کیوں ہوا تھا۔ پوری کلاس میں اسے تعارف کے لیے ایک ہی لڑکی ملی تھی یا وہ ہر لڑکی سے اسی بے تکلفی کے ساتھ بات کر لیتا تھا...... وہ فی الحال اندازہ نہیں کر سکی تھی لیکن اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس کا تفصیلی تعارف سنا۔

وہ ایبک سلطان کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی اور کالج سے ہاسٹل تک ایبک اس کے سر پر سوار رہا تھا...... اور اس کی وجہ اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی۔

ایبک سلطان، فاطمہ کی پہلی محبت تھی۔ پہلی محبت...... پہلی غلطی...... پہلا تجربہ...... پہلا زخم...... بہت سارے سبق تھے جو اس پہلے تجربے نے اسے دیے تھے جو اس نے محبت کے نام پر کیا تھا...... یا شاید اسے ہوا تھا۔

لاہور آنے کے بعد وہ کسی لڑکے کے ساتھ پہلی بار انوالو ہوئی تھی...... لیکن اس انوالومنٹ کا آغاز اس کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ یہ ایبک تھا جو خود اس کی طرف بڑھا تھا۔ کلاس کی تمام لڑکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے...... اسے خوشی سے پھولنا چاہیے تھا...... کچھ غرور آنا چاہیے تھا...... ساتویں آسمان پر پہنچ جانا چاہیے تھا...... زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکا اس میں اس طرح کی دلچسپی دکھا رہا تھا لیکن اس کے برعکس وہ بہت عجیب سی فیلنگز کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے اتنے سال اکیلے محتاط اور ہر ایک سے دور رہ کر اپنے خول میں زندگی گزاری تھی کہ کنیئرڈ کے دو سالوں نے بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ صرف جسمانی طور پر ہاسٹل اور کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی تھی لیکن ذہنی طور پر وہ اب بھی ان سے بہت دور تھی۔ وہ خول جو بچپن کے اس حادثے نے اس کے گرد بنا دیا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط اور سخت ہوتا گیا تھا اور فاطمہ نے ہمیشہ خود کو اس خول کے اندر بے حد محفوظ تصور کیا تھا تنہا نہیں۔

ایبک سلطان کی آمد نے پہلی بار اس خول پر ضرب لگا کر دراڑیں ڈالی تھیں۔ وہ کالج میں اس کی طرف کیوں متوجہ ہوا تھا؟ اس کی اس غیر معمولی توجہ کا مقصد کیا تھا...... ان دو سوالوں سے زیادہ پریشان کن سوال فاطمہ کے لیے یہ تھا کہ وہ ایبک کی توجہ کو resist کیوں نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ ایک لاابالی، کھلنڈرا، ہنس مکھ، بے پروا لڑکا تھا اور فاطمہ ہر چیز میں اس کے برعکس تھی۔ اس کے باوجود ایبک کا اسی کی طرف متوجہ ہونا اور فاطمہ کا چاہنے کے باوجود اس احتیاط کا مظاہرہ نہ کر پانا جو اس کی زندگی کا حصہ تھی...... فاطمہ کے لیے عجیب سہی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی ایک بے حد خوشگوار تبدیلی تھی۔ ایبک کی امی اسی میڈیکل کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ وہ ایک انتہائی دوستانہ مزاج رکھنے والی بے حد نفیس سی خاتون تھیں۔ ایبک سے بھی ملنے سے پہلے فاطمہ ان سے مل چکی تھی۔ وہ ان لوگوں کی ایک کلاس لیتی تھیں اور ان چند ٹیچرز میں سے ایک تھیں جنہیں اسٹوڈنٹس بہت پسند کرتے تھے۔ ایبک اور اس کی دوستی چند ہفتوں میں ہی ان کے نوٹس میں آ گئی تھی۔ فاطمہ کو کچھ تحفظات تھے ان کے ردِعمل کے حوالے سے...... لیکن اس کی توقعات کے برعکس مسز سلطان کا رویہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ اور حوصلہ افزا تھا۔ وہ ایبک کے ساتھ اکثر اوقات ان کے آفس چلی جایا کرتی تھی اور

اس آمدورفت نے جیسے ایک روٹین کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ایبک کے والد کی چند سال پہلے ڈیتھ ہو چکی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی اور بہن تھی۔ فاطمہ کو اپنی اور ایبک کی زندگی میں عجیب مماثلت نظر آرہی تھی۔ اس کی فیملی کے ساتھ اسے ایک عجیب سی اپنائیت اور مانوسیت کا احساس ہوتا تھا اسے۔ وہ خیر دین سے ایبک اور اس کی فیملی کا ذکر کرنا چاہتی تھی لیکن ایک عجیب سی جھجک ہر بار مانع آجاتی تھی۔ خیر دین سے اس قدر قربت اور بے تکلفی ہونے کے باوجود اسے یہ سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ خیر دین کے سامنے ایبک کا ذکر کیسے کرے...... کیا حوالہ دے...... دوست کہے؟ تو دوستی کی کیا توجیہہ پیش کرے۔ وہ اگر گھر پر رہ رہی ہوتی تو خیر دین سے ایبک کو چھپانا بہت مشکل ہو جاتا...... کیونکہ وہ اس کی گفتگو میں آتا تھا...... لیکن خوش قسمتی سے وہ ہاسٹل میں رہتی تھی اور ہاسٹل میں رہتے ہوئے ایبک کو خیر دین سے چھپالینا آسان تھا...... اور یہ فاطمہ کی خوش فہمی تھی۔

خیر دین زمانہ شناس انسان تھا۔ فاطمہ کو اپنے ہاتھ کی پشت کی طرح جانتا تھا۔ اس میں آنے والی کوئی بھی تبدیلی نوٹس کرنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ جب بھی ہاسٹل سے واپس گھر آتی تو واپس جانے کے لیے بے حد بے قرار رہتی اور خیر دین کے لیے یہ اس میں آنے والی ایک بہت بڑی اور عجیب تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ گھر آنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ خیر دین نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا...... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ وہمی نہیں تھا اور اب اسے بار بار وہم ہو رہے تھے۔ فاطمہ ہمیشہ سے خوش لباس تھی یہ عادت اس نے خیر دین سے لی تھی۔ اچھا، صاف ستھرا اور زمانے کے رواج کے مطابق لباس لیکن اب یک دم فاطمہ ضرورت سے زیادہ اور خلافِ عادت اپنے آپ پر توجہ دیتی نظر آتی تھی۔ اسے یک دم کاسمیٹکس اور جیولری میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی...... اور وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ خیر دین بار بار خود کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ چڑیا جوان ہو چکی تھی ڈاکٹر بن رہی تھی، بڑے شہر میں تھی...... ہر طرح کے لوگوں سے میل ملاپ تھا اس کا، اس کو خود پر توجہ دینی ہی چاہیے تھی...... لیکن بار بار کچھ نہ کچھ کھٹکتا تھا اسے چڑیا سے اپنے ان واہموں کے حوالے سے کوئی سوال خیر دین کے لیے بہت مشکل تھا لیکن ان چیزوں کو بھی ہضم کرنا آسان نہیں تھا جو وہ دیکھ رہا تھا اگر اطمینان اسے تھا تو صرف یہ تھا کہ چڑیا کبھی بھٹک نہیں سکتی تھی۔ وہ کبھی کوئی غلط قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ خیر دین کا سر جھکا دینے والا کوئی کام نہیں کر سکتی تھی اور اس یقین اور اعتماد نے خیر دین کی نیندیں کبھی اڑنے نہیں دیں۔

ایبک سلطان، خیر دین سے بہت دیر چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ ایک بار چھٹیوں میں گھر آنے پر کسی بات پر غیر محسوس طور پر فاطمہ نے خیر دین کے سامنے اس کا نام لیا۔ خیر دین نے اس کی زبان سے کسی لڑکے کا نام پہلی بار نہیں سنا تھا۔ وہ کو ایجوکیشن میں پڑھتی تھی اور اب پھر کو ایجوکیشن میں ہی پڑھ رہی تھی۔ کسی لڑکے کا ذکر آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن جس طرح چڑیا ایبک کا نام لیتی تھی وہ غیر معمولی تھا...... اور خیر دین اسے جتائے بغیر بغور یہ نوٹس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ایبک کا ذکر کتنے تواتر سے اس کی گفتگو کا حصہ بن رہا تھا اور جب خیر دین کو یقین ہو گیا کہ اب ایبک کے بارے میں اس کا کوئی سوال چڑیا کو بوکھلائے گا نہیں تو اس نے چڑیا سے ایبک کے بارے میں پوچھ ہی لیا تھا۔ فاطمہ خیر دین کے سوال پر چند لمحوں کے لیے کنفیوزڈ انداز میں نانا کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین خود اس کے کسی کلاس فیلو کے بارے میں سوال کر رہا تھا اور وہ بھی ایبک کے بارے میں...... ورنہ اس سے پہلے وہ خود ہی خیر دین کو کسی کلاس فیلو کے بارے میں بتاتی تو بتاتی خیر دین خود کبھی کسی کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔

''کلاس فیلو ہے میرا۔'' فاطمہ نے بظاہر لہجہ نارمل رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے خیر دین سے کہا تھا لیکن غیر ارادی طور پر اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ خیر دین کی نظر سے وہ رنگت کی تبدیلی چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اپنا لہجہ نارمل رکھتے ہوئے ایبک کے بارے میں تمام معلومات لیتا گیا تھا اور جب وہ سوال جواب ختم ہوئے تو خیر دین بھی چڑیا کی طرح بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ اس نے چڑیا سے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ اب وہ اس کے مستقبل اور اس کی شادی کے حوالے سے سوچتا اور فکر مند ہوتا رہتا تھا۔ حلیمہ سے اس سلسلے میں اس کی اکثر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ اوپر تلے دو بیٹوں کی پیدائش کے بعد اس کا پاکستان آنا جانا کچھ کم ہو گیا تھا لیکن فون پر وہ اب بھی بہت باقاعدگی سے خیر دین اور چڑیا کے ساتھ رابطے میں تھی۔

حلیمہ اور اس کے شوہر نے وقتاً فوقتاً خیر دین کو فاطمہ کے لیے کویت میں ہی اپنے کچھ جاننے والوں میں کچھ رشتے بتائے تھے لیکن خیر دین کا دل کسی بھی رشتے پر نہیں جما تھا۔ وہ سب مناسب رشتے تھے۔ اس کے فیملی بیک گراؤنڈ اور سوشل اسٹیٹس کے اعتبار سے بہت مناسب رشتے...... کویت یا پاکستان میں بزنس یا دوسرے کسی پروفیشن میں سیٹلڈ مرد...... حلیمہ اور اختر کے توسط سے آنے والے رشتے شریف خاندان کے بھی تھے۔ خیر دین کو ان کی بہت زیادہ چھان پھٹک کی بھی ضرورت نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں خیر دین کو کبھی بھی کوئی رشتہ فاطمہ کے جوڑ کا نہیں لگتا تھا۔ چڑیا، خیر دین کے لیے اس قدر قیمتی تھی کہ اس کے لیے کسی کو بھی چڑیا کے برابر کا سمجھنا بھی مشکل تھا اور اب چڑیا خود کسی کو پسند کر رہی تھی اور غیر محسوس طور پر خیر دین بے حد مطمئن تھا۔ وہ چڑیا کی پسند تھی اور خیر دین کو یقین تھا کہ ایبک سلطان کوئی عام اور معمولی مرد نہیں ہو سکتا تھا۔

''اگلی بار میں تم سے ملنے لاہور آؤں گا تو ایبک سے ملوں گا۔'' خیر دین نے فاطمہ سے کہا۔ وہ خیر دین کی بات پر کچھ مطمئن سے انداز میں مسکرائی تھی کہ جو چیز وہ چاہتی تھی لیکن خیر دین سے کہہ نہیں پائی تھی وہ خیر دین نے خود کہہ دی تھی۔

خیر دین چند ہفتوں کے بعد اس کے میڈیکل کے دوسرے سال میں پہلی بار ایبک سے ملا اور چڑیا کی طرح اسے بھی ایبک پہلی نظر میں ہی پسند آگیا تھا۔ وہ چڑیا کے لیے خود لڑکا ڈھونڈنے نکلتا تو ایبک جیسے خاندان کا کوئی لڑکا نہیں ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس دن لاہور سے واپسی پر خیر دین بے انتہا مسرور تھا اور ایسی ہی سرشار فاطمہ بھی تھی۔ خیر دین کی ایبک کے بارے میں رائے اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی اور خیر دین کی پسندیدگی کا مطلب تھا کہ وہ ایبک کے حوالے سے جو خواب دیکھ رہی تھی ان میں کم از کم خیر دین کی طرف سے کوئی رکاوٹ ڈالے جانے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔

ایبک اور فاطمہ کی دوستی چار سالوں میں دوستی سے محبت میں تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ ان دونوں کے تعارف کے بعد چند مہینوں میں ہی دوستی نام کی چیز نہیں رہی تھی۔ ایک دوسرے سے فارمل طریقے سے محبت کے اقرار اور شادی کے وعدے نہ ہونے کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے سے کمیٹڈ تھے...... ایک دوسرے کے دلی جذبات سے مکمل واقفیت رکھتے تھے اور مستقبل کو اکثر پلان کرتے رہتے تھے۔ ایبک بہت لائق ہونے کے باوجود بہت بے پروا تھا اور یہ وہ خامی تھی جو فاطمہ میں بالکل نہیں تھی۔ میڈیکل کے چار سالوں میں فاطمہ ہر prof ٹاپ کرتی رہی تھی لیکن اپنی اسٹڈیز سے زیادہ اس کا دھیان ایبک پر رہتا تھا۔ وہ اس کے نوٹس اور اسائنمنٹس پورے کرنے اور رکھنے کی تگ و دو میں ہلکان ہوتی رہتی۔ اسے ٹیسٹ اور ایگزامز کے لیے اسٹڈی کرنے کے لیے focussed ہونے کی تلقین کر کر کے جان مارتی اور جب اس کا اثر نہ ہوتا تو خود اس کے ساتھ پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی۔ ایبک اس بات کا برملا اظہار کرتا تھا کہ اگر اس کی دوستی فاطمہ سے نہ ہوتی تو وہ ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس کی لسٹ میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میڈیکل کالج میں اس کی اچھی پرفارمنس کا سہرا بلاشبہ فاطمہ کے سر تھا۔

وہ چار سال فاطمہ کی زندگی کے بہترین سالوں میں سے تھے۔ زندگی یک دم ہی بہت خوب صورت ہوگئی تھی اس کے لیے...... وہ سارے رنگ جو اس نے بہت پہلے چیزوں میں بھرنے ختم کر دیے تھے۔ وہ ان رنگوں کو جیسے نئے سرے سے تلاش کرنے لگی تھی۔ وہ دونوں اپنے پروفیشن کے حوالے سے اپنے goals کو ڈسکس کرتے...... اسپیشلائزیشن کے حوالے سے اپنے پلانز ایک دوسرے کو بتاتے رہتے...... مل کر ایک اسپتال بنانے کے منصوبے بناتے رہتے اور اس اسپتال میں جدید ترین مشینری نصب کرنے کے لیے فنڈز generate کرنے کے لیے ذرائع ڈھونڈتے پھرتے۔ ایبک مالی حیثیت سے بھی بہت مستحکم بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ باپ کی وفات ہونے کے باوجود اس کی ماں کو اس کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایسے کسی مسئلے کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا۔ ایبک کے لیے کسی اسپتال کا قیام کوئی مشکل بات نہیں تھی جبکہ فاطمہ کے لیے اکیلا ایسا کوئی خواب دیکھنا ناممکنات میں سے تھا۔

میڈیکل کے پانچویں سال حلیمہ کے پاکستان آنے پر پہلی بار حلیمہ اور خیر دین نے بہت سنجیدگی سے ایبک اور فاطمہ کے رشتے کے بارے میں سوچنا شروع کیا تھا اور یہی پہلا موقع تھا جب فاطمہ نے باقاعدہ طور پر ایبک سے اپنے گھر رشتے کے لیے کسی کو بھیجنے کی بات کی تھی اور ایبک کے جواب نے اسے بھونچکا کر دیا تھا۔

☆☆☆

’’تمہیں پتا نہیں تھا کہ جواد ڈرنک کرتا ہے؟‘‘ شیر دل نے عکس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے شہر پہنچا تھا اور اب وہ دونوں عکس کے آفس میں بیٹھے تھے۔

’’دو سال سے جان پہچان تھی تم دونوں کی...... پتا ہونا چاہیے تھا تمہیں۔‘‘ شیر دل نے چمچ کے گرد ٹی بیگ کے دھاگے کو لپیٹتے ہوئے اس کو نچوڑ کر کپ سے نکالتے ہوئے کہا۔ عکس کچھ دیر بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ سوال شرمندہ کرنے کے لیے نہیں تھا لیکن اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ شیر دل اب چائے کا سپ لیتے ہوئے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

’’میں نے اس سے پوچھا تھا ایک آدھ بار...... اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ڈرنک وغیرہ نہیں کرتا...... سگریٹ تک نہیں پیتا...... اکثر وہ شراب کے خلاف بات بھی کرتا تھا...... میرے لیے یہ یقین کرنا ناممکن تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ یہ تو اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ شراب پیتا ہوا پکڑا گیا ہے...... اپنے فادر کی طرح اس نے بھی مجھے یہی کہا ہے کہ میڈیا ٹرائل کیا گیا ہے اس کا کیونکہ اگلے الیکشنز میں اس کی فیملی اسے صوبائی اسمبلی کے امیدوار کے طور پر سامنے لانا چاہتی تھی۔‘‘ عکس نے بالآخر گہری سانس لیتے ہوئے چائے میں سے ٹی بیگ نکال کر رکھ دیا۔

’’جواد سے کب بات ہوئی ہے تمہاری؟‘‘ شیر دل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

’’آج صبح...... اس کی bail ہو گئی تھی کل رات ہی لیکن مجھ سے بات نہیں ہو سکی اس کی...... کہہ رہا تھا طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجھ سے خود بات نہیں کر سکا۔‘‘ عکس اب کچھ سوچتے ہوئے چائے کے سپ لے رہی تھی۔ ’’میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے اپنی منگیتر کے طور پر میرا نام کیوں لیا؟ اس نے کہا اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میڈیا نے خود ہی یہ خبر ڈھونڈ نکالی اور چلا دی ورنہ اس کی فیملی کہاں اپنی عورتوں کا نام اس طرح ٹی وی اسکرین پر دیکھتی اور خوش ہوتی ہے۔‘‘ شیر دل نے چائے کا کپ رکھ دیا تھا۔

’’تم کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا؟‘‘ عکس نے نظریں اٹھا کر شیر دل کو دیکھا۔

’’میرے پاس یقین کرنے کا آپشن نہیں ہے...... کم از کم اس اسٹیج پر۔‘‘ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

’’عکس اس نے پولیس اسٹیشن میں خود تمہارا نام لیا تھا...... ایک بار نہیں بار بار...... وہ پولیس کو پہلے اپنے باپ کا نام لے کر دھمکا رہا تھا بعد میں تمہارا نام لے کر...... ایف آئی آر میں پولیس نے یہ بھی لکھا ہے...... مجھے اگر جواد کی کسی چیز پر اعتراض ہے تو وہ یہی ہے...... کچھ بھی ہوتا اسے اس سارے معاملے میں تمہارا نام نہیں لانا چاہیے تھا...... اس میں اتنی بہادری اور غیرت ضرور ہونی چاہیے تھی کہ وہ تمہارے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے تمہاری عزت کا خیال کر لیتا...... That's the only point that bothered me...... ورنہ مجھے اس کے ڈرنک کرنے یا کسی عورت کے ساتھ بھی پکڑے جانے پر کوئی اعتراض نہیں...... اور وہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ ڈرنک نہیں کرتا...... وہ نشے میں بالکل آؤٹ تھا جس وقت پولیس نے اس کی گاڑی کو روکا تھا۔ پولیس والوں نے تو انسانی ہمدردی اور اس کی جان کی تحفظ کے لیے اسے روکا تھا کہ کہیں گاڑی مار نہ دے...... ورنہ اس سے ابتدائی بات چیت میں اس کا فیملی بیک گراؤنڈ جاننے کے بعد انہیں کوئی شوق نہیں تھا اس پر کوئی ایف آئی آر وغیرہ رجسٹر کرنے کی کوشش کر کے اپنا منہ کالا کرنے کا...... وہ بے چارے تو اس کے گھر والوں کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کو آ کر لے جائیں لیکن ان موصوف نے نشے کی حالت میں وہاں سڑک پر ہی اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ آس پاس سے گزرنے والوں میں سے کسی نے کسی چینل کو اطلاع کر دی اور میڈیا کے وہاں پہنچنے کے بعد پولیس کو مجبوراً اس کے خلاف ایف آئی آر رجسٹر کرنی پڑی۔‘‘ شیر دل اسے بے حد سنجیدگی سے واقعے کی تفصیلات بتا رہا تھا۔

’’اور تم سے کل رات کو بات نہ کرنے کی وجہ طبیعت کی خرابی سے زیادہ نشے کی وجہ سے بات کرنے کے قابل نہ ہونا ہو گا...... لیکن خیر مسئلہ تو حل ہو گیا ہے اب...... اور ہو ہی جانا تھا اتنی پہنچ تو تمہارے سسرال والوں کی ہے ہی کہ اتنی چھوٹی سی بات پر پکڑے جانے پر اپنے بیٹے کو رات بھی پولیس اسٹیشن میں گزارنے دیتے۔‘‘ شیر دل نے چائے کا کپ دوبارہ اٹھا لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ کہتی شیر دل کے سیل فون پر کوئی کال آنے لگی تھی۔ چائے کا کپ واپس رکھتے ہوئے شیر دل

نے بے حد برق رفتاری سے فون اٹھایا تھا اور فون پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس نے اس کے چہرے پر اطمینان بھری ایک مسکراہٹ پھیلتے دیکھی تھی۔ پتا نہیں کیا تھا اس مسکراہٹ میں کہ عکس شیر دل کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ وہ اب فون پر شہر بانو سے بات کر رہا تھا۔

’’تم نیویارک پہنچ گئیں؟‘‘

’’ہاں ابھی سامان وغیرہ لینا ہے ہم لوگوں کو......‘‘ شہر بانو کی آواز تھکی ہوئی تھی۔

’’اگلی فلائٹ کا پتا کیا؟‘‘ شیر دل نے اس سے پوچھا۔

’’نہیں ابھی نہیں سامان وغیرہ لینے کے لیے کھڑے ہیں فی الحال تو...... ویسے بھی اگلی فلائٹ میں چار پانچ گھنٹے ہیں ابھی اور میں اتنی تھک چکی ہوں کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی...... تمہیں ساتھ آنا چاہیے تھا شیر دل۔‘‘ شہر بانو نے شکایت کی۔ شیر دل نے مسکراتے ہوئے اس کو بہلانے والے انداز میں کہا۔

’’I know yaar...... میں پہلے ہی بہت مس کر رہا ہوں کل رات سے تم دونوں کو......‘‘

’’مس تو تمہاری بیٹی کر رہی ہے تمہیں...... میری جان کھا لی ہے اس نے پورے راستے میں بار بار تمہارا پوچھ کر...... اب تم بات کرو اس سے۔‘‘ شہر بانو نے مثال کو دیکھتے ہوئے فون کو بالآخر اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ جو شیر دل کا نام لیے جانے پر بے حد impatient ہو رہی تھی۔ اس کی آواز فون پر سنائی دیتے ہی شیر دل کو جیسے کچھ دیر کے لیے واقعی یہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ عکس مدھم مسکراہٹ کے ساتھ فون پر مثال کے ساتھ ہونے والی اس کی گفتگو سنتی رہی۔ ایک عجیب سا رشک آیا تھا اسے شہر بانو اور مثال پر اور شیر دل پر...... وہ ایک پرفیکٹ تکون تھی...... ایک مکمل خوب صورت فیملی...... جس پر کسی کو بھی رشک آ سکتا تھا۔

’’بیٹا ممی کو بالکل تنگ نہیں کرنا اب تم نے...... ممی کا خیال رکھنا ہے۔‘‘ شیر دل اب الوداعی کلمات کہہ رہا تھا مثال سے اور اس سے ایک کے بعد ایک وعدہ لے رہا تھا۔

’’ممی کو فون دو۔‘‘ اس نے مثال کو آخری ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

’’شیر دل تم بیٹی سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ مجھے بھول جاتے ہو۔‘‘ شہر بانو نے فون پکڑتے ہی کچھ خفگی سے اس سے کہا اور اس کا یہ شکوہ غلط نہیں تھا۔ شیر دل ہنس پڑا تھا۔

’’میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں سویٹ ہارٹ؟‘‘ عکس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس نے چند لمحوں کے لیے شیر دل سے نظر ہٹائی تھی اور بالکل اس لمحے شیر دل کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کہاں تھا۔ شہر بانو کو اگلی فلائٹ کے حوالے سے کچھ ہدایات دیتے ہوئے اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کیا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں عکس سے کہا۔

’’سوری یار...... بس وہ دونوں نیویارک پہنچ گئی ہیں۔ شہر بانو پہلی بار مثال کے ساتھ اکیلے اتنا لمبا سفر کر رہی ہے اس لیے میں تھوڑا بے چین ہوں۔‘‘ عکس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

’’میں نے کچھ کہا؟‘‘

’’نہیں تم نے کہا تو نہیں...... لیکن میں پھر بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی لمبی بات ہو گئی ان لوگوں کے ساتھ میری۔‘‘ وہ سیل فون واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

’’تم کیا سوچ رہی ہو......؟‘‘ شیر دل کو اچانک خیال آیا جیسے وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

’’شہر بانو اور مثال پر رشک آ رہا تھا مجھے۔‘‘ عکس نے اپنی فیلنگز کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل حیران ہوا۔ عکس سے ایسا جملہ آنا بے حد غیر متوقع تھا۔

’’اچھا؟ اور کس لیے؟‘‘ وہ پہلے استعجابی انداز میں ذرا سا ہنسا پھر اس نے کہا۔

’’تم بہت اچھے شوہر اور باپ ہو شیر دل۔‘‘ عکس نے مسکراتے ہوئے اسے compliment دیا۔ شیر دل ہنس

پڑا تھا۔ اسے واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس تعریف کے جواب میں وہ کیا کہے۔

"پتا نہیں...... کوشش کرتا ہوں...... شہربانو بہت اچھی ہے۔" اس نے کچھ بے ربط سے انداز میں کہا۔

"جانتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں تم سے زیادہ تو کوئی نہیں جانتا ہوگا۔ تمہارا ہی تو انتخاب تھی وہ۔" شیر دل نے مسکرا کر جیسے اسے کچھ یاد دلایا تھا۔ عکس مسکرا دی۔

"انتخاب غلط تھا کیا؟"

"میں نے کب کہا؟ ہم کیا بات کر رہے تھے؟" شیر دل نے اس کی بات پر تبصرہ کیا اور پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ عکس کچھ کہتی آفس کا دروازہ کھول کر ایک دراز قد آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ شیر دل اور عکس دونوں بے اختیار چونکے تھے۔ شیر دل نے ماتھے پر کچھ بل لیے اس آدمی کو دیکھا...... اس کا اس طرح بغیر اطلاع کیے اندر آنا اسے بے حد کھلا تھا۔ اس آدمی نے اندر آتے ہی بے حد خوش دلی سے سلام کرنے کے بعد شیر دل کو بغور دیکھا۔

"اوہ تم...... مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم آ رہے ہو؟" شیر دل نے عکس کو پہلے حیران ہوتے اور پھر خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ اس آدمی سے کہتے سنا تھا۔

"بس ایک دم سے پروگرام بنا لیا تم سے ملنے کا۔" اس آدمی نے مسکراتے ہوئے عکس سے کہا۔

"شیر دل یہ جواد ہے اور جواد یہ میرے بیچ میٹ......" عکس اب جواد کا تعارف کروانے کے بعد جواد سے شیر دل کا تعارف کروا رہی تھی۔ شیر دل جواد کا نام سنتے ہی یک دم اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا تھا۔ عکس کے تعارف کروانے سے بھی پہلے اس نے بے حد گرم جوشی کے ساتھ جواد سے ہاتھ ملایا تھا جس نے خود بھی اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے علیک سلیک کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جہاں پوسٹڈ ہیں وہاں تو اکثر کام پڑتا رہتا ہے ہم لوگوں کو...... میرا خیال ہے آپ سے تو ملاقات رہے گی اب میری۔" جواد نے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں اس کی پوسٹنگ کا سنتے ہی بڑی گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اینی ٹائم۔" شیر دل نے بھی جواباً اسی گرم جوشی کے ساتھ اس سے کہا۔ دوبارہ اپنی نشست سنبھالنے کے بعد شیر دل نے ایک بار پھر جواد کا بغور جائزہ لیا تھا۔ اس کا پہلا امپریشن جو اس پر پڑا تھا دوسرا بھی وہی رہا تھا...... وہ جواد ملہی کو پسند نہیں کر سکا تھا۔ چند منٹ وہ مزید وہاں بیٹھا رہا تھا اور ان چند منٹوں میں بھی اس نے عکس اور جواد کے درمیان تناؤ کی ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی۔ چائے کا ایک اور کپ جواد اور عکس کے ساتھ مختصر ترین وقت میں پینے کے بعد شیر دل اٹھ کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ واپسی کا پورا راستہ وہ صرف جواد اور عکس کے بارے میں ہی سوچتا رہا تھا۔ عکس کے ساتھ جواد کی بے تکلفی اسے بہت ہی عجیب انداز میں چبھی تھی اور یہ نہیں تھا کہ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ عکس کے ساتھ کسی کی بھی بے تکلفی اسے ایسے ہی چبھتی تھی اور یہ تب بھی تھا جب وہ اکیڈمی میں غنی حمید کے بہت قریب تھی یا کم از کم شیر دل کو لگتی تھی۔ عکس اکیڈمی میں جس دن بھی جس بھی مرد کے ساتھ شیر دل کو بیٹھی نظر آ جاتی شیر دل کو کم از کم ایک دن کے لیے اس مرد سے نفرت ہو جاتی تھی اور وہ وجوہات سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ خود اس کو بھی ناپسند کرتا تھا لیکن وہ ان لوگوں کو بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا جو اس کے آس پاس نظر آتے تھے اور ان لوگوں کی فہرست میں سب سے اوپر غنی حمید کا نام تھا۔

سرکاری گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھے جی ٹی روڈ پر شام کے دھند لکے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عکس کے بارے میں سوچ رہا تھا...... اور جواد کے بارے میں...... جو اس وقت عکس کے پاس تھا...... اکیلا...... اس کی زندگی میں وہ جگہ لینے والا تھا جو شیر دل چاہنے کے باوجود نہیں لے سکا تھا۔ اسے جواد ملہی سے حسد نہ ہوتا تو کیسے نہ ہوتا...... اسے کبھی عکس کی زندگی میں آنے والے کسی مرد پر رشک نہیں آیا تھا۔ اسے صرف حسد ہوتا تھا۔

☆☆☆

"مجھے تو حسد ہوتا اگر میں وہاں انوائیٹڈ ہوتی اور میں تمہارے بجائے کسی اور کو best probationer کا

ایوارڈ لے کر جاتا دیکھتی...... ہماری فیملی کے لیے اس سے زیادہ embarrasing بات کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔"

شیر دل کی ممی نے اس کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب کی رات اس کے گھر واپس آنے پر اس سے کہا تھا۔ CTP کے اختتام پر ہونے والی اس پاسنگ آؤٹ پر کچھ وجوہات کی وجہ سے پیرنٹس انوائیٹڈ نہیں تھے۔ اور شیر دل فیملی کے لیے یہ بھی جیسے ایک face saving تھی۔ اپنے لاؤنج میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے شیر دل ماں کی باتیں سنتا ہوا کن انکھیوں سے اپنے باپ کو دیکھتا رہا جو بے تاثر چہرے کے ساتھ چائے کے سپ لیتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیوی کی طرح شیر دل کی اس "ناقص" کارکردگی پر کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"STP ابھی باقی ہے ممی۔" شیر دل نے جیسے اپنے ماں باپ کو assurance دینے کی کوشش کی۔

"وہاں عکس مراد علی نہیں ہو گی کیا؟" شیر دل کے باپ نے پہلی بار بڑے تحمل اور رسانیت سے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ شیر دل بے اختیار کچھ کھسیانا ہوا تھا۔ یہ اس کے باپ کے جوتے مارنے کا پرانا انداز تھا۔ وہ جانتا تھا وہ سوال نہیں پھبتی تھی۔

"ویسے کیا بیک گراؤنڈ ہے اس کا؟...... کس فیملی کی ہے یہ لڑکی؟" شیر دل کی ماں کو یک دم عکس مراد علی میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ شیر دل نے ڈیٹیلز شیئر کیں جو ہر کامنر کی طرح اسے بھی عکس کے بارے میں معلوم تھیں۔

"اوہ۔" اس کی ممی کو جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ ان کا خیال تھا وہ شاید کسی بیورو کریٹ کی اولاد تھی۔ پشت در پشت بیورو کریسی کا حصہ رہنے والے کسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور انہیں اپنے اس اندازے کے غلط ہونے پر جیسے کچھ مایوسی ہوئی۔ کسی کاروباری گھرانے کو تو شیر دل کی فیملی بہت نچلا درجہ ہی دے سکتی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی ہماری جان پہچان کی کسی فیملی سے تعلق ہے تو کچھ اور بھی پلان کیا جا سکتا ہے۔" شیر دل کی ممی نے مسکراتے ہوئے پہلے بیٹے اور پھر شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ملازم اب ان کی چائے کے کپ میں کچھ اور چائے ڈال رہا تھا۔

"مثلاً کیا؟" شیر دل نے کچھ حیران ہو کر ماں سے پوچھا۔

"تمہاری شادی وغیرہ کا کوئی سلسلہ شروع کیا جا سکتا تھا...... لڑکی دیکھنے میں کیسی ہے؟" شیر دل کو ماں کی بات پر یقین نہیں آیا۔

"ممی آپ مذاق کر رہی ہیں۔" وہ ہنس پڑا۔ اس کی ماں کا سینس آف ہیومر بہت اچھا تھا اور شیر دل ہمیشہ اس سے محظوظ ہوتا تھا...... اب بھی ہوا تھا۔

"ہاں، ہو سکتا تھا۔" اس بار شیر دل نے اپنے باپ کو بے حد سنجیدگی سے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے دیکھا۔ شیر دل کی ہنسی کو بے اختیار بریک لگا۔

"You can't be serious" (آپ یقیناً سنجیدہ نہیں ہیں۔) اس نے بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اتنی بری ہے وہ کیا؟" اس کی ماں نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

"وہ اچھی کہاں سے ہے ممی......؟ سی ایس ایس میں ٹاپ کر لینے یا best Probationer کا ایوارڈ لے لینے کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے چل پڑوں۔" شیر دل کو ماں کی بات اب بری لگی جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ مذاق نہیں تھا۔

"ایسے ہی سوچا ہے ہم کون سا تمہاری شادی واقعی اس کے ساتھ طے کرنے جا رہے ہیں۔" اس کی ماں نے اسے خفا ہوتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

"ممی آپ بھی بعض دفعہ حد کرتی ہیں ویسے...... میری شادی کروا رہی ہیں اس سے...... کہاں میں...... کہاں عکس مراد علی...... کوئی میچ ہی نہیں ہے ہم دونوں کا۔" شیر دل نے بے حد سنجیدگی سے اپنی چائے ختم کرتے ہوئے کپ رکھا۔

”وہ اتنی بری ہے؟“ اس کی ماں کو ایک عجیب سی کرید ہوئی عکس کے بارے میں۔

”she is just average“ (وہ بس ٹھیک ہی ہے) شیر دل نے بے حد خفگی سے کہا۔ I mean below average ”عام معیار سے بھی کم ہے۔“ شیر دل کو جیسے اپنی ہی وضاحت سے تسلی نہیں ہوئی اور اس نے اضافہ کیا۔ ”very ordinary“۔ دوسرے اضافے پر ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑا۔ عکس اس کے تصور میں آئی تھی اور اسے لگا اس کی وضاحت کچھ مناسب نہیں تھی۔

”I mean she is not that bad but she is not my kind of a girl“ (میرا مطلب ہے کہ وہ اتنی بری لڑکی نہیں ہے لیکن وہ میرے مزاج کی لڑکی نہیں ہے۔“) چند لمحوں میں ہی اس نے گڑبڑا کر اپنے ہی جملے کی کچھ تصحیح کی۔

”ویسے تم کو کیسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ شیر دل کی ماں کو یک دم جیسے اس موضوع پر اس سے تفصیل سے بات کرنے میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔

”عکس مراد علی کے علاوہ مجھے ہر لڑکی پسند ہے۔“ اس بار شیر دل نے کندھے اچکا کر جیسے مذاق میں ایک بات کہی۔

”عکس کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے...... تم اس کا ریفرنس کیوں دے رہے ہو؟“ اس کی ماں نے کہا۔

”ایسے ہی کہہ دیا میں نے...... اور پلیز آپ یہ فلمی سچویشن create کرنے کی کوشش نہ کریں فی الحال...... مجھے ابھی STP پوری کرنی ہے...... پھر اپنی پہلی پوسٹنگ کے دوران تو کم از کم اس طرح کے کسی سلسلے میں دلچسپی نہیں ہے۔“ شیر دل ماں کے ارادے بھانپتے ہوئے بولا۔

”میں صرف انگیجمنٹ کا سوچ رہی تھی۔“

”آپ اس کا بھی مت سوچیں best Probatiner کا ایوارڈ نہ لینے کی اتنی بڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے مجھے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ مسکرا دیے تھے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بھی شیر دل کو اپنے باپ کی خاموشی بری طرح چبھی تھی۔ انہوں نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا اور وہ مسلسل سنجیدہ رہے تھے جو ایک جملہ انہوں نے بولا تھا وہ شیر دل کو کانٹے کی طرح چبھ گیا تھا۔ STP کے best Probationer کا ایوارڈ اب اس کے لیے عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ زمین کا ٹکڑا میرے لیے عزت کا مسئلہ نہیں ہے چڑیا...... وہ 20 سال کی حق حلال کی کمائی ہے میری...... خون پسینے سے کمائی جانے والی ایک ایک پائی اکٹھی کر کے خریدی گئی تھی وہ زمین...... میں اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔“ چڑیا نے عجیب تکلیف کے احساس کے ساتھ اپنے نانا کو دیکھا۔

وہ ابھی کچھ دیر پہلے حوالات سے نکلا تھا اور اب وہ اور چڑیا بس پر بیٹھے واپس شہر جا رہے تھے۔ خیر دین کے کندھے ایک بار پھر عجیب سی شکست خوردگی کے عالم میں جھکے ہوئے تھے۔ چڑیا نے ہمدردی سے اپنے نانا کو دیکھا۔ وہ خیر دین کے لیے آج بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی...... لیکن اب کم از کم سمجھا سکتی تھی اور وہ اس وقت وہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہمیں اب اس زمین کی ضرورت نہیں ہے نانا...... اس کو بیچ کر بھی ہمیں اتنے پیسے نہیں ملیں گے جن سے ہماری زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آجائے۔ ہمارے پاس گھر ہے...... آپ نے اپنی دکان بھی خرید لی ہے...... میں میڈیکل کالج جا رہی ہوں...... ہمیں اس زمین کے لیے اب ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ چڑیا نے خیر دین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بس کے شور میں قدرے بلند آواز میں کہا۔

”ہر چیز کو پیسے سے تھوڑی ناپا جاتا ہے۔ بعض چیزوں کی قدر پیسے کی وجہ سے نہیں ہوتی چڑیا...... وہ میری حق حلال کی کمائی ہے...... میں کسی کا حصہ چھیننے تو نہیں گیا تھا...... اپنی چیز لینے گیا تھا...... اتنا بھی حق نہیں مجھے کہ اپنی چیز لینے کے لیے میں قانون کا سہارا مانگ سکوں۔“ خیر دین بات کرتے کرتے رو پڑا، چڑیا نے بے حد تکلیف سے اپنے نانا کو دیکھا۔ اسے

نو سال پہلے کی تکلیف اور بے بسی یاد آئی تھی...... اور پچھلے دو دنوں سے بار بار یاد آرہی تھی۔

”مت روئیں نانا۔“ اس نے گلوگیر آواز میں خیر دین سے کہا۔ خیر دین نے یک دم خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ چڑیا کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی کا کوئی اظہار نہیں چاہتا تھا۔

نو سال کے بعد خیر دین چڑیا کے ساتھ بڑے فخر سے گاؤں آیا تھا۔ اب اس کی جیب میں پیسے بھی تھے اور اس کے سر پر نو سال پہلے کی طرح ایک جوان بیٹی اور ایک چھوٹی بچی کا بوجھ نہیں تھا۔ وہ گاؤں آکر اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرا تھا جس نے کئی سال پہلے گاؤں سے شہر جاتے ہوئے اس کی مالی مدد کی تھی۔ خیر دین نے اپنے رشتے داروں سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی اس کے رشتے داروں نے اسے منہ لگایا تھا۔ گاؤں میں اب خیر دین کی عزت تھی کیونکہ خیر دین وہاں اسی طرح بس چند دن رہنے آیا تھا جس طرح سرکاری نوکری کے دوران آیا کرتا تھا۔ اس کے میل جول اور گاؤں والے اس کی جتنی عزت کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ وہ اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر لڑکی کی جو کلغی لگا کر آیا تھا وہ کسی کو زیادہ نظر نہیں آئی۔ شاید اس لیے کیونکہ چڑیا ابھی میڈیکل کالج میں گئی تھی ڈاکٹر بنی نہیں تھی اور اس لیے بھی کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی...... وہ بھی ایسی لڑکی جس کا داغدار بچپن گاؤں کے ہر بڑے بوڑھے کو ازبر تھا۔

خیر دین کو شہر میں ساری زندگی گزارنے کے بعد اگر تعلیم پر کوئی فخر یا ناز تھا تو گاؤں والوں نے اسے چکنا چور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لوگوں کو اس سے یہ جاننے میں تو دلچسپی تھی کہ اس نے حال ہی میں جو ریڑھی سے دال کی دکان بنالی تھی وہ کیسی چل رہی تھی وہ روز کے کتنے کما اور کتنے بچا لیتا تھا...... اور کیا گاؤں میں سے کسی اور کے شہر جا کر دال کی کوئی ریڑھی لگانے میں ویسا اسکوپ تھا جیسا خیر دین کے لیے بنا تھا...... لیکن کسی نے خیر دین کی ڈاکٹری پڑھنے والی نواسی کے بارے میں زیادہ نہیں پوچھا تھا کیونکہ وہاں کسی کو اپنی بیٹیوں یا اگلی نسل کی لڑکیوں کو ڈاکٹر تو کیا ابتدائی تعلیم سے زیادہ پڑھانے کی بھی خواہش نہیں تھی۔ وہ عورت کے اسی رول اور حیثیت سے خوش تھے جو صدیوں سے ان کے علاقے میں عورت کی تھی۔ چڑیا ڈاکٹر بن کے وہاں آئی ہوتی تو شاید پھر بھی وہاں اس کی قدر ہوتی۔ مفت دوا اور علاج کی غرض بہت سے لوگوں کو غرض مند بنا کر ان کا احسان مند کر دیتی لیکن فی الحال خیر دین کا وہ فخر گاؤں والوں کے نزدیک کسی کام کا نہیں تھا...... ان کے نزدیک شہر میں خیر دین کے کام میں ہونے والی ترقی زیادہ بڑی چیز تھی۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی کو کویت اچھی جگہ دوبارہ بسا دینا بھی قابلِ تحسین تھا...... لیکن چڑیا کی وہ ایک ڈگری نہیں جس کے لیے خیر دین نے بچپن سے خواب دیکھے تھے۔ جس کے لیے خیر دین نے راتیں محنت کرتے کاٹی تھیں۔

خیر دین نے گاؤں آتے ہی جو حرکت کی تھی اس نے یک دم اس کی فیملی کی سالوں پرانی کدورت اور دشمنی کو جیسے جگا دیا تھا۔ خیر دین نے گاؤں آتے ہی چڑیا کے منع کرنے کے باوجود اپنے خاندان پر جعلسازی کے ذریعے اپنی زمین ہتھیا لینے کی ایف آئی آر کٹوا دی تھی اور تھانے دار نے اس کے حلیے اور بول چال سے متاثر ہوتے ہوئے کچھ لیے دیے بغیر ہی ایف آئی آر نہ صرف رجسٹر کر لی تھی بلکہ اس پر فوراً کارروائی کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور یہ کوشش جیسے ایک پینڈورا باکس کھولنے کے برابر تھا۔

☆☆☆

”فی الحال تو شادی کی بات کرنا اور سوچنا بھی پینڈورا باکس کھولنے کے برابر ہے۔“ ایبک نے فاطمہ کے اس مطالبے پر کہ وہ اپنی امی اور فیملی کو اس کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے لائے جواب دیتے ہوئے کہا۔ فاطمہ اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے جیسے کچھ بول نہیں سکی۔

”پینڈورا باکس کس اعتبار سے کہہ رہے ہو؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ ایبک چند لمحے بڑی سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔

”میری پچھلے سال اپنی کزن سے انگیجمنٹ ہوئی ہے۔“ فاطمہ کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔

”تم نے کیا کہا؟ میں نے سنا نہیں۔“

''میری انگیجمنٹ ہوچکی ہے لیکن میں کوشش کررہا ہوں کہ یہ ختم ہوجائے...... مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔ ایک ڈیڑھ سال میں، میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لوں گا۔'' فاطمہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کے لیے یہ ناقابلِ یقین تھا کہ ان کے اس طرح کے تعلق کے باوجود ایبک نے چپ چپاتے منگنی کرلی تھی اور فاطمہ کو اس بارے میں بتایا تک نہیں تھا۔

''تم نے مجھ سے ذکر نہیں کیا؟'' اس نے بالآخر ایبک سے شکایت کی۔

''تم سے کیا ذکر کرتا یار...... تم خوامخواہ میں اپ سیٹ ہوتیں اور اگر تم اپ سیٹ ہوتیں تو میں بھی کہاں خوش رہ سکتا تھا۔'' ایبک نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔

''لیکن ایبک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک سال ہوگیا تمہاری منگنی کو۔ اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔''

''میں نے کہا نا یار، میں اس رشتے سے خوش ہوں ہی نہیں اور نہ ہی مجھے وہاں شادی کرنی ہے...... پھر منگنی کا ہونا نہ ہونا اور اس کے بارے میں بتانا یا نہ بتانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔'' ایبک نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

''میرے لیے رکھتا ہے ایبک۔ مجھے بے خبری میں رکھنا اور کبوتر بنے رہنا کبھی اچھا نہیں لگتا۔'' فاطمہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔

''میں منگنی ختم کروانے کی کوشش کررہا تھا۔'' ایبک نے کچھ کمزور آواز میں اسے وضاحت دی۔

''پھر بھی بتانا چاہیے تھا۔'' فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے خدشہ تھا کہ تم خفا ہوکر مجھ سے الگ ہوجاؤ گی۔'' اس کی وضاحت نے کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو جیسے لاجواب کردیا تھا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی کتابیں سمیٹنا شروع کردیں۔

''تم اس طرح مجھ سے خفا ہوکر جاؤ گی تو میں بہت اپ سیٹ رہوں گا۔'' ایبک نے اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں خفا نہیں ہوں...... ہرٹ ہوئی ہوں اور میرا خیال ہے مجھے اس کا حق ہے......'' وہ کہتے ہوئے کرسی دھکیل کر لائبریری کی میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ایبک بھی کھڑا ہوگیا۔

''I am sorry'' اس نے مدھم آواز میں جیسے فاطمہ کو ایک بار پھر منانے کی کوشش کی۔ فاطمہ کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ دل ٹوٹنے جیسے جملے اس نے پہلے کئی بار سنے تھے اور وہ سن کر ہنستی رہتی تھی۔ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے یہ یقین کرنا کہ پیار میں ناکامی پر دل ٹوٹ سکتا ہے بالکل ناممکن تھا لیکن لائبریری سے ہاسٹل تک کا سفر کرتے ہوئے فاطمہ کو پہلی بار اس تکلیف دہ احساس سے گزرنا پڑا۔ کالج اور ہاسٹل میں وہ لڑکیوں کی منگنیاں ہوتے اور ٹوٹتے دیکھتی رہتی تھی۔ افیئر چلتے اور پھر اسی طرح بریک اپ ہوجاتے اور زندگی چلتی رہی لیکن کچھ نہیں بدلتا تھا۔ لڑکیاں کچھ دیر روتی دھوتی تھیں پھر ٹھیک ہوجاتی تھیں...... بہل جاتی تھیں...... ان کی گفتگو میں آنے والے مرد کا نام کبھی بہت جلدی اور کبھی بہت دیر سے لیکن تبدیل ہوجاتا تھا...... اور ایسی چیزوں کو بہت بار دیکھتے رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اندر ایسا حوصلہ نہیں پا رہی تھی کہ اپنی زندگی میں سے مائنس کرکے دیکھ سکتی یا اپنی زندگی میں ایبک کے بجائے کسی دوسرے مرد کا تصور کرپاتی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ کی خواہش کی تھی۔ کسی کے ساتھ کی خواہش کے لیے اپنے گرد کھڑی دیواریں گرائی تھیں اور اب اس کے یوں قدم پیچھے ہٹا لینے پر کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو ایسا ہی محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کسی بھیڑ کے بیچوں بیچ اکیلی کھڑی رہ گئی۔

ہاسٹل آنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک سن دماغ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک یہ ماننے کو تیار نہیں ہورہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عام لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھنا نہیں چاہتی تھی کہ ہاسٹل کے کسی کمرے میں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روتی اور لڑکیوں کا ایک مجمع اکٹھا کرکے ان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو شیئر کرتی لیکن عجیب بات تھی اب اس تکلیف سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھی یہی چاہ رہا تھا...... بستر پر

[illegible] کر پھوٹ پھوٹ کر رونے کو...... اور کسی کے کندھے پر سر رکھ کر ایبک سے ہونے والی تمام شکایتیں دہرانے کو۔ [illegible] امید جو ایبک نے اسے تھمانے کی کوشش کی تھی اس کا دل اسے کبھی تھامنے پر تیار نہیں ہو پا رہا تھا۔ کہیں نہ کہیں اس [illegible] اسے وارن کررہی تھی کہ ایبک اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ نہ تو اپنی منگنی کو اس کے لیے توڑے گا نہ ہی اس [illegible] شادی کرے گا اور یہ وارننگ اس کی اذیت کو بڑھا رہی تھی۔ پیار میں کھایا جانے والا پہلا دھوکا ایسا ہی ہوتا ہے۔ [illegible] کے علاوہ سب کچھ لگتا ہے...... دل یہ نہیں مانتا کہ ہم اتنے معمولی ہوگئے کہ کسی کا دل مٹھی میں نہیں کرسکے...... اور [illegible] یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ کسی کی دنیا ہمارے علاوہ بھی کسی دوسرے وجود سے مکمل ہوسکتی ہے حقیقت بہت دیر تک [illegible] نہیں آزمائش، پریشانی، غلط فہمی، بددعا لگتی ہے...... بس حقیقت بن کر نظر نہیں آتی۔ فاطمہ کے ساتھ بھی یہی ہورہا تھا [illegible] کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو ایبک کے اس رویے کی کوئی توجیہہ دے کر بہلانے کی کوشش کررہی تھی اور وہ اس میں بری طرح ناکام ہورہی تھی۔ چار سال اس نے جو خواب دیکھتے ہوئے گزارے تھے وہ منٹوں میں ختم ہوگئے تھے۔ [illegible] بہت کم عمر، ناتجربہ کار، نوجوان لڑکی کے طور پر دیکھے جانے والے خواب...... ایک من پسند جیون ساتھی...... ایک اچھا سا گھر اور ایک پُرسکون زندگی جس میں وہ سب کچھ ہوتا جو فاطمہ کی اپنی ساری زندگی میں نہیں رہا تھا۔

زندگی کا ہر امتحان انسان ذہانت اور محنت سے پاس نہیں کرسکتا بعض امتحانوں کے لیے قسمت کے علاوہ اور کوئی چیز درکار نہیں ہوتی...... یہ فاطمہ کی زندگی کا ایک اور تکلیف دہ سبق اور نتیجہ تھا جو اس رات اس نے بیٹھ کر اخذ کیا تھا...... وہ خود کو ذہین، سمجھدار، محنتی، قابل مانتی تھی لیکن اس نے کبھی خود کو خوش قسمت نہیں مانا تھا، یہ ایک چیز تھی جس پر اس کا یقین خیر دین کی تربیت کے باوجود بھی متزلزل ہی رہا تھا...... اور اس کی زندگی میں وقتاً فوقتاً ایسا کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا تھا جو اس کے اس یقین کو پختہ نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اچھی قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی۔

زندگی میں ہونے والے اس پہلے ہارٹ بریک کا اگلا دن ایک مشکل دن تھا...... ہر اعتبار سے ایک مشکل دن۔ اسے ایبک کا سامنا کرنا تھا...... اسے اسٹڈیز اور کلاسز میں اپنا فوکس رکھنا تھا...... اور اسے خیر دین کو فون پر اپنی اور ایبک کی گفتگو سے آگاہ کرنا تھا...... اور...... سب کے ساتھ اسے ایک معمول کا دن نارمل انداز میں گزارنا تھا۔

''ہم اب دوبارہ نہیں ملیں گے۔'' فاطمہ نے اگلے دن ایبک سے سامنا ہوتے ہی کہا تھا۔

''کیا مطلب؟'' ایبک ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''میں نے تم سے کہا ہے میں وہ منگنی ختم کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔'' وہ بہت بے چین تھا۔

''نہیں ایبک میں اس سب کا حصہ نہیں بنوں گی۔ میں تم سے ملتی رہوں گی تو میری تکلیف بڑھتی رہے گی کیونکہ میں نے تمہیں ایک دوست کبھی نہیں سمجھا اور میں اس احساسِ جرم کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی کہ میں کسی اور لڑکی کے ساتھ تمہاری منگنی تڑوانے کی کوشش میں تمہاری حصے دار بنی رہی۔'' فاطمہ نے بہت سنجیدگی سے اسے کہا۔

''میں اس سے محبت کرتا ہی نہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم ہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ایبک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اگر ایسا ہے تو تم اس منگنی کو تڑوا کر اپنی فیملی کو لے کر میرے گھر آجانا میں ضرور تم سے شادی کرلوں گی۔'' فاطمہ نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''میں یہی تو کررہا ہوں...... تھوڑا وقت دے دو مجھے۔'' فاطمہ نے تحمل سے اس کی بات کاٹی۔

''تم جتنا وقت لینا چاہتے ہو لو...... بس میں اس عرصے کے دوران تم سے ملنا نہیں چاہتی۔''

''لیکن کیوں؟ ہم دوستوں کی طرح مل سکتے ہیں۔ اکٹھے اسٹڈی کرسکتے ہیں...... میں تم پر اتنا ڈیپینڈنٹ ہوں کہ میں تو خود اپنے نوٹس تک نہیں بنا سکتا۔'' ایبک بہت پریشان تھا۔ فاطمہ جانتی تھی وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ چار سال کے دوران اگر فاطمہ اس کے ساتھ نہ ہوتی تو ایبک کلاس کی پہلی دس پوزیشنز میں کبھی نہیں آسکتا تھا۔ وہ اس کے کہے بغیر اس کے ہر کام کو اپنی ذمے داری سمجھتے ہوئے کیا کرتی تھی۔ اس کے فولڈر میں ہر کام کے دو شیڈول بنتے تھے ایک اس کا اپنا اور دوسرا ایبک

کے لیے اور ایبک کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے نتیجے میں اندھیرا چھاتا نظر آرہا تھا تو وہ اپنی فیلنگز میں بالکل ٹھیک تھا۔

"تم بہت ذہین اور لائق اسٹوڈنٹ ہو۔ میرے بغیر بھی سب کچھ کر سکتے ہو ایبک...... پھر تمہاری ممی بھی ہیں تمہاری مدد کے لیے۔" فاطمہ نے کہہ کر وہاں سے جانے کی کوشش کی۔ ایبک بہت دور تک اسے منانے کی کوشش کرتا ہوا اس کے ساتھ چلتا رہا لیکن فاطمہ نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا تھا اس دن واپس ہاسٹل آکر وہ پہلی رات سے بھی زیادہ اپ سیٹ اور اداس تھی۔ پچھلی رات ایبک کا وہ رویہ تھا جس نے اسے پریشان کیا تھا لیکن اسے امید بھی دلائی تھی اور آج یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا اور ایبک سے تمام تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ آسان نہیں تھا وہ بری طرح کمزور پڑ رہی تھی...... قطع تعلق کر لینا اس قدر آسان نہیں تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔ اس رات اس نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایک عام لڑکی کی طرح وہ ساری رات بیٹھ کر روتی رہی تھی اور اگلے دن اس نے کالج سے بغیر کسی وجہ کے پہلی چھٹی کی۔

"کیا ہوا چڑیا؟" خیر دین نے ہاسٹل سے کی جانے والی کال پر اس کی آواز سنتے ہی بے حد تشویش سے کہا۔ وہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی کہنا چاہتی تھی...... نانا کچھ نہیں...... لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکی۔ وہ رو پڑی تھی اور پھر روتی ہی گئی تھی۔ خیر دین بہت دیر چپ چاپ اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

"ایبک کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"نانا اس نے پچھلے سال منگنی کر لی اور مجھے اس نے بتایا تک نہیں۔" فاطمہ نے سسکیوں کے ساتھ خیر دین کو بتایا۔ بہت دیر خیر دین صدمے سے گنگ رہا۔ سارے سوال جواب یک دم جیسے دم توڑ گئے تھے اس کے لیے۔ کوئی اس سے زیادہ کیسے سمجھ سکتا تھا۔ چڑیا بہت زیادہ دیر تک اس سے بات نہیں کر سکی۔ کال ختم ہو گئی تھی لیکن اس رات وہ سو نہیں پائی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بھی وہ اپنی روم میٹس کے کمرے میں ہونے کے باوجود بھی بستر میں گھس کر منہ چھپا کر روتی رہی تھی۔

اگلی صبح وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کالج جانے کے لیے تیار ہو کر ہاسٹل سے نکلی تھی اور تب اس نے ہاسٹل کے دروازے پر صبح سویرے چادر کی بکل مارے اونگھتے ہوئے خیر دین کو بیٹھے دیکھا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف آئی تھی۔

"نانا آپ اس وقت یہاں......؟" خیر دین اس کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر چڑیا کو دیکھ کر وہ جیسے یک دم مطمئن ہوا۔

"بس کل رات تم سے بات کرنے کے بعد مجھے چین نہیں آیا۔ میں رات کو ہی نکل آیا تھا تم سے ملنے کے لیے لیکن اجازت نہیں ملی تم سے ملنے کی...... کیونکہ بہت رات ہو گئی تھی۔" خیر دین نے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ فاطمہ کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ اس عمر میں اس کے لیے سردیوں کی وہ رات ہاسٹل کے اس گیٹ کے پاس کھلے آسمان کے نیچے گزار رہا تھا۔ پتا نہیں زندگی میں اس کو کتنی بار خیر دین کے لیے تکلیف کا باعث بننا تھا۔ فاطمہ کو اپنے آپ پر جیسے شرم آئی تھی۔

وہ اس دن کالج جانے کے بجائے خیر دین کے ساتھ ریس کورس میں چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اس نے ریس کورس کی ایک بینچ پر خیر دین کے ساتھ بیٹھے ہوئے گزار دیا۔ انہوں نے بہت ساری باتیں کیں لیکن ان میں سے کسی بات میں ایبک کا ذکر نہیں تھا۔

"تمہیں بہت اچھا جیون ساتھی ملے گا چڑیا۔" جانے سے کچھ دیر پہلے خیر دین نے یک دم بنا کسی تمہید کے اس سے کہا۔ فاطمہ نے چونک کر خیر دین کو دیکھا پھر ایک رنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ اس نے خیر دین سے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"کیونکہ تم بہت اچھی ہو۔" خیر دین نے اس سے محبت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "اور تم بہت بہادر ہو، سمجھدار ہو...... تم زندگی بنانا جانتی ہو بیٹا۔"

"نانا زندگی میں ایک چیز قسمت بھی ہوتی ہے۔" فاطمہ نے بڑی رنجیدگی سے خیر دین کی بات کاٹ دی تھی۔ "آپ ہی کہتے تھے نا قسمت بڑی چیز ہوتی ہے۔" اس نے نم آنکھوں کے ساتھ خیر دین کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔ خیر دین ایک لمحے کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے چڑیا سے کہا۔

"اور تم کہتی تھیں نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ایک کھیل بناؤں گی چیس کی طرح کا جس میں کوئین ہی بادشاہ ہو گی۔" چڑیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"زندگی اور کھیل میں بہت فرق ہوتا ہے نانا...... کھیل کو ہم کھیلتے ہیں لیکن زندگی ہمیں کھیلتی ہے۔ ہم زندگی کے مہرے ہوتے ہیں زندگی کو مہرہ نہیں بنا سکتے۔" خیر دین بہت دیر اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے یک دم مسکرا دیا۔

"ایک زمانہ ہوتا تھا چڑیا جب تم میری ہر بات مان لیتی تھیں۔" خیر دین نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں اب بھی آپ کی ہر بات مان لیتی ہوں۔" چڑیا نے کہا۔

"ہاں لیکن اب تم بعض دفعہ ایسی باتیں کرتی ہو جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا...... لیکن ایسی باتیں تو تم تب بھی کرتی تھیں جب بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں۔" خیر دین کو بات کرتے ہوئے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ ہنس دیا۔ فاطمہ نہیں ہنس سکی تھی۔ وہ جانتی تھی خیر دین اس کا ذہن اور دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نے یہ دھوپ چھاؤں دیکھی ہے؟" خیر دین نے یک دم چڑیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ چڑیا نے پارک میں ڈھلتی دھوپ کی سرخی کو دیکھا جو اب پارک کے ایک کونے میں سمٹ رہی تھی۔

"یاد ہے جب ہم صبح یہاں اس بینچ پر آکر بیٹھے تھے تو یہاں دھوپ تھی پھر آہستہ آہستہ وہ دھوپ یہاں سے وہاں چلی گئی اور یہاں چھاؤں آگئی...... کبھی تم نے سارا دن دھوپ اور چھاؤں کو ایک جگہ جمے دیکھا ہے؟" اس نے نرم آواز میں چڑیا سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"زندگی بھی ایسی ہی ہوتی ہے اس میں بھی دھوپ چھاؤں ایک جگہ نہیں رہتی...... کبھی برے دن ہوتے ہیں پھر اچھے آجاتے ہیں پھر اچھے گزر جاتے ہیں اور برے آجاتے ہیں...... پر اچھا برا کوئی وقت کبھی کسی انسان کے لیے مستقل نہیں رہتا۔" فاطمہ نے بے اختیار گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خیر دین سے کہا۔

"باقی سب ٹھیک ہے نانا لیکن میں نے اب کبھی کسی سے محبت نہیں کرنی...... یہ جو تکلیف آج سہی ہے نا میں نے...... یہ دوبارہ سہنا نہیں چاہتی میں۔" فاطمہ نے اٹھتے ہوئے دوٹوک انداز میں خیر دین سے کہا۔ وہ اب کھانے پینے کی وہ چند بچی کھچی چیزیں سمیٹ رہی تھی جو وہ سارا دن استعمال کرتے رہے تھے۔

"کل میری دکان پر ایک لڑکا آیا وہ مجھے بڑا اچھا لگا۔" خیر دین نے اچانک اٹھتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر فاطمہ سے کہا۔ فاطمہ نے عدم دلچسپی سے اس کی بات سنی۔

"اونچا لمبا گورا چٹا تھا، کسی بڑے اچھے خاندان کا تھا...... سرکاری گاڑی میں آیا تھا اپنے کسی دوست کے ساتھ...... شاید باپ وغیرہ سرکاری افسر ہے...... مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہا تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو۔" فاطمہ نے ٹھٹک کر خیر دین کو دیکھا۔ خیر دین کے لہجے میں ایک عجیب سی معصوم سی خواہش تھی...... اپنی چڑیا کو ہمیشہ کی طرح سب سے اچھی نظر آنے والی چیز دینے کی خواہش...... وہ چڑیا کا نصیب کس قلم سے لکھنا چاہتا تھا چڑیا کو کبھی سمجھ نہیں آئی تھی لیکن آج ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ خیر دین نے دکان پر دال کھانے کے لیے آنے والے کسی مرد کو دیکھ کر اسے چڑیا کا نصیب بنے دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ چند لمحے وہ خیر دین کو دیکھتی رہی پھر وہ اپنے نانا کی معصومیت پر ہنس پڑی تھی۔

"آپ بعض دفعہ عجیب باتیں بھی کرنے لگے ہیں نانا۔" چڑیا نے اس سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے اس کا نام کیا تھا؟" خیر دین نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے جیسے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ چڑیا سے کہا۔ چڑیا کو اور ہنسی آئی۔

"نانا آپ اس سے نام بھی پوچھنے بیٹھ گئے؟" اسے جیسے خیر دین کی جذباتیت پر یقین نہیں آیا تھا۔

مجھے کہہ رہا تھا کہ اسے میری شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ خیر دین مسکراتے ہوئے چڑیا کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بتانے لگا۔ ”ہاں...... تم سے کہہ رہا ہوں ناوہ مجھے بڑا اچھا لگا تھا...... چھ فٹ لمبا تھا...... بڑا تمیز والا لگ رہا تھا

”کیا نام تھا اس کا؟“ چڑیا نے اچانک پوچھا۔

☆☆☆

شیر دل نے اسے گھوڑے سے گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے وہ غیر ارادی طور پر گھوڑے کی باگ کھینچتے کھینچتے رک گیا تھا۔ اس کا گھوڑا چند لمحوں کے لیے ہلکا ہوا پھر اسی طرح دوڑتا ہوا رنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا جہاں شیر دل نے بالآخر اسے روک لیا تھا۔ چہل قدمی والے انداز میں گھوڑے کو چلاتے ہوئے وہ اسے وہاں لے کر آیا جہاں عکس مراد علی اپنے ساتھی مرد کامنرز، رائیڈنگ انسٹرکٹر اور پیرا میڈیک اسٹاف کے گھیرے میں زمین پر بالکل بے حس و حرکت چت لیٹی ہوئی نظر آ رہی تھی اور اس کے بالکل قریب غنی حمید ایک گھٹنا زمین پر ٹکائے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ عکس کے گھوڑے سے گرتے ہی وہ کامنرز میں سے پہلا آدمی تھا جو اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کے پاس پہنچا تھا اور اس کے عکس کے پاس پہنچنے پر شیر دل کا اضطراب عجیب سی خفگی میں بدلا تھا۔ رنگ کے باہر کھڑی ایمبولینس سے بھاگ کر عکس کے پاس پہنچنے والے پیرا میڈیکل اسٹاف کے ساتھ ہی دوسرے کامنرز اور رائیڈنگ انسٹرکٹر بھی اپنے گھوڑوں سے اتر کر اب عکس کے گرد دائرہ بنائے کھڑے تھے صرف شیر دل تھا جو گھوڑے پر کچھ فاصلے پر بیٹھا اس صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ لوگ صبح کے وقت ہارس رائیڈنگ کے لیے نکلے ہوئے تھے جب یہ حادثہ ہوا تھا۔ وہ DMG گروپ کی STP کے آغاز کا چوتھا دن تھا اور صبح سویرے کلاسز کے آغاز سے پہلے رائیڈنگ کا یہ سیشن سردیوں کے اس کہر آلود موسم میں ان سب کے لیے عذابِ جان تھا۔ شیر دل اور غنی حمید سمیت DMG کے چند دوسرے آفیسرز ایچی سن اور اس جیسے دوسرے اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والوں کے لیے گھڑ سواری جیسے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ رنگ میں اپنا اپنا گھوڑا لیتے ہی وہ تین چار لوگ گھوڑے کو بڑے اطمینان سے اِدھر اُدھر ٹہلانے میں مصروف ہو گئے تھے اور باقی کا سارا گروپ ہر روز کی طرح آج بھی گھوڑے پر درست طریقے سے چڑھنے اور بیٹھنے کی ڈرل کرنے میں مصروف تھا۔ چند منٹوں پہلے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے روز کی PT ڈرل کرنے کے بعد وہ سب اپنے گھوڑوں کو trotting (آہستہ آہستہ دوڑانا) کے لیے انسٹرکٹر کے ساتھ ایک دائرے میں دوڑا رہے تھے۔ عکس اور غنی کے گھوڑے شیر دل کے گھوڑے سے چار پانچ گز کے فاصلے پر تھے۔ ان کے درمیان عباس شیرازی اور عرفان محمود کے گھوڑے تھے۔ اس گروپ میں عکس واحد لڑکی تھی اور رائیڈنگ انسٹرکٹر ہر روز اس کے گھوڑے کو سب سے پہلے ایڑ دینے کے لیے کہتا تھا۔ دائرے میں گھوڑے دوڑاتے دوڑاتے ایک مرحلے پر تمام گھوڑے یوں ایک مکمل دائرہ بنا لیتے تھے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا تھا کہ دائرے کا سرا کون تھا اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ عکس trot کرتی ہوئی پہلے نکلی تھی۔ چھٹے نمبر پر گھوڑا دوڑاتے ہوئے شیر دل کی نظریں ہمیشہ کی طرح اس پر بھٹک رہی تھیں۔ وہ خود ایک ماہر گھڑ سوار تھا اور trot جیسی چیز اس کے اور غنی کے لیے ایک حلوہ تھی۔ اس لیے اس کی توجہ رائیڈنگ سے زیادہ عکس پر مرکوز رہتی تھی جو گھوڑے پر قابو پانے کی کوشش میں بے حال نظر آتی تھی۔ چوتھے دن تک وہ گھوڑا بہتر انداز میں کنٹرول کر رہی تھی اور شیر دل اس وقت بھی اسے دیکھتے ہوئے اسی ایک چیز پر غور کر رہا تھا جب اس نے عکس کے پاؤں کو رکاب سے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ ذرا سا بائیں طرف پھسل کر جھکی پھر اس نے گھوڑے کی گردن سے لپٹ کر جیسے اپنا توازن ٹھیک کرنے کی کوشش کی۔ غنی حمید تب تک اپنا گھوڑا تیزی سے بھگاتے ہوئے اس کے برابر لے آیا تھا۔ اس نے عکس کے گھوڑے کے برابر گھوڑا بھگاتے ہوئے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی جو تب تک اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے جھول رہی تھی۔ عکس کا گھوڑا غنی کے گھوڑے کے بالکل قریب آنے پر یک دم بدکا تھا اور اس نے بھاگتے ہوئے دائرہ توڑنے کی کوشش کی اور بالکل اس وقت شیر دل نے عکس کو توازن مکمل طور پر کھو کر گھوڑے کے

بائیں جانب گرتے دیکھا۔ وہ گھوڑے کے ذرا سا لڑکھڑا جانے کی وجہ سے بالکل سیدھا پشت کے بل زمین پر گری تھی۔ خوش قسمتی سے اس کا گھوڑا لڑکھڑاتے ہوئے بھی سنبھل گیا ورنہ وہ یا تو اس کے اوپر گرتا یا وہ اس کے پیروں سے زخمی ہو جاتی۔ وہ جس انداز میں گری تھی شیر دل کو یقین تھا وہ اٹھ کر رنگ سے چلتے ہوئے نہیں جا سکتی تھی۔ رائیڈنگ رنگ میں زمین پر ریت تھی اس کے باوجود جتنی اونچائی سے وہ گری تھی ایسا ممکن نہیں تھا کہ وہ گرتے ہی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ چند لمحوں کے لیے شیر دل کو بھی واقعی سمجھ نہیں آیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ گھوڑے سے اتر کر اس کے پاس دوسروں کی طرح جانا چاہیے یا اسی طرح گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اس دائرے کے گرد گھومنا چاہیے جو عکس مراد علی کے گرد بنا ہوا تھا اور جس میں سے اب اسے عکس نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، چار منٹ...... پانچویں منٹ پر شیر دل نے اس دائرے کو ٹوٹتے دیکھا۔ مرد کامنرز آہستہ آہستہ اپنے گھوڑوں کی طرف جانے لگے تھے اور اس نے اس چھٹتے ہوئے ہجوم کے درمیان عکس مراد علی کو زمین پر بیٹھا دیکھا تو وہ ٹھیک تھی۔ اطمینان کی ایک سانس اسے بھی آئی تھی۔ وہ اب سر پر پہنا ہوا ہیلمٹ دوبارہ پہنتے ہوئے اس کی بیلٹ کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے کس رہی تھی۔ شیر دل کچھ فاصلے پر اپنا گھوڑا روکے اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے کامنرز اپنے گھوڑوں پر سوار ہو رہے تھے۔ پیرا میڈیک اسٹاف فرسٹ ایڈ باکس زمین پر رکھے عکس کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں رائیڈنگ انسٹرکٹر اور غنی حمید بھی وہیں تھے۔ وہ اب ہاتھوں میں پہنے پروٹیکٹو گلوز ٹھیک کر رہی تھی۔ شیر دل نے اسے اپنے بازو سے چہرے پر لگی ریت صاف کرتے دیکھا پھر اس نے رائیڈنگ بوٹس کے اندر اپنے پیروں کی پوزیشن ٹھیک کرتے ہوئے ان کی زپ نیچے کر کے دوبارہ بند کی۔

ساتویں منٹ میں شیر دل نے اسے غنی حمید کا بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوتے دیکھا۔ وہ اب اپنے دونوں پیروں پر کھڑی اپنی گرے رائیڈنگ ٹراؤزرز سے ریت جھاڑنے کے بعد اپنے گلے اور بلیو کورٹ کے گرد لپٹے اسکارف کو ٹھیک کرتے ہوئے کوٹ کے بٹن بند کر رہی تھی جب اس نے اپنے بالمقابل پانچ گز کے فاصلے پر گھوڑے پر بیٹھے شیر دل کو دیکھا۔ صرف چند لمحوں کے لیے دونوں کی نظریں ملی تھیں، صرف چند لمحوں کے لیے وہ ٹھٹکی تھی پھر اسی سرعت سے اس نے نظریں چرائیں۔ ایک پیرا میڈیک اسٹاف کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر دو گھونٹ پی کر بوتل واپس کی اور پھر شیر دل نے اسے دائرے کے وسط میں کھڑے اپنے گھوڑے کی طرف جاتے دیکھا جس کی باگ ایک سائیس پکڑے کھڑا تھا۔ شیر دل کو اگر اس کے قدموں میں کوئی لڑکھڑاہٹ اور چہرے پر تکلیف کے کوئی آثار دیکھنے کی خواہش تھی تو اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔

دسویں منٹ میں شیر دل سمیت 16 پروفیشنرز نے عکس مراد علی کو ایک عجیب سی خاموشی اور تعظیم و تحسین کے عالم میں بے حد پُر اعتماد انداز اور مہارت سے اپنے گھوڑے پر دوبارہ سوار ہوتے دیکھا۔ اس نے رائیڈنگ انسٹرکٹر کو رکاب میں پاؤں پھنسانے کے لیے رکاب کو ہاتھ لگانے دیا تھا نہ ہی باگ پکڑنے میں اس کی مدد لی تھی۔ وہ باگ پکڑ کر پہلی ہی

کوشش میں بے حد ہموار انداز میں گھوڑے پر سوار ہوئی تھی۔ اپنے گھوڑے کو چند قدم چلاتے ہوئے
دائرے کے وسط سے دائرے کے اس سرے پر لے آئی تھی جہاں سے وہ لوگ ہمیشہ trotting کا آغاز
کرتے تھے اور شیر دل نے اسے ایک بار پھر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے دیکھا۔ اس عورت کی برداشت اور بے جگری نے
شیر دل کو پانی کیا تھا، وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود درجنوں بار گھوڑے سے گر چکا تھا
اور اچھی طرح ان انجریز اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف سے واقف تھا۔ عکس مراد علی سے زیادہ ہمت اور حوصلہ کسی
میں نہیں تھا۔ یہ اعتراف صرف شیر دل نے نہیں کیا تھا ان سترہ کے سترہ DMG پروفیشنرز نے کیا تھا جن کو لیڈ کرتے
ہوئے وہ وہاں پہنچی تھی۔

اور شیر دل کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ عکس مراد علی نے ایسی تکلیف اور اذیت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیروں پر
کھڑے ہونے کا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا۔ اس کی کمر کا نچلا حصہ ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور اس میں سے کرنٹ کی
طرح نکلنے والی ٹیسوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نہ صرف باقی کا پورا وقت رائیڈنگ کرتی رہی تھی بلکہ اس نے اس دن
معمول کی طرح ہر کلاس لی۔ وہ اس گروپ میں واحد عورت تھی اور ان 17 مردوں کے سامنے اسے ایک مرد کی طرح
کھڑے رہنا تھا۔ وہ اس سال پاکستان کے 17 ذہین ترین ذہنوں کے ساتھ اس DMG کیمپس میں تھی جن میں سے
ہر ایک دوسرے کے لیے مگرمچھ تھا اور وہ ان سب کے لیے شارک مچھلی بننا چاہتی تھی۔ اس رائیڈنگ رنگ میں چوتھے دن
گر کر زمین پر گرے رہنے کا آپشن قابلِ قبول نہیں تھا۔ وہ اگلے ساتھ آٹھ مہینے DMG کیمپس کے کامن روم میں
سنائے جانے والے جوکس کا موضوع نہیں بننا چاہتی تھی۔

رات کو ڈائننگ ہال میں ڈنر کے بعد شیر دل اس کے پاس گیا تھا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ رہ نہیں
سکا۔ وہ اس وقت ویٹر سے کچھ کہہ رہی تھی جب شیر دل اس کے پاس آ گیا۔

"I hope you are alright now" اس نے عکس کے متوجہ ہونے پر اس سے کہا۔ وہ ایک لمحے کے
لیے ٹھٹکی پھر شیر دل نے اسے مسکراتے دیکھا۔

"I am absolutely alright"

شیر دل اور وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ شیر دل کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک عجیب سا
احساس ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی امنڈی تھی جسے اس نے نظریں چرا کر اور سر جھکا کر چھپایا تھا۔ وہ اب ہاتھ
میں پکڑے سونف کے کچھ دانوں کو ہتھیلی پر ہلکا سا رگڑتے ہوئے مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شیر دل کو لگا
اسے وہم ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں نمی...... اور کس لیے؟...... عکس نے پاؤں بیرونی دروازے کی طرف
بڑھا دیے۔ شیر دل بھی پیچھے نہیں رکا۔ بہت خاموشی سے وہ ڈائننگ ہال سے برابر چلتے ہوئے نکلے تھے۔ ہاسٹل کی
طرف جاتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔

"گھوڑے سے دو چار دفعہ گرنا ضروری ہوتا ہے۔" عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ اس سے انسان کا کانفیڈنس بڑھتا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"کانفیڈنس میں اضافے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور کم خطرناک طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

"زندگی اور گھوڑا دونوں گراتے ہیں اور گرے بغیر دونوں کی سمجھ نہیں آتی۔" عکس یک دم ہنس پڑی۔ شیر دل نے
یک دم پھر اسے دیکھا تھا۔ اس کی ہنسی کی کھنک نے عجیب سے انداز میں اس کے دل کو چھوا تھا۔

"آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟" شیر دل نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں نے انجوائے کیا ہے آپ کی بات
کو۔" عکس نے جواباً کہا۔

"آپ دوسرے آدمی ہیں جو ایسی فلاسفی بول رہا ہے۔"

"اور پہلا آدمی کون ہے؟" شیر دل نے عجیب سے تجسس کے ساتھ اس سے پوچھا۔

☆☆☆

"مجھے کیوں نہیں پوچھنا چاہیے یہ؟" وہ اس دن جواد کے ساتھ اپنی دو سالہ کورٹ شپ اور منگنی کے بعد کا
پہلا آرگیومنٹ کر رہی تھی اور اس آرگیومنٹ کا آغاز اس نے نہیں کیا تھا۔ یہ کام جواد نے کیا تھا۔

"تمہیں میری ہر بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔" جواد کی گفتگو کی ٹیگ لائن تھی اور عکس زندگی میں پہلی بار اس سے گفتگو
کر کے اس قدر مایوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے آفس میں یوں اچانک آ جانے کا مقصد صرف اس معاملے پر
اسے وضاحت دے کر صورتِ حال کو سنبھالنا تھا لیکن جواد کی گفتگو سے ہونے والا احساس اس کے برعکس تھا۔ اسے لگا وہ
بلاواسطہ اسے ذہنی طور پر آئندہ بھی ایسی ہی کسی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے آیا تھا کیونکہ وہ
سیاست میں آنے کی تیاری کر رہا تھا اور میڈیا اور مخالف پارٹی اسے اور اس کے خاندان کو بدنام کرنے کے لیے اب کچھ بھی
کر سکتے ہیں۔ وہ بار بار اسی ایک بات کو دہرا رہا تھا اور یہ بات اس نے اتنی بار دہرائی تھی کہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی
ہونے کے باوجود عکس کو غصہ آ گیا تھا۔

"میڈیا کسی ٹھوس وجہ کے بغیر کیوں تمہیں بدنام کرنا چاہے گا؟ تم پاکستان کے کوئی بہت بڑے سیاست دان نہیں ہو
جواد...... اور میری سمجھ میں تو یہ نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھائے تمہیں سیاست میں آنے کا شوق کیسے ہو گیا۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے
یہی کہا کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور......" جواد نے کچھ خفگی سے اس کی بات کاٹی تھی۔

"اب مجھے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم سے پوچھ کے تو نہیں کرنا اور پھر میں نے کل رات تمہارا attitude (رویّہ) اور
اپنے ساتھ تمہاری loyalty (وفاداری) دیکھ لی ہے۔" جواد نے بے حد طنزیہ انداز میں اس سے کہا۔

"میری loyalty اور میرا attitude" عکس جیسے کچھ ہکا بکا ہوئی۔

"میں وہاں پولیس اسٹیشن میں تھا تو تم نے میرے لیے کیا کیا؟...... تم ابو کو فون کر کے صرف یہ پوچھتی رہیں کہ
کیا میں واقعی شراب پیتے پکڑا گیا ہوں...... اور یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ تم نے ایک دفعہ بھی انہیں کسی قسم کی مدد کی
آفر نہیں کی۔"

"میں جانتی تھی اگر تم بے گناہ ہو گے تو تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔" چند لمحے کے لیے جواد کو کوئی جواب نہیں سوجھا پھر جیسے
وہ بہت خفا ہو کر بولا۔

"میری پوری فیملی تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کر رہی ہے میرا مذاق اڑا رہی ہے......" عکس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جواد تم میری وجہ سے پولیس اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔"

"بار بار پولیس اسٹیشن کا ذکر اس طرح کرنا بند کر دو کہ جیسے میں کوئی مرڈر کر کے وہاں پہنچا تھا۔" اسے جواد کی بات پر
اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا اس کی بلند آواز سے۔ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس کا آفس تھا اور وہاں باہر اس کا اسٹاف

موجود تھا جو اندر سے آنے والی ہر آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا..... بلند آواز میں بول رہا تھا۔

''ہمیں اگر اس طرح چلا کر ایک دوسرے سے بات کرنی ہے تو بہتر ہے ہم فی الحال بات نہ کریں جب تم ہوش میں آجاؤ گے اور تمہیں لگے گا کہ ہم دو پڑھے لکھے مہذب لوگوں کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں تو پھر ہم بیٹھ کر اس ایشو پر بات کرلیں گے جس کے لیے تم اتنی دور سے آئے ہو۔'' عکس نے یک دم اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی فائلز سمیٹتے ہوئے بڑے تحمل سے اس سے کہا۔ جواد کا ردِعمل اس کے لیے اس سے بھی شاکنگ ثابت ہوا تھا۔ وہ یک دم کرسی سے کھڑا ہوا تھا اور اس نے غصے سے تقریباً دہاڑتے ہوئے اپنی پوری آواز سے اس سے کہا۔

''میں تمہارا اسٹاف نہیں ہوں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں..... تم مجھ سے ڈپٹی کمشنر بن کر بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا۔'' وہ چند لمحے کے لیے جیسے کنگ سی رہ گئی تھی۔ ذلت اور توہین کے احساس سے زیادہ وہ جواد کا وہ نیا روپ دیکھ کر شاکڈ ہوئی تھی۔ وہ اس جواد سے آج پہلی بار متعارف ہوئی تھی۔ اتنے عرصے سے وہ ایک سوفٹ اسپوکن، بے حد تہذیب اور شائستگی سے بات کرنے والے ایک بہت خوش مزاج اور نفیس آدمی سے آشنا تھی جس کے ساتھ زندگی کا سفر کرنا اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔

''تم ''ہونے'' والے شوہر ہو..... شوہر ہو نہیں اس لیے رعب جھاڑنے کی کوشش مت کرو۔ کم از کم اس طرح گلا پھاڑ کر نہیں۔ یہ رشتہ صرف ایک انگوٹھی تک کا ہے جسے میں اگر ہاتھ سے اتار کر تمہارے منہ پر ماردوں تو تمہیں اس آفس سے اٹھوا کر باہر پھنکوا سکتی ہوں اور کبھی بھی یہ مت سوچنا کہ میں یہ نہیں کرسکتی..... چاہے میں منگیتر ہوں یا تمہاری بیوی.....'' اس نے بڑے تحمل سے ٹھنڈے لہجے میں جواد سے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر گاڑی لگوانے کی ہدایت دی۔ جواد کا پارا سیکنڈز میں نیچے آیا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں کہیں اور چل کر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔'' اس نے اپنا اگلا جملہ مدھم آواز کے ساتھ بدلے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں..... کم از کم آج کے اس مظاہرے کے بعد میں آج کہیں بھی تم سے بیٹھ کر بات نہیں کروں گی۔ مرد کی مردانگی طاقت رکھنے کے باوجود اپنی آواز کو مدھم رکھنے میں ہے، ایک عورت کے سامنے گلا پھاڑنے میں نہیں..... وہ عورت کو بھی آتا ہے..... تم چائے پیو، میں جارہی ہوں۔''

''I am sorry'' وہ لمحوں میں اپنے اسی روپ میں آیا تھا جس سے وہ واقف تھی۔

''اچھی بات ہے لیکن ہم پھر بھی آج کوئی بات نہیں کریں گے۔'' وہ کہہ کر آفس سے نکل آئی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن سنسنا رہا تھا۔ ایک شادی شدہ زندگی کے کیا چیلنجز تھے اور کیا ہوسکتے تھے اس کا ایک مظاہرہ عکس نے دیکھ لیا تھا۔

''طاقتور ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر کے لیے وہ عجیب بے بسی اور مخمصے کا شکار ہو کر بیٹھی رہ گئی تھی اور جواد ایک روایتی مرد کی طرح اسے اسی احساس سے دوچار کرنے آیا تھا۔ ایک طاقتور عورت کے کام کی جگہ پر اس کی تذلیل کی کوشش..... اسے نفسیاتی طور پر ہلانے اور خوفزدہ کرنے کا سب سے مؤثر اور کارآمد طریقہ یا شاید جواد کے لیے ایک رات پہلے ہونے والے واقعے کے بعد اپنی عزتِ نفس کو اپنے اور اس کی نظروں میں بحال کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا یا پھر شاید یہ غصے کا وہ احساس تھا جو جواد کو پچھلی رات کے قضیے میں عکس مراد علی کے بالکل نیوٹرل رہنے سے ہوا تھا..... ایک ڈیفنس میکنزم کے تحت وہ اپنے آپ کو مزید وضاحتوں اور صفائیوں سے بچانے کے لیے عکس پر الٹ پڑا تھا..... وہ وقتی اشتعال تھا یا سوچا سمجھا پلان..... وہ جو کچھ بھی تھا اس کے نتائج وہ نہیں نکلے تھے جو جواد چاہتا تھا لیکن اس واقعہ نے عکس کو بہت اپ سیٹ کیا تھا..... پچھلی رات سے بھی زیادہ۔

''مردوں کے بارے میں میرے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔'' شیر دل نے رات کو عکس کو دوبارہ کال کی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اس سے جواد کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی اور اپنی مایوسی چھپا نہیں سکی تھی۔

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا، تم واقعی بڑے غلط اندازے لگاتی ہو مردوں کے بارے میں۔'' شیر دل نے اس کی بات کی

معنی خیز انداز میں تائید کی۔ عکس نے اس کے انداز اور جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہر بار میری judgement بہت flawed (ناقص) نکلتی ہے۔'' وہ واقعی کافی دل شکستہ تھی، شادی سے چند ہفتے پہلے ایسی کوئی صورتِ حال کسی بھی لڑکی کو اسی طرح دل شکستہ کرتی اور وہ بہر حال ایک لڑکی تھی۔

''میری سمجھ میں صرف یہ نہیں آیا کہ تمہیں جواد ملہی میں نظر کیا آیا تھا..... مجھے ایک نظر دیکھنے پر ہی وہ اچھا نہیں لگا تھا۔ تم دو سال اس سے ملتے جلتے رہنے کے بعد بھی یہ نہیں جان سکیں کہ وہ ایک short tempered (غصے والا) آدمی تھا جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کے ساتھ ہر طرح کی جہالت کا مظاہرہ کر سکتا تھا..... میں یہ تو نہیں مان سکتا کہ تم محبت میں اندھی ہو گئی تھیں کیونکہ عکس مراد علی تم کو کوئی محبت میں اندھا کر سکتا تو کیلکولی اسپیکنگ یہ اعزاز صرف مجھے حاصل ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کام میں بھی نہیں کر سکا تو کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں ہو سکتا..... تو واقعی سوچنے والی بات ہے یہ کہ تم نے اس آدمی کو اتنا misread کیوں کیا' اس کے مزاج کے حوالے سے'' عکس نے اس کے ابتدائی جملوں کو ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے اس کے آخری جملے پر کہا۔

''مجھے تو یہ تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ ڈرنک کرتا ہے۔''

''خیر وہ میرے لیے کوئی اتنا قابلِ اعتراض کام نہیں ہے۔'' شیر دل نے اسے ٹوکا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر تم کسی کو شادی کے لیے ریجیکٹ کر دو۔ عادی ڈرنک ہونا اور بات ہے اور سوشل ڈرنک کرنا ایک بالکل الگ..... بہت سارے مرد سوشل ڈرنک کرتے ہیں لیکن وہ بہت اچھے شوہر بھی ثابت ہوتے ہیں...'' شیر دل نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا۔ عکس نے یک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم ڈرنک کرتے ہو شیر دل؟'' شیر دل اس سوال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ حیرانی سے ہنسا تھا۔

''یہ کیا سوال ہوا؟''

''تم ڈرنک کرتے ہو شیر دل؟'' عکس نے اپنا سوال دہرایا۔

''یہاں میری بات نہیں ہو رہی۔'' شیر دل نے ایک بار پھر جواب سے بچنا چاہا۔

''تم ڈرنک کرتے ہو؟'' عکس اب بھی ڈائریکٹ تھی۔

''اگر کرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟'' شیر دل نے جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا۔

''تم ڈرنک کرتے ہو؟'' اپنی اتنی طویل دوستی کے دوران آج پہلا موقع تھا جب شیر دل نے عکس کو کسی بات کو اس قدر اصرار سے پوچھتے دیکھا تھا۔

''نہیں۔'' شیر دل نے بالآخر کہا۔

''میں جانتی تھی۔'' اس نے دوسری طرف عکس کے انداز میں ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔

''لیکن میں اسے برا نہیں سمجھتا۔'' شیر دل نے ساتھ ہی کہا۔

''میں سمجھتی ہوں۔''

''کون سی چیز زیادہ قابل اعتراض ہے تمہارے نزدیک، بدتمیز اور شارٹ ٹیمپرڈ ہونا یا شراب پینا؟'' شیر دل نے جیسے ایک عجیب احساس کے تحت اس سے پوچھا تھا۔

''شراب پینا۔'' عکس نے جواب دینے میں ایک لمحہ نہیں لیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔

''مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ تم شراب پینے والوں سے اتنی نفرت کرتی ہو..... کیوں؟'' عکس اس بار چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

''بہت سی چیزیں ہمیں پسند ہوتی ہیں اور کچھ پسند نہیں ہوتیں..... ہر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے کیا؟''

...ین وجہ ہوتی ہے ہر چیز کی۔" شیر دل نے اصرار کیا۔

"جواد کی کال آ رہی ہے۔" عکس نے یک دم کہا۔

"تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو؟

"نہیں...... کم از کم آج نہیں...... اسے میرے آفس آ کر اس طرح کی بدتمیزی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے میری عزت کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔"

"میں تمہیں یہی ایک فرق سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جب تم جواد کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر رہی تھیں جو تم میں اور جواد میں ہے۔ وہ جیسی فیملی سے تعلق رکھتا ہے وہاں اس طرح کے رویے کوئی بہت بڑی بات نہیں ہوتی۔ تمہیں پتا اور اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اگر اتنی بڑی پولیٹیکل فیملی سے تعلق رکھنے کے باوجود تم سے شادی کر رہا تھا تو اس کا تھوڑا ایچ تو تمہارے سر پر آنا ہی تھا۔"

"تمہیں لگتا ہے میں نے سوچے سمجھے بغیر جواد کا پروپوزل قبول کر لیا تھا؟" وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔

"سوچے سمجھے بغیر اگر کوئی پروپوزل تمہیں قبول کرنا چاہیے تھا تو میرا کرنا چاہیے تھا۔" شیر دل اس بار بھی سنجیدہ تھا۔

"میں بہت کنفیوزڈ ہوں شیر دل...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... جواد کو ایک موقع اور دینا چاہیے یا وہ سننا چاہیے جو میری چھٹی حس مجھ سے کہہ رہی ہے۔" اس نے ایک بار پھر شیر دل کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس سے جیسے اپنی الجھن شیئر کی تھی۔

"میں تمہیں اس بارے میں کوئی مشورہ دینے سے پہلے تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟"

"تم نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیوں کیا تھا؟"

"اس وقت ہم کوئی اور مسئلہ ڈسکس کر رہے تھے۔" ایک لمبی خاموشی کے بعد اس نے عکس مراد علی کو کہتے سنا۔

"تم نے اس وقت مجھے کہا تھا تم کبھی نہ کبھی انکار کی وجہ مجھے بتاؤ گی؟" شیر دل نے اسے یاد دلایا۔

"وہ وقت ابھی نہیں آیا۔" عکس نے مدھم آواز میں کہا۔

"اور کب آئے گا؟"

"بہت جلد...... اس کے بعد تم شاید میری شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرو گے۔" عکس نے بے حد عجیب سے انداز میں اس سے کہا۔

"یہ کام تو میں مر کر بھی نہیں کر سکتا۔ la belle dame sans merci... میں تمہیں اگنور نہیں کر سکتا۔" شیر دل نے جیسے احتجاج کیا تھا۔

"ہاں اگنور تم مجھے نہیں کر سکو گے لیکن......" وہ بات کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شیر دل کو وہم ہوا اس کی آواز کو آنسوؤں کا پھندا لگا تھا۔

"عکس......" اس نے اسے پکارا۔

"زندگی میں بہت سارے فیصلے اپنی عزت کے لیے کرنے پڑتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کے بعد بولی تھی۔ اس کی آواز صاف تھی۔ شیر دل کو لگا اس کا وہم وہم ہی تھا لیکن اس کا جملہ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

"ہاں لیکن صرف عزت کی خاطر ہم کسی کنویں میں نہیں کود سکتے۔" اسے لگا تھا شاید عکس کا ریفرنس جواد کی طرف تھا۔

"میں کود سکتی ہوں۔" اس کے جواب نے کچھ دیر کے لیے شیر دل کو لاجواب کر دیا۔

"میں پھر تمہیں عقل مند نہیں کہوں گا۔"

"ٹائیٹلز میٹر نہیں کرتے پرائڈ میٹر کرتی ہے۔"

"یہ کون سی پرائڈ ہے جو تمہیں احمقانہ فیصلے کرنے کے لیے مجبور کر رہی ہے؟" وہ اس کے جواب سے مزید

...نازل ہوا تھا۔

"زندگی میں وہ فیصلے کرنے چاہئیں جو زندگی کو پرسکون کر دیں۔"

"میں بھی یہی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں...... بہت دیر بعد ہمت کر پا رہی ہوں اس فیصلے کی...... لیکن مجھے لگتا ہے میری زندگی میں سے ایک بہت بڑی خلش نکال کر مجھے پُرسکون کر دے گا......"

"ایک اور error of judgement" شیر دل نے تنقیدی انداز میں اسے وارن کیا۔

"دیکھتے ہیں۔" اس نے مختصراً کہا۔

"میں زندگی میں تمہیں اگر کبھی بزدلی کا مظاہرہ کرتے دیکھوں گا تو مجھے تم پر بہت غصہ آئے گا۔ عکس مراد علی میں کم از کم تمہیں ایک روایتی، کمزور، دبو، مصلحت پرست، exploited عورت کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا۔" شیر دل نے بہت خفگی سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ وہ بہت دیر کچھ نہیں بولی پھر اس نے شیر دل سے کہا۔

"اور میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔" شیر دل بے اختیار مسکرایا۔

"میں چاہتا ہوں تم زندگی ایسے مرد کے ساتھ گزارو جو تمہیں ویلیو کرے...... شادی کے نام پر ایک لیبل اور پھندا اپنے گلے میں مت لٹکاؤ۔" اسے سمجھاتے ہوئے شیر دل کو احساس نہیں ہوا تھا کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کے سارے ریفرنسز غلط سمجھا تھا...... وہ جواد ملہی کے بارے میں اس سے مشورہ نہیں کر رہی تھی وہ کس چیز کے بارے میں اس سے مشورہ کر رہی تھی وہ اسے دو دن بعد پتا چلا تھا...... عکس مراد علی نے اسے ہلا ڈالا تھا۔

☆☆☆

اپنے نانا کو حوالات کے پیچھے دیکھ کر چڑیا ہل کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کی تکلیف دہ یادوں میں ایک اور یاد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ تھانے دار نے زمین کی جعلی رجسٹری کے کاغذ پھاڑتے ہوئے بڑے تنفر سے چڑیا سے کہا تھا۔ "اس بڈھے کو سمجھا دینا کہ وہ دوبارہ اس گاؤں میں مت آئے، زمین تو اسے ملنی نہیں ہے اگلی بار اپنی "عزت" سے بھی ہاتھ گنوا کر جائے گا۔ وہ کس "عزت" کی طرف اشارہ کر رہا تھا چڑیا کو وہ اشارہ سمجھنے کے لیے کسی ڈکشنری کی ضرورت نہیں تھی۔ تھانے میں ایس ایچ او کے کمرے میں تھانے کے آدھ درجن مرد عملے کی اوپر سے نیچے تک ایکسرے کی طرح چادر کے اندر لپٹے اس کے وجود کو کھنگالتی ہوئی غلیظ نظریں اور مکروہ مسکراہٹیں فاطمہ کو ہر مفہوم سمجھانے کے لیے کافی تھیں۔ تھانے دار کی میز کے بالمقابل کسی سائل کی طرح کھڑے لرزتے کانپتے خیر دین کے لیے گندی گالیاں سنتے ہوئے فاطمہ نے ویسا ہی خوف، ویسی ہی ذلت محسوس کی تھی اس دن بھی جیسے اس روز ڈی سی ہاؤس میں کپڑے اتار کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ آج بھی ویسی ہی دہشت زدہ اور گنگ تھی۔ ویسے ہی لرزتی کانپتی سسکیاں، ہچکیاں لیتی ہوئی...... وہ وہاں خیر دین کو چھڑانے آئی تھی بالکل اسی طرح جیسے کئی سال پہلے اس رات خیر دین اسے بچانے آیا تھا۔

دو دن پہلے گاؤں میں آتے ہی خیر دین نے اپنی زمین پر ناجائز قبضے کے لیے اپنے خاندان کے خلاف ایف آئی آر رجسٹر کروائی تھی اور اس وقت اس ایس ایچ او نے بڑی عزت اور احترام کے ساتھ رشوت کے کچھ پیسے لینے کے بعد اس کے خاندان کے خلاف ایک بڑی مضبوط ایف آئی آر رجسٹر کی تھی اور خیر دین کو بھرپور کارروائی کا یقین دلایا تھا۔ خیر دین ایک عجیب سی خوشی اور سرشاری کے عالم میں واپس گھر آیا تھا اور تقریباً ساری رات بے حد خوشی کے عالم میں چڑیا کے ساتھ وہ سارے منصوبے شیئر کرتا رہا جو وہ اس زمین کی واپسی کے بعد اس زمین کے حوالے سے بنا رہا تھا۔ فاطمہ نے اپنے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے بعد اسی دن پہلی بار خیر دین کو ایسا خوش اور پُرجوش دیکھا تھا۔

اگلی صبح فجر کے فوراً بعد چند پولیس والے آ کر خیر دین کو گاؤں کے اس کے دوست کے گھر سے اس کے دوست کے ہمراہ ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے تھے۔ فاطمہ جب تک گھر کی خواتین کے ہنگامے پر بیدار ہوئی خیر دین وہاں سے لے جایا جا چکا تھا۔ ایک عجیب سی سراسیمگی اور خوف کے عالم میں وہ جیسے بے اختیار ہو کر اس خاندان کی عورتوں کے ساتھ تھانے گئی تھی جہاں اسی تھانے دار نے اسے ان تمام عورتوں سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے چڑیا کو خیر دین سے ملنے نہیں

دیا لیکن تھانے میں اپنے رہائشی کمرے میں کمرا بند کرتے ہوئے دھمکاتے ہوئے زمین کی رجسٹری لانے
حکم دیا تھا اور اسے نہ لانے کی صورت میں جن نتائج کی دھمکی دی تھی وہ فاطمہ اس کمرے سے باہر آنے کے
بعد کسی کے سامنے دہرانے کے قابل بھی نہیں تھی۔ عجب دہشت کے عالم میں وہ واپس گھر گئی تھی اور رجسٹری لے کر واپس
تھانے آ گئی تھی۔ وہ پاکستان کے بہترین اسکول، کالج سے پڑھتے ہوئے پاکستان کے ایک بہترین میڈیکل کالج میں زیر
تعلیم تھی۔ غیر معمولی ذہانت کی حامل ایک روشن مستقبل رکھنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے
میں ایک لوہار کمی کمین کی نواسی تھی۔ جو کمزور اور نوجوان تھی اور بھیڑیوں کے چنگل میں تھی۔ گوشت خور تو شکار کرتے ہوئے
صرف بھوک سے مجبور ہو کر گوشت کھانے کی ترغیب پاتا ہے۔ انسان وہ واحد جانور ہے جو بھوک نہ ہونے کے باوجود بھی
کسی دوسرے انسان کی ہڈیاں بھنبھوڑ سکتا ہے۔ اگر وہ اسے کمزور، اکیلا اور نہتا نظر آتا ہو...... انسان صرف اسی وجہ سے
زیادہ خطرناک اور کم ظرف جانور ہے۔

بہت سال پہلے ایسا ہی ایک سمجھوتا خیر دین نے کیا تھا جو حوالات سے باہر آنے کے لیے...... اپنی زندگی کے ملبے میں
سے وہ سامان نکالنے کے لیے جس سے وہ دوبارہ اپنی زندگی بنا پاتا...... نو سال بعد وہ رجسٹری اس ایس ایچ او کو تھماتے
ہوئے ویسا ہی ایک سمجھوتا فاطمہ نے کیا تھا...... اپنی اور خیر دین کی زندگی کو ایک بار پھر ملبے کا ڈھیر بن جانے سے بچانے
کے لیے...... وہ جانتی تھی اس رجسٹری کے ضائع ہو جانے کے بعد زمین کا وہ ٹکڑا خیر دین کبھی نہیں لے سکتا تھا لیکن زمین
کے ٹکڑے زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا باعث نہیں بننے چاہئیں۔

حوالات میں خیر دین اور چڑیا کا آمنا سامنا اس رجسٹری کو دے دینے کے بعد ہوا تھا اور حوالات کے دروازے کے
سامنے چڑیا کے نمودار ہوتے ہی خیر دین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا حوالات کے اس کھلنے والے دروازے
کی قیمت کیا تھی۔

خسارے کا ایک اور سودا اور دل پر ایک اور داغ لے کر وہ دونوں اپنی عزت کو جیسے ایک گٹھڑی میں باندھے ہمیشہ کے
لیے اس گاؤں سے نکل آئے تھے اب پیچھے واقعی کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے خاندان نے خیر دین کی ایف آئی آر کے جواب
میں اس مقامی ایم پی اے کی مدد لی تھی جس کے حلقے میں وہ ووٹر تھے اور جس کے لیے ایک ایف آئی آر کا صفحہ تھانے دار کی
لاگ بک سے غائب کرنا جیسے ایک چھومنتر کی طرح تھا۔

خیر دین کو حوالات سے نکلوانے کے بعد چڑیا اور وہ گاؤں میں نہیں رکے تھے۔ ایک بس میں آٹھ گھنٹے کا سفر کرتے
ہوئے وہ واپس آ گئے تھے لیکن آٹھ گھنٹے کا وہ سفر فاطمہ کے لیے انگاروں کا ایک سفر تھا۔ خیر دین بس کی کھڑکی سے باہر دیکھتا
چادر میں منہ چھپائے روتا رہا تھا اور فاطمہ اس تجربے سے کچھ نئے سبق لیتی اور اندازے لگاتی رہی تھی...... اور اس سفر میں
جو پہلا سبق اس نے لیا تھا وہ یہ تھا کہ نانا کی ہر بات ہمیشہ ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی بہت ساری باتیں صرف کتابی ہو سکتی
تھیں۔ زندگی میں اچھائی برائے اچھائی ہو تو سکتی ہے لیکن یہ ہر وقت نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا سا مزید زہر تھا جو اس نے پیا تھا اور
وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کی محبت کا منکا اس کے اندر سے وہ چوسنے میں ناکام رہا تھا۔

وہ ان پیپرز میں لکھی تحریر کا سر پیر سمجھنے میں ناکام ہو رہا تھا...... سرد ہاتھوں اور زرد چہرے کے ساتھ ان کو تین بار
پڑھنے کے بعد بھی...... وہ ابھی ایک گھنٹے پہلے اپنی ماں کی ایمرجنسی کال پر بھاگم بھاگ لاہور آیا تھا لیکن جو کچھ وہ دیکھ اور
سن رہا تھا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... پتا نہیں آتش فشاں پھٹ چکا تھا یا پھٹنے والا تھا...... مگر شیر دل اپنے
پیروں کے نیچے زمین کی گڑگڑاہٹ سن رہا تھا...... کسی زلزلے کے آثار تھے یا پھر روزِ جزا اور مکافاتِ عمل کا آغاز......

"یہ تمہارا mess ہے اسے تمہیں ہی ٹھیک کرنا ہے۔" اس کی ماں نے اسے کہا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے وہ
mess نہیں تھا وہ دلدل تھی جس میں ان کی فیملی پھنسنے والی تھی...... دلدل شہد کی ہو یا کیچڑ کی...... وہ اپنے اندر سے نکلنے
نہیں دیتی جب تک انسان غرق نہ ہو جائے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

پہلا قدم

اقبال بانو

وہ برآمدے میں ساس کے پاس موڑھے پہ بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی کہ حمیدہ بیگم بولیں۔

"عالیہ، تمہاری اماں نہیں آئیں؟"

"کس لیے امی؟"

"اے لو تمہیں ساتواں مہینہ چڑھ گیا ہے، گود بھرائی کی رسم نہیں کرنی کیا؟"

"ہمارے ہاں ایسی کوئی رسم نہیں ہوتی۔"

"مگر ہمارے ہاں تو ہوتی ہے۔ ارسلان میرا

اکلوتا بیٹا ہے، خاندان والے کیا کہیں گے کہ ارسلان کے پہلے بچے پر سسرال والوں نے بیٹی کی گود بھرائی کی رسم بھی نہ کی۔''

''خاندان والے......'' عالیہ دھیرے سے ہنس دی۔ وہ تنک کر بولیں۔

''لو ہنسنے کی کیا بات ہے...... میری تو بیٹیوں کے تین تین بچے ہو گئے ہیں مگر میں نے ہر بچے کی مرتبہ ان کی سسرال جا کر گود بھرائی کی۔ اس سے بیٹیوں کے سر بلند ہو جاتے ہیں۔ تم بھی ماں کو کہو پہلی اولاد ہے تمہاری۔''

''جی...... کہوں گی......؟'' عالیہ پرات اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''عجیب لڑکی ہے، جو بات کہو ہمارے ہاں یہ رسم نہیں وہ رسم نہیں۔ یہ رسمیں، ریتیں تو پہچان ہیں ہماری۔'' حمیدہ بیگم بڑبڑائیں۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد عالیہ نے برتن سمیٹے اور کچن میں رکھ کر ڈائننگ روم میں آ کر میز صاف کی۔

''چائے نہیں ملے گی بیگم......؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں پانی چولھے پر رکھ آئی ہوں۔'' عالیہ نے جگ اٹھایا۔ ''امی آپ کے لیے بھی۔''

''نہیں بھئی، رات بھر نیند نہیں آتی۔ مجھے گرم گرم دودھ لا دو ایک گلاس۔'' حمیدہ بیگم جلدی سے بولیں۔

عالیہ نے چائے بنائی، ساس کے لیے دودھ گرم کیا، گلاس میں دودھ ڈالا، دو مگ چائے کے ٹرے میں رکھے اور گلاس بھی رکھ کر وہ باہر آئی تو ماں بیٹا لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عالیہ نے وہیں میز پر ٹرے رکھ دی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

''تم بھی چائے پی رہی ہو؟'' ارسلان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں کیا حرج ہے؟''

''کیوں...ڈاکٹر نے کہا ہے دودھ پیا کرو۔''

''آج ذرا ٹھنڈ ہے نا تو دل چاہ رہا تھا......'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے بس دودھ پیو۔''

''چائے ضائع جائے گی......'' عالیہ نے کہا۔

''میں پی لوں گا، تم اپنے لیے دودھ لاؤ......'' ارسلان نے دوسرا کپ بھی اپنے آگے سرکا لیا۔

''اچھا میں سوتے وقت پی لوں گی۔'' عالیہ نے مگ اپنی طرف کیا۔

''ابھی......'' ارسلان نے کہنا چاہا کہ حمیدہ بیگم بول پڑیں۔

''کہہ تو رہی ہے پی لے گی، تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو اور ذرا شرم نہیں تمہیں کہ ماں سامنے بیٹھی ہے چہلیں سوجھ رہی ہیں۔'' حمیدہ بیگم نے غصے سے کہا۔

''امی یہ چہلیں نہیں ہیں، میں خیال نہیں رکھوں تو......''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں عالیہ کا خیال نہیں رکھتی؟'' بات کاٹ کر وہ چیخ کر بولیں۔

''یہ بات نہیں ہے امی......'' ارسلان گڑبڑا گیا۔

''پھر کیا مطلب ہے تمہارا...... ایسی حالت میں عورت کی طبیعت اوپر نیچے ہوتی ہے، کبھی دل چاہتا ہے کوئی چیز کھانے کو کبھی نہیں زبردستی ٹھونسو گے تو قے کر دے گی۔'' حمیدہ بیگم نے اپنا دودھ کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی کر بولیں۔

''بہو گرم نہیں کیا تھا؟''

''امی کیا تھا گرم۔''

''اے لو میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ دل تھا ذرا

گرم دودھ پی لوں گی تو سردی کم لگے گی مگر بہو بیگم نے دودھ گرم کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔''

''امی جب عالیہ دودھ لائی تھی بھاپ نکل رہی تھی۔'' ارسلان نے ماں کی طرف دیکھا۔ ''ٹھنڈ بھی تو بہت ہے۔ اس لیے جلدی ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔''

''دو چار جوش دے لیتیں تو ایسا نہ ہوتا۔ اچھا بھئی میں تو سونے جا رہی ہوں۔'' حمیدہ بیگم صوفے سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

''شب بخیر امی......!'' ارسلان نے کہا۔ عالیہ جلدی سے کچن میں گئی، پانی کی بوتل اور گلاس اٹھا کر حمیدہ بیگم کے کمرے میں آئی، میز پر گلاس اور بوتل رکھی۔ حمیدہ بیگم واش روم میں تھیں وہ جلدی سے کمرے سے باہر آ گئی۔ ارسلان لاؤنج میں نہیں تھا۔ اس نے کچن میں آ کر برتن دھوئے، چولھا اور شیلف صاف کر کے وہ بوائلڈ پانی کی بوتلیں رکھ رہی تھی کہ ارسلان آ گیا۔

''بھئی کب تک انتظار کرواؤ گی؟''

''آپ جائیں نا کمرے میں، میں آ رہی ہوں......'' عالیہ نے فریج میں بوتل رکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے بغیر کمرا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔''

''یہ رومانس کا ٹائم نہیں ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''پھر کون سا ٹائم ہوتا ہے بھلا......؟ چلو کمرے میں۔''

''کچن تو سمیٹنے دیں۔'' اس نے سالن کا ڈونگا فریج میں رکھا اور پلٹ کر دھلے برتن ریک میں رکھنے لگی۔ ارسلان سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہا تھا پھر بولا۔

''مجھے بھی کوئی کام بتاؤ۔''

''رہنے دیں، کچن میں صرف عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔''

''اور یہ جو ٹی وی پر شیف آتے ہیں۔''

''وہ تو معاوضہ لیتے ہیں۔''

''تم بھی معاوضہ دے دینا۔''

''ابھی میں اتنی امیر نہیں ہوں۔'' وہ چولھا صاف کرتے ہوئے بولی۔

''یار تم بہت امیر ہو۔'' وہ بولا۔

''اچھا مجھے تو پتا نہیں تھا۔''

''آخر تم میری بیوی ہو۔'' ارسلان چہکا۔

''ہاں یہ تو یاد ہی نہیں رہا۔'' وہ زور سے ہنسی۔

''میں تو بہت امیر ہوں۔'' عالیہ نے ارسلان کے بازو میں ہاتھ ڈال کر محبت سے کہا۔ ''چلو اب کام ختم ہو گیا ہے۔'' عالیہ نے کچن کا دروازہ بند کیا اور ارسلان اسے ساتھ لگائے کمرے میں داخل ہوا۔

مکتبہ اھلا وسھلا
Monthly Digest
Sole Distributor
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

''تم تھک جاتی ہوگی؟'' ارسلان اسے بیڈ پر بٹھا کر بولا۔

''جب آپ کی محبت کی پناہوں میں آتی ہوں تو ساری تھکن اتر جاتی ہے۔'' عالیہ نے اس کے بازو سے گال رگڑتے ہوئے کہا۔

''سچ!'' ارسلان نے عالیہ کو پیار سے دیکھا..... پھر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ''عالیہ! تم نے مجھے محبت کے ان رموز سے آشنا کیا جو مجھے پتا ہی نہیں تھے۔''

''اچھا۔'' عالیہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''حالانکہ لوگ کہتے ہیں ارینج میرج سمجھوتا ہوتی ہے مگر میں کہتا ہوں ایسی بات نہیں ہے۔ بعض مرتبہ تو لو میرج میں بھی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔''

''یہ بات تو ہے۔''

''ہماری شادی کو آئندہ ماہ پورا سال ہو جائے گا لیکن مجھے لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو جب تم میرے اس بے سجائے کمرے میں آئی تھیں۔''

''آج آپ کو یہ سب کیوں یاد آرہا ہے؟''

''کبھی کبھی دل چاہتا ہے تم سے اظہارِ محبت کروں۔'' عالیہ ہنس دی۔

''ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''جناب کو علم ہونا چاہیے کہ کبھی کبھی نہیں بلکہ روز ہی آپ محبت کی تجدید کرتے ہیں۔'' عالیہ نے کہا۔

''اچھا مجھے تو پتا ہی نہیں چلتا۔''

''میں سنتی ہوں، مجھے تو پتا ہے نا۔'' عالیہ نے ہنس کر کہا۔

''تم نے دودھ پیا؟''

''پی لیا ہے۔'' وہ نظریں چرا کر بولی۔

''میری طرف دیکھ کر کہو۔''

''کیوں ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔'' عالیہ اٹھ کر ڈریسنگ کے قریب آئی اور ہاتھوں پر لوشن لگانے لگی۔

''تم جھوٹ مت بولا کرو۔''

''صرف دو گلو دودھ لیا جاتا ہے بتائیں کیا پورا ہو۔ ساتھ والی خالہ آگئی تھیں ان کے لیے چائے بنی پھر امی سے ملنے خالہ رشیدہ آئیں تو آپ جانتے ہیں کہ کھانے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے دو مرتبہ چائے بنی..... تو.....''

''کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے دودھ نہیں بچتا..... کل سے دودھ والے کو کہو ایک کلو تمہارے لیے الگ دیا کرے، سب کچھ جہنم میں گیا تم نے ایک کلو دودھ پینا ہے بس۔''

''امی سے کیا کہیں گے؟''

''یہ میرا ہیڈک ہے، تم پریشان نہ ہو۔''

''اچھا آپ بھی پریشان نہ ہوں آرام سے سو جائیں، میں دودھ نہیں پیوں گی تو مر نہیں جاؤں گی۔''

''ہونے والے بچے کے لیے اور تمہارے لیے پروٹین بہت ضروری ہے۔''

''ڈاکٹر ایویں کہتے ہیں، عورتیں تو سوکھی روٹی کھا کر بھی بچے پیدا کر لیتی ہیں۔'' عالیہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

''بس کچھ بھی ہو.....'' ارسلان نے کہنا چاہا تو عالیہ نے بات کاٹ دی۔

''پلیز ارسلان! میں کوئی ٹینشن نہیں لینا چاہتی جس طرح چل رہا ہے چلنے دیں۔''

''تم کیسی عورت ہو، تمہیں ذرا بھی اپنے بچے کا خیال نہیں۔''

''خیال ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے ٹینس نہ ہونے دیں۔ آپ کو پتا ہے میں بہت حساس ہوں ارسلان..... بس مجھے خوش رہنے دیں۔ یہی بہت ہے۔'' عالیہ نے ہاتھوں پر کریم لگائی اور ارسلان

خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم اور ظفر علی، عالیہ کے گھر آئے تو وہ ماں اور بھائی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ انہیں وہ لاؤنج میں بٹھا کر چائے بنانے چلی آئی۔ خدیجہ بیگم بھی ڈھیر سارے فروٹ اور بڑا سا آلمنڈ کیک لائی تھیں۔ عالیہ نے چائے بنائی، بڑے میں کیک رکھا اور نمکو، بسکٹ بھی رکھے۔ لاؤنج میں آئی تو امی سے خدیجہ بیگم باتیں کر رہی تھیں جبکہ ظفر بھائی اخبار پڑھ رہے تھے۔

''ارسلان کب آتے ہیں؟'' انہوں نے اخبار لپیٹ کر رکھتے ہوئے کہا۔

''بس آنے ہی والے ہوں گے۔'' عالیہ نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔

''بہو تم کیک بھی اٹھا لائیں، تمہاری اماں کیا سوچیں گی کہ ہمارے گھر میں چائے کے ساتھ سرو کرنے کو کچھ نہ تھا۔''

''ایسی بات نہیں ہے امی.....'' عالیہ نے کہنا چاہا تو خدیجہ بیگم جلدی سے بولیں۔

''لو بہن کیسی بات کی ہے، اللہ آپ کو بہت دے، عالیہ کو آلمنڈ کیک بہت پسند ہے تو ظفر نے لے لیا، سب کھائیں گے۔''

''اور پھر نمکو اور بسکٹ تو ہمارے گھر کے ہیں امی۔'' عالیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اسی وقت ارسلان بھی آگیا۔

''ہیلو! بھئی بڑی رونق ہے آج تو ہمارے گھر میں۔'' ارسلان خوشی سے بولا۔ ظفر سے گلے ملا اور خدیجہ بیگم کی طرف سر جھکایا تو انہوں نے اس کی بلائیں لے لیں اور دعا دی۔

''اللہ خوش رکھے۔''

''ہمیں بھی چائے ملے گی بیگم۔'' وہ عالیہ سے بولا۔

''کیوں نہیں۔'' عالیہ نے پاس پڑے خالی مگ میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا تھا آپ آنے والے ہوں گے، پہلے ہی کپ لا کر رکھا ہے۔''

''بیوی ہو تو ایسی.....'' ارسلان نے کپ تھام لیا۔ حمیدہ بیگم نے منہ بنایا تو خدیجہ بیگم کے چہرے پر خوشی مسکراہٹ بن کر بکھر گئی۔

''اب آپ عالیہ کو کب بھیجیں گی؟'' خدیجہ بیگم نے حمیدہ بیگم سے پوچھا۔

''کہاں.....؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''بھئی ہمارے گھر..... جب کہیں ہم آکر لے جائیں گے۔''

''مگر ابھی تو عالیہ کی ایسی کنڈیشن نہیں ہے خالہ جان۔'' ارسلان نے کہا۔

''پتا ہے مگر پہلے کے لیے تو جائے گی۔''

''نہیں، عالیہ کہیں نہیں جائے گی۔'' ارسلان جلدی سے بولا۔

''یہ رواج ہے ارسلان۔'' حمیدہ بیگم بولیں۔

''میں کسی رواج کو نہیں مانتا، عالیہ میری ذمے داری ہے اور میں ہی نبھاؤں گا۔'' ارسلان نے سختی سے کہا۔

''فضول کی ضد ہے تمہاری۔'' حمیدہ بیگم بولیں۔

''امی آپ سمجھیں..... عالیہ کی طبیعت خراب ہوگی تو وہ کسے کہے گی؟''

''اے لو میاں، وہ کوئی جنگل میں جا رہی ہے۔ باپ ہے، میں ہوں، بھائی ہیں اس کے۔'' خدیجہ بیگم تنک کر بولیں۔

''عالیہ میری بیوی ہے اور کہا نا یہ صرف میری ذمے داری ہے، جب آپ کے ہاں تھی تو باپ بھائی کی ذمے داری تھی۔''

''دیکھیں بہن آپ ہی ارسلان کو سمجھائیں۔'' خدیجہ بیگم نے حمیدہ بیگم سے کہا۔

''صحیح تو کہہ رہی ہیں' دنیا کیا کہے گی۔'' حمیدہ بیگم بولیں۔

''میری اپنی دنیا ہے اور مجھے لوگوں کی پروا نہیں۔'' ارسلان سپاٹ لہجے میں بولا۔

''میں سمجھاؤں گی ارسلان کو، آپ بے فکر رہیں۔''

''دیکھو نا اسپتال کا ہمارے یہاں سے بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا یہاں سے بلکہ کچھ نزدیک ہی ہے اگر وہاں رہے گی تو سہولت ہوگی۔''

''یہاں بھی ہر سہولت ہے۔ میں اپنی بیوی کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔''

''دوسرے......'' خدیجہ بیگم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہم دوسرے ہیں۔''

''ہاں' میرے لیے دوسرے ہی ہیں۔'' ارسلان نے غیریت کی انتہا کردی تھی۔ ظفر علی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ہم غیر ہیں تو غیر ہی سہی۔''

''ظفر بھائی آپ تو میری بات سمجھیں۔ رسم و رواج سہولیات کے لیے ہوتے ہیں کسی کو پریشان کرنے کے لیے نہیں۔ آپ بھی مصروف آدمی ہیں دفتر سے شام کو آتے ہیں مظفر بھائی بھی شاپ سے رات کو آتے ہیں، انکل بوڑھے ہیں، میں آپ لوگوں پر اپنا بوجھ بھی لاد دوں تو یہ کوئی شرافت تو نہیں ہے۔''

''دنیا میں یہی رواج ہے۔'' حمیدہ بیگم پھر بولیں۔

''تو اسے ختم کردیں۔ میرا بچہ ہے اور اسے میرے گھر ہی پیدا ہونا چاہیے۔ یہیں اس کا عقیقہ چلّہ ہو پھر بے شک عالیہ میکے جائے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''تو یہاں گھر میں تمہاری امی کیسے دیکھ بھال کریں گی، عالیہ کو بچہ سنبھالنا ہوگا۔ ہمارے گھر میں تو دو بہوئیں ہیں، عافیہ ہے، میں ہوں۔'' خدیجہ بیگم نے کہا۔

''میں اکیلا ہی بیوی بچے کی دیکھ بھال کرلوں گا۔''

''توبہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں چلّے والی عورت کے۔''

''میں کرلوں گا۔ طاہرہ کو بلوالوں گا اگر ضرورت پڑی۔'' حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔

''تم تو کچھ بولو، چلنا ہے یا نہیں؟'' خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

''جیسے ارسلان کہیں گے۔'' عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

''اپنی رائے بھی تو دو۔''

''آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو تو بس۔'' عالیہ نے کندھے اچکائے۔

''اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔''

''میں کچھ نہیں کہتی...... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزارنی ہے۔'' عالیہ نے برتن سمیٹے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

''چلو پھر......'' خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''کل کو میاں تم ہی طعنے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔''

''میں ان دامادوں میں سے نہیں ہوں جن سے آپ کا اور امی کا پالا پڑا ہے، میں اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، کبھی میرے گھر سے آپ کو طعنہ نہیں ملے گا۔'' ارسلان نے اطمینان سے کہا۔

عالیہ بھی برتن رکھ کر آگئی تھی۔ خدیجہ بیگم نے بیٹی کو پیار کیا، حمیدہ بیگم سے ملیں، ظفر نے عالیہ کا سر تھپتھپایا اور باہر نکلے۔ عالیہ اور ارسلان بھی ان کے ساتھ باہر پورچ تک آئے۔

''پلیز خالہ برا نہ مانیے گا۔ غلط رسموں کو ہم نہیں ختم کریں گے تو یہ خوار کریں گی' اس مہنگائی کے دور میں بندہ ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے آپ کیوں یہ بار اٹھانا چاہتی ہیں۔'' ارسلان نے خدیجہ بیگم کے کندھے تھام کر کہا۔

''خوش رہو بیٹا، ایسا نہ ہو کوئی طعنہ ترشی عالیہ کو دکھی کرے یہ ایسی حالت میں پریشان ہوگی تو بچے پر اثر پڑے گا۔ ایسی حالت میں عورت کو خوش رہنا چاہیے ورنہ بچے ایب نارمل..... اور بیمار پیدا ہوتے ہیں۔ ٹینس عورت بیمار بچے ہی پیدا کرے گی نا؟''

''مجھے پتا ہے آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی — بس آپ اس برے رواج کو ختم کرنے کے لیے میرا ساتھ دیں۔''

''اللہ تمہیں کسی کا محتاج نہ کرے، خوش رہو۔'' خدیجہ بیگم نے اس کی پیشانی چومی۔ عالیہ کو گلے لگالیا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ظفر نے بھی ارسلان سے مصافحہ کیا۔

ان کے جانے کے بعد عالیہ اور ارسلان نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر اندر آگئے۔ حمیدہ بیگم بے حد غصے میں بیٹھی تھیں، دیکھتے ہی بولیں۔

''آخر تم اپنی کیوں منواتے ہو۔ دنیا سے الگ تو نہیں ہو تم؟''

''امی میں بحث نہیں کرتا...... جو چیز میں غلط سمجھتا ہوں وہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''دنیا کیا کہے گی، وہ تمہاری پھوپیاں کہیں گی کیسے لٹ پونجیوں میں بیٹا بیاہا ہے نہ گود بھرائی کی رسم

پاکستان کی پہلی
کہانی ورکشاپ

اُن کیلئے، جنہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر یقین ہے، جو کہانیاں، افسانے، ناول لکھنا چاہتے ہیں!

صفِ اوّل کے کہانی کاروں اور ادیبوں کی نگرانی میں فکشن رائٹنگ سیکھیے۔

فکشن فورم پاکستان اور
میڈیا اویئرنیس اینڈ گائیڈنس سوسائٹی (رجسٹرڈ)
کے زیرِ اہتمام

7 اور 8 اپریل 2012ء
(صبح 11 بجے سے شام 5 بجے)

ورکشاپ کے موضوعات
★ پلاٹ کی اہمیت ★ اچھا ابتدائیہ ★ مؤثر ڈائیلاگ
★ جیتے جاگتے کردار ★ نظرِ ثانی کرنے کے طریقے
★ سسپنس پیدا کرنا ★ کہانی شائع کرانے کیلئے رہنمائی

کورس فیس: -/1900 روپے
(جس میں شامل ہیں کورس میٹریل، اسٹیشنری، لنچ، چائے، اسنیکس، ٹریننگ اور سرٹیفکیٹ)

مقام
APEX ACADEMY، میزانائن فلور، پلاٹ C-19، 27 ویں کمرشل اسٹریٹ، عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے سی ویو کلفٹن کی جانب جاتے ہوئے، پی ایس او پیٹرول پمپ کے پیچھے، توحید کمرشل ایریا، ڈی ایچ اے، کراچی۔

رجسٹریشن کیلئے فوری رابطہ کیجئے
ای میل: fictionforumpk@gmail.com
سیل فون: 0315-3830001, 0301-8210848

ہوئی اور اب چلّہ بھی.....''

''آپ میری بچیوں کو میرے سامنے کردیجیے گا میں تو اب محرک چلانے لگا ہوں، یہ سب آپ جیسی عورتوں نے رئیس بنائی ہیں۔ بہو آپ کی بیٹا آپ کا بیٹے کی اولاد آنکھ کھولے تو تخیال میں، یہ کون سی تک ہے۔ دل سے ہر کوئی تنگ ہے اتنے خرچوں سے۔''

''تم نے اتنی آسانی سے کہہ تو دیا، اب دیکھو میں تو بیمار ہوں کس طرح دیکھوں گی عالیہ کو اور بچے کو۔''

''طاہرہ آجائے گی، ہما کو بلالیں۔''

''گھر سے فالتو ہیں نا..... آجائیں۔''

''پانچ ماہ پہلے جب طاہرہ کے تیسرا بیٹا ہوا تھا یہاں تو عالیہ نے طاہرہ کی خدمت کی تھی، اب طاہرہ آجائے گی تو عالیہ کا چلّہ۔'' ارسلان اطمینان سے بولا۔

''ایسا تو کہیں نہیں سنا جو تم کہہ رہے ہو اور پھر طاہرہ کیسے آسکتی ہے؟''

''عالیہ اس کی خدمت کرسکتی ہے تو وہ بھاوج کے کام نہیں آسکتی۔ بس امی رہنے دیں آئندہ میری بہنوں کو کہہ دیں چلے کرنے یہاں نہ آئیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''رسم ہوتی ہے پہلے بچے کے لیے مگر یہاں تو ہر تیسرے مہینے بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ میں اتنا خرچ افورڈ نہیں کرسکتا۔ کبھی طاہرہ آرہی ہے تو کبھی مینا اور پھر ہما کو کوئی طریقہ نہیں ہے۔''

''پتا نہیں تمہارے دماغ میں کیا خناس بھر دیا گیا ہے۔'' انہوں نے تیکھی نظروں سے عالیہ کو دیکھا۔

''میری بیوی نے مجھے کچھ نہیں کہا اسے مت گھوریں۔ چلو عالیہ کھانا لاؤ مجھے بھوک لگی ہے، میں چینج کر کے آتا ہوں۔'' ارسلان نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

''اسے سمجھاؤ کہ دنیا کے ساتھ چلے۔''

''میری کب مانتے ہیں۔''

''مانتا تو وہ تمہاری ہی ہے۔'' معنی خیز انداز میں کہا گیا۔

''غلط فہمی ہے آپ کو۔'' عالیہ سر جھٹک کر بولی اور کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

عالیہ نے ٹرے میز پر رکھ دی ارسلان چینج کر کے آچکا تھا۔ وہ پوچھنے لگا۔

''تمہارا دل تو نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔''

''نہیں ارسلان..... میں نے بھی سوچا ہوا تھا کہ یہ فضول رسموں سے چھٹکارا پاؤں گی۔ مجھے خوشی ہے آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''تم نے کب سوچا؟''

''بہت بچپن میں، جب ہماری پانچوں پھوپیاں ڈیلوری کے سلسلے میں آتی تھیں۔ آپ کی طرح ابا بھی اکیلے بھائی تھے صرف ایک پرچون کے اسٹور کی آمدنی کیا کرتی.....؟ مگر ہماری دادی کی فرمائش پر پھوپیوں کی گود بھرائی کی رسم پر تو ڈھیروں فروٹ اور خشک میوہ لے جایا جاتا۔ ہم بھی شوق سے جاتے، خوب کھاتے، کبھی ماں اور باپ کے فکرمند چہرے نظر ہی نہ آئے۔ دادی جان ابا کو نچوڑ ہی لیتی تھیں۔ اماں کا سارا زیور ہی نندوں کے چلّوں اور گود بھرائی کی نظر ہوگیا۔

''واقعی.....؟'' ارسلان حیرت سے بولا۔

''آپ یقین کریں ارسلان، اماں کی بالیاں آخری بچی تھیں جو ظفر بھائی کی ایم اے کی فیس کے لیے دینی پڑیں۔''

''مائی گاڈ.....!''

''ان دنوں بھی چھوٹی پھوپی آمنہ کی چھوٹی بیٹی

''آپ کی بات درست ہے مگر میرے میاں کو اتنی عقل ہوتی تو..... میرا ایک ہی بھائی ہے اور جب میں اسے اتنے بوجھ تلے دیکھتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے یقیناً سب بہنوں کو ہوتا ہوگا۔ ارسلان نے ہمت کی ہے آئندہ ہم بھی اپنے مردوں کو سمجھا سکتے ہیں۔ آپ ارسلان سے خفا نہ ہوں اور خود بھی سوچیں تو آپ کو لگے گا کہ ارسلان غلط نہیں ہے۔ اس نے پہلا قدم اٹھایا ہے..... بری رسم کے خلاف اس کا ساتھ دیں۔'' حمیدہ بیگم نے آہستہ سے ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

درختوں پر نئے پتے بہار دکھا رہے تھے۔ اور کیاریوں میں گلاب بھی جھوم رہے تھے۔ بہار کا موسم تھا جب ایک صبح عالیہ نے خوب صورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ ارسلان اسے خود اسپتال لایا تھا اور پھر صرف ایک گھنٹے بعد اسے پتا چلا کہ وہ بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔

نرس نے ارسلان کی گود میں بچہ دیا تو اسے بے تحاشا خوشی ہوئی۔ عالیہ کمرے میں شفٹ ہوئی تو ارسلان بچے کو لے کر اس کے پاس گیا۔ ''بہار کا پہلا پھول ہمارے آنگن میں کھلا ہے۔'' ارسلان نے بچے کو اس کی گود میں دیا تو عالیہ بھی لجاتے ہوئے مسکرادی۔

''دیکھو عالیہ اگر تم میکے چلی جاتیں تو ہم دونوں اس خوشی سے محروم رہتے کہ اپنے بچے کو سب سے پہلے ہم نے دیکھا، ہم نے پیار کیا۔'' عالیہ نے سر ہلادیا۔

''اب میں سب کو اطلاع دیتا ہوں کہ ہم باپ بن گئے ہیں۔'' محبت سے سرشار ارسلان نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور مسکرا کر بٹن پش کرنے لگا۔ عالیہ بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

ہمارے ہاں ہی پیدا ہوئی تھی۔ روز کے پھل، انڈے، مٹھائی کے علاوہ روزانہ شام کو داماد جی کے لیے اچھا کھانا، بڑا... مشکل وقت کاٹا ہے ہم نے.....''

''کوئی منع نہیں کرتا تھا.....؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''کون کرتا، دادی کو کون سمجھاتا.....؟ ہمیں اماں سمجھاتیں، ہماری خواہشوں کو پس پشت ڈال دیتیں مگر دادی کے سامنے اُف نہ کرتیں۔''

''دادی تمہیں یاد عذاب!'' ارسلان نے کہا تو وہ مسکرادی۔

''کھانا تو کھائیں آپ.....''

''یار بس ان رسموں کو دیکھ کر دل خوش نہیں ہوتا اوب جاتا ہے۔ اب امی کی بات سنو، یہ بھلا کیا تک ہے کہ تم طاہرہ کی خدمت کرسکتی ہو وہ نہیں کرسکتی۔ صرف بھاوج پر ہی فرض ہے۔ بس میں خود ہی تمہاری دیکھ بھال کرلوں گا۔ چھٹی لے لوں گا آفس سے۔'' ارسلان محبت سے بولا۔

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ فکر نہ کریں، میں کام کرلوں گی۔ ماسی کو ذرا دیر تک ٹھہرا لوں گی۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' ارسلان نے کہا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ حمیدہ بیگم کا موڈ بہت بہو سے خراب تھا۔ وہ چاہتی تھیں بہو میکے جائے مگر جب بیٹا نہیں مان رہا تو وہ کیا کرتیں۔ فون پر ہما سے کہہ رہی تھیں۔

''پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے عالیہ نے کہ وہ اسی کی مانتا ہے۔ اسے بیوی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔''

''امی ٹھیک تو ہے، ارسلان صحیح کر رہا ہے۔''

''اے لو..... کیا صحیح ہے۔''

''کسی پر اتنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔''

''تم بھی تو یہاں.....'' انہوں نے کہنا چاہا تو ہما نے بات کاٹ کر کہا۔

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوک شمشیر پہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں
...وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے
لوگ، بہت سے مواقع ایسے
ضرور ملتے ہیں... جب
محبت دستک دیتی ہے
...اور اس کی خوشبو
میں روشنی کی تابناکی
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے
ساتھ ساتھ... مکر وفریب
... سفاکی اور تنگ نظری کے
سائے ...ازل سے محبت کرنے والوں
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی
کبھی تڑپ کی دگی بھی حکم کے آگے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

دولت خان آفریدی تھے اور ماہتاب شنواری...... دولت خان کی پہلی منکوحہ بی بی جان تھیں۔ بی بی جان کی پہلی شادی دولت خان کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی۔ رحمت خان اپنے ساتھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے ان کے بعد پانچ بہنیں اور پھر دولت خان تھے۔ رحمت خان سے بی بی جان کے دو بیٹے ایاز خان اور ارباز خان تھے۔ دولت خان اپنے بڑے بھتیجے ایاز خان کے ہم عمر تھے۔ رحمت خان کو دل کا دورہ پڑا تو بی بی جان کی عدت کے بعد روایت کے مطابق ان کا عقد ثانی دولت خان سے کر دیا گیا۔ دولت خان کو اس نئے رشتے سے ایسی شرم آئی کہ وہ بغیر بتائے کراچی آ گئے اور آٹھ نو سال ایک پلمبرنگ کے استاد کے پاس رہے۔ پھر ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے کویت جانے کا موقع مل گیا۔ استاد کے کہنے پر ان کی بیٹی ماہتاب سے شادی کرلی۔ ماہتاب نے پرائمری اسکول میں نوکری کی اور بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر دولت خان کا ہاتھ بٹایا۔ دولت خان پردیس میں راہی ملک عدم ہو گئے مگر ماہتاب نے انتہائی حوصلے سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بڑی بیٹی نایاب کو ڈاکٹر بنایا اور اچھا رشتہ آنے پر اس کی شادی کر دی۔ بہجت خان الیکٹریکل انجینئر تھا اور ایک پرائیوٹ ادارے سے وابستہ تھا۔ بہجت کی بیوی ارم، ماہتاب کی ایک کولیگ کی بھتیجی تھی۔ حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا اور وہ ایک محکمہ تعلیم میں سولہ گریڈ کی آفیسر تھی پھر پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا۔ ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں حجاب کا تقرر کیا گیا۔ رباب انجینئر بننے جا رہی تھی۔ نایاب کے دو بیٹے تھے اور بہجت کی ایک بیٹی تھی انعم۔ ماہتاب اب چاہتی تھیں کہ حجاب کی شادی ہو جائے۔ تقدیم کی اماں سولہ سال سے معذور تھیں اور ابا کینٹ بورڈ میں ملازم تھے۔ تقدیم، تمہید، تسنیم، تعظیم اور تقدیس پانچ بہنیں اور ایک بھائی مونس تھا۔ اماں کی معذوری کی وجہ سے تمہید نے پڑھائی چھوڑ دی اور ان کے ساتھ گھر میں رہتی۔ تقدیم ابلاغ عامہ میں ماسٹر کرنے کے بعد ایک این جی او سے وابستہ تھی۔ تسنیم یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کی طالبہ تھی مونس فوج میں تھا۔ اپنی نند حمیرا کی بیٹی خوش بخت سے مونس کی شادی کرنے کا ارادہ تھا اماں کا...... بیٹیوں کے جوڑ کے رشتے نہ آنے کی وجہ سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تسنیم یونیورسٹی میں ایک سال جونیئر مدثر میں انوالو تھی۔ عبادالرحمٰن پانچ سال کا تھا جب ابو کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ تایا جی نے چالاکی سے آبائی گھر سے بے دخل کر کے انہیں گھر بھیج دیا۔ ماں باپ تھے نہیں بھائیوں کے گھر نوکروں سے بدتر حالت میں وہ رہیں۔ عبادالرحمٰن نے سول انجینئرنگ میں ڈگری لے کر تعمیراتی فرم سے وابستگی اختیار کی تو ماں بیٹا ایک فلیٹ کرائے پر لے کر اس میں رہائش پذیر ہو گئے۔ حجاب امی کے لیے جوتے لینے جاتی ہے تو وہاں الطاف کو وہ پسند آ جاتی ہے اور وہ اپنی بہنوں کو حجاب کے گھر رشتے کے لیے بھیجتا ہے۔ مونس کے بیچ میٹ عقیل ہمدانی کے ماموں صبور احمد اسلام آباد میں مقیم تھے۔ عقیل کے ساتھ مونس کا ان کے گھر جانا ہوتا ہے۔ صبور احمد اور طاہرہ کے دو بیٹے منصور اور طہور اور بیٹی عائزہ تھی۔ مدثر اور تسنیم کا عشق شدت اختیار کر رہا ہے۔ عبادالرحمٰن کے سٹیل ہونے کے بعد ننھیال ددھیال والے اپنی بیٹیوں کے لیے عباد کی آس لگا رہے تھے لیکن عباد خاندان میں کسی سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حجاب اپنے لیے آنے رشتے کے لیے استخارہ کرتی لیکن اس کے خواب سے امی مطمئن نہیں ہوتیں اور رشتہ طے کر دیتی ہیں۔ مدثر، تسنیم کو کورٹ میرج کے لیے زور دیتا ہے، عقیل چھوٹی پر جاتا ہے تو صبور احمد مونس کو عائزہ کی برتھ ڈے کے لیے بلاتے ہیں، تقدیم، تسنیم کے موبائل پر مدثر کے میسج پڑھ لیتی ہے اور سب کچھ ابا کو بتا دیتی ہے، تسنیم یونیورسٹی کے بہانے مدثر کے ساتھ جا کر کورٹ میرج کر لیتی ہے، مدثر اسے اپنے دوست نادر کے گھر لے جاتا ہے نادر کی بیوی ثریا بڑے عجیب انداز میں ان کا استقبال کرتی ہے۔ تسنیم، تقدیم کو میسج کر دیتی ہے کہ اس نے کورٹ میرج کر لی ہے۔

.... (اب آگے پڑھیں) ....

تقدیم اس وقت دفتر میں تھی اور ”موسٹ ارجنٹ“ کام جلدی جلدی نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ باس مسز جلالی اس سلسلے میں کافی سخت تھیں۔ کسی کام کو غیر ضروری التوا میں رکھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ اپنے کام سے دلچسپی رکھنے اور اپنی ذمے داریوں کو بروقت نمٹانے والے رفقائے کار ان کی گڈ بکس میں رہتے۔ احترام بھی پاتے اور ترقی بھی۔ تقدیم انہیں شکایت کا موقع نہ دیتی۔ بہت خوش رہتی تھیں وہ اس روز تین بجے کے لگ بھگ حجاب اپنی چھوٹی بہن رباب کے ساتھ اس کے دفتر آئی تھی۔ آنے سے پہلے اس نے فون کیا تھا۔

”میڈم! اجازت ہو تو تھوڑی دیر کو آپ کے دفتر آ جاؤں؟“

”دفتر کیوں گھر آ جانا۔“

”ٹائم شارٹ ہے یار۔“

”خیریت!“ وہ کھٹک گئی۔

”آ کر بتاؤں گی، فکر مت کرو، زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ مجھے پتا ہے تمہاری باس کو غیر ضروری وزیٹرز کا آنا پسند نہیں۔“

”باس جانتی ہیں میرے پاس کوئی غیر ضروری وزیٹرز نہیں آتا۔ میرے ذاتی مہمان بھی انتہائی ضروری کام ہی سے آتے ہیں۔“

”اور تم آفس میں ایکسٹرا ٹائم لگا کر اپنے مہمانوں کو دیے جانے والے وقت کا حساب کتاب پورا کر دیتی ہو۔“

”جناب!“

”اچھا ہم تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں تمہارے پاس۔“

”ہم؟“

”میں اور رباب۔“

”او کے۔“

حجاب اسے اپنے نکاح کی تقریب میں شرکت کی دعوت دینے آئی تھی۔ تقدیم نے اس قدر ہنگامی دعوت دہی پر گلہ کیا۔

”یار پرسوں نکاح ہے اور تم آج بتا رہی ہو۔ کم از کم چار چھ دن پہلے تو بتایا ہوتا تاکہ میں ایک نیا جوڑا تو سلوا لیتی۔“

”چار، چھ دن پہلے تو انہیں خود بھی پتا نہیں تھا تقدیم باجی۔“ رباب نے حجاب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی صفائی پیش کی۔

”ایسی بات نہ کرو رباب جس پر یقین کرنے کو جی نہ چاہے۔“

”ایمان سے یہی بات ہے۔“ حجاب بولی۔ ”سب کچھ بہت ایمرجنسی میں ہوا ہے۔“

”ایمرجنسی کی وجہ؟“

”شاید انہیں ڈر ہو کہ انہیں کوئی اور نہ لے جائے۔“ رباب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”انہیں کنھیں؟“ تقدیم نے پوچھا۔

”ان کے ہونے والے اُن کو۔“

”تم اس کی فضول باتوں کو ایک کان سے سنو دوسرے سے نکال دو...... دونوں کان کھول کر میری بات

سنو..... دوستوں میں سے صرف تمہیں انوائیٹ کر رہی ہوں اور تمہیں آنا ہے۔'' رباب نے کہا۔

''باقی دوستوں کو گلا نہیں ہوگا؟''

''مجبوری ہے، گھر میں ہی چھوٹا سا فنکشن کر رہے ہیں جسے نہ بلایا اسی کا دل برا ہوگا۔''

''تو پھر مجھے بھی نہ بلاؤ۔''

''خبردار جو ایک لفظ اور بولیں۔''

''دیکھو مجھے نہ بلا کر تمہیں ساری دوستوں سے بس ایک ہی بات کہنی ہوگی کہ تم دوستوں میں سے کسی کو بھی نہیں بلایا۔ مجھے بلا کر تم باقی دوستوں کو... شکایت کا بہانہ کیوں دینا چاہتی ہو اوروں کو؟''

''چپ کر جاؤ.....'' رباب نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''تم صرف دوست نہیں ہو میری۔''

''ایک تو تمہاری آنکھیں..... بقول کسی شاعر..... چھلکتے جام..... اوپر سے آئی لائنر اور مسکارا! بندہ نہ بھی مرنا چاہے تو مر جائے۔''

''خیریت تو ہے! بڑی شاعرانہ گفتگو فرمائی جا رہی ہے۔'' رباب مسکرا کر بولی۔

''رشک آ رہا ہے مجھے اس شخص پر جو زندگی بھر کے لیے تمہارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرانے جا رہا ہے۔ بائی دا وے کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟'' تقدیم نے کہا۔

''جب آؤ گی تو خود دیکھ لینا خود پوچھ لینا۔''

''بس یہ سمجھیں تقدیم باجی کہ ان کی لاٹری نکل آئی ہے۔'' رباب کے لہجے میں رشک تھا۔ جاب نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

''اُن کی یا اِن کی؟''

''دونوں کی۔'' جاب کے گھورنے پر رباب نے اپنا کان دباتے ہوئے کہا۔

''مونس نے چھوٹا ہو کر گڑبڑ کر دی۔'' تقدیم بولی۔

''کیا مطلب!'' جاب نے چونک کر کہا۔

''بڑا ہوتا تو تمہیں کہیں نہ جانے دیتی میں۔''

''پہلے کیوں نہیں کہا۔ چھوٹا بھی چلا جاتا یار۔'' وہ ہنسی۔

''اچھا ہوا جو آپ نے نہیں کہا تقدیم باجی! یہ تو اپنی عمر کے لوگوں کو بھی بیٹا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں، اسے تو بالکل ہی پپو سمجھیں۔''

''اچھا ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے، چلتے ہیں۔''

''چائے؟''

''کچھ نہیں، بس تم نے پرسوں شام آنا ہے، گھر والوں میں سے جو تمہارے ساتھ آنا چاہے موسٹ ویلکم۔ میں تمہیں دعوت دینے کے لیے گھر بھی آ سکتی تھی مگر میں نے سوچا رباب کے ساتھ بازار تو جانا ہی ہے تم سے کون سا تکلف ہے۔ تمہارے آفس سے ہوتے ہوئے تمہیں کہتے چلے جائیں گے۔''

جاب اور رباب کے جاتے ہی تسنیم کا میسج آ گیا۔ چھٹی کا وقت ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ تسنیم کے ایس ایم ایس نے اس کے حواس معطل کر دیے۔ تسنیم کا نمبر ملایا تو دو مرتبہ بیل بجی پھر فون بند کر دیا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس سے کہے اور کیا کہے۔ فوری طور پر اسے گھر جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کرسی سے اٹھی تو آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا سا چھا گیا، ایسا لگا دوبارہ کرسی پر نہ بیٹھی تو چکرا کر گر پڑے گی۔ میز کا کنارہ

دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا اس تقدیم؟'' اس کی ایک ساتھی عارفہ اسے یوں بے دم سی ہو کر دوبارہ بیٹھتے دیکھ کر بولی۔

''پتا نہیں کیوں چکرا گیا۔'' اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

''آپ کا چہرہ تو ایک دم زرد ہو رہا ہے مس تقدیم۔'' عارفہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آ کھڑی ہوئی اور اس کا چہرہ دیکھ کر تشویش سے بولی۔

''میم کو بتاؤ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔'' عارفہ باس کے کمرے کی طرف لپکی۔ باس اپنے کمرے سے نکل کر تقدیم کے پاس آئیں تو وہ دوبارہ اٹھ چکی تھی۔

''خیریت مس تقدیم؟''

''میم! اچانک چکرا گیا..... میں..... میں گھر جا سکتی ہوں؟''

''شیور..... میرا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔''

''نو..... نو میم..... تھینک یو ویری مچ..... میں..... میں خود چلی جاؤں گی..... ٹیکسی لے لوں گی۔''

''شیور؟''

''یس میم۔''

''او کے۔''

دفتر سے گھر تک سارا راستہ انتہائی پریشانی میں کٹا، ہر پھر کر اس کے ذہن میں ایک نام گردش کرنے لگتا۔ مدثر..... اگر اس سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ گھر پہنچی تو اماں بولیں۔

''شکر ہے تم تو آج روزانہ سے تھوڑا جلدی آ گئیں مگر تسنیم نہ جانے کیوں نہیں آئی ابھی تک۔''

''کچھ کام ہوگا اماں.....'' وہ اماں سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''اس کے کاموں کی خبر خود اسے ہوتی ہے یا پھر اللہ کو۔ اتنی توفیق تو ہوتی نہیں اسے کہ اگر دیر تک رکنا ہو یونیورسٹی میں تو ایک فون ہی کر دے۔''

''آ جائے گی اماں۔''

''ہاں، یہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ آ جائے گی۔'' کیا کہتی وہ اماں سے۔

ابا دفتر سے آ چکے تھے۔ وہ لرزاں و ترساں ابا کے روبرو بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹی؟'' وہ ابا کو اپنے موبائل پر موصول پیغام سے آگاہ کرنے کے لیے اپنا حوصلہ مجتمع کرنے لگی۔

''ابا!'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''میں..... میں جو بات آپ کو بتانے جا رہی ہوں..... اسے سن کر ہمت سے کام لیجیے گا۔'' ابا جو کمزور اعصاب کے آدمی تھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

''مونس تو ٹھیک ہے نا؟'' ابا کا چہرہ یک لخت مدقوق نظر آنے لگا تھا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ شدتِ رنج سے اس کا گلا بند ہوئے جا رہا تھا۔

''جی ابا..... مونس تو ٹھیک ہے۔'' ابا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''تسنیم چلی گئی ہے ابا.....'' اس نے بہ مشکل بتایا۔

''تسنیم چلی گئی ہے۔'' ابا بڑبڑائے۔ ''کہاں..... کہاں چلی گئی ہے؟''

تقدیم کے ہونٹ کپکپائے۔

''کہاں چلی گئی ہے تسنیم؟'' ابا نے اپنا سوال دُہرایا۔

''اس نے...... اس نے کورٹ میرج کر لی ہے ابا۔''

''کیا......'' ابا جو مونس کی خیریت سن کر مطمئن سے ہو گئے تھے ہڑبڑا گئے۔ ''کیا کہا تم نے! کورٹ میرج......!'' ابا کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

تقدیم نے آہستگی سے اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ ''اس نے میسج کیا تھا میرے موبائل پر۔''

ابا چند لمحے ہکا بکا اس کا منہ دیکھتے رہے پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر شدید صدمے کی کیفیت میں بولے۔ ''میرے خدا! یہ بھی ہونا تھا۔'' ابا کی آواز تقدیم کو کسی جاں بہ لب بیمار کی کراہ محسوس ہوئی۔ دفعتاً ابا نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ان کا پورا جسم ارتعاش میں آ گیا۔ وہ شدید جذباتی کیفیت سے دوچار محسوس ہوتے تھے۔

''ابا...... ابا پلیز!'' تقدیم انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ ''اماں تک آپ کی آواز پہنچی تو وہ پریشان ہوں گی۔'' ابا اپنی سسکیاں سینے میں گھونٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

''ساری زندگی اللہ سے ڈر کر گزاری...... روزی میں کبھی بے ایمانی نہیں کی...... کسی کا حق نہیں چھینا...... کسی کا دانستہ دل نہیں دکھایا...... پھر بھی...... مجھ سے کہاں غلطی ہو گئی...... بتاؤ بیٹا مجھ سے کہاں غلطی ہو گئی؟'' ابا نے تقدیم کو اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تقدیم نے یوں سر جھکا لیا جیسے انہیں پرسا دے رہی ہو۔ دفعتاً اماں اپنی وہیل چیئر خود چلاتی کمرے میں در آئیں۔

''ارے ذرا تسنیم کو......'' ابا کو روتے دیکھ کر اماں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''کیا ہوا؟'' انہوں نے تقدیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ابا اپنے گھٹنوں پر ہاتھ دھرتے ہوئے بدقت اٹھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لمحوں میں برسوں کا سفر کر کے انتہائی تھک گئے ہوں۔ اماں کی وہیل چیئر کے نزدیک پہنچ کر وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''تقدیم کی ماں مجھے تسلی دو...... میری ڈھارس بندھاؤ ورنہ...... میرا دل پھٹ جائے گا۔''

تقدیم یہ تو جانتی تھی کہ ابا کمزور اعصاب کے آدمی ہیں مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ اس حد تک کمزور ہوں گے یا پھر سانحہ اتنا شدید تھا کہ وہ سہار نہیں پا رہے تھے۔

''ارے کچھ پتا تو چلے کیا ہوا ہے؟'' اماں روہانسی ہو کر پھر تقدیم کو دیکھنے لگیں۔

''مر گیا ہوں...... مر گیا ہوں تقدیم کی ماں...... جیتے جی مار دیا ہے مجھے تمہاری بیٹی نے...... کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا تسنیم نے ہمیں......'' دفعتاً ابا بلک بلک کر رونے لگے۔

''ہوا کیا ہے...... بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟'' اماں متوحش دکھائی دینے لگیں اور آنکھیں بند کر کے وہیل چیئر پر ایک طرف کو جھک گئیں۔

تقدیم اماں کو سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مردہ سی آواز میں بولیں۔ ''کیا ہوا ہے تقدیم؟ تیرے ابا کیا کہہ رہے ہیں...... ارے! اتنا تو یہ اپنی ماں کی موت پر بھی نہیں بلکے تھے۔''

''یہ ابا کے لیے ان کی ماں کی موت سے بھی بڑی موت ہے۔'' تقدیم نے دکھی ہو کر دل ہی دل میں سوچا پھر

اس نے دھیمی آواز میں اماں کو بتایا۔

''تسنیم کا میسج آیا تھا میرے فون پر، اس نے کسی سے شادی کر لی ہے کورٹ جا کر۔'' اماں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''مجھے کچھ ہو جائے گا تقدیم کی ماں۔'' ابا نے اپنے دونوں ہاتھ اماں کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور سر جھکا کر گھٹ گھٹ کر رونے لگے۔

تمہید، تعظیم اور تقدیس کمرے کے دروازے میں کھڑی ہراساں نظروں سے کمرے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اماں نے اپنے سر کا عقبی حصہ وہیل چیئر کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کے چہرے پر مردنی سی تھی۔ تقدیم ان کا سر سہلاتے ہوئے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔

''اماں کے لیے پانی لاؤ۔'' تقدیم نے بہنوں کی طرف دیکھا۔ تمہید الٹے قدموں پانی لانے کے لیے لپکی۔ تعظیم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

''کیا ہوا آپی؟'' تقدیس دبے پاؤں تقدیم کے نزدیک آ کھڑی ہوئی۔ تقدیم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

تمہید اور تعظیم اماں اور ابا دونوں کے لیے پانی کے گلاس لیے ہوئے پلٹیں۔ پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر اماں اپنی قویٰ کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتی دکھائی دینے لگیں۔ ابا نڈھال تھے۔ تمہید، تقدیم، تعظیم اور تقدیس چاروں کی نگاہیں اماں سے ابا پر اور ابا سے اماں پر ڈول رہی تھیں۔

''کیا ہوا تقدیم؟'' تمہید نے سرگوشی میں پوچھا۔

تقدیم چپ رہی۔

''بتاؤ نا؟'' تمہید کے لہجے میں اب اصرار تھا۔

''تسنیم نے کسی سے شادی کر لی ہے۔'' تقدیم کو بتانا ہی پڑا۔

''ہاہ!'' تمہید نے گھبرا کر اپنے منہ پر ہاتھ دھر لیا۔ تعظیم اور تقدیس جو تقدیم کی بات سننے کو قدرے جھک گئی تھیں ان کی آنکھوں میں وحشت در آئی۔

تقدیم کا خیال تھا اماں سکتہ ٹوٹنے پر دھاڑیں مار مار کر روئیں گی مگر اس کی توقع کے برخلاف اماں نے حیرت انگیز ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ اپنے قدموں میں بیٹھے ابا کے سر پر اپنا پچھی ہاتھ یوں دھیرے دھیرے پھیرتے ہوئے جیسے کوئی دردمند ماں اپنے کسی تکلیف سے دوچار بچے کو ممتا بھرے لمس سے دلاسا دینے اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کرے۔ انہوں نے خلافِ معمول بڑی توانا آواز میں کہا۔

''گئی ہے...... جانے دو...... آپ بھگتے گی...... اب گھر میں آئے دن کوئی دنگا فساد تو نہیں ہوگا۔''

ابا سر اٹھا کر بے یقینی سے اماں کو دیکھنے لگے۔ بیمار، کمزور، اور معذور شریکِ حیات کا یہ روپ ان کے لیے حیران کن تھا۔ اپنی وہیل چیئر پر وہ بڑے اعتماد اور طنطنے سے بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر کو تو جیسے پوری کائنات کو چپ سی لگ گئی پھر اماں کی آواز نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔

''اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی ہمدرد لڑکیاں ایسے تھوڑی رہا کرتی ہیں گھر میں جیسے وہ رہا کرتی تھی۔ ہر وقت کمرا بند۔ نہ گھر کے کام کاج سے کوئی دلچسپی نہ گھر والوں کے دکھ سکھ سے غرض...... بس اپنی ذات میں مگن...... آپ ایسی بیٹی کو رو رہے ہیں۔'' اپنے آخری فقرے پر اماں نے ابا کو دیکھا جو ٹکٹکی باندھے اسی بے یقینی سے اماں کو دیکھ رہے تھے۔

''بس بات گھر سے نہ نکلے۔'' یہ حکم صادر کرتے ہوئے اماں نے چاروں بیٹیوں کو ایک نظر دیکھا۔

''کب تک! تقدیم کی ماں کب تک نہیں نکلے گی گھر سے بات؟'' ابا کے لب پھڑکے۔

''پتا چلائیں کہ وہ لفنگا ہے کون اور اس مردود سے کہیں ہماری بیٹی کو تو ہم پر رحم نہ آیا تو ہم پر اتنا رحم کر کہ اسے چار لوگوں کی موجودگی میں ہمارے گھر سے ایک بار لے جاتا کہ ہماری دوسری بچیوں کی راہ کھوٹی نہ ہو..... بس پھر اس کا اور ہمارا رشتہ ساری زندگی کو ختم۔''

تمہید، تقدیم، تعظیم اور تقدیس چاروں کی نظریں باہم ملیں۔ ہر ایک کو اپنی آنکھوں میں ڈبکیاں کھاتے آنسوؤں کا عکس باقیوں کی آنکھوں میں لرزاں دکھائی دیا۔ برسوں سے وہیل چیئر پر عضو معطل کے مانند پڑی اماں ایسی حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کریں گی یہ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے اس کا نام مدثر ہے۔'' تقدیم نے کہا۔ اماں، ابا اور تینوں بہنیں سب بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''تمہیں کیسے پتا؟'' اماں نے پوچھا۔

''میں نے تنسیم کے موبائل میں اس کے میسجز پڑھے تھے۔''

''اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' اماں نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ اُن کے لہجے میں گلہ اور نگاہوں میں ایسی کاٹ تھی کہ تقدیم شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

''وہ مجھ سے لڑتی۔''

''ارے لڑتی ہی نا..... یہ بدنامی تو نہ دیکھنی پڑتی..... خدا جانے اور کیا کچھ چھپایا جاتا ہوگا مجھ سے۔''

تقدیم نے چونک کر اماں کو دیکھا۔ اس کی زبان سے نکلا ایک جملہ اماں کو اس حد تک بدگمان کر دے گا یہ اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا۔

''مجھے بتایا تھا اس نے۔'' ابا نے اسے انتہائی بحرانی لمحوں میں کمک بہم پہنچائی۔

اماں نے چونک کر ابا کی جانب دیکھا۔

''جس روز تنسیم اس سے لڑی تھی اس روز یہی بات تھی۔'' ابا نے مزید کہا۔

''تو پھر آپ بیٹھے کاہے کو رو رہے ہیں۔ ارے جب پتا چلا تھا تو اسی وقت اس منحوس ماری کی منڈیا مروڑ دیتے۔ اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیتے..... مر جاتی تو اچھا تھا۔'' اماں بولیں۔

''ٹھیک کہتی ہو۔'' ابا بولے۔

دفعتاً اماں اتنی زور سے کراہیں کہ اگلا تکلیف کی شدت ان کا سینہ شق کر دے گی۔ اپنا سر وہیل چیئر کی پشت کے کنارے پر ٹکا کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

تمہید گھبرا کر اماں کے کندھے دھیرے دھیرے دبانے لگی۔ تقدیم نے پانی کا گلاس اٹھایا اور اماں کے لبوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''پانی پی لیں اماں۔''

اماں نے ایک گھونٹ بھرا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور پپوٹوں پر ارتعاش..... اچانک ان کی بند آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے دونوں رخساروں پر نم لکیریں کھنچتے چلے گئے۔ اماں کا بے اختیار کراہنا اور ان کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو اس امر کے غماز تھے کہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ سہارنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔

''اماں..... اماں پلیز حوصلہ کریں۔'' تقدیم نے دھیرے دھیرے ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''میں..... ٹھیک ہوں..... میری فکر نہ کرو..... اس کا پتا کرو، کہاں ہے۔'' اماں بولیں۔

تقدیم نے پہلے اپنے نمبر سے پھر ابا کے نمبر سے تنسیم کا نمبر ملایا۔ فون بند تھا۔ مدثر کے نمبر پر فون کیا تو پہلے بیل بجی پھر اس نے بھی فون بند کر دیا۔ رات سر پر تھی۔ پریشانی میں رات کی آمد کس قدر مہیب محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆

نادر شام کو دفتر سے گھر واپس لوٹا تو مدثر نے تنسیم سے اس کی ملاقات کروائی۔ شادی کی مبارک باد دینے کے بعد اس نے کہا۔

''بھابی! اس غریب خانے کو اپنا ہی گھر سمجھیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو ثریا کو بتا دیں۔''

''کیا! کیا! میرا نام کس سلسلے میں لیا جا رہا ہے۔'' نادر کی بیوی ایک چھوٹی ٹرے لیے جس میں چائے کے تین کپ رکھے ہوئے تھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''میں بھائی کو بتا رہا ہوں کہ ثریا میری بڑی اچھی بیوی ہے۔'' نادر نے کہا۔

''اگر ثریا اچھی بیوی ہے تو کیا کوئی بری بیوی بھی رکھی ہوئی ہے۔'' نادر کی بیوی نے چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

''کان پکڑتا ہوں میرے لیے ایک ہی کافی ہے۔'' نادر نے دونوں کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''آپ مردوں کا کیا اعتبار..... اب مدثر کو ہی دیکھ لیں۔ کتنے مزے سے گھر والوں سے چھپتے چھپاتے شادی کر کے بیٹھ گیا۔ ماں باپ کو ارمان نہیں ہوتا ہے کیا عزت سے بہو گھر لانے کا۔ دس لڑکیاں نظر میں رکھتی ہیں مائیں اپنے بیٹوں کے لیے۔ آنٹی بے چاری کو جب پتا چلے گا تو کتنا افسوس ہوگا انہیں۔'' ثریا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چلو کوئی نہیں جہاں میرے یار کا دل مل گیا۔'' نادر نے اپنے صلح جو لہجے میں بیوی کی گرمی گفتار کو گویا دھیما کرنے کی کوشش کی۔

''میرا تو یہی سوچ سوچ کر دل دکھے جا رہا ہے کہ بے چارے لڑکی کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ جیتے جی مر گئے ہوں گے وہ تو..... اللہ توبہ۔'' ثریا نے اپنے دونوں رخسار پیٹے۔ ''جس گھر کی ایک لڑکی گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی سے کسی پرائے جا کر شادی کر لے اس گھر کا تو پھر رستہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے لوگ۔'' ایکا یک ثریا نے تنسیم کو مخاطب کیا۔ ''تنسیم اور بہنیں ہیں تمہاری؟''

''جی۔'' تنسیم جس کا خمیدہ سر ثریا کی باتوں سے اور بھی جھک گیا تھا آہستگی سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

''کتنی؟''

''چار۔''

''کم سے بڑی یا.....؟''

''دو بڑی ہیں مجھ سے دو چھوٹی۔''

''بڑی بہنوں کی شادی ہو گئی؟''

تنسیم کو دل میں ثریا پر غصہ آنے لگا۔ یہ سب کچھ وہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں بھی تو پوچھ سکتی تھی مگر شاید وہ اسے اپنے شوہر کی موجودگی میں ذلیل کرنا چاہتی تھی۔

''جی نہیں۔'' اس نے بڑی بہنوں کی شادی کے بارے میں ثریا کے استفسار پر کہا۔

''چھوٹوں کا تو پھر سوال ہی نہیں یا ہوگئی کسی کی؟''

''جی نہیں۔''

''بہت ظلم کیا تم نے اپنی بہنوں کے ساتھ..... کیا ہوگا بے چاریوں کا مستقبل! کون لے جانا پسند کرے گا انہیں اپنے گھر۔''

ثریا کے تابڑ توڑ حملوں سے تسنیم کو شرمندگی اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی خطا سے زیادہ اسے مدثر پر غصہ آرہا تھا جس نے اسے اپنے گھر لے جانے کے بجائے ایک انجانے گھر میں لا بٹھایا تھا۔

''بھائی کتنے ہیں؟'' ثریا نے پوچھا۔

''ایک۔''

''بڑا یا چھوٹا؟''

''چھوٹا۔''

''چچ چچ چچ! وہ بے چارہ بھی اب ساری زندگی سر نہیں اٹھا سکے گا کسی کے سامنے۔''

تسنیم کے جبڑے آپ ہی آپ بھنچ گئے۔

''گھر سے نکلنے سے پہلے یہ تو سوچ لیتیں کہ انجام کیا ہوگا۔''

''چھوڑیں بھابی آپ کن چکروں میں پڑ گئیں۔'' مدثر نے جو اتنی دیر سے ثریا کی دخل در معقولات کو بڑے صبر و ضبط سے برداشت کر رہا تھا جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے پتا ہے تمہیں میری کھری کھری باتیں بری لگ رہی ہوں گی۔ میں خود بھی بہنوں بیٹی والی ہوں۔ برا مت ماننا مدثر تمہاری اپنی کوئی بہن نہیں ہے نا اس لیے تمہیں دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کی عزت کا احساس نہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے بھابی۔'' مدثر ناگواری سے بولا۔

''میں تو کرتی ہوں کھری بات کسی کو بری لگتی ہے تو لگے۔''

''اب بس بھی کرو ثریا۔'' نادر نے ٹوکا۔

''ثریا تو بس کہہ دے گی، زمانہ بس نہیں کرے گا۔ ان کی اولاد بھی طعنے سہے گی اس بات کے کہ ان کے اماں ابا نے کچہری جا کر اپنی مرضی سے نکاح کیا تھا۔''

''اوہو!'' نادر زچ دکھائی دینے لگا۔

''اوہو۔'' ثریا نے نادر کی نقل اتارتے ہوئے اسے گھورا۔

''اچھا یار مدثر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' نادر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ثریا نے چائے کی ٹرے سے ایک مگ اٹھا کر نادر کو تھما دیا۔

''رات کو کھانے میں کوئی خاص چیز بناؤں؟'' نادر کے لہجے سے عیاں تھا کہ یہ بات محض رسماً پوچھ رہا تھا۔

''نہیں نہیں، کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اپنا گھر ہے جو موجود ہے کھالیں گے۔'' مدثر نے کہا۔

''میں نے تو ارہر کی دال چڑھا رکھی ہے۔'' ثریا بولی۔

''دال بڑا مال۔'' مدثر اپنی خفت مٹانے کو چہکا۔

نادر اور ثریا کے جانے کے بعد مدثر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔ ''بھابی کی باتوں کا برا نہ ماننا..... ذرا صاف گو سی عورت ہیں مگر دل کی بری نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے انہیں ہمارا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔ دوپہر کو بھی وہ بڑی اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔''

''اکھڑی اکھڑی ہوں یا جمی جمی، انہیں اور ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کو برداشت کرنا پڑے گا۔''

''تم مجھے اپنے گھر کب لے جاؤ گے؟''

''لے جاؤں گا یار..... جلدی لے جاؤں گا..... اوہو تم نے اچھا کیا جو گھر یاد دلا دیا۔ می انتظار کر رہی ہوں گی ں فون تو کر دوں۔'' مدثر نے اپنا موبائل آن کیا اپنی می کا نمبر ملایا۔ لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے تسنیم، مدثر کی ں کی بات چیت بھی سن سکتی تھی۔

''میں تمہیں فون کر کر کے تھک گئی۔ آج کہاں غائب ہو تم صبح سے اب تک؟'' اس نے می کو کہتے سنا۔ ''اور ون کیوں بند کر رکھا ہے تم نے؟'' مدثر نے اپنے کان کی لو سہلاتے ہوئے تسنیم کو دیکھا اور دھیرے سے آنکھ دبا کر ں سے جھوٹ بولا۔

''اسائنمنٹ تیار کر رہی تھی۔ لائبریری میں بیٹھا ہوں یہاں فون بند رکھنا پڑتا ہے۔''

''کچھ کھایا پیا؟''

''آپ پیسے کدھر دیتی ہو جو بندہ کچھ کھا بھی سکے۔''

''اچھا! پیسے دیے بغیر ہی تم اتنے بڑے ہو گئے۔ ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں گھر کب آؤ گے؟''

''آجاؤں گا آجاؤں گا۔ ذرا کام ختم کر لوں۔'' اس نے تسنیم کی جانب دیکھتے ہوئے دوبارہ آنکھ دبائی۔ می سے بات ختم کر کے اس نے دوبارہ فون آف کر دیا اور تسنیم سے بولا۔

''بچت ہو گئی۔ می کو فون نہ کرتا تو پرابلم ہو سکتی تھی۔ وہ ڈیڈی اور منعم کو کھڑکاتیں۔''

نوسو انو بجے کے لگ بھگ ثریا نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں کھانے کی ٹرے باہر سے ہی پکڑا دی۔ ایک پلیٹ مرغی کا سالن، چار چپاتیاں، جگ بھر پانی، گلاس پہلے ہی کمرے میں موجود تھا۔

''سالن، روٹی اور ضرورت ہو تو لے لینا۔'' ثریا نے کہا۔

''بہت ہے بھابی۔''

''رات کا کیا پروگرام ہے مدثر؟'' باہر سے نادر کی آواز سنائی دی۔

مدثر نے ٹرے ایک ہاتھ میں پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے کمرے کا دروازہ پورا کھولتے ہوئے باہر دیکھ کر کہا۔ ''گھر جاؤں گا یار، آپ لوگ میرے انتظار میں بیٹھے نہ رہنا، دروازہ تسنیم بند کر لے گی۔''

''بھابی سے کہنا آرام سے سوئیں، اپنا گھر سمجھ کر۔''

''ہاں ہاں یار، اپنا ہی گھر سمجھا ہے بھی تو تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''اپنا گھر بھی کہتے ہو اور تکلیف دینے کی بات کر کے تکلف کا اظہار بھی کرتے ہو۔''

''سوری یار سوری۔'' نادر سے اپنے مکالمے کے دوران مدثر تمام وقت ایک ہاتھ سے کھانے کی ٹرے پکڑے کھڑا رہا۔

رات بارہ بجے تک مدثر تسنیم کے پاس رہا۔ بارہ بجنے کے بعد وہ اپنے گھر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

''مجھے اکیلے ڈر لگے گا مدثر۔''

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ نادر میرا جگری یار ہے۔ بھروسا ہے مجھے اس پر اسی لیے تمہیں یہاں لے کر آیا ں اور اکیلے کی بھلا کیا بات ہے۔ نادر ہے، بھابی ہیں، بچے ہیں۔''

''بچوں کو تو انہوں نے ہمارے کمرے میں لگتا ہے آنے ہی نہیں دیا۔''

''تمہارے سہاگ دن کی پرائیویسی کا خیال رہا ہوگا بھابی کو۔'' وہ تسنیم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے

مسکرایا۔

”بھابی اتنا خیال رکھنے والی نہیں لگتیں، دیکھا نہیں شام کو انہوں نے کتنی باتیں سنائیں تمہیں اور مجھے۔“

”اچھا خیر آؤ آ کر دروازہ بند کرلو۔“

”رک جاؤ نا پلیز!“ اس نے مدثر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

”سمجھا کرو یار، گھر میں بھی تو حاضری دینی ہے۔“

”ایک رات سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“

”رات بھر گھر سے غائب رہنے کی کوئی ہسٹری نہیں رہی ہے میری۔ ممی، ڈیڈی کو ساتھ لے کر ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوں گی اور میرے ہاتھ لگنے پر مجھے وہ جوتے لگائیں گی کہ......“ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اس نے اپنی دائیں انگشتِ شہادت سے باری باری دونوں کانوں کو چھوا۔

”صبح کب آؤ گے؟“

”ظاہر ہے یونیورسٹی جانے سے پہلے بیگم کو حاضری دینی ہوگی۔“ اس نے تسنیم کو بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر منہ بسورتے اور ایک ہاتھ سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ”یار! یہ تو بڑی پرابلم ہوگئی۔ ماں کے پاس حاضری لگواؤ۔ بیگم کو چہرہ دکھاؤ۔ یونیورسٹی میں حاضری لگواؤ۔“

”یونیورسٹی کیوں؟“

”یونیورسٹی کیوں!“ اس نے تسنیم کے الفاظ دُہراتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کردی ہو پھر اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”یونیورسٹی اس لیے کہ ہم دونوں کے ایک ساتھ غائب ہونے پر کوئی پرابلم نہ ہو اور اس لیے بھی کہ آخری سمسٹر ہے کلاسز مس نہ ہوں۔“

”تو پھر مجھے کیوں چھڑوا دینا چاہتے ہو۔ میرا ابھی تو لاسٹ سمسٹر ہے پریوس کا پھر بس ایک سال اور رہ جائے گا۔“

”دیکھتے ہیں یار اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے...... نادر اور بھابی سو گئے ہوں گے، آؤ تم دروازہ بند کرلو۔“

وہ گھر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کرنے کو اس کے ساتھ ہولی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ دوسرے کمرے کا بند دروازہ نادر، ثریا اور بچوں کے سوئے ہونے کا غماز تھا۔ مدثر نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر نکلتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے آرام سے سو جانا۔“

مدثر کے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کیا، لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنے کمرے میں آئی اور جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے قفل چڑھالیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی سوچوں کا در کھل گیا۔ اماں، ابا، بہنیں، بھائی سب اسے پوری طرح ٹوٹ کر یاد آنے لگے جیسے وہ صدیوں سے ان سے بچھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

تمام اہلِ خانہ خلافِ معمول اب تک جاگ رہے تھے۔ ہر ایک اداس، ہر ایک مضطرب جیسے گھر میں اللہ نہ کرے کوئی میت ہوگئی ہو اور پہلی رات کاٹے نہ کٹ رہی ہو۔

”سو کیوں نہیں جاتیں؟“ ابا نہ جانے کتنی بار اماں سے کہہ چکے تھے۔

”سو جاؤں گی...... آپ تو سوئیں...... صبح دفتر بھی جانا ہوگا۔“

اماں کو تسنیم کی نہ جانے کب کب کی اور کون کون سی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس کا دنیا میں آنا، اس کا بچپن،

گھٹنوں کے بل چلنا، پہلی بار قدم اٹھانا، بھاگنا، بولنا، تتلانا، ہنسنا، مسکرانا، شرارتیں، شوخیاں، بیماری آزاری، اوائل عمر ہی سے ضدی پن، بڑے ہونے پر تنک مزاجی، بھائی بہنوں سے لڑائی جھگڑے، اسکول کالج پھر یونیورسٹی جانا، فیروزی رنگ کی اس پر خصوصی پھبن اور گھر میں اس کا آخری دن! اس روز اس نے گھر سے جاتے ہوئے کاسنی رنگ کی پھولدار قمیص اور ہم رنگ شلوار اور دوپٹا پہن رکھا تھا۔ حسبِ عادت بنا سلام کیے، بغیر خدا حافظ کہے جب وہ گھر سے نکلی تو انہوں نے روزانہ کی طرح آیت الکرسی پڑھ کر اس کے گرد حصار باندھ دینے کی نیت کی تھی۔ گھر سے باہر جانے والے اپنے تمام اہلِ خانہ کے لیے ایسا کرنا اماں کا معمول تھا۔ روزانہ کی طرح اس دن بھی اماں اپنے کمرے کی باہر سڑک کے رخ پر کھلنے والی کھڑکی کے نزدیک وہیل چیئر پر بیٹھی آگے پیچھے گھر سے باہر جانے والے افرادِ خانہ کو باری باری جاتے دیکھتی رہی تھیں۔ پہلے تقدیس گئی تھی اس کے بعد تعظیم، پھر ابا ان کے بعد تقدیم اور سب سے آخر میں تسنیم۔ وہ اسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھیں جب تک وہ ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی تھی۔ کسے خبر تھی کہ وہ آخری مرتبہ گھر سے جارہی تھی۔ کندھے پر سرمئی رنگ کا بڑا سا پرانا بیگ لٹکا کر جو مسلسل استعمال اور کتابوں کاپیوں کے علاوہ میک اپ کی لوازمات اور بے شمار الم غلم کے بوجھ سے کئی مرتبہ ٹوٹنے کے بعد ہر بار موچی کے ہاں سے گٹھوایا گیا تھا۔ غریب کی بیٹی اپنی مرضی سے شادی کرنے کے ارادے سے گھر سے بھاگی بھی تو اپنے کندھے پر موچی کے ہاں سے گٹھا پرانا بیگ لے کر۔

اماں کا دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اپنی کوکھ سے جنی تسنیم کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ دل میں طرح طرح کے واہمے سر اٹھا رہے تھے۔ جانے کون ہوگا وہ جس کی خاطر وہ ان سب کو چھوڑ گئی تھی۔ کیسی بدنصیب تھی۔ ماں باپ کے گھر سے عزت سے رخصت ہونا بھی نصیب نہ ہوا اسے۔ اس وقت نہ جانے کہاں ہوگی۔ لے جانے والے نے کیا سلوک کیا ہوگا اس کے ساتھ۔ لڑکیوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بہکا کر بھگا لے جانے والے ہمیشہ اچھا سلوک ہی تو نہیں کرتے بھاگ آنے والی لڑکیوں کے ساتھ۔ یہ جو آئے دن نوجوان لڑکیوں کی لاشیں کبھی کسی ہوٹل کے کمرے میں، کبھی کسی ویران مقام پر ملا کرتی ہیں ان میں نہ جانے کتنی تسنیم ہی کی طرح شریف اور عزت دار گھرانوں سے بھاگ کر آنے والیوں کی لاشیں ہوتی ہوں گی۔ اماں کا دل رہ رہ کر کانپ اٹھتا۔ اللہ نہ کرے تسنیم کسی بدکار کے ہاتھوں پھنس کر کسی ناگہانی کی شکار نہ ہوجائے۔ اماں کو ہول سے اٹھ رہے تھے۔ اللہ نہ کرے آنے والی صبح اخبار میں کوئی ایسی ویسی خبر نہ ہو تسنیم کے بارے میں۔

”الٰہی! جیسی بھی ہے میرے پیٹ کی جنی تو ہے۔ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔“ اماں تسنیم پر اپنے تمام تر غصے کے باوجود اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر پر دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں۔

ابا کو بھی چین نہیں آرہا تھا۔ کبھی کروٹ بدلتے کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ رہ رہ کر ٹھنڈی سانسیں بھر رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا تسنیم کو کہاں تلاش کریں۔ کیونکر اسے گھر واپس لائیں۔

بہنیں کیا بڑی کیا چھوٹی سب کی سب فکر مند اور بے قرار تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو یہی دکھ کھائے جارہا تھا کہ تسنیم اس وقت نہ جانے کہاں ہوگی اور کس مشکل میں ہوگی۔ خوش امیدی کسی کو بھی نہیں تھی۔ تقدیم کو بھی نہیں۔ تسنیم کا خالی کمرا انہیں کاٹ کھانے کو آرہا تھا۔ اس کی چیزیں دیکھ کر دل منہ کو آرہا تھا۔ نیند ان سب کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”تقدیم آپی اگر کسی نے پوچھا کہ تسنیم باجی کہاں گئیں تو کیا کہیں گے؟“ تقدیس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

”ابھی دو چار دن تو کوئی نوٹس ہی نہیں لے گا۔“ تقدیم نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”اس کے بعد؟“ تمہید کا لہجہ تقدیس کے لہجے سے بھی زیادہ گمبھیر تھا۔

''انشاء اللہ اس سے پہلے ہی کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' تقدیم نے تمہید کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔

''کیسے، کیسے نکلے گا راستہ، جب اس کا موبائل ہی بند ہے۔'' تمہید کی آواز سے ملال چھلک رہا تھا۔

''کب تک بند رہے گا...... جب گھر کی یاد آئے گی تو ضرور کھولے گی وہ اپنا موبائل۔''

''کیا پتا کب یاد آئے۔ کتنے دنوں بعد۔'' تمہید بہت دکھی ہو رہی تھی۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے تقدیم آپی کہ شادی والی بات کسی نے ان سے زبردستی میسج کرائی ہو، کوئی انہیں اغوا ہی نہ کر کے لے گیا ہو۔'' تعظیم دور کی کوڑی لائی۔

تقدیم نے چونک کر تعظیم کی طرف دیکھا۔ اس نکتے پر تو شام سے اب تک کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ہاں یہ ممکن تو تھا لیکن نہیں...... حالات اور واقعات سے تو یہی ظاہر تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ تسنیم کے موبائل فون پر ایک نہیں بیسیوں ایس ایم ایس تھے جو تقدیم نے پڑھے تھے اور تعظیم کے اندیشے کی نفی کرتے تھے۔

''کل صبح یونیورسٹی جاؤں گی میں، ہوسکتا ہے وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔'' تقدیم نے کہا۔

تمہید سمیت تینوں بہنوں نے اسے انتہائی بھروسے اور یقین سے دیکھا۔ گھر میں جب کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ ہوتا ابا کے بعد سب اسی کو نجات دہندہ کے طور پر دیکھنے لگتے تھے اور وہ عموماً اس اعتماد پر پوری بھی اترتی تھی۔ رات پچھلے پہر تک جاگنے کے بعد بالآخر چاروں بہنیں آڑی ترچھی ہو کر دو پلنگوں پر سو گئیں۔ کسی نے سچ کہا ہے نیند سولی پر بھی آجاتی ہے۔ صبح ابا دفتر نہیں گئے۔ تقدیم نے بھی اپنے دفتر سے چھٹی کی اور یونیورسٹی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

تسنیم گزشتہ رات اس طرح بے خبر ہو کر نہیں سو سکی تھی جیسے اپنے گھر میں سویا کرتی تھی۔ نیند اور اس کی آنکھوں میں آنکھ مچولی سی رہی۔ تھوڑی دیر کو آنکھ لگتی پھر کھل جاتی۔ ایک غیر گھرانے میں رات بسر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ گو دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ کھڑکی کی دونوں چٹخنیاں بھی اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ مدثر بھی یہ اطمینان دلا گیا تھا کہ اہلِ خانہ سے اسی کی نہیں اس کے گھر والوں کی بھی برسوں پرانی شناسائی تھی مگر پھر بھی وہ خوفزدہ سی تھی۔ کتنے بہت سے واقعات ایسے ہی ہوتے تھے جن میں شناسا ہی کارگزاری دکھا جاتے تھے۔ اسی خوف کے درمیان اسے رہ رہ کر اپنے گھر والوں کا خیال بھی آتا رہا۔ اس نے دو مرتبہ مدثر کو بھی فون کیا۔ پہلے کوئی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ پھر تین بجے۔ پہلی کال پر وہ کافی دیر اس سے بات کرتا رہا۔ دوسری کال پر اس نے کہا۔

''سو جاؤ یار...... تمہاری آواز سے نادر اور بھابی ڈسٹرب ہوں گے۔''

''میں بہت آہستہ بول رہی ہوں۔''

''پھر بھی۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے مدثر۔''

''آنکھیں بند کرو اور سونے کی کوشش کرو۔''

''نیند ہی نہیں آرہی...... تم صبح کب آؤ گے؟''

''بتایا تو تھا تمہیں...... یونیورسٹی جانے سے پہلے تمہاری طرف ہی آؤں گا۔''

''ممی، ڈیڈی کو کب بتاؤ گے؟''

''انشاء اللہ بہت جلد...... اچھا اب تم سو جاؤ۔''

''میرا تم سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے مدثر۔''

''کرلیں گے یار۔ باتیں ہی کریں گے اور ہم نے کیا کرنا ہے مگر اس وقت سوتے سے جاگا ہوں، کل پورا دن کس طرح گزرا تم جانتی ہی ہو۔ دو تین گھنٹے سو جاؤں پھر فریش ہو کر تمہاری طرف آؤں گا...... اوکے...... گڈ نائٹ۔'' اس کے گڈ نائٹ کہنے سے پہلے ہی مدثر نے فون کال منقطع کر دی۔

علی الصباح کسی نے زور زور سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون؟'' اس نے دروازے کے نزدیک جا کر پوچھا۔

''میں ہوں۔''

وہ پہچان گئی، یہ خاتونِ خانہ کی آواز تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا پھر اسے مدثر کے دوست کی بیگم کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! نہا دھو لو تو چائے لے آؤں۔'' انہوں نے اسے سرتاپا تنقیدی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ مزید کچھ کہے سنے بنا وہ پلٹ گئیں اور تسنیم دروازہ بند کر کے غسل خانے میں جا گھسی۔ خاصی دیر بعد وہ ایک ٹرے لیے ہوئے آئیں۔ چائے کا ایک مگ، ایک پراٹھا اور ہاف فرائی انڈا۔ ٹرے کو بیڈ پر رکھ کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''رات کو جب میری آنکھ کھلی، مجھے تمہارے گھر والوں کا خیال آیا۔ کیا گزری ہوگی بے چاروں پر۔'' تسنیم کو صبح صبح ہی لیکچر بازی بری لگی۔

''مانا کہ تم نے ان کی تسلی کو میسج کر دیا تھا، ایک مرتبہ فون بھی کر لیتیں۔'' وہ چپ رہی۔

''ہاں مگر کس منہ سے کرو گی فون...... ان کی تو عزت خاک میں مل چکی۔'' دفعتاً ثریا چونکی۔ ''اچھا کپڑے بدل لیے تم نے، میں نے تو اب غور کیا۔ کپڑے لے کر نکلی ہوگی گھر سے...... کیوں؟'' ثریا کا آخری استفسار یہ جملہ جواب کا متقاضی تھا۔

''جی...... ایک جوڑا...... لے آئی تھی میں۔'' اس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

''بھئی واہ! بڑی ہوشیار ہو۔'' اس کے جی میں آیا کہے سادہ تو آپ بھی نہیں لگتیں مگر مصلحت کے تحت چپ رہی۔

''ایک بات بتاؤ۔'' وہ اس کے روبرو آ کھڑی ہوئیں اور اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ایک غیر آدمی کے لیے اپنے گھر کو چھوڑتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگا۔ کورٹ جا کر تم سے شادی کرنے کے بجائے اگر مدثر تمہیں کہیں اور لے جاتا اور خراب کر کے چھوڑ دیتا یا خدانخواستہ تمہیں مار مور دیتا تو؟'' تسنیم کو اب ضبط کا یارا نہ رہا۔

''مدثر تو آپ کے ہسبینڈ کے دوست ہیں، کیا آپ انہیں ایسا سمجھتی ہیں۔''

''بات میرے سمجھنے کی نہیں، تمہیں سمجھانے کی ہے۔ میرے ہسبینڈ کا دوست ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مدثر کوئی فرشتہ ہے...... انسان ہی ہے اور انسان پر شیطان آتے کتنی دیر لگتی ہے۔ اللہ نہ کرے بدل جاتی اس کی نیت تو پھر؟ نہ تم اِدھر کی رہتیں نہ اُدھر کی...... اور ابھی بھی کیا پتا کہ مدثر کے گھر والے تمہیں قبول کرتے ہیں یا نہیں۔''

تسنیم نے بے ساختہ ہڑبڑا کر ثریا کو دیکھا۔

''ہاں ہاں غلط تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ اپنا گھر چھوڑ کر آنے والی لڑکیوں کو لوگ آسانی سے تھوڑی قبول کرتے ہیں۔ بھئی لڑکے والوں کی بھی عزت ہوتی ہے آخر...... عزیز رشتے دار ہوتے ہیں، دوست احباب ہوتے ہیں۔ ملنے جلنے والے ہوتے ہیں۔ انہیں بھی تو منہ دکھانا ہوتا ہے۔ لوگ چوکتے تھوڑی ہیں باتیں بنانے اور انگلیاں

اٹھانے سے۔ منہ کھول کر کہہ دیتے ہیں ارے بھئی فلاں کی جو بہو ہے۔ اپنے گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔"

تسنیم کو اپنے سینے میں سانس کی لے دھیمی ہوتی محسوس ہوئی۔

"اوہو! ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے تم ناشتا کرلو۔"

"مدثر آجاتے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"مدثر کے آنے کے انتظار میں ناشتے سے بیٹھی رہو گی کیا۔ اس کی فکر مت کرو وہ گھر سے ناشتا کر کے آئے گا۔ مرد بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ اپنا کھایا پیا ہی کام آئے گا۔ ایک بات پوچھوں؟"

تسنیم ٹھٹکی، اب خدا جانے کیا پوچھنے جا رہی تھیں وہ۔

"سچ بتانا۔"

تسنیم ثریا کا منہ دیکھنے لگی۔

"مدثر میں ایسی کیا خوبی دیکھی تم نے جو اس کی خاطر اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا کر چلی آئیں؟"

جواب آسان تھا مگر تسنیم کو جواب دینے میں شرم محسوس ہوئی۔

"بولو؟"

وہ خاموش رہی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" وہ بھی ڈٹی رہیں۔

"کوئی ایک خوبی نہیں، ان کی مجھے ہر بات اچھی لگتی ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو جس کی ہر بات اچھی لگے اس کے لیے آدمی اپنی، اپنے خاندان کی عزت کو داؤ پر لگا دے۔ انسان کو تو زندگی میں بہت سے لوگ اچھے لگتے ہیں۔" ثریا نے اسے چبھتی نظروں سے دیکھا۔ تسنیم کو اپنا سر جھکائے بنا چارہ نہ دکھائی دیا۔

"تم سے کوئی پانچ چھ سال ہی بڑی ہوں گی میں۔ اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال رکھا، آج عزت سے شوہر کے گھر میں بیٹھی ہوں۔ میکا، سسرال ہر جگہ عزت ہے۔" تسنیم کو سانس لینا بھی دوبھر محسوس ہونے لگا۔ کہنے کو غیر مگر کتنی دخیل ہو رہی تھی ثریا اس کی زندگی میں۔ کل شام اس نے کچھ کم سنائی تھیں جو صبح پھر شروع ہو گئی تھی۔ تسنیم اور کسی کی اتنی سن لیتی۔ مگر وقت اور حالات ہی ایسے تھے کہ سنے بنا چارہ نہیں تھا۔

"پلیز! مجھے یہاں سے لے چلو ورنہ تمہاری ثریا بھابی کے طعن و تشنیع مجھے مار دے گی۔" مدثر آیا تو وہ اس کے سینے سے لگ کر رو دی۔

"یار! اس سے بہتر ٹھکانا نہیں ہے فی الحال میرے پاس۔" مدثر نے ہری جھنڈی دکھا دی۔

"کب تک؟ کب تک رہنا ہوگا مجھے یہاں؟"

"دیکھتے ہیں۔" عجیب بے یقینی تھی۔ "کچھ کھایا پیا؟"

"ہاں...... چائے جو تمہاری بھابی کی باتوں سے برف ہو گئی تھی۔"

"بس تھوڑے دن کی سختی ہے پھر عیش کرو گی۔"

"کتنے بجے واپس آؤ گے؟" کچھ دیر اس کے پاس ٹھہر کر وہ یونیورسٹی جانے لگا تو اس نے پوچھا۔

"یونیورسٹی سے اِدھر ہی آؤں گا۔ ممی کو دو تین دن کے لیے اسائنمنٹ کا بہانہ فٹ کر دیا ہے میں نے۔"

مدثر کے جانے کے بعد اس نے اپنا موبائل نکالا اور اس قدر آہستگی اور احتیاط سے آن کیا جیسے ذرا سی بے احتیاطی کی تو دھماکا ہو جائے گا۔ رابطہ کرنے والے شاید مایوس ہو کر بیٹھ چکے تھے۔

☆☆☆

یونیورسٹی جاتے ہوئے تقدیم کا ذہن اسی بھول بھلیوں میں الجھا رہا کہ یونیورسٹی پہنچنے کے بعد تسنیم کی تلاش کا آغاز کہاں سے اور کیونکر کرے گی۔ یونیورسٹی پہنچی تو تسنیم کے شعبے کی طرف جاتے ہوئے اس نے حکمت عملی طے کرلی۔ اپنا سیاق وسباق بتائے بغیر اس نے تسنیم کی ڈپارٹمنٹ میں موجودگی کے بارے میں استفسار کیا تو جواب ملا۔

"وہ شاید آج آئی نہیں ہے...... تم نے دیکھا؟" جواب دینے والی طالبہ نے اپنی دوسری ساتھی سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"سوری۔" پہلی نے تقدیم کو معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا۔

"ایکسکیوز می۔" تقدیم نے تین لڑکیوں کے ایک گروپ کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ ٹھٹک گئیں۔ تقدیم نے تسنیم کی بابت استفسار کیا۔

"آپ کیفے ٹیریا یا کار پارکنگ میں دیکھیں، وہ فائنل ائیر کے مدثر کے ساتھ ہوگی۔" تقدیم کے کان کھڑے ہوئے۔ ستون کی آڑ میں کھڑی دو لڑکیوں سے پوچھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے دوسری سے پوچھا۔

"مدثر کو دیکھا ہے تم نے؟" دوسری نے شانے اچکا کر لاعلمی ظاہر کی۔

"فائنل ائیر کی کلاسز نیچے ہوتی ہیں۔ آپ وہاں مدثر کا پوچھیے گا، تسنیم اور وہ ساتھ ہی ہوں گے۔"

"تھینک یو۔" تقدیم نیچے جانے کے لیے زینے کی طرف بڑھی۔

"یار! اس تسنیم نے تو حد ہی کر دی ہے۔ جب دیکھو مدثر کے ساتھ اس کی گاڑی میں۔" تقدیم نے ان دونوں میں سے ایک کو کہتے سنا۔

مدثر کی تلاش شروع کی تو پتا چلا وہ غیر حاضر تھا۔ وہ بے نیل مرام لابی سے گزر رہی تھی کہ ایک نوجوان نے بتایا۔ "مس! آپ مدثر کو تلاش کر رہی تھیں نا، وہ ابھی ابھی آیا ہے۔"

وہ ٹھٹک گئی۔

"ہم نے اسے آپ کا بتا دیا ہے، وہ آ رہا ہے۔"

"او کے...... تھینک یو، ویری مچ۔"

"مدثر! اِدھر۔" تقدیم کی مدد کو آنے والے نوجوان نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے سے تقدیم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بلند آہنگی سے کہا۔

تقدیم نے اپنی نظر نوجوان کی نگاہوں کے تعاقب میں دوڑائی۔

"مس! ایکسکیوز می میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔" نوجوان نے تقدیم سے کہا۔

"تھینکس۔"

"یو ویلکم۔" نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس پلٹ گیا اور وہ جسے اس نے مدثر کہہ کر مخاطب کیا تھا تقدیم کے نزدیک آرکا۔

"جی فرمائیے۔" اس کے لہجے میں بلا کی احتیاط تھی۔

''مدثر؟'' تقدیم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔
''جی..... جی ہاں۔'' وہ چوکنا سا نظر آنے لگا۔
تقدیم کو اپنے جبڑوں پر دباؤ محسوس ہوا۔ ''مجھے تسنیم سے ملنا ہے۔'' اس نے براہِ راست استفسار سے گریز کیا۔
''تت..... تسنیم.....؟'' وہ بے ساختہ ہکلایا۔
''ہاں..... تسنیم۔'' تقدیم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''مجھے اوپر آپ کے ڈپارٹمنٹ میں بتایا گیا ہے کہ تسنیم سے ملنے کے لیے مجھے آپ کو تلاش کرنا چاہیے۔''
''میرا..... تسنیم سے کیا تعلق؟'' وہ سٹپٹا کر بولا۔
''کچھ نہ کچھ تو ہوگا جو تسنیم سے ملنے کے لیے مجھے آپ کو تلاش کرنے کو کہا گیا۔''
''کس نے کہا؟''
''کسی ایک نے نہیں۔''
''اچھا خیر..... بائی دا وے آپ ہیں کون؟''
''میں تسنیم کی بہن ہوں۔''
''آئی سی۔'' وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کی چین کو اپنی انگشتِ شہادت پر مضطربانہ نچانے لگا۔
''تسنیم کہاں ہے؟''
''مجھے کیا پتا۔''
''غلط بیانی کی ضرورت نہیں۔''
''مجھے کیا ضرورت ہے غلط بیانی کی..... غلط بیانی تو آپ کر رہی ہیں..... خود کو تسنیم کی بہن کہہ رہی ہیں اور پوچھ مجھ سے رہی ہیں کہ وہ کہاں ہے۔''
''یہ غلط بیانی نہیں بدقسمتی ہے میری۔''
''ایکسکیوزمی..... میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' تقدیم سمجھ گئی وہ فرار کو بہانہ تراش رہا تھا۔
''تسنیم کل صبح یونیورسٹی کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ شام کو اس نے میرے موبائل پر میسج کیا۔''
''سوری..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ مستقل نظریں چرائے ہوئے تھا۔
''یہ نہیں پوچھیں گے آپ کہ کیا میسج کیا تھا اس نے؟''
''دیکھیں جی..... مجھے کسی کے میسج سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں یہاں پڑھنے کے لیے آتا ہوں اور بس۔''
''کاش ایسا ہی ہوتا۔''
''کیا مطلب؟''
''تسنیم کل سے گھر نہیں لوٹی ہے۔'' تقدیم نے اس کا ردعمل دیکھنے کو توقف کیا۔ ایک نوجوان لڑکی کی گمشدگی کی خبر کسی اجنبی کو بھی چونکانے کے لیے کافی تھی مگر اس نے ایسا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ''اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانی ضروری ٹھہری تو ہمیں کسی پر تو اپنا شبہ ظاہر کرنا ہی ہوگا۔'' تقدیم نے گہری نگاہوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس قصے سے نہ سروکار تھا نہ دلچسپی۔ ''ہم پولیس کو تمہارا نام دیں گے۔'' تقدیم نے گویا ٹیپ کا مصرعہ ادا کیا۔
''میرا! میرا نام کس سلسلے میں؟'' اس نے ہڑبڑا کر تقدیم کو دیکھا۔

''تسنیم کی بازیابی کے لیے۔''

''دیکھیں۔'' وہ تیوری بگاڑ کر بولا۔'' آپ مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، آخر چاہتی کیا ہیں آپ؟''

''تسنیم کی ویرابائوٹس...... اس کا اتا پتا...... کہاں ہے وہ...... ورنہ......'' تقدیم نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

''ورنہ؟''

''پولیس خود معلوم کر لے گی۔''

قریب سے گزرتا ایک طالبعلم تقدیم کی بات سن کر ٹھٹک گیا اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مدثر سے پوچھنا چاہا کہ معاملہ کیا ہے۔

''کچھ نہیں یار۔'' مدثر نے ہاتھ اٹھا کر اسے اطمینان دلایا۔ وہ ایک نظر تقدیم پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

''دیکھیں یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اوور ہیر کرنے والے کہانیاں بنا لیتے ہیں۔''

''کہانیاں بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ڈپارٹمنٹ گواہی دے گا کہ تسنیم سے تمہاری دوستی تھی۔''

''جھوٹ...... بکواس......'' وہ پاؤں زمین پر مارتے ہوئے بولا۔

''چلو...... گواہی دلواتی ہوں تمہارے اپنے ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے۔''

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

''اب چپ کیوں ہو گئے؟'' تقدیم آپ سے تم پر آ چکی تھی۔

اس نے ایک نظر تقدیم کو دیکھا۔

''بولو؟''

''اگر دوستی تھی بھی تو آپ صرف مجھے قصوروار نہیں ٹھہرا سکتیں۔''

''تو تم اس سے اپنی دوستی تسلیم کر رہے ہو؟''

''جی۔'' وہ نظریں جھکا کر بولا۔

''وہ تمہارے پاس ہے؟''

اس نے سر جھکایا پھر آہستگی سے اثبات میں ہلایا۔ تقدیم نے ایک گہری سانس کھینچی۔

''کورٹ میرج والی بات میں کتنی حقیقت ہے؟''

''سو فی صد۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

تقدیم کا دل پھٹ پڑنے کو تیار ہوا مگر مصلحتِ وقت کے تحت اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور متحمل لہجے میں بولی۔ ''صرف ایک بار یہ سوچ لیتے کہ وہ کسی کی بیٹی، کسی کی بہن بھی ہو گی۔''

''میں اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا تھا مگر وہ کہتی تھی جب تک بڑی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی تب تک پیرنٹس راضی نہیں ہوں گے۔''

''اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا...... پوچھ سکتی ہوں تمہاری اپنی کتنی بہنیں ہیں؟''

''کوئی نہیں۔''

تقدیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تبھی تمہیں بہنوں کی عزت کا احساس نہیں۔ سوچ سکتے ہو کہ کیا گزری ہے

"ہمارے پورے گھر پر۔"

اس نے سر جھکا لیا۔

"جیتے جی مار دیا ہے تم دونوں نے ہم سب کو۔ تسنیم نے کبھی یہ بتایا تمہیں کہ والد کمزور اعصاب کے آدمی ہیں۔ والدہ برسوں سے وہیل چیئر پر ہیں، بھائی ابھی بڑی ذمے داریاں اٹھانے کے لائق نہیں ہے، چار بہنیں گھر میں اور بھی ہیں...... وہ اکیلی نہیں تھی بہت سے رشتے جڑے ہوئے تھے اس سے۔ خالائیں ہیں، چچا ہیں، پھوپیاں ہیں ان کے کنبے ہیں۔ کیسے منہ دکھائیں گے ہم ان سب کو؟" جذبات کی شدت سے تقدیم کی آواز لحہ بہ لحہ رندھتی چلی گئی۔

"سوری!" وہ اس کے چپ ہو جانے کے بعد آہستہ سے بولا۔

"تمہارے سوری کہہ دینے سے گئی ہوئی عزت واپس نہیں آسکتی۔ بوڑھے باپ اور معذور ماں کے دل پر لگے زخم بھر نہیں سکتے۔" تقدیم نے اسے زہر خند نظروں سے دیکھا۔

مدثر نے اپنا جھکایا ہوا سر اور بھی جھکا لیا۔ کچھ دیر کو خاموشی ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی پھر تقدیم نے گھائل لہجے اور بوجھل آواز میں کہا۔ "اسے جو حماقت کرنی تھی وہ کر چکی۔ اب تم ایک فیور دو۔"

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور تقدیم کو دیکھنے لگا۔

"ایک مرتبہ اسے والدین کے گھر سے رخصت کر کے لے جاؤ بس۔"

"آپ کا مطلب ہے آپ کے گھر سے؟" وہ چونک کر بولا۔

"ہاں۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"یہ میری والدہ کا فیصلہ ہے اور خواہش بھی۔ وہ نہیں چاہتیں کہ تسنیم کی اس غلطی کا اثر باقی بھائی بہنوں کے مستقبل پر پڑے۔"

"یہ تو بہت پازیٹو اپروچ ہے ان کی۔"

"مجبوری ہے۔" تقدیم کے لہجے میں تلخی تھی۔

وہ شرمندہ سا نظر آنے لگا۔

"والدہ چاہتی ہیں اس سے پہلے کہ محلے والے اور رشتے دار گھر میں تسنیم کی عدم موجودگی کا نوٹس لیں۔ اسے ایک بار گھر واپس لا کر رخصت کر دیا جائے۔"

نوجوان طلبا کے ایک گروپ نے ان کے نزدیک سے گزرتے ہوئے مدثر پر آواز کسی۔ "کیا ہو رہا ہے مدثر بھائی؟"

مدثر نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلیاں نچائیں پھر تقدیم سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں یہاں اچھا نہیں لگ رہا۔"

"تسنیم سے کہاں ملا جاسکتا ہے؟" وہ اس کے ہمراہ چلتے ہوئے بولی۔

"سوری...... فی الحال نہیں۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"پہلے مجھے پوچھنے دیں اس سے۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ ملنا چاہتی ہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسی۔ مدثر چونکا۔ زندگی کے نقش و نگار بھی کبھی ایک ہی جھٹکے میں کس قدر بدل جاتے ہیں۔ تکلیف کی شدت ناقابل برداشت ہو جائے تو کبھی کبھی انسان رونے کے بجائے ہنس پڑتا ہے۔ تقدیم بھی اس وقت ایسے ہی تجربے سے گزری تھی۔ کیا لطیفہ تھا تسنیم سے ملنے کے لیے اسے خود تسنیم کی اجازت درکار تھی۔

"اصل میں...... تسنیم میرے ایک دوست کے گھر میں ہے۔" مدثر نے بتایا۔ تقدیم چلتے چلتے رک گئی اور اسے توضیح طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ "میرے اپنے گھر والوں کو بھی ابھی اس سے میری کورٹ میرج کا علم نہیں۔"

"حیرت ہے! کس طرح تنہا اتنے بڑے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں آج کل کے نوجوان۔"

وہ تقدیم سے اپنی ملاقات کے پورے دورانیے میں پہلی بار دھیرے سے مسکرایا۔ "ہر کوئی آپ کی طرح سمجھدار تھوڑی ہوتا ہے۔" اس نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بولا۔ "اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ تقدیم آپی ہیں۔"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم؟" وہ بے ساختہ چونکی۔

"تسنیم آپ کا اکثر ذکر کرتی رہی ہے۔"

"کیوں، کس لیے؟"

"وہ کہتی ہے ابا کے بعد تقدیم آپی ہمارے گھر کی دوسری مرد ہیں، بہت محبت کرتی ہے وہ آپ سے بلکہ سبھی گھر والوں سے۔"

تقدیم خاموش رہی۔ کیا محبت کرنے والے یہ کرتے ہیں جو تسنیم نے کیا تھا۔ کیسی محبت تھی تسنیم کو اس سے اور باقی گھر والوں سے۔ اس بے وقوف اور عاقبت نا اندیش لڑکی کو تو شاید اپنے آپ سے بھی محبت نہیں نفرت تھی ورنہ وہ ماں باپ کے گھر کو اس ذلت کے ساتھ چھوڑنے کے بجائے اس گھر میں عزت سے مر جانے کو ترجیح دیتی۔ وہ ایک بار پھر قدم بہ قدم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جس کی آستین اس کے والدین کی ناموس کے خون میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تمہارے گھر والوں کے لاعلم ہوتے ہوئے یہ مسئلہ کیونکر حل ہوگا؟" تقدیم نے متفکر لہجہ میں کہا۔

"زیادہ آسانی سے۔"

"کیا مطلب؟"

"ڈیڈی کو تو نہیں ممی کو بتادوں گا کہ میں نے ایک لڑکی سے کورٹ میرج کر لی ہے، بھائی بھابی کی وجہ سے ارینجڈ میرج کا ڈراما کرنا ہے۔"

"کتنے بھائی ہیں تمہارے؟"

"بس ایک۔"

"تمہارے پیرنٹس راضی ہو جائیں گے؟"

"ممی کو میں راضی کروں گا۔ ڈیڈی کو راضی کرنا ممی کا کام ہوگا۔ ہو جائیں گے، دونوں راضی ہو جائیں گے۔ اپنے بچوں کی عزت تو سبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ اب دیکھیں نا آپ کی اپنی مدر اپنے بچوں کی عزت کی خاطر ہی تو اتنا بڑا اسٹیپ لینا چاہتی ہیں۔"

"بچوں کو ماں باپ کی عزت کیوں پیاری نہیں ہوتی؟" تقدیم نے سوچا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتی وہ پارکنگ ایریا تک جا پہنچی تھی۔ مدثر رکا تو وہ بھی ٹھٹک گئی۔

"اب آپ کہاں جائیں گی؟" وہ اسے ایک معلق سی کیفیت میں دیکھنے لگی۔

"ظاہر ہے گھر...... لیکن سوچ رہی ہوں گھر والوں کی تسلی کے لیے کیا لے کر جاؤں؟"

"میں...... میں تسنیم سے بات کرتا ہوں...... اگر وہ مان جاتی ہے تو میں اپنے پیرنٹس کو ساتھ لے کر آپ کے گھر آؤں گا۔"

"جلد!" تقدیم کے لہجے میں التجائیہ بے قراری تھی۔

"انشاء اللہ!"

"تسنیم کو بہر صورت آمادہ کرنا ہوگا تمہیں۔ یہ ایک گھر کی عزت کا سوال ہے۔"

"فکر نہ کریں۔ آئیں میں آپ کو اسٹاپ تک چھوڑ دوں۔"

"تھینک یو، میں چلی جاؤں گی۔"

"شیور۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "رابطے کی صورت؟" تقدیم نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

"میں خود فون کروں گا آپ کو۔"

تقدیم مذبذب تھی اگر اس نے فون نہ کیا! دھوکا دے کر کہیں غائب ہوگیا تو؟ مگر اندیشوں اور وسوسوں سے بھلا کیا ہاتھ آنا تھا۔ خدا کا نام لے کر بھروسا کیے بنا چارہ نہ تھا۔ یہ بھی خدائی مدد تھی کہ وہ مل گیا تھا اور اس نے اقرار بھی کرلیا تھا۔ اعتراف نہ کرتا تو......؟ پولیس تھانے میں جانے کا مطلب تو صرف جگ ہنسائی تھی۔

گھر پہنچی تو بیم ورجا میں ڈوبی نگاہیں اسے اپنی منتظر دکھائی دیں۔

"ہاں بیٹا کچھ پتا چلا؟" ابا کے لہجے میں تکان تھی۔

"جی ابا۔" سب ہمہ تن گوش دکھائی دینے لگے۔ اماں نے جملہ احوال سننے کے بعد کہا۔

"خدا اس منحوس کو غارت کرے۔ اندھا کوڑھی ہو کر بیٹھے...... تقدیم تو نے اسے گریبان سے کیوں نہ پکڑلیا...... ارے اس کے پروفیسروں کو بتاتی۔ اس کے ساتھ پڑھنے والوں میں ذلیل کرتی اسے...... کمبخت نے ہماری عزت خاک میں ملائی اس کے منہ پر بھی تو کالک ملی ہوتی تو نے۔"

"اپنا سکہ کھوٹا تو پرائے کو کیا دوش۔" ابا کے لہجے میں دکھ تھا۔

"ڈھٹائی تو دیکھے کوئی...... کرتوت کر کے یونیورسٹی میں دندناتا پھر رہا ہے۔"

"غنیمت ہوا تقدیم کی ماں ورنہ کیا پتا چلتا کہ وہ کہاں گئی اور کس کے ساتھ گئی۔" ابا کو شاید تسنیم کا نام بھی اپنی زبان پر لانا گوارا نہ رہا تھا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" اماں نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"کل سے ان دونوں کو بھی گھر بٹھاؤ۔" ابا نے تعظیم اور تقدیس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خلافِ عادت درشتی سے کہا۔

تعظیم اور تقدیس نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اب معلوم ہوا لوگ بیٹیوں کی پیدائش پر کیوں روتے ہیں۔" ابا کے لہجے میں تلخی تھی۔

تمہید، تعظیم اور تقدیس خجل نظر آنے لگیں۔ ایک بہن کی غلطی نے ان سب پر ابا کے اعتبار کو متزلزل کر دیا تھا۔ ہمیشہ محبت سے بات کرنے والے باپ کا یہ روپ ان کے لیے اجنبی تھا۔ تقدیم بھی انہی میں سے تھی۔ تسنیم کی خطا کی خفت بے خطا بہنوں کے چہروں پر لرزاں دیکھی تو انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اس منظر سے نکل جانے کا اشارہ کیا۔ تینوں چپ چاپ کمرے سے چلی گئیں۔ ابا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

تینوں بہنوں کے پیچھے پیچھے تقدیم بھی دوسرے کمرے میں پہنچی تو تعظیم اور تقدیس سر جھکائے، منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔

"ہمارا کیا قصور جو ابا نے ہم پر پابندی لگادی۔" تعظیم اسے دیکھ کر جارحانہ لب ولہجہ میں بولی۔

"ابا شاک میں ہیں تعظیم، اس وقت ہمیں ان سے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے اُن کی پریشانی اور دکھ بٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔" تقدیم نے اسے رسانیت سے سمجھایا۔

"پریشان تو ہم بھی ہیں آپی۔" تقدیس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تقدیم نے اسے گلے سے لگالیا۔ وہ سسکنے لگی، تقدیم کا دل دکھنے لگا۔ اس عمر کی لڑکیوں کے لیے تو زندگی قوسِ قزح کی طرح بہت رنگین اور دلفریب ہوتی ہے۔ تسنیم اپنے پیچھے چھوٹی بہنوں کے لیے کیا چھوڑ گئی تھی۔ آنسوؤں میں ڈوبی اماوس کی رات۔ تقدیس کو اپنے بازوؤں کے لمس سے دلاسا دیتے ہوئے تقدیم کو خیال آیا شام کو حجاب کا نکاح تھا۔ صبح اس نے فون کر کے بتایا تھا کہ نکاح کی تقریب اس کے گھر پر منعقد ہونے کے بجائے دولھا کی خواہش پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہو رہی تھی۔ کتنے نصیبوں والی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو عزت سے ماں باپ کے گھر سے جاتی ہیں اور لے جانے والے چاؤ سے لے جاتے ہیں۔ تسنیم کتنی بدقسمت تھی۔

☆☆☆

چھوٹا سا گھر باہر سے جگمگا رہا تھا۔ مکینِ خانہ اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھے۔ کل تک تو یہی طے تھا کہ نکاح کی تقریب گھر میں ہوگی لیکن صبح سویرے الطاف نے امی کو فون کر کے کہا۔

"آنٹی میں چاہتا ہوں نکاح کا فنکشن ہوٹل میں کیا جائے۔"

"ہوٹل میں۔" امی اچانک سر پر آپڑنے والے خرچے کے خیال سے پریشان ہوگئیں۔ "بیٹا ہم نے تو سارا انتظام گھر پر کر رکھا ہے۔ کھانا پکانے کا سارا سودا سلف بھی آگیا ہے۔"

"گھر میں کام آجائے گا۔"

"لیکن...... ہوٹل میں اتنی جلدی بندوبست کے لیے مجھے بہجت اور قائم علی شاہ سے صلاح کرنی ہوگی۔"

"وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں خود بندوبست کرلوں گا۔ بس یہ سمجھیں کہ آپ لوگوں نے مہمانوں کی طرح آنا ہے۔ کسی بات کی فکر کی ضرورت نہیں۔ ہوٹل میں کھانے کا بندوبست، پیمنٹ سب میں کروں گا۔"

"بیٹا یہ اچھا تھوڑی لگتا ہے۔"

"بیٹا کہتی ہیں اور تکلف کرتی ہیں۔" الطاف نے کہا۔

"میں نے تو قریبی رشتے داروں کو بھی بلا رکھا ہے۔"

"سر آنکھوں پر آنٹی جان...... کچھ اندازہ ہے کہ کتنے لوگ ہوں گے۔"

"سب مل ملا کر تیس پینتیس تو ہوں گے۔"

"آپ کے اپنے گھر والوں کو بھی شامل کر کے یا ان کے علاوہ؟"

"سب کو ملا کر۔"

"کوئی مسئلہ نہیں۔ ہماری طرف سے دونوں بہنیں ہوں گی، ان کے شوہر، بچے اور میرا ایک دوست اور اس کی امی...... میں پچاس لوگوں کا بندوبست کرالیتا ہوں۔"

"گھر میں ہو جاتا تو اچھا تھا ساری تیاری بھی ہے۔" امی نے دبی زبان سے کہا۔

"نہیں، نہیں آنٹی، ہوٹل میں ٹھیک رہے گا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کس ہوٹل میں

بندوبست ہوا ہے آپ سب کو بتا دیجیے گا۔ حجاب کو پارلر جانے کے لیے گاڑی کتنے بجے چاہیے؟''

''نایاب لے جائے گی اسے اپنی گاڑی میں۔''

''نہیں، نہیں جب میری گاڑی ہے تو کسی کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے گرمجوشی سے کہا۔

''میں حجاب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔''

''جی ٹھیک ہے میں ہولڈ کرتا ہوں۔''

امی نے حجاب سے پوچھ کر اسے پارلر جانے کا وقت بتایا۔

زیادہ نہیں پون گھنٹے بعد الطاف کا دوبارہ فون آ گیا۔ اس نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں نکاح کی تقریب کے انعقاد کا بندوبست ہو جانے کی اطلاع دی۔ امی نے سب سے پہلے بہجت پھر نایاب کو اطلاع دی۔ پھر مدعو کیے گئے رشتے داروں کو فون کرنے لگیں۔ قریبی رشتے داروں کو بلانا ضروری تھا۔ بابا کے گاؤں سے رشتے داروں کی شرکت امی نے رخصتی پر موقوف رکھی تھی تاہم انہیں اطلاع کر دی تھی کہ حجاب کا نکاح کر رہے ہیں۔ ہمسایوں میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا تھا جس کو نہ بلاتیں اسے گلہ ہوتا۔ نایاب باجی کا مشورہ تھا کہ نکاح کے بعد آس پڑوس کے گھروں میں مٹھائی بھجوا دیں گے بس۔ حجاب کے اسکول میں ساتھیوں کو اس کے نکاح کی خبر تو تھی مگر اس نے بلایا کسی کو نہ تھا۔ دوستوں میں سے بھی صرف تقدیم کو دعوت دی تھی۔ مقام تقریب کی تبدیلی سے اسے آگاہ کرنے کے لیے حجاب نے پارلر جاتے ہوئے راستے سے فون کیا۔ تقدیم جو اپنی پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی معذرت خواہانہ لہجہ میں بولی۔

''حجاب اگر میں نہ آسکوں تو ناراض نہ ہونا پلیز۔''

''قتل کر دوں گی تمہیں۔''

''پتا ہے کیا آج تمہید باجی کو دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں کچھ لوگ۔ میرا گھر پر ہونا ضروری ہے۔'' اس نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لینے کی تدبیر کی۔

''ہاں..... پھر تو مجبوری ہے۔'' حجاب کا جارحانہ لہجہ یک دم مفاہمانہ ہو گیا۔ ''کسی اور دن بلا لیا ہوتا انہیں۔''

''انہیں شاید آج ہی سہولت لگی ہو آنے میں۔''

''کتنے بجے آنا ہے انہوں نے؟''

''سات ساڑھے سات بجے۔'' تقدیم نے جان بوجھ کر وہی وقت بتایا جو تقریبِ نکاح کا تھا۔

''اگر وقت مل جائے تو آ جانا۔ فون کر دینا مجھے۔ میں کسی کو بھیج دوں گی تمہیں لانے کے لیے۔''

''ٹھیک ہے۔''

شام ہوتے ہی گھر کے فرنٹ پر آراستہ قمقمے جگمگا اٹھے۔ امی نے مہمانوں کے استقبال کے لیے بڑے چاؤ سے گھر کے باہر برقی قمقموں والی جھالریں آراستہ کروائی تھیں۔ مگر الطاف کی جانب سے ہوٹل میں تقریب کے بندوبست پر انہیں میزبان کے بجائے مہمان بن کر جانا پڑ گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ الطاف نے شاندار بندوبست کروایا تھا۔ بہترین آرائش، پُرتکلف ضیافت، فوٹو گرافرز، مووی میکر، الطاف نے ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ تقدیم کا نہ فون آیا نہ حجاب کو تقریب کی رونقوں میں اس کا خیال آیا۔ دلکش عروسی لباس میں ملبوس بھاری زیورات پہنے، پھولوں سے سنوری، خوشبوؤں میں بسی وہ روشنیوں کے ہالے میں بیٹھی تھی۔ الطاف سے اس کا نکاح پڑھایا جا چکا تھا اور الطاف اس کے پہلو میں بیٹھا بار بار اسے میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا۔ امی ڈائس

کے سامنے پڑے صوفوں پر الطاف کی بہنوں اور اپنی قریبی رشتے دار عورتوں کے ساتھ بیٹھی آنکھوں ہی آنکھوں میں حجاب اور الطاف کی بلائیں لے رہی تھیں۔ مووی میکر دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، زاویے، ہر رخ سے تقریب کو کور کر رہا تھا۔ دو فوٹو گرافرز دھڑا دھڑ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ کبھی ڈائس پر بیٹھے دولھا دلہن کی کبھی تقریب میں شریک مہمانوں کی۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ چھوٹے سے گھر میں ایسی شاندار تقریب منعقد کی جاسکتی تھی بھلا۔

☆☆☆

''نہیں مدثر...... کسی قیمت پر نہیں۔'' تسنیم نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

یونیورسٹی میں تقدیم سے مل کر مدثر سیدھا نادر کے گھر پہنچا تھا اور اس نے تسنیم کو تقدیم سے ہونے والی ملاقات کا احوال بلاکم وکاست سنا دیا تھا۔

''تمہارے گھر والے چاہتے ہیں کہ تمہیں ایک بار اس گھر سے رخصت کر دیا جائے تا کہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے۔''

''میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ کس منہ سے جاتی بھلا۔

''سوچ لو۔''

''کیا سوچ لوں؟ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ سر جھکا کر، مجرموں کی طرح جاؤں میں دوبارہ اس گھر میں، نیور مدثر...... یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔''

''لیکن ہمیں اپنے گھر تو جانا ہے نا؟''

''کون سے گھر؟'' وہ چونکی۔

''ممی، ڈیڈی کے گھر۔''

''ہاں، وہاں جانے کے لیے تو میں ابھی تیار ہوں، تم لے کر جانے والے تو بنو۔''

''دیکھو...... اگر تم اپنے گھر والوں کی بات مان لیتی ہو تو میں ممی کو مجبور کروں گا کہ وہ ڈیڈی کے ساتھ تمہارے گھر جا کر میرے لیے تمہارا رشتہ مانگیں۔ اس طرح منعم اور اس کی بیوی کی زبانیں بھی بند رہیں گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے ایک ہی دن میں رشتہ، نکاح سب کچھ ہو جائے گا؟''

''ہاں یار یہ مسئلہ تو ہے۔'' مدثر سوچ میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''ممی کو میں کانفیڈنس میں لے کر بتا دوں گا سب کچھ۔''

''سب کچھ کیا؟''

''یہی کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے پیار ہو گیا تھا۔ ہم نے کورٹ میرج کر لی۔ اب صرف تمہیں گھر لانے کے لیے ڈراما کرنا ہے۔ وہ ڈیڈی کو لے کر تمہارے گھر جائیں، رشتہ مانگیں اور میں کسی بھی بہانے سے ضد ڈال دوں کہ مجھے تو فوری شادی کرنی ہے۔''

''مثلاً...... کیا ضد ڈالو گے؟''

وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر چٹکی بجا کر بولا ''میں ضد کیوں ڈالوں ممی سے کیوں نہ کہوں کہ وہ ڈیڈی سے کہیں لڑکی اچھی ہے بس آج ہی نکاح پڑھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔''

''فار گاڈز سیک مدثر، شیخ چلی بننے کی کوشش نہ کرو۔''

وہ پھر سوچنے لگا اچھا تو پھر یہ کرتا ہوں کہ منعم اور اس کی بیوی کے سامنے میں ممی سے کہتا ہوں مجھے ایک

لڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور اس کے گھر والے اس کی شادی کسی اور سے کرنا چاہ رہے ہیں اگر ایسا ہو گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔''

''پھر؟''

''پھر کیا، مجھے خودکشی سے بچانے کے لیے ممی ڈیڈی کو میری شادی ہنگامی بنیادوں پر تم سے کرنا پڑے گی اور ہماری کورٹ میرج کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔''

''نادر بھائی اور ثریا بھابی کو تو پتا ہے۔''

''یار میرا مطلب ہے میرے گھر والوں کو۔''

''کیوں چھپانا چاہتے ہو اپنے گھر والوں سے، تم تو کہتے تھے تمہارے ممی، ڈیڈی نے منعم کی بیوی کو قبول کیا ہے تو مجھے کیوں نہ کریں گے۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو یار۔ میں تمہیں عزت سے اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ منعم اور اس کی بیوی کو اگر یہ پتا چلا کہ تم مجھ سے کورٹ میرج کر کے میرے گھر آئی ہو تو وہ تمہیں بھی اپنے لیول کا سمجھے گی۔ کسی وقت بھی یہ طعنہ دے سکتی ہے کہ میں نے اگر اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ کر منعم سے شادی کی ہے تو...... ہوا کیا تم بھی تو اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر مدثر سے کورٹ میرج کر کے آئی ہو۔ یہ طعنہ صرف تمہی کو نہیں ہماری آنے والی نسل کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ تمہارے والدین صرف تمہارے بھائی بہنوں کے مستقبل کی خاطر ہی تو تمہیں چار لوگوں کے سامنے اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتے ہیں نا۔ ہمیں بھی تو اپنی آنے والی نسل کی فکر کرنی چاہیے ورنہ......''

''ورنہ؟'' وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے یہ شعر پڑھا۔

''تاریخ کے قاضی کا فتویٰ ہے یہ ازل سے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی''

تسنیم اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کے الفاظ ثریا کے الفاظ کی تکرار تھی یا وہ اس سے اپنے سنجوگ کو غلطی سمجھ رہا تھا۔

''ہاں یار غلطی ہوگئی۔'' مدثر نے اس کے خیال کی توثیق کی۔

''غلطی!'' تسنیم نے الجھی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں انتظار کر لیتا تو اچھا تھا۔''

''کس بات کا انتظار؟''

''تم سے شادی کرنے کے لیے صحیح وقت کا انتظار...... آج یونیورسٹی گیا تو خود کو مس فٹ محسوس کر رہا تھا۔ باقی لڑکوں سے الگ تھلگ سا...... جیسے کندھوں پر کوئی بوجھ رکھا ہو جیسے دل میں کوئی چور آ گھسا ہو۔''

''مدثر! پچھتاوے کا احساس اور وہ بھی اتنی جلدی۔''

''انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہونے میں دیر نہیں لگتی تسنیم...... گناہ کا احساس گناہ کا خیال دل میں آتے ہی ہو جاتا ہے۔ قاتل کو قتل کر کے اپنے گناہ کا احساس ہونے میں دیر کب لگتی ہے۔ اس کے بعد تو مکافاتِ عمل شروع ہو جاتا ہے تم اسے پچھتاوا کہہ رہی ہو میں اسے مکافاتِ عمل سمجھتا ہوں۔ ہمارے لیے تلافی کا محفوظ ترین راستہ وہی ہے جو تمہارے گھر والے چاہ رہے ہیں۔''

وہ جو کورٹ میرج سے پہلے اسے کھلی آنکھوں سنہری سپنے دکھایا کرتا تھا کورٹ میرج کے بعد دوسرے ہی دن غلطی کا اعتراف اور پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا۔

☆☆☆

نکاح کے دوسرے ہی دن الطاف تصویریں پہنچانے کے بہانے گھر آ گیا۔ ''آنٹی، فوٹو گرافر کی دکان سے تصویریں اٹھائیں اور سیدھا یہاں آ گیا ہوں۔ میں نے خود بھی نہیں دیکھی ہیں ابھی۔''

''تو بیٹا پہلے تم خود دیکھ لیتے بہنوں کو دکھاتے۔''

''پہلے حجاب دیکھ لے۔ فوٹو سیشن والی البم ابھی تیار نہیں تھی۔ کل شام ملے گی تو وہ بھی لے آؤں گا۔ آپ کے گھر میں رشتہ کر کے میں بہت خوش ہوں۔''

''خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔''

''حجاب تو خوش ہے نا؟''

''ہاں..... خوش کیوں نہ ہوگی بھلا..... تم نے بہت عزت دی ہم لوگوں کو۔''

''کل حجاب کے اسکول سے بھی کوئی آیا تھا یا نہیں؟''

''نہیں بیٹا اس نے ابھی کسی کو نہیں بلایا، ہتی ہے رخصتی پر بڑا فنکشن ہوگا تو بلائیں گے۔ ویسے اطلاع تھی اس کے اسکول میں۔''

اس نے جیب سے والٹ نکالا، ہزار ہزار کے پانچ کرارے نوٹ والٹ سے نکال کر امی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''حجاب کو دے دیجیے گا اسکول والوں کو کم از کم مٹھائی تو کھلا دے۔''

''کھلا دے گی بیٹا اس کی کیا ضرورت ہے؟'' امی اس کے ہاتھ سے پیسے لینے میں متردد ہوئیں۔

''یہ میری خوشی ہے۔''

''میں بتاتی ہوں اسے۔''

''تصویریں بھی لے جائیں۔'' امی پیسے اور تصویریں لے کر بیٹھک سے چلی گئیں۔ رباب تصویروں کو دیکھتے ہی چھٹی۔ امی نے حجاب کو پیسے دیے اور بولیں۔ ''یہ الطاف نے دیے ہیں کہ تم اپنے اسکول والوں کو مٹھائی کھلا دینا۔''

''پانچ ہزار!'' رباب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ''اتنے پیسوں میں تو پوری دعوت ہو جائے گی۔''

''پیسے لینے کی کیا ضرورت ہے امی۔ اسٹاف کو مٹھائی میں خود اپنی جیب سے بھی کھلا سکتی ہوں۔''

''میں نے تم سے پہلے خود یہی بات کہی اس سے مگر اس نے کہا یہ میری خوشی ہے۔''

''رکھ لیں، رکھ لیں۔'' رباب چہکی۔

''ہاں اب تو تمہارا شوہر ہے وہ۔ حق ہے تمہارا اس پر، کچھ دیتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔''

''ابھی تو آپ دیکھیے گا دبئی سے آپ کے لیے کیسے کیسے تحفے آتے ہیں۔'' رباب مسکرائی۔

''امی جائے بنے گی یا.....؟'' حجاب نے پوچھا۔

''ہائے ہائے کیسا خیال ہے؟'' رباب نے شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پوچھ کر بتاتی ہوں۔ تب تک آپ تصویریں دیکھیں۔'' رباب نے دیکھی ہوئی تصویریں حجاب کو تھمائیں۔

حجاب اس خیال سے کہ اسے الطاف کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرنے کو اٹھنا ہوگا جلدی جلدی تصویریں دیکھنے لگی۔ حیران کن بات تھی کہ ایک نہیں کئی تصویروں میں الطاف آؤٹ آف فوکس دکھائی دیتا تھا اور ان تصویروں میں اس کا سراسی طرح غائب تھا جیسے حجاب نے استخارہ کرنے پر خواب میں دیکھا تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

آئینوں کی بستی میں

عطیہ عمر

میں اور نزہت دو بہنیں تھیں اور ایک بھائی عبداللہ ..... جو ہم دونوں سے چھوٹا تھا۔ ابا سرکاری ملازم تھے۔ محدود آمدنی لیکن بہت سی قناعت اور اس قناعت کے صلے میں عطا ہونے والا اطمینان اور سکون! جس کے باعث ہمارے گھر میں کبھی افراتفری نہیں دیکھی گئی۔

اماں بھی ابا کی طرح تھیں اس لیے دونوں میں خوب بنتی تھی۔ میں ان دنوں تازہ تازہ کالج میں آئی تھی کہ پھپھو کی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔

ہماری اماں کنواری لڑکیوں کے ہر تقریب میں جانے کے خلاف تھیں۔ لیکن یہ قریبی رشتے داری کا معاملہ تھا۔ اس لیے ہم سب نے اس شادی میں شرکت کی۔ شہر بانو باجی کی رخصتی کے بعد جب ہم لوگ واپس آرہے تھے تو ایک خاتون، جنہوں نے خوب چمکیلی ساڑی پہن رکھی تھی اور ڈھیر سارا زیور، مجھے بہت پیار کیا۔

پھر ایک شام ان خاتون کو میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ ان کے جانے کے بعد اماں کافی خوش لگ رہی تھیں۔ جانے کون خاتون تھیں کوئی دور کی رشتے دار ہوں گی۔ میں نے تو پہلی بار دیکھا تھا مگر جلد ہی عقدہ کھل گیا اور وجہ جان کر تو میں ہکا بکا رہ گئی۔

''ایں..... ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔'' اماں، ابا باتیں کررہے تھے۔ میں برآمدے میں پڑھ رہی تھی کہ اماں کی آواز آئی۔ ''سنتے ہیں، شہر بانو کی شادی پر ایک خاتون نے ہمارے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔ ان کا بیٹا دبئی میں ملازمت کرتا ہے۔ ہماری ہی ذات کے ہیں ابھی حال ہی ڈیفنس میں ہزار گز کا... بنگلا بنایا ہے۔ انہیں ہماری زہرہ بہت اچھی لگی۔ کہہ رہی تھیں شادی بے شک سال بھر بعد ہو منگنی ابھی کرلیں گے۔ اور اگر آپ لوگ ابھی تیار ہو جائیں تو ہم تو بہت خوش ہوں گے۔ ہم نے کون سا بہو سے نوکری کروانی ہے۔ اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔''

''حمیدہ بیگم! سیانے کہتے ہیں کہ پہلا رشتہ اور پہلا لگا کہ اللہ کی نعمت ہوتا ہے۔ معمولی وجوہ کو بنیاد بنا کر انکار کرنا کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتا ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کی ناشکری سے، غرور، تکبر اور بڑے بولوں سے۔ بے شک ابھی زہرہ کم سن ہے، تعلیم بھی نامکمل ہے لیکن رشتے سے انکار کے لیے یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ دبئی میں ملازمت ہونا ہی کافی نہیں، لڑکے کی تعلیم، عادات، مذہبی رجحان وغیرہ کی معلومات لیں گے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو دبئی سے بھی تحقیق کروائیں گے۔ آخر بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے لیکن سب سے پہلے تم اور میں استخارہ شروع کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کرو، زہرہ سے بھی کہو.....''

زرینہ بھابی، ابا کے رشتے کے بھائی کی بیٹی تھیں۔ عمر میں ابا سے دس، بارہ سال چھوٹی تھیں۔ ان کی سسرال ہمارے گھر کے قریب تھی تو اکثر آتی رہتیں۔ اس روز بھی ہمارے گھر میں موجود تھیں کہ زبیدہ خالہ دبئی والے بیٹے کی اماں ہمارے گھر آئیں۔ وہ غالباً اپنے سوال کا جواب لینے آئی تھیں کیونکہ اماں نے کہا تھا ہم استخارہ کرلیں پھر بتائیں گے۔ اس بات کا انہوں نے کچھ برا بھی مانا۔

''حمیدہ بہن، ساری برادری ہمیں جانتی ہے اور میرا ماجد تو ایسا گبرو جوان ہے کہ جس جگہ کھڑا ہو وہ جگہ بارعب لگتی ہے۔ پھر ہزاروں روپے تو اس کی تنخواہ ہے، ڈیڑھ، دو سال کے اندر ڈیفنس میں بنگلا بن گیا۔ جو کچھ بھی ہے سب آپ کے سامنے ہے۔ پھر آپ نہ جانے کون سی نئی بات کررہی ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں سنا۔'' اماں نے سمجھایا۔

''بہن، ناراض مت ہوں، خدانخواستہ ہم آپ پر کوئی شک، شبہ نہیں کررہے۔''

مگر آج وہ آئیں تو اِدھر، اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے بھی استخارے کے نوافل پڑھ لیے تھے لیکن ذہن میں الجھن سی تھی۔ اطمینان نہ تھا۔ اماں، ابا نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

میں نے چائے لاکر رکھی تو زبیدہ خالہ نے بہت تپاک سے مجھے پیار کیا پھر اماں سے زیادہ زرینہ بھابی باتیں کرتی رہیں، پھر ہمارے گھر سے دونوں اکٹھے باہر نکلیں۔ اس کے بعد زبیدہ خالہ ہمارے گھر نہ آئیں۔ کچھ عرصے بعد زبیدہ خالہ کے بیٹے ماجد کی

شادی زرینہ بھابی کی بھتیجی سے ہوگئی۔ اماں نے مجھے بتایا کہ تمہارے ابا کو ایک تو یہ الجھن تھی کہ ابھی تم چھوٹی ہو، تعلیم نامکمل ہے، اس کے باوجود استخارہ کیا لیکن اطمینان نہ ہوا۔ ماجد کے بارے میں معلوم ہوا کہ میٹرک پاس ہے..... اور ٹرک اور ٹریلر کا ڈرائیور ہے۔ ہمارا ارادہ انکار کرنے کا ہی تھا کیونکہ تمہارے ابا کے ایک جاننے والے کا بھائی اسی کمپنی میں ملازمت کررہا ہے جہاں ماجد کام کرتا ہے۔ اسی نے ماجد کی تعلیم کے بارے میں بتایا جبکہ اس کی اماں نے بی اے تک تعلیم بتائی تھی۔ تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ رشتے طے کرتے وقت ہر بات صاف اور سیدھی بتانے سے اعتبار قائم رہتا ہے۔ جب ابتدا میں ہی جھوٹ بولا جائے تو اعتبار متزلزل رہتا ہے۔

زرینہ بھابی کافی خوب صورت تھیں۔ ان کی بیٹی وردہ بھی ان کے جیسی بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ مجھ سے تین، چار سال چھوٹی نزہت تھی۔ اور وردہ تقریباً اس کی ہم عمر ہوگی لیکن قد کاٹھ میں اس سے چند سال بڑی لگتی تھی۔

ماجد سے میرا رشتہ نہ ہوسکا مگر اماں، ابا بہت مطمئن تھے۔ زرینہ بھابی یا زبیدہ خالہ سے کسی قسم کا گلہ یا شکایت نہ تھی۔ بقول ابا کے جہاں اللہ کا حکم ہوگا، وہیں ہوگا۔ بی اے کرنے کے بعد میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔ نزہت اب کالج میں تھی اور عبداللہ اسکول میں۔ ہم دونوں بہنیں تو گھر میں ہی پڑھ لیتیں لیکن عبداللہ تعلیمی میدان میں کچھ کمزور تھا۔ اس کے کلاس ٹیچر کے مشورے سے اپنا نے اسے ٹیوشن کے لیے بھیجنا شروع کردیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ تو نہ لے سکی گھر میں ہی کچھ بچوں کو پڑھانا شروع کردیا۔ انہی دنوں دور پرے کے اماں کے بھائی، بھابی ہمارے گھر آنے لگے۔ عارف ان کے بیٹے تھے۔ دبلے، پتلے، قدرے سانولے اور درمیانے قد کے مالک عارف ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے۔ تعلیم یافتہ تھے لیکن ظاہر ہے عمر اور تجربے کی مناسبت سے فی الحال کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت اپنے چھوٹے سے آبائی مکان میں اپنے والدین اور دو بڑے شادی شدہ بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔

عارف کے والدین اور بہنوں، بھائیوں نے مجھے اور میرے والدین نے عارف کو پسند کیا اور سادگی سے شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ عین نکاح سے کچھ دیر قبل اطلاع آئی کہ عبداللہ تھانے میں ہے۔ بات تو پریشانی کی تھی مگر ابا نے نکاح ملتوی نہیں کیا۔ نکاح، رخصتی سے ایک روز پہلے مسجد میں ہورہا تھا۔ اس لیے ابا نے اپنی پریشانی اپنے تک رکھی اور نکاح کے بعد چچا اور ماموں وغیرہ کے ساتھ تھانے گئے۔ معلوم ہوا کہ ٹیوشن سینٹر میں عبداللہ کی دوستی چند لڑکوں سے ہوئی۔ جو چھوٹی موٹی چوریوں میں ملوث تھے۔ تین روز پہلے ان لڑکوں نے عبداللہ کو ساتھ ملا کر ایک بڑی چوری کی کوشش کی۔ عبداللہ پہلی بار ان کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ ایک لڑکے کے پڑوسی دوسرے شہر گئے تھے۔ ان لڑکوں نے اس گھر سے زیور وغیرہ لوٹنے کا پروگرام بنایا۔ ابھی ان لوگوں نے زیور، نقدی وغیرہ اکٹھی ہی کی تھی کہ مالک مکان کا بیٹا واپس آگیا۔ افراتفری میں یہ لڑکے وہاں سے بھاگ نکلے اور چوری کا مال وہیں چھوڑ گئے۔ مگر بھاگتے ہوئے ایک لڑکا نظر میں آگیا۔ تھانے میں رپورٹ درج ہوئی تو تفتیش کے دوران عبداللہ کا نام بھی سامنے آگیا۔

چونکہ نقصان نہیں ہوا تھا اور پھر مالک مکان ان لڑکوں کا پڑوسی تھا۔ اس لیے ان لڑکوں کے والدین کی منت سماجت سے پیچ گیا اور اس نے معاف کردیا۔ حوالات سے یہ سب چھوٹ کر گھروں کو آگئے مگر زرینہ بھابی اور ان کے جیسے چند اور عزیز رشتے

داروں نے اس معاملے کو خوب اچھالا۔ رخصتی کی تقریب میں زرینہ بھابی، اماں سے بظاہر رازداری سے پوچھ رہی تھیں مگر انداز ایسا تھا کہ جو بھی اردگرد موجود ہو، متجسس ضرور ہو۔

''چچی جان! زہرہ کی سسرال کو علم ہوگیا کہ... عبداللہ رات کو حوالات میں تھا تو کیا ہوگا؟

''انہیں معلوم ہے......''

''آئے، ہائے ایک انڈا وہ بھی گندا......کیسی بدنامی ہو رہی ہے۔ چلو ایک بہن کی تو شادی ہوگئی مگر دوسری ابھی باقی ہے۔ بھائیوں کے کرتوت کی سزا بہنوں کو جھیلنا پڑ جاتی ہے۔''

''اللہ سے دعا کرسکتی ہوں کہ وہ سب کا بھلا کرے اور میرے بچوں کا بھی......اللہ سب کو ہدایت دے۔'' اماں نے اپنی طرف سے بات ختم کی تھی مگر زرینہ بھابی اور کچھ خواتین کو ایک چٹخارے دار موضوع مل گیا تھا۔

عبداللہ لاابالی اور شرارتی تو تھا لیکن اللہ کا شکر ہے بے حس نہیں تھا۔ حوالات کی وہ رات، اسے سرتاپا بدل گئی۔ جب ایس ایچ او نے کہا۔

''لڑکے! اپنے ابا کی طرف دیکھ، ان کی سفید ڈاڑھی، نورانی چہرہ دیکھ کر ہمارے دل میں ان کا احترام پیدا ہو رہا ہے اور تیری وجہ سے انہیں تھانے آنا پڑا ہے۔ تو، تو کوئی ایسا کام کرتا کہ لوگ کہتے ایسے نیک باپ کے بیٹے کو ایسا ہی بڑا کام کرنا چاہیے تھا۔ اب لوگ ان کا بھی مذاق اڑائیں گے۔'' عبداللہ نے رو رو کر ابا سے معافی مانگی، ان کے پیر پکڑ لیے، جن کے گھر واردات کر رہے تھے ان سے بھی معافی مانگی اور پھر ایک ذمّے دار، سمجھدار عبداللہ سامنے آیا۔ میٹرک میں پورے بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن تھی۔

اماں ابا اللہ رحمٰن و رحیم کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے۔ زرینہ بھابی مبارک باد دینے تو آئیں لیکن اس روز بھی عبداللہ کے حوالات جانے کا ذکر نہ بھولیں۔

نزہت ابھی ایف اے میں تھی کہ ابا کو دل کا دورہ پڑا۔ عبداللہ نے اسی سال فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا تھا۔ اماں، ابا نے نزہت کی جلدی شادی کا فیصلہ کرلیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو اپنی ذمّے داریوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ عبداللہ کی تعلیم مکمل ہونے میں ابھی کافی وقت باقی تھا لیکن بیٹی کو جلد از جلد رخصت کردینا چاہتے تھے۔

خالہ کی دیورانی اپنے بھائی کے لیے لڑکی دیکھ رہی تھیں۔ خوب پیسے والے، کاروباری لوگ تھے۔ خالہ کی دیورانی نے نزہت کو دیکھ رکھا تھا۔ پھر اماں کے رکھ رکھاؤ سے بھی متاثر تھیں۔ انہوں نے خالہ سے کہا کہ میں اپنی امی وغیرہ کے ساتھ تمہاری بھانجی کے لیے آؤں گی۔ زرینہ بھابی اسی خاندان کی فرد تھیں۔ انہیں معلوم ہوا تو کسی بہانے اپنی وردہ کو لے کر خالہ کی دیورانی کے گھر جا پہنچیں۔ خالہ نے بتایا کہ اس روز وہاں کوئی تقریب تھی۔ ان کی دیورانی کے میکے والے مدعو تھے۔ وردہ کا رنگ روپ، سراپا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر زرینہ بھابی کی باتیں۔ ''میری وردہ کے تو اتنے رشتے آرہے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کس کو ہاں کروں، کس کو ناں......ویسے بھی ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ بس اللہ نے شہزادیوں جیسی صورت دی ہے تو اللہ نصیب بھی ویسا ہی کرے۔''

سجاد اچھی شکل صورت اور دراز قد کا حامل جوان تھا پھر اس کا خوب چلتا ہوا کاروبار تھا۔ اس نے وردہ کو دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ نزہت دبلی، پتلی، عام سی صورت شکل اور بوٹے سے قد کی لڑکی تھی جبکہ وردہ گلابی دمکتی رنگت، دراز قد، خوب صورت نقوش کی مالک تھی۔ تو فیصلہ اسی کے حق میں ہونا تھا۔

خالہ کو کافی افسوس ہوا۔ اکثر کہتیں۔ ''زرینہ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ نزہت کے لیے ارادہ رکھتے ہیں

پھر بھی اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیا۔'' مگر اماں کہتیں۔

''مہرالنساء کیسی فضول باتیں کرتی ہو؟ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، جو تم دل میں رکھ کر بیٹھی ہو۔ ارادہ تھا نا، رشتہ طے تو نہیں ہوگیا تھا، جو اللہ کو منظور ہوگا، وہی ہوگا اللہ سب کا بھلا کرے۔''

اور پھر ابا کے ایک دوست نے اپنے بیٹے کا رشتہ دیا۔ ایوب ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹی دو بہنیں تھیں جو غیر شادی شدہ تھیں اور ایک بڑی شادی شدہ بہن بھی تھی۔ بہت جلد اور انتہائی سادگی سے نزہت کی شادی ہوگئی۔ نزہت کی رخصتی کے موقع پر زرینہ بھابی کسی رشتے دار خاتون سے کہہ رہی تھیں۔

''مجتبٰی چچا اور حمیدہ چچی کو اللہ نے دو بیٹیاں دیں اور ایک بیٹا، وہ بھی چوری چکاری کی لت میں پڑ گیا تھا۔ پھر آمدنی بھی محدود، لڑکیاں بھی درمیانی صورت شکل کی ہیں تو ایسے ہی رشتے ملنا ہیں۔ زہرہ کا میاں دیکھا ہے، چھوٹا قد، کالا سا، پھر اس کی سسرال، توبہ جیسے چڑیا گھر۔ سب کے لیے ایک ایک پنجرہ......اور اب یہ نزہت بھی جنجال پورے میں جا رہی ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے، چھوٹی بہنوں کی شادیاں اسی کی ذمّے داری ہوگی۔ ہاں، شکل کا یہ داماد بہتر ہے۔''

مجھے کافی افسوس ہوا۔ وقت گزرتا گیا۔ اللہ نے میری گود میں پہلے ہاشم بھیجا پھر صفوان اور سب سے چھوٹی امینہ۔ نزہت کو بھی اللہ تعالیٰ نے معیز، امان اور مومنہ سے نوازا۔

عارف کافی محنتی اور ایماندار انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خوب نوازا۔ محکمانہ امتحان پاس کرتے گئے اور ترقی ہوتی گئی۔ ہاشم بھی اپنے ابا پر گیا۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی، ہر امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری وظیفہ پر لندن چلا گیا۔ تعلیم مکمل ہوئی تو اسے وہیں ملازمت مل گئی۔ عارف کی اور میری خواہش تھی کہ وہ اپنے وطن واپس آجائے مگر اس کا کہنا تھا کہ چند سالوں تک کی ملازمت مزید اور اچھے تجربے کا باعث ہوگی۔ اس کے بعد اس کا ارادہ بھی مستقل طور پر پاکستان میں ہی رہائش اختیار کرنے کا تھا۔ تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی شادی کردوں۔ عارف کے بھائیوں میں سے صرف ایک بھائی کی بیٹی تھی اور اس کی شادی بھی ہوچکی تھی۔ اس لیے ہاشم کی ددھیال کی بھی مشترکہ پسند مومنہ ہی تھی۔

شروع کے کئی سال مشترکہ خاندانی نظام میں رہنے کے بعد اب سب بھائیوں نے اپنے الگ الگ گھر بنا لیے تھے کیونکہ سب کے خاندان بڑے ہو رہے تھے لیکن پھر بھی سب کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا، میل ملاپ وہی پرانے خلوص اور رواداری کا مظہر تھا۔ میرے ساس، سسر کا انتقال ہوچکا تھا اور وہ ہمارا لاابالی اور کھلنڈرا سا عبداللہ آج ملک کا ایک جانا پہچانا سرجن تھا۔ اللہ نے اماں کو اکلوتے بیٹے کی دنیاوی ... خوشیاں بھی دکھائیں۔ اپنی بیماری کے باوجود ابا نے اپنی زندگی اچھی طرح گزاری۔ عبداللہ اسپیشلائزیشن کے لیے امریکا جا رہا تھا تو اس نے آبائی گھر بیچ کر ہم بہنوں کو ہمارا حصہ دینے کے بعد اماں، ابا کو حج کے لیے بھیج دیا۔ ہمارے گھر کے قریب ایک چھوٹا سا گھر اماں، ابا کے لیے خریدا جس میں وہ دونوں چند سال ہی اکٹھے رہ سکے۔ عبداللہ کی شادی کی تاریخ مقرر ہوچکی تھی کہ اماں وضو کرنے کے بعد جا نماز بچھا رہی تھیں کہ گر گئیں۔ اسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں۔ عبداللہ، اپنی دلہن کے ساتھ ساتھ ابا کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ سال، ڈیڑھ سال ہی بہو، بیٹے کے ساتھ رہ سکے اور پھر ابا کا بھی انتقال ہوگیا۔

آج کل عبداللہ پاکستان میں ہے۔ اس کے ہاتھ میں اللہ نے بہت شفا دی ہے۔ اس کے تینوں

بیٹے بھی بہت لائق، محنتی اور سلجھے ہوئے بچے ہیں اور ماشاء اللہ تینوں ہی تعلیمی میدان میں نمایاں ہیں۔ ابیہ ہماری بھابی محبت کرنے والی، سلیقہ شعار خاتون ہے جس نے ہمارا میکا آباد رکھا ہے۔

نزہت نے کم عمری کے باوجود ازدواجی زندگی کے اتار چڑھاؤ بہت طریقے سے سنبھالے۔ شادی کے بعد اس کی ساس جو اچھی خاصی صحت مند تھیں ایک دم فالج کا شکار ہو گئیں۔ نزہت کی اپنی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہ تھی۔ ماں بننے کا پہلا تجربہ تھا مگر اس نے حتی المقدور اپنی ذمے داری نبھائی۔ دونوں چھوٹی نندیں، اس کا ساتھ دیتیں مگر ایک کالج اور دوسری اسکول میں پڑھتی تھی۔ دن بھر گھر اور ساس کی دیکھ بھال اکیلی نزہت کی ذمے داری ہوتی۔ تب ہماری اماں حیات تھیں اور صحت مند بھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز نزہت کے ہاں جاتیں، کھانا بنا دیتیں، اس کی ساس کو نہلانے دھلانے میں اس کی مدد کرتیں پھر ایوب کے ابا نے ایک مستقل ملازمہ رکھ لی۔ وہ بہو کی حالت دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی ملازمت کر رہے تھے اس لیے پورے گھر کا مالی بوجھ اکیلے ایوب پر نہ تھا۔

رفتہ رفتہ دونوں نندوں کی شادیاں ہو گئیں۔ نزہت نے نہ صرف بھابی بلکہ بڑی بہن اور ماں کا کردار ادا کیا۔ اس بات کا اظہار بارہا اس کی بڑی نند ثمینہ نے کیا۔ اپنی اماں کی دیکھ بھال میں وہ بھی نزہت کا ہاتھ بٹاتی تھی لیکن ایک تو اس کی سسرال ذرا فاصلے پر تھی پھر اس کی ساس کو ثمینہ کا روز روز میکے جانا پسند بھی نہیں تھا۔

نزہت کی شادی کا دسواں سال تھا، اس کی ساس کا چند ماہ پہلے انتقال ہوا تھا اور وہ اب تین بچوں کی ماں تھی کہ اچانک ایوب بھائی پر غبن کا الزام لگا اور ان کی جاب ختم ہو گئی۔ حالانکہ انکوائری میں یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ایوب بھائی کو پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اصل مجرم کو بچایا جا سکے۔ لیکن ایوب جیسے ایماندار شخص کے لیے جھوٹے الزام میں نام آنا ہی بہت زیادہ بے عزتی اور شرمندگی کا باعث تھا۔ وہ بہت زیادہ بیمار ہو گئے اور کسی حد تک نفسیاتی مسائل کا بھی شکار ہو گئے۔

یہ حالات نزہت اور اس کے سسر کے لیے بہت زیادہ پریشانی کا باعث تھے۔ اب تو سسر بھی ریٹائرڈ تھے۔ جمع پونجی روزمرہ اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ نزہت نے اجرت پر سلائی شروع کر دی لیکن ظاہر ہے اس سے اخراجات پورے ہونا تقریباً ناممکن تھے۔ نزہت کا زیور بھی ایک ایک کر کے بک گیا۔ اس روز ایوب بھائی کی طبیعت بہت خراب تھی اور وہ بہت مایوسی کی باتیں کر رہے تھے۔

''ہمیشہ محنت اور ایمانداری سے کام کیا لیکن صلہ کیا ملا؟ ایک جھوٹا الزام، جگ ہنسائی اور آج میرے بیوی بچے ڈھنگ کے روٹی کپڑے کو ترس رہے ہیں؟ میں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟''

''تو یہ کریں ایوب، سوچیں، اللہ نے ہم پر کتنی کرم نوازیاں کی ہیں۔ ہم میاں، بیوی میں پیار، محبت، اعتماد کا یقین دیا۔ آپ کے اور میرے والدین، بہن، بھائیوں، بچوں کی محبتیں دیں اور سب سے بڑھ کر ہمیں مسلمان بنایا۔ ایمان کی دولت دی، کیوں ناشکری کرتے ہیں؟''

برآمدے میں بیٹھے نزہت کے سسر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دل سے دعا نکلی۔ ''یا الٰہی! میں اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے تجھ سے ہی مدد مانگتا ہوں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو ہی ہمارا مددگار ہے، ہم تجھ پر بھروسا کرتے ہیں، تجھے ہی پکارتے ہیں۔''

اور پھر انہی پریشانیوں کے دنوں میں ایوب کا پرانا دوست برہان ان سے ملنے آیا۔ وہ کھاتا پیتا کاروباری شخص تھا۔ ایوب کی بے روزگاری اور غبن کے الزام کے بارے میں چند دن پہلے ہی اسے معلوم ہوا تھا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ واپس آیا تو یہ اطلاع ملی۔ پہلے تو اس نے ایوب سے شکوہ کیا۔ ''سال، ڈیڑھ سال سے تم بے روزگار ہو، بیمار ہو۔ کئی بار تم سے ملاقات ہوئی مگر تم نے ذکر تک نہ کیا...... کیا غیر سمجھتے ہو یا قابلِ بھروسا نہیں جانتے؟ یہ تو ابھی اتفاق سے معلوم ہو گیا اور ایوب نے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں، میں نے اپنی پریشانی سے دوسروں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔'' برہان کہنے لگا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری بیماری، پریشانی ہم سے چھپ سکتی ہے اور پھر دوست کا فائدہ کیا اگر مشکل میں کام نہ آئے۔ فی الحال تو میرا ایک کام ہے۔ تم فٹافٹ اپنی بیماری بھگاؤ کیونکہ مجھے ایک ایماندار اور محنتی بندہ چاہیے، فوراً۔ کئی بار تمہارا خیال آیا۔ فیضان (برہان کا بھائی) نے بھی تمہارا ذکر کیا تھا لیکن ہم دونوں یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ تمہاری اپنی جاب ہے۔ نہ جانے یہ کام چلے نہ چلے کیونکہ کاروبار میں رسک تو لینا پڑتا ہے اور تم اپنی جاب سے بھی جاؤ لیکن اب تو تم فارغ ہو، کیا خیال ہے میرے ساتھ کام کرو گے؟ میں اور فیضان تو اپنے کاروبار میں بہت مصروف ہیں لیکن پروجیکٹ ہماری نظر میں ہے۔ امید تو ہے کہ انشاء اللہ فائدہ مند ہوگا لیکن بس یہی سوچ کر خاموش تھے کہ ہمارے پاس وقت نہیں اور کسی غیر شخص پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ اب جب تم یہ کام دیکھو گے تو ہمیں کوئی فکر نہیں ہوگی۔'' برہان نے بغیر احسان جتائے، اس طرح ان کی مدد کی پیشکش کی کہ ابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے بے شک وہ رحمٰن و کریم اس طرح اپنے بندے کی مدد کرتا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ایوب کہنے لگا۔

''مگر یار، مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں، پھر میرے پاس ایک دھیلا نہیں تو بغیر پیسے کے کس طرح......''

برہان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تجربہ میرے پاس ہے، ہر بات میں مشورہ دوں گا، نگرانی بھی کروں گا اور پیسہ تو ہم ویسے بھی لگانے کو تیار تھے۔ مسئلہ تو صرف ایک نگران کا تھا جو تمہاری صورت میں حل ہو رہا ہے۔''

پھر اللہ نے کرم فرمایا۔ ایوب بھائی کی بیماری کی اصل وجہ پریشانی تھی۔ جب اللہ نے پریشانی دور فرمائی تو صحت بھی مل گئی۔ ایوب بھائی نے محنت کی، اللہ نے مدد فرمائی اور کام اچھی طرح چلنے لگا۔ ایوب بھائی کے ابا نے مشورہ دیا کہ اپنا گھر بیچ کر یہ سرمایہ کاروبار میں لگا دو۔ اگرچہ پہلے بھی برہان بھائی انہیں اچھا خاصا منافع دے رہے تھے یہ کہہ کر کہ سرمایہ ہمارا اور محنت تمہاری۔

یوں رفتہ رفتہ مشکلات کم ہوتی گئیں۔ اور اللہ نے آسانیاں زیادہ کر دیں۔ اللہ نے ایوب بھائی کے کاروبار میں اتنی برکت دی کہ بچوں کی تعلیم، گھر کی تعمیر، سب کام ہوتے گئے۔ آج زرینہ بھابی نے جب میرے سامنے رشک اور کسی قدر حسرت سے وردہ اور نزہت کا مقابلہ کیا تو مجھے گزرا وقت یاد آنے لگا۔ میں، نزہت، عبداللہ، گئے دنوں میں انہیں کمتر لگتے تھے۔ ہمارے منہ پر بھی ہمارا مذاق اڑانے سے باز نہ آتی تھیں۔ آج ہمیں رشک سے دیکھ رہی ہیں اور خود کو کمتر اور بے چارہ سمجھ رہی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے انہیں سمجھاؤں کہ دوسروں سے حسد کرنے والا خود کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہتا مگر میں سوچ رہی ہوں کہ انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ بعض لوگوں کو سمجھانا واقعی مشکل ہوتا ہے۔ ہے ناں؟

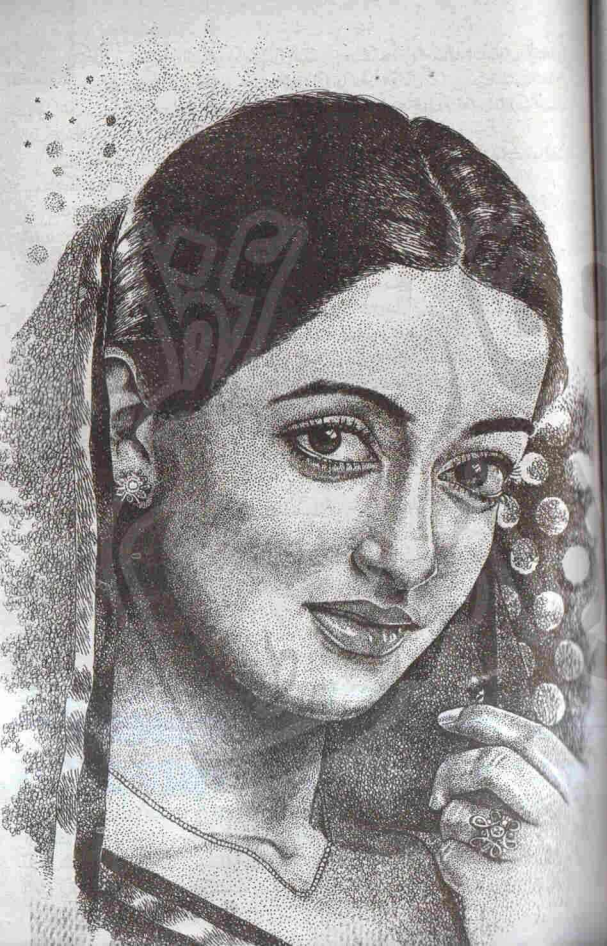

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلند و بانگ دعوے کیے جاتے ہیں -بدقسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آجاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے-غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مرد و زن کے اس تعلق میں کون کیا کہتا ہے اور کیا پاتا ہے

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

سکھاں نے اپنی بیٹی کو ایک نظر دیکھ کر پہچانا بھی نہ تھا...... اسے لگا کہ وہ کوئی بھوت تھا، تار تار لباس، نُچا ہوا بدن، چہرے پر خراشیں، لہولہان...... اسے یہی اندازہ ہوا کہ وہ زندہ نہ تھی، مگر اس کے نحیف سے وجود سے ایک کراہ برآمد ہوئی تو اس سے لپٹ کر سکھاں اور بھی دہاڑیں مارنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے اور اس کی حالت دیکھ کر سکھاں سے ہمدردی کرنے لگے۔

کوئی بھاگ کر کسی کمپاؤڈر کو بلا لایا، اس نے اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم پٹی کی اور بتایا کہ اسے نزدیکی بڑے قصبے کے اسپتال میں لے جانا پڑے گا۔ مانگ تانگ کر پیسہ جمع کیا گیا اور اسے لے کر وہ اسپتال روانہ ہوئے۔

منت سماجت کر کے، اللہ اور رسول کے واسطے دیئے گئے، ڈاکٹر بھی اس کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال دیکھ رہا تھا، کچھ لوگوں کے مجبور کرنے پر بغیر رپورٹ درج کروائے اس کا علاج شروع کر دیا گیا۔ بچہ تو ضائع ہو گیا تھا، جسم پر تشدد کے آثار بہت زیادہ تھے، کئی دن تک اسے غنودگی میں ہی رکھا گیا تھا کیونکہ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بہت متاثر ہوئی تھی وہ......

اس کے سپنوں کے محل ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گئے تھے، اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کُتوں کی طرح اسے بھنبھوڑ رہے تھے، اس کی تذلیل کر رہے تھے، اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے...... ان سب سے عاری ہو گئی تھی وہ...... اسے فقط وہ الفاظ ذہن کے ایوانوں میں گونج گونج کر تحیر میں مبتلا کر رہے تھے جو اس کے دیوتا نما محبوب نے کہے تھے۔

اس نے کہا تھا...... کہ وہ جانے کس کا بچہ ہے اور وہ اسے اس کے سر مڑھ رہی تھی، اس نے کہا تھا کہ جسے چاہو اس بچے کا باپ بنا لو...... کیونکہ وہ بچہ اس کا ہو ہی نہیں سکتا...... اس نے اسے بدکردار کہا تھا، اس پر الزام لگایا تھا کہ اس کے جانے کس کس سے تعلقات ہیں۔ وہ تو اندر تک ٹوٹ گئی تھی، بکھر گئی تھی، اس نے ہر کسی کی نصیحتوں کو فراموش کر دیا تھا، ماں کی، نگی کی...... منشی کی...... وہ جس راہ پر چل نکلی تھی اس پر اسے پھول ہی پھول نظر آتے تھے اور یہ سب لوگ کہتے تھے کہ وہ کانٹوں کی راہ پر چل رہی ہے۔

واہ ری قسمت...... کیا کھیل کھیلا تو نے مجھ محبت کی ماری کے ساتھ! وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

جانے کیوں نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد قائم علی کے ضمیر پر بوجھ سا پڑ گیا تھا، تنہائی میں وہ سوچتا تو اسے معراج کا قصور بھی اتنا نظر نہ آتا، جتنی اسے سزا قائم علی نے دے دی تھی۔

اس کے دل میں ابھی تک معراج کے لیے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا، اسے اس کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کا انداز بار بار یاد آتا...... ”کاش وہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ نہ کرتی! میں اسے منا کر لے آتا، میں اس سے معافی مانگ لیتا۔ مگر وقت کا بہاؤ ہمیشہ آگے کی طرف رہتا ہے، ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اس بہتے دھارے کا رخ موڑ کر واپس ماضی میں چلے جائیں۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اس وقت کو واپس لے آتا جس دن میں شہر گیا تھا، نہ میں شہر جاتا، نہ معراج کسی اور جگہ...... اور ہماری بیٹیاں ہمارے پاس ہی ہوتیں۔“

ماہ تاج کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہ ملا تھا نہ کوئی اور اتا پتا، اور اس کی موت جیسی بھی بھیانک سہی مگر اس پر اب اسے صبر آ گیا تھا کیونکہ معلوم تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ نہیں صبر آتا تھا تو ماہ پارہ اور حسن آرا کی گمشدگی پر نہیں آتا تھا۔ اگر اسے اس کا دکھ تھا تو کیا معراج کو نہیں......

”میں نے اس کے ساتھ کیسا برا کیا!“ وہ سوچتا اور مزید پریشانی میں مبتلا ہوتا جاتا۔ ”ہم اکٹھے اس دکھ کو بھوگتے تو اس کی شدت کتنی کم ہوتی...... میں نے اپنے لیے مشکل راہ کا انتخاب کیا اور اسے بھی آزمائش میں ڈال دیا۔ وہ تو اس آزمائش میں پوری اتری کہ کتنے برس سے اس نے آہ تک نہیں بھری اور میں...... میں کیسا کمزور نکلا کہ اپنے نفس کے ہاتھوں کس دلدل میں اتر گیا...... اب میرے لیے جانے کون سی آزمائش منتظر ہے، بیٹا ہو گا یا بیٹی! میری بیٹی اس کو ٹھے

کی زینت بنے گی؟ بیٹا ہوا تو وہ مجھے مل جائے گا...... مگر میں اس کو کیسے پالوں گا؟ کیا معراج لوٹ آنے کو تیار ہو جائے گی اور اس بیٹے کو پالنے کی ذمے داری قبول کر لے گی؟ کیا وہ میری دوسری شادی کا سن کر بھی لوٹ آئے گی؟ اب تو زرتاج بھی سمجھدار ہے، وہ اس سارے قصے کو جان کر کس ردِ عمل کا اظہار کرے گی؟ اسے ماں سے جدا کر کے میں نے اس پر اور اس کی ماں، دونوں پر ظلم کیا...... مجھے معاف کر دے میرے مولا!“ وہ چھکوں پھکوں رونے لگتا۔ ”مجھ پر میری استطاعت سے بڑھ کر آزمائش نہ ڈالنا! معراج کے دل میں میرے لیے نرمی پیدا کر دے، میرا اجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے...... اور...... میرے مولا...... الماس سے مجھے بیٹی نہ دینا...... میں اپنی بیٹیوں کی پیدائش پر کبھی نالاں نہ تھا، تو جانتا ہے! میں تو اس بات پر خوش تھا کہ میرے نبی ﷺ کو بھی تو نے بیٹیاں دیں اور مجھ ناچیز کو، اس حقیر امتی کو بھی اس قابل جانا کہ میں ان بیٹیوں کی پرورش کر کے، ان کے فرض سے فارغ ہو کر، روزِ قیامت اپنے نبی ﷺ کی قربت پاتا، مگر میرے نصیب ایسے نہ تھے۔ شاید میرے لیے یہ آزمائش تھی اور میں اس میں صبر کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دے اللہ! اور میری بیٹیاں اگر زندہ ہیں تو انہیں کسی نیک کی پناہ میں رکھنا، ہماری آزمائش کو طویل نہ کرنا اور ہمیں ان سے جلد ملا دینا!“ رو رو کر اس کی ڈاڑھی بھیگ گئی تھی، اس نے اٹھ کر وضو کیا اور مصلے پر کھڑا ہو گیا، اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

”زرتاج باجی کس چیز کا امتحان دینے گئی ہیں شہر ماسی جی؟“ اس نے پوچھا، نقاہت اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”اس کے بارھویں جماعت کے دو پرچے رہ گئے تھے، پچھلی بار اس کی تیاری نہ تھی اور پھر باہر سے اس کے مامے بھی آ رہے ہیں بچوں کی چھٹیوں میں، اس لیے وہ کچھ دن اور رہے گی وہاں!“ معراج بی بی نے وضاحت سے بتایا۔ ”تو بتا اب کیسا محسوس کر رہی ہے؟“

”بہتر ہوں ماسی......“ اس نے کراہ جیسی آواز نکالی۔

”اس کم بخت نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر مارنے والے سے بچانے والی ذات بڑی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بچے کی حفاظت کی ہے جو تمہاری کوکھ میں پل رہا ہے......“

”مگر میرے پورے جسم میں بہت درد ہے...... وہ آیا نہیں، میرا پوچھنے؟“ اس نے پوچھا۔

”پڑا ہو گا کہیں نشہ کر کے......“ معراج نے غصے سے کہا۔

”میں کب تک اٹھ کر اپنے گھر جانے کے قابل ہو جاؤں گی؟“

”کلثوم...... تیرے گھر کو ہمسائے تالا لگا کر چابی مجھے دے گئے ہیں اور اسے انہوں نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے!“

”مگر وہ کہاں جائے گا، کہاں سوئے گا، کہاں سے روٹی کھائے گا؟“ اس نے پریشانی سے پوچھا۔

”وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ تو اس کے لیے پریشان ہو......“ معراج نے کہا۔ ”میں نے تیری بھلائی کے لیے کچھ سوچا ہے...... تو ٹھیک ہو جا پھر بتاؤں گی اور اب میں تجھے اس وقت تک تیرے گھر نہیں جانے دوں گی، جب تک اسے اپنی زیادتی کا احساس نہ ہو اور وہ ناک رگڑ کر تجھ سے معافی نہ مانگنے آئے......“

”ایسا دن تو کبھی نہیں آنے والا ماسی، مجھے واپس جانا ہی ہو گا، وہ جیسا بھی ہے...... میرا شوہر تو ہے اور میں اس کا خیال نہ رکھوں گی تو اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گی؟“

”لعنت ہے ایسے شوہر پر...... جانے تیرے ماں باپ کے کس گناہ کی سزا کے طور پر یہ تیرے پلّے پڑ گیا ہے، تیری ماں سے میرا بڑا پیار تھا اور اس ناتے مجھے تکلیف ہوتی ہے جب میں تجھے تکلیف میں دیکھتی ہوں، تجھے دیکھ کر مجھے میری ماہ تاج یاد آ جاتی ہے......“ معراج کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کہاں ہے ماہ تاج اب؟'' کلثوم نے پوچھا۔

''وہ مرگئی تھی......''

''کیسے؟'' حیرت سے اس نے پوچھا۔

''اسے کسی نے قتل کردیا تھا......'' معراج نے سنبھل کر کہا۔ ''سات برس کی تھی وہ، اب ہوتی تو تیرے جتنی ہوتی!''

''اس بے چاری سے کسی کی کیا دشمنی تھی جو اسے قتل کردیا؟'' حیرت سے کلثوم نے پوچھا۔

''لڑکی کا لڑکی ہونا...... اس کا کمزور ہونا ہی مردوں کو اس کا دشمن بنادیتا ہے......'' معراج بی بی نے کہا، جسے کلثوم کچھ نہ سمجھی تھی۔

''اوہو...... بڑا دکھ ہوا سن کر...... آپ مجھے اپنی بیٹی ہی سمجھیں ماسی'' اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''میرا ابھی اس دنیا میں ہے کون!''

''تو میری بیٹی ہی تو ہے، اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب تو یہاں سے اس وقت تک نہیں جاسکتی جب تک میں نہ کہوں''۔

''مگر میں یہاں کیا کروں گی، کیسے رہ سکتی ہوں اور کتنا عرصہ......''

''میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے کلثوم......'' معراج نے کہا۔ ''اب جلد ہی زرتاج کی شادی ہوجائے گی، اسے میں نے کچھ کام سکھادیا ہے اور کچھ وہ سیکھ رہی ہے۔ اپنے طور پر اس نے کوئی کیس نہیں کیا مگر اس کی مدد میرے کام کو آسان کردیتی ہے۔ مجھے تو اعتماد ہے کہ وہ اپنے طور پر کیس کرسکتی ہے مگر وہ ذرا گھبراتی ہے......''

''چلیں جب ان کے سر پر پڑے گی تو وہ خود ہی شروع کردیں گی......'' کلثوم نے کہا۔

''کلثوم! تو کتنی جماعتیں پڑھی ہے بیٹا؟''

''ماسی میں تو صرف پانچویں تک ہی پڑھ سکی ہوں......'' اس کے انداز میں شرمندگی تھی۔ ''لالے کو میرا گھر سے باہر جانا پسند نہ تھا!''

''تیرا باہر جانا اسے کیوں کھٹکتا تھا، خود تو وہ...... باہر منہ مارتا پھرتا تھا اور تیری زندگی کو عذاب بنا گیا اور تیری ماں کو بھی اسی کی حرکتیں لے ڈوبیں۔ وہ غریب تو اپنی زندگی کی بازی ہار گئی اور سزائیں ساری تیرے لیے رہ گئیں!''

''اماں کا شاید وہی وقت تھا جانے کا...... مگر میرے لیے واقعی جانے یہ کیوں قسمت میں لکھا تھا، میں نے کیا گناہ کیا تھا؟'' وہ رونے لگی، معراج نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی اور اس کے آنسو پونچھے۔

''بس میں نے سوچا ہے کہ تجھے یوں بے بسی کی زندگی نہ گزارنے دوں گی، میں تجھے اپنا کام سکھاؤں گی اور شہر سے کتابیں لاؤں گی تاکہ تو کچھ آگے پڑھ بھی سکے، زرتاج تجھے پڑھائے گی اور میں خود بھی!''

''آپ پڑھی لکھی ہیں ماسی؟'' حیرت سے اس نے سوال کیا۔

''ہاں بس...... کچھ پڑھا ہی تھا اچھے وقتوں میں!''

''کتنی جماعتیں پڑھیں آپ نے؟''

''کبھی گنی نہیں......'' معراج نے ہنس کر بات ٹالی۔

''اس کا مطلب ہے کہ بہت سی جماعتیں پڑھی ہیں آپ نے!'' وہ بھی بہت دن کے بعد کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

''تو بھی بہت سا پڑھ سکتی ہے کلثوم...... اور بہت کچھ سیکھ بھی سکتی ہے، سیکھنے کے لیے عمر کی کوئی حد نہیں ہوتی!''

''پر اب تو مجھے گھر جانے دیں ماسی!''

''کیوں تو اپنے بچے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے؟'' معراج نے اسے ڈانٹا۔ ''چپکی پڑی رہ اور اب تو نے اس کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!'' ڈانٹ سن کر کلثوم سہم گئی تھی۔

☆☆☆

''آپا...... دو ایک دن کے لیے اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں کسی کام سے کہیں جانا چاہ رہا تھا، سیما کو ساتھ نہ لے جا سکوں گا!'' شاکر نے سلمٰی سے بات کی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی بہنوں سے مل کر آئے اور ان کی کوئی مالی مدد...... بھی کر آئے گا، اگر سلمٰی کو یہ بتاتا کہ اپنی بہنوں سے ملنے جارہا ہے تو وہ یہ سوچتی کہ اس بچی کو لے کر وہ اپنی بہنوں کے پاس کیوں نہیں گیا۔ بہت سے سوالوں سے بچنے کا یہی طریقہ تھا جو اس نے اختیار کیا تھا۔

''کب تک لوٹ آئیں گے؟'' سلمٰی نے پوچھا تھا۔

''جتنا جلد ہوسکا...... کچھ تو سیما کی وجہ سے اور کچھ اپنے کام کی وجہ سے بہت دن کے لیے جا ہی نہیں سکتا!'' اس نے کہا۔

''میں تو کہتی ہوں جلد ہی...... اب آپ اپنا گھر بسالیں، اگر گاؤں جارہے ہیں تو اپنی شادی کا دن مقرر کرکے ہی لوٹیں، ابھی تو سیما بچی ہے اور اس کے لیے ہر اس عورت کو ماں کے روپ میں قبول کرنا آسان ہوگا، جوں جوں بڑی ہوتی جائے گی توں توں سمجھدار ہوگی اور اسے رشتوں کی سمجھ بوجھ ہوجائے گی۔ اس کے لیے جب سگی اور سوتیلی کا مفہوم سمجھنا آسان ہوجائے گا تو......''

''میں خود بھی ان باتوں کو سمجھتا ہوں آپا اور جلد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔ گاؤں جاؤں گا تو آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی، میرا گاؤں بھی دیکھ لیں گی اور باقی کام تو ہوں گے ہی!'' اس نے مسکرا کر کہا تھا مگر سلمٰی کو اس کے چہرے پر شرم کا لال رنگ پھیلتا نظر آرہا تھا، بھلا مرد بھی شرماتے ہیں، اس نے دل میں سوچا تھا۔

☆☆☆

''ہاں تو پرویز صاحب......'' گلاس ٹرے میں رکھتے ہوئے جاوید نے پوچھا۔ ''کیا کام کرتے ہیں آپ؟''

''ہر کام کرلیتا ہوں جاوید صاحب...... زیادہ خوشی تو مجھے آپ جیسے دوستوں کی خدمت کرکے ہوتی ہے!'' اس کی آواز معتدل تھی کیونکہ پینا اس کا روز کا معمول تھا جبکہ جاوید جیسے لوگ جو کبھی کبھار اور چھپ چھپا کر پیتے ہیں، انہیں دو تین گلاس ہوش و حواس سے بیگانہ کردینے کو کافی ہوتے ہیں۔

سائرہ نے جاوید سے کہا تھا کہ وہ پی۔ کے کے بارے میں جانچ پڑتال کرے اور اس جانچ پڑتال کے عمل میں دو تین ملاقاتوں میں ہی پرویز جان گیا تھا کہ جاوید کس کھیت کی مولی ہے۔ اسے اسی کے مزاج کے مطابق شراب و شباب کے وہ جلوے دکھائے تھے کہ وہ اس کا مرید ہوگیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سائرہ نے اسے کیا ذمے داری تفویض کی تھی اور اسے کس نظر سے پرویز کو جانچنا تھا، مریم...... جسے اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹی کہا تھا، اس کے ساتھ شادی کے لائق وہ تھا کہ نہیں؟ مگر اس نے اپنے شوق اور نشے میں انصاف سے کچھ نہ جانچا، اسے پرویز ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔ خوبرو جوان تھا، کماؤ تھا...... کمائی کا ذریعہ کیا تھا؟ یہ تو وہ پوچھتا جو مریم کا سگا ہوتا۔ وہ مریم کو خوش رکھے گا اور اس سے بے وفائی تو نہیں کرے گا؟ اس کی فکر تو اسے ہوتی جس کا مریم سے کوئی رشتہ ہوتا...... خونی یا اخلاقی۔

اور یوں ایک مریم قربان ہوگئی۔ ایک لالچی آدمی کے گھٹیا جذبات کی نذر کردی گئی، وہ جو اسے زیر کرنا چاہتا تھا، اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے تو شادی سے کوئی غرض نہ تھی، فقط چار دن اس سے تعلق رکھتا اور پھر اسے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتا۔ مگر اسے علم ہوگیا تھا کہ وہ شادی کے بغیر حاصل ہونے والی ''چیز'' نہ تھی۔

سائرہ مطمئن تھیں مریم کے لیے، نہ صرف جاوید نے انہیں سب اچھا کی رپورٹ دی تھی بلکہ مریم بھی اس سے ملاقات کے بعد کسی شک و شبے میں مبتلا نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سائرہ اور جاوید کے مابین تعلقات بالکل ٹھیک تھے، اس وقت تک سائرہ کو علم نہ تھا کہ جاوید کن کن بری عادات میں مبتلا تھا۔ گھر اور باہر کی ذمے داریاں دونوں مل بانٹ کر چلاتے تھے اور زندگی سہل انداز میں گزر رہی تھی۔

سادگی سے شادی ہونا تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تیاریاں تو کی جانی تھیں، جو کہ خفیہ طریقے سے کی جارہی تھیں۔

سائرہ دونوں طرف کی خریداری کر رہی تھیں اور اپنے گھر پر ہی سارا سامان رکھ رہی تھیں۔ اندیشوں اور فکروں کے باوصف بھی وہ انتہائی خفیہ طریقے سے گھر پر اسکول کے تین روزہ ٹرپ کا بتا کر بے سروسامان نکلی اور سائرہ آپی کے گھر پر ہی چند لوگوں کی موجودگی میں اس کا نکاح پرویز سے ہو گیا۔ اس کے دل کو کم از کم یہ اطمینان تو تھا کہ وہ ایک مسلمان کی بیوی بنی ہے اور مسلمان اولاد کو جنم دے گی۔

جب وہ رخصت ہو کر پرویز کے ہمراہ اس کے متوسط سے گھر میں پہنچی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس کے طور طوار...... اس کے گھر کی حالت سے ہرگز میل نہ کھاتے تھے۔ مگر اسے ان باتوں سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ بھی تو سنیتا آنٹی کے گھر پر رہ رہی تھی اور وہ ساری شان و شوکت اس کی ملکیت نہ تھی۔ پرویز بھی اتنا امیر نہ تھا جتنا دکھائی دیتا تھا، مگر اسے اس سے کیا فرق پڑتا تھا، اسے تو فقط اپنے ماضی سے کٹنا تھا اور اس کے لیے ایک نیا طرزِ زندگی درکار تھا...... وہ اسے پرویز کی ہمراہی میں مل سکتا تھا۔

☆☆☆

''مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہیں یا تم واقعی میرے قریب بیٹھی ہو!'' اس نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا جو کہ حرف بہ حرف حقیقت تھا، اسے واقعی اندازہ نہ تھا کہ کبھی مریم خود اس سے تنہائی میں ملنے کی خواہش کا اظہار کرے گی۔ اپنی دلی کیفیت کا اظہار مریم کے سامنے کرنے میں اسے کوئی عار محسوس نہ ہوا تھا۔

''میں کوئی رومانوی گفتگو کرنے کے لیے یہاں آپ سے ملنے نہیں آئی...... بلکہ آپ سے کھل کر کوئی بات کرنے آئی ہوں!'' مریم نے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

''میں ہمہ تن گوش ہوں......'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر عاجزی کی اداکاری کی۔

''اور میں بے حد سنجیدہ ہوں!'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا، ''اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میں آپ کو ایک کہانی سنانا چاہتی ہوں؟''

''کس قسم کی کہانی اور کیوں...... میرا مطلب ہے کہ مجھے کیوں؟'' اسے حیرت ہو رہی تھی، وہ تو کسی اور ہی تاثر اور خواہش کے زیرِ اثر ملاقات کرنے کو آیا تھا۔

''اس سوال کا جواب میں آپ کو کہانی کے آخر میں دوں گی......'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اور جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں وہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ میری زندگی سے اس کہانی کا تعلق تو ہے ہی، ممکن ہے کہ آپ بھی اس کہانی کے کردار بن جائیں......''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں، تمہاری زندگی کی کہانی کا کردار بن کر مجھے خوشی ہو گی!'' اس نے باچھیں پھیلا کر کہا تھا۔

☆☆☆

لکی کی ملاقات اس نوجوان سے گاؤں کے میلے میں ہوئی تھی، وہ اپنے ماما کے پاس مراد نگر گئی تھی اور وہاں سے ان کی بیٹیوں کے ہمراہ میلے میں گئی تھی۔ بھرے میلے میں اس کا سامنا اچانک اس نوجوان سے اس وقت ہوا جب سرکس کے خیموں میں سے ان کے جانور نکل بھاگے، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور جس کا جدھر منہ آیا، بھاگ اٹھا۔ لکی کی ماموں زاد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک سمت کو بھاگی، وہ اس اچانک صورتِ حال کے لیے تیار نہ تھی اس لیے بوکھلا گئی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کا پاؤں مڑ گیا۔ سرکس کے جانور اگرچہ اتنے خطرناک نہ تھے مگر شیر جیسے جانوروں کی دہشت ہی کافی ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر اس نے لکی کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر اپنی موت کے خوف نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

''کون ہو تم لڑکی اور کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں......''

''میں مہمان ہوں اس گاؤں میں اور میرا پاؤں مڑ گیا ہے......'' اس نے تکلیف سے کہا، ''میرے ماموں کی بیٹی کسی کو مدد کے لیے بلانے گئی ہے، ابھی آتی ہی ہو گی!''

''جب تک شیر پہنچ کر تمہیں کھا چکا ہو گا!'' اس نے اسے ڈرایا۔ ''اگر تمہیں منظور ہو تو میں تمہاری مدد کر دوں؟'' جان کو خطرہ لاحق ہو تو کسے اعتراض اور کیسا اعتراض ہوتا، وہ بھی اس جیسا خوبرو نوجوان مدد کی پیش کش کر رہا ہو تو...... اس کے بعد ان کے درمیان اگلے چند دنوں میں کچھ خفیہ ملاقاتیں ہوئیں، لکی کی ماموں زاد ربیکا ان کی ان ملاقاتوں کی رازدار تھی۔ پہلی ملاقات کے بعد ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نظر ایک عیسائی لڑکی سے لڑ گئی ہے مگر عشق جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو ذات پات کو کب گردانتا ہے۔

ستاروں کے آگے کے جہاں کون کون سے ہیں، اس کا اندازہ عشق کے ابتدائی مراحل میں کب ہوتا ہے، اسی لیے وہ اپنے انجام سے بے خبر یہ مراحل طے کرتے رہے۔ لکی کو اب مراد نگر آنا اچھا لگتا تھا کیونکہ وہاں اس کی آنکھوں کی تراوٹ اور دل کی ٹھنڈک کا سامان تھا، اس کا سلطان تھا...... پھر عشق ایسا سر چڑھ کر بولا کہ ہر شے غیر اہم ہو گئی، فقط ان دونوں کی اپنی ذات اور خوشی کے سوا۔ مذہب کی دیوار قائم رہی اور باقی حدیں اور فاصلے مٹ گئے، ربیکا کی مدد سے انہوں نے لکی سے چھوٹی بہن کی ایک شہری سہیلی کو رازدار بنایا اور ان دونوں کا خفیہ نکاح ہو گیا۔

اسے یقین تھا کہ وہ اسے مذہب تبدیل کرنے پر منا لے گا۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر شہر چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے، اس سلسلے میں ساری تیاریاں اور انتظامات مکمل تھے کہ ان کے منصوبے کا علم سلطان کے باپ کو ہو گیا، کایا پلٹ ہو گئی۔ دودھ نہ بخشنے اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دے کر اس کا عشق کافور کر دیا گیا، راتوں رات...... اس کے سارے منصوبے ملیامیٹ کر دیے گئے، اس سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کروا لیے گئے اور اس کا نکاح گھر میں موجود اس کی یتیم پھوپھی زاد سے کر دیا گیا، جو کہ اسی گھر میں رہ کر جوان ہوئی تھی اور اس سے بچپن سے منسوب بھی تھی۔

اس کا بچپن سے اس سے منسوب ہونا اور اس کا اس گھر میں ہمہ وقت اس کی نظروں کے سامنے رہنا...... کچھ بھی سلطان کو اس کی طرف مائل نہ کر سکا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ ماں کے ترلے منتوں اور باپ کی مرنے یا مار دینے کی دھمکیوں کا شاخسانہ تھا کہ وہ اس رات اس کے پہلو میں تھا...... اس کے شوہر کی حیثیت سے!

گاؤں کے باہر ایک ٹیلے پر وہ دونوں کھڑی تھیں، چادروں سے ان کے وجود چھپے ہوئے تھے اور دور سے دیکھنے پر بھی علم نہ ہوتا تھا کہ وہ مرد تھے یا کہ عورتیں۔ بارھویں تیرھویں رات کا چاند اپنی چاندنی سے بار بار ان کا راز کھولنے کی کوشش کرتا مگر وہ ہر تھوڑی دیر کے بعد دبک کر بیٹھ جاتیں۔ کسی کو علم بھی نہ تھا ان کی وہاں موجودگی کا، سوائے سلطان کے کہ جس کے ساتھ یہ سارا منصوبہ طے ہوا تھا، جانے ان کا بھید سلطان کے باپ کو کیسے معلوم پڑا تھا کہ سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ لکی کے گھر پر وہ دونوں مراد نگر جانے کا بتا کر نکلی تھیں، چند کوس کا فاصلہ انہوں نے اس طرح طے کیا آہستہ آہستہ کہ وہ رات تک وہاں پہنچیں اور گاؤں سے باہر ہی انتظار کرنے لگیں، سلطان کو عشا کے بعد آ جانا تھا کیونکہ اس وقت گاؤں میں سب سو چکے ہوتے ہیں۔

رات ڈھل رہی تھی، مسجدوں سے فجر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں جب وہ دونوں آگے پیچھے مجرموں کی طرح گھر میں داخل ہوئیں...... لکی کے ماموں غضب ناک حالت میں ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ''آیا نہیں وہ تمہیں لینے؟'' سوال تھا یا بم کا گولہ...... وہ دونوں ہکا بکا ان کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

''زیادہ شور مت مچاؤ جوزف...... ان کی بے وقوفی کے بارے میں کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں، اس کی ماں بھی ہماری بیٹی کو ہی قصوروار کہے گی اور اگر ہم اس بات کو نہیں دفن نہیں کریں گے تو تمہیں علم ہے کہ پطرس کتنا بددماغ ہے...... وہ اس آوارہ لڑکی سے شادی پر آمادہ نہیں ہو گا، یہ بدبخت تو یہ بھلا بیٹھی ہے کہ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے اور میں کبھی بھی اس سے اپنے بیٹے کی شادی نہ کرتی اگر اس کے بدلے میں میری بیٹی کا رشتہ اس کے بھائی کے ساتھ نہ ہوتا......'' ممانی نے اس پر گویا احسان کیا۔ ''میں اس غلطی کو صرف اس صورت میں معاف کر سکتی ہوں کہ اگر یہ تمہاری آخری غلطی ثابت

ہوتو......‘‘ وہ کبھی اس شادی پر آمادہ نہ ہوتی جو اپنی آنکھوں سے طلاق نامہ نہ دیکھ لیتی اور اس پر مستزاد ہنگامی طور پر ہونے والی شادی کے شادیانوں کی آوازیں اپنے کانوں سے نہ سن لیتی۔ اس کی بربادی، کسی کی شادی کے جشن کے طور پر منائی جارہی تھی۔

جلد ہی پیش بندی کے طور پر اس کے خاندان کے بزرگوں نے آپس میں بات چیت طے کی اور اس کی اور ربیکا کی شادیاں ایک ہی دن ہوگئیں۔ شادی سے قبل ہی اسے علم ہوچکا تھا کہ وہ سلطان سے محبت کی امانت کی حقدار ٹھہری تھی مگر اس راز کو اس نے خود تک محدود رکھا تھا کیونکہ ربیکا سمیت سب کو یہی علم تھا کہ اس کا اور سلطان کا بندھن صرف کاغذی تھا۔ ان کے علم میں یہ نئی بات لاکر وہ اپنا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور یوں اس نے اپنی ساری زندگی پطرس کے ساتھ خلوص سے گزاری، اس طرح کہ مریم کی ذرا قبل از وقت پیدائش نے بھی کسی کو اس فکر میں مبتلا نہ کیا کہ وہ بیٹی پطرس کی نہیں۔

ایک گاؤں میں رہ کر بھی لکی نے یوں زندگی لوگوں سے کٹ کر گزاری کہ عمر بھر اس کا سامنا سلطان سے نہیں ہوا۔ جس طرح اس کی شادی کی خبر لکی کو مل گئی اسی طرح لکی کی شادی کی خبر بھی اسے ملی، جسے اس نے معمول کی خبر سمجھ کر سنا ہوگا کیونکہ وہ اپنے گھر میں اطمینان سے رہ رہا تھا، جو اسے لکی سے شادی کی صورت میں میسر نہ ہوتا۔ مریم کی پیدائش نے لکی کے دل سے باقی سب چیزوں کو نکال دیا اور وہ اپنے گھر، شوہر اور بچوں میں مصروف ہوگئی۔ مریم کے بعد چار بہن بھائی اور بھی ہیں اور آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہ کس کی کہانی ہے......‘‘ اس نے ایک طویل سانس لی۔

’’لیکن میں اس میں کہاں ہوں......اور جب لکی نے کسی کو نہیں بتایا کہ مریم، پطرس کی بیٹی نہیں تھی تو تمہیں کیسے علم ہوا؟‘‘ اس کا سوال منطقی تھا۔

’’جب مریم جوان ہوئی تو اسے اپنے مذہب کے بجائے اسلام کی محبت میں مبتلا دیکھ کر لکی کو اندازہ ہوا کہ اس کے خون میں اس مذہب سے محبت ہے اور وہ جیسے بھی چاہے گی اسے اس مذہب سے دور نہ رکھ سکے گی۔ اس لیے اس نے اسے خود سے دور، شہر بھیجنے کا ارادہ کیا جہاں سنیتا آنٹی اور ڈیوڈ انکل کے پاس رہ کر اسے آزاد ماحول ملے گا جو اسے عیسائیت کی طرف راغب رکھے گا۔ شہر بھیج کر گویا انہوں نے میرے لیے آسانی پیدا کردی تھی۔ یہاں آکر میں نے باقاعدہ اسلام قبول کرلیا اور چوری چھپے اپنی عبادات کرتی رہی۔ اس کے بعد میں نے اپنی ماں کو اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں بتایا تو تب اس نے مجھے بتایا کہ میری رگوں میں ایک مسلمان باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے بعد میری کوشش تھی کہ مجھے کوئی اچھا آدمی مل جائے......تو میں اس سے شادی کرلوں، اس سے قبل کہ میری شادی کسی عیسائی سے طے کردی جائے......‘‘

’’تو تمہارے خیال میں، میں ایک اچھا آدمی ہوں؟‘‘ وہ زیرِلب مسکرایا۔ ’’ویسے تم اچھا آدمی سے کیا مراد لیتی ہو؟‘‘

’’صرف وہ جو مجھے چاہتا ہو اور میرے ساتھ ہر مشکل میں نباہ کرسکے......زمانے کے خلاف میری خاطر نبرد آزما ہوسکے، خصوصاً جو مشکلات اس سے شادی کرنے کے نتیجے میں درپیش ہوں گی!‘‘ اس نے سادگی سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔

’’ممکن ہے کہ تم مجھ سے زیادہ توقعات وابستہ کربیٹھی ہو، میں وہ نہ ہوں جو دکھائی دیتا ہوں......‘‘ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ’’میرا مطلب ہے کہ میں اتنا امیر نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہی ہوگی!‘‘

’’مجھے کسی کے پاس کم یا زیادہ دولت ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......‘‘ اس نے فوراً کہا۔ ’’بس اسے میرا اور میرے جذبات کا خیال ہونا چاہیے......‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ تمہیں صرف میری محبت کی ضرورت ہے؟‘‘ اس نے مریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا اور وہ بے طرح شرما گئی تھی۔

☆☆☆

چوہدری مراد علی کا قتل......اور وہ بھی اپنے بھتیجے کے ہاتھوں، بلاشبہ مراد نگر کے علاوہ اردگرد کے دیہات کے لیے

بھی ایک سانحۂ عظیم تھا۔ شجاع تو غیظ و غضب کی حالت میں ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا۔ عابدہ بیگم کے لیے صدموں کا کوہِ گراں گرا تھا۔

سب سے برا حال تو رابعہ کا تھا، جس کے لاڈ اٹھانے والے ماما کا قتل......اسے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ غنودگی کے عالم میں پڑی تھی، ہوش میں آتی تو حقیقت سے باخبر ہوتی اور رو رو کر نڈھال ہوجاتی۔ معراج نے عابدہ بیگم کو مشورہ دیا کہ اسے شہر بھجوادیں ورنہ اس کی اور آنے والے بچے کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔ عابدہ بیگم نے معراج کی منت کی کہ اس وقت وہی وہاں جاسکتی تھی۔ مگر انہیں شہر کون لے کر جاتا؟ شیر علی تو چھوٹا تھا، کسی حادثاتی صورتِ حال کو نہیں سنبھال سکتا تھا، جہانگیر ہرگز اس وقت گاؤں سے نہ جاسکتا تھا کہ وہ بڑا تھا اور باپ کی آخری رسومات کے وقت اس کی موجودگی سب سے اہم تھی۔ قرعہ شجاع کے نام نکلا تھا، بلکہ یہ تجویز ہی جہانگیر نے دی تھی، اس طرح اسے گاؤں سے بھیجا جاسکتا تھا۔ ماں نے منتیں کیں کہ جنازے کے فوراً بعد انہیں شہر روانہ کردیا جائے۔ جنازے کے وقت تک رابعہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی تھی......اتنی کہ عابدہ بیگم تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ معراج نے انہیں تسلی دی کہ بروقت شہر پہنچ گئے تو خطرے والی کوئی بات نہ ہوگی۔ رابعہ درد کے عالم میں تھی اور مندی مندی آنکھوں سے سب دیکھ رہی تھی۔ معراج بی بی کے بیٹھتے ہی اگلی نشست پر شجاع بھی آن بیٹھا، رابعہ کی ساری حسیں بیدار ہوگئیں۔

’’میں نے شہر نہیں جانا......‘‘ وہ نقاہت سے بولی، معراج کا ہاتھ اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

’’مجبوری ہے بیٹا......‘‘ معراج نے اس کا پسینے میں بھیگتا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ’’سب ٹھیک ہو جائے گا، پھر ہم واپس آجائیں گے!‘‘

’’جہانگیر کو بلائیں ماسی......‘‘ وہ کراہی۔ ’’مجھے مت بھیجیں......اس طرح!‘‘ وہ معراج کے سامنے یہ کہتے کہتے رک گئی، شجاع کے ساتھ۔

’’سب ٹھیک ہوجائے گا میری بچی، میں ہوں نا تمہارے ساتھ......‘‘ اسے ایسی کسی تسلی یا دلاسے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ درد اور مجبوری کے احتجاج کو اپنے آنسوؤں میں بہا رہی تھی۔ مگر گاڑی چل پڑی تھی......اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے مقتل کی طرف لے جایا جارہا ہو۔

’’میں مرجاؤں گی ماسی......‘‘ اس نے ہولے سے فریاد کی، ڈرائیور کے سامنے چیخ بھی نہیں سکتی تھی، خاندان کی عزت اور بھرم اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔

’’اللہ سے خیر مانگو میری بچی، یوں اس طرح کی باتیں نہیں کرتے......‘‘ معراج نے کہا۔ ’’درود شریف پڑھو دل ہی دل میں......‘‘ وہ اس کی کمر پر اپنے ہاتھوں سے مساج کرنے لگی، رابعہ پھر غنودگی میں جارہی تھی۔

اگلی نشست پر بیٹھا شجاع......اس وقت تصور کی جس پرواز میں تھا اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ پچھلی نشست پر کون بیٹھا ہے اور کیوں......اس وقت تو فقط وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح چوری چھپے واپس گاؤں جاکر وہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکتا تھا۔ جہانگیر سے اسے کوئی توقع نہ تھی، انتقام کی آگ صرف اس کے وجود میں بھڑک رہی تھی کیونکہ جہانگیر تو ہر معاملے کو قانونی طور پر نمٹانا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

’’میں ایک بار معراج سے ملنا چاہتا ہوں......‘‘ زرتاج کو چھوڑنے آیا تو قائم علی نے نعیم سے التماس کی۔

’’میں اس سے پوچھ کر بتاؤں گا......‘‘ نعیم نے مختصراً کہا تھا۔ اگرچہ اس کے دل میں قائم علی کے لیے بڑی ناراضی تھی مگر اس نے اس امید کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا کہ اس کی بہن کا اجڑا ہوا گھر پھر سے بس جائے۔

’’صرف پوچھنا نہیں......میری سفارش کرنا ہوگی تمہیں!‘‘ اس نے زور دے کر کہا۔

’’اس کی زندگی کو سزا میں تم نے تبدیل کیا اور اب بھی چاہتے ہو کہ پلک اس کی طرف سے ہو؟‘‘

''میں اس پر بہت شرمندہ ہوں.....'' اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''اپنے لیے نہ سہی مگر زرتاج کے لیے!''

''میری بہن کی زندگی اتنی ارزاں نہیں قائم علی کہ اسے کسی کھلونے کی طرح جب چاہے دل بہلانے کے لیے استعمال کرلیں اور جب چاہیں کسی بیکار چیز کی طرح گھر سے باہر پھینک دیں.....'' نعیم کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''اب بھی تم فقط اس لیے اس سے ملنا چاہتے ہو کہ تمہیں اپنی جوان ہوتی بیٹی کے لیے گھر پر ایک عورت چاہیے!''

''کوئی عورت نہیں..... معراج! صرف اس کی اپنی ماں!'' قائم علی نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔

''میں وعدہ نہیں کرتا کیونکہ موحی اس بارے میں بات بھی نہیں سننا چاہتی.....''

''نعیم..... تمہیں میری دوستی کا واسطہ.....''

''مجھے واسطہ دینے سے پہلے سوچو کہ تم نے خود اس دوستی کا کتنا مان رکھا!''

''بھابی سے کہنا میری سفارش کریں، معراج ان کی بات کو بہت اہمیت دیتی ہے!'' اس نے اپنی سفارش کو مزید مضبوط بنایا۔

''میں کہہ دوں گا اس سے، تمہاری طرف سے مگر مجھے کچھ زیادہ توقع نہیں ہے.....'' دل میں لاکھ چاہنے اور امید رکھنے کے باوجود بھی نعیم نے قائم علی کو امید کا سرا نہ پکڑایا تھا۔

''تم میری دوستی کی خاطر میرے لیے کوشش کرنا نعیم، مجھے امید ہے کہ معراج مجھے معاف کردے گی..... اس کا دل بہت بڑا ہے!'' وہ جیسے گھگیا رہا تھا۔

''کاش تمہارا دل بھی میری بہن جیسا ہوتا.....'' نعیم سوچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

''مما یہ کیا چیز ہے آپ کی دوست کا بیٹا؟'' کرن نے چڑ کر ماں سے پوچھا تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' شگوفہ نے چونک کر سوال کیا۔ سہیل پہلے تو نینا کے ساتھ آتا تھا مگر اب وہ اکیلا بھی ان کے ہاں آجانا شروع ہوگیا تھا۔ نینا تو اس بات پر خوش تھی کہ چلو اسی بہانے شگوفہ غیر محسوس طریقے سے اس کا علاج بھی کرے گی۔

''بس ایسے ہی بے گھا مڑسا.....'' کرن نے کندھے اچکا کر کہا۔ ''یوں شرماتا ہے جیسے کوئی لڑکی ہو!''

''تو بیٹا شریف گھروں کے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں نا.....'' شگوفہ دل ہی دل میں اس بات پر خوش ہوئی تھی۔

''تم ذرا اسے تنگ نہ کرو نا!''

''وہ شرمیلا نہیں مما.....'' کچھ سوچتے ہوئے کرن نے کہا تھا۔ ''کچھ عجیب سا ہے..... میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے ایسے میرا ہاتھ جھٹکا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی.....'' کرن کو الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔

''تم حد سے زیادہ بے تکلف نہ ہوا سی سے ڈیئر.....'' شگوفہ نے کہا۔ ''لڑکیاں شرماتی لجاتی اچھی لگتی ہیں اور ذرا فاصلہ رکھو..... مرد ایک ایسا بچہ ہے جو عورت کو کھلونا سمجھتا ہے اور اس کھلونے کی طرف زیادہ لپکتا ہے جو اس کی دسترس میں نہ ہو!''

''اوہ مما..... میں نے اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا، بس یونہی جیسے دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں!'' کرن نے کہا۔ ''اور وہ..... اس کا ہاتھ کانپنے لگا مما اور صرف ہاتھ ہی نہیں، اس کا پورا جسم!''

''تو اس سے اندازہ کرلو نا کہ وہ کتنا شریف لڑکا ہے.....'' شگوفہ کو اپنی نظرِ انتخاب پر فخر محسوس ہوا تھا۔

''مما.....'' اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح اپنے خیال کی وضاحت کرے۔

''بس کرن..... بہت ہوگیا، نفسیات پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے، سیدھی سادی بات میں بھی کوئی نہ کوئی الجھن کا پہلو نکال لیتی ہو!''

''آپ نے بھی تو نفسیات ہی پڑھی ہے نا!'' کرن دوبدو بولی۔

''میں نے خود پر حاوی نہیں ہونے دیا نفسیات کو، اسے پڑھا اور ذریعہ بنایا معاش کا، جبکہ تم..... تم کچھ زیادہ ہی حاوی اور شکی ہوگئی ہو، سید کی سی بات میں بھی کوئی نکتہ نہ کوئی نکتہ ایسا نکال لیتی ہو کہ اگلا پریشان ہوجاتا ہے۔''

''پتا نہیں مما..... آپ اتنی جلدی غصے میں کیوں آگئی ہیں، میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے اور آپ جذباتی ہوگئیں، اس میں اتنا شدید ردِعمل دکھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''سچ تو یہ ہے کرن کہ مجھے سہیل بہت اچھا لڑکا لگا ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں نینا کو اچھی طرح جانتی ہوں، کہیں باہر والی غیروں میں نکل کر رشتہ کرنے سے بہتر ہے کہ میں ایک بنی بنائی رشتہ سہیل سے کروں.....'' شگوفہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم بڑی ہو تو میری سوچ پہلے تمہاری طرف ہی گئی اور میں نے تم سے کہا کہ اس سے دوستی بڑھاؤ، اگر تمہیں میرے انتخاب پر اعتراض ہے تو صاف صاف کہہ دو، میں کنول کے لیے.....'' وہ رکیں۔ ''حقیقت یہ ہے کہ میں سہیل کو کھونا نہیں چاہتی!''

☆☆☆

''کیا.....'' حیرت سے جہانگیر نے جیسے چیخ کر پوچھا۔

''جی سرکار.....'' فیضی نے سر جھکا کر کہا۔ ''حقیقت یہی ہے!''

''مگر کیوں، کیوں کر رہے ہیں یہ لوگ ایسا؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''سرکار..... سب ڈرتے ہیں ان سے، ان کے خلاف گواہی دینے سے!'' فیضی نے کہا۔ ''اور پھر چھوٹے چوہدری صاحب کا لوگوں کو ڈر ہے، ان کے شہر چلے جانے سے انہیں احساس ہو رہا ہے کہ اگر وہ گواہی دیں گے تو چوہدری نورعلی اور ان کے بیٹے ان کا جینا حرام کردیں گے اور آپ تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، آپ میں شرافت ایک ایسی خوبی ہے جو اچھے اچھوں کو بزدل بنا دیتی ہے!''

''یہ کیا بات ہوئی، بات قانونی کارروائی کی ہے اور اگر وہ لوگ گواہی دیں گے تو قاتل گرفتار ہوجائیں گے، پھر انہیں کس کا اور کس بات کا ڈر ہے؟''

''سرکار..... کون، کون گرفتار ہوگا..... ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا ہے اور پھر گاؤں کے لوگوں کی عزت محفوظ ہے ان کے ہاتھوں نہ جان.....'' فیضی نے وضاحت کی۔ ''ابھی تھوڑے دن ہی کی بات ہے جو اس جوان لڑکی کے ساتھ انہوں نے کیا اور کوئی ان پر ہاتھ بھی نہ ڈال سکا..... الٹا جن لوگوں نے ان کے خلاف گواہیاں دیں.....''

''کیا ہوا ان کو؟'' جہانگیر نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

''معلوم نہیں سرکار..... وہ لوگ تو نظر ہی نہیں آئے کسی کو اس دن سے!''

''کیا؟'' جہانگیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا ان لوگوں نے گواہوں کو مار دیا؟''

''معلوم نہیں سرکار.....'' فیضی نے کہا۔ ''سرکار میں تو کہتا ہوں کہ آپ فوراً چھوٹے چوہدری صاحب کو واپس بلا لیں..... پھر دیکھیں کہ کون گواہی دینے کو تیار نہیں ہوتا!''

''فیضی، میں تو سارے معاملات کو قانونی طور پر ہی حل کرنا چاہتا ہوں، نہ کہ انتقامی کارروائیوں میں الجھ کر اپنی آئندہ نسل کے لیے مسائل چھوڑ جاؤں.....'' جہانگیر نے آہستگی سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ شجاع اس وقت انتقام کی آگ میں جل رہا ہوگا، اسی لیے تو اس کو میں نے شہر بھجوا دیا ہے، میں اسے اس جہالت کے ماحول سے دور رکھنا چاہتا ہوں!''

''تو پھر سرکار آپ بھی شہر چلے جائیں اور بھول جائیں اس بات کو کہ قاتل اپنے انجام کو پہنچ سکتے ہیں، جہاں قانون بھی اندھا ہو اور قانون کے رکھوالے بھی، وہاں آپ اس بات کی امید لگائے بیٹھے ہیں کہ کوئی اپنی جان خطرے میں ڈال کر آپ کے حق میں گواہی دے گا، وہ بھی چوہدری نورعلی اور اس کے بیٹوں کے خلاف.....''

”کچھ بھی ہو فیضی...... میں سب کچھ قانونی طریقے سے ہی کروں گا، اور کچھ بھی ہو میں شجاع کو واپس نہیں بلاؤں گا، یہ میرا خود سے وعدہ ہے......“

☆☆☆

شجاع بخار میں پھنک رہا تھا، گھر پہنچ کر ملازموں نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے نکالا تھا کیونکہ اس کا جسم راستے میں اتنا درد کرنا شروع ہو گیا تھا کہ وہ کراہتا ہوا نیم غنودگی میں تھا۔ رابعہ دم سادھے بیٹھی تھی، اپنا خوف کسی کے سامنے بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جہانگیر کا منشی شجاع کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور دوا وغیرہ لا کر دی تھی۔ رابعہ نے گھر آ کر عمران کو نہلا دھلا کر سلا دیا تھا، اسے بھی سفر کی تھکاوٹ تھی، معراج بی بی نے اس کی کمر دبائی اور اسے آرام کرنے کو کہا۔ رابعہ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر معراج بی بی کی چارپائی اپنے کمرے میں لگوالی تھی۔

جس کے خوف سے اسے نیند نہ آ رہی تھی، وہ مسکن دواؤں کے زیرِ اثر شیر علی کے کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ اگر اسے ڈاکٹر نے نیند کی دوائیں نہ دی ہوتیں تو وہ چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ وہ تو بالکل ہوش و خرد سے بیگانہ تھا مگر رابعہ کے ہوش تو اس بات نے اڑا دیے تھے کہ آج نہیں تو کل...... وہ ٹھیک ہو جائے گا، پھر اس کے اندر کا درندہ جاگ اٹھے گا، جس نے اسے اچھے برے کی پہچان بھلا دی تھی۔ وہ کس طرح خود کو محفوظ رکھ پائے گی، اسے اب جہانگیر کو بتانا ہی پڑے گا...... جب تک جہانگیر کو حقیقت کا علم نہ ہوگا اس کا دل رابعہ کی طرف سے صاف نہ ہوگا، جو یہ سمجھتا تھا کہ رابعہ کسی وجہ کے بغیر شجاع کو ناپسند کرتی تھی۔ کیا دونوں بھائی ایک دوسرے کی جان کے دشمن نہ بن جائیں گے؟ اس نے سوچا۔

ماما جی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اس بات کا علم ہم دونوں کے سوا کسی کو نہ ہو...... تو کیا میں عمر بھر خوف کے تحت زندگی گزار دوں گی، نہیں نہیں...... مجھے جہانگیر کو بتانا ہی ہوگا۔ ماما جی کی وفات سے میں ان سے کیے گئے وعدے کی پابندی سے آزاد ہو گئی ہوں۔ ”ماما جی......“ وہ سسکی، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے کانوں کے پیالوں کو بھرنے لگے۔ ہولے ہولے اس کی آواز بلند ہونے لگی، ”میرے پیارے ماما جی...... اب میں کسے ماما جی کہوں گی، میرے بچے کس کو دادا کہیں گے، آپ کے جانے سے سارا گاؤں یتیم ہو گیا ہے ماما جی، آپ باپ تو تین بیٹوں کے تھے مگر سارا گاؤں آپ کو اپنا باپ سمجھتا تھا، آپ سب کی عزتوں کے محافظ تھے ماما جی...... آپ کے ہوتے ہوئے ہمیں کتنا سہارا تھا......“ اس کی بلند ہوتی ہوئی آواز نے معراج کو گہری نیند سے جگا دیا، وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔

”تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟“ انہوں نے رابعہ کے پلنگ کی پائنتی بیٹھ کر پوچھا۔

”میرے ماما جی مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے ماسی...... اب کون میرا سہارا ہے ماسی!“ وہ زور زور سے رونے لگی، معراج نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”اللہ مالک ہے بیٹا، پہلے پہل تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم کس طرح جئیں گے۔ مگر بیٹا تکلیف دینے والا جانتا ہے کہ ہم اس کو کس طرح برداشت کریں گے، تم حوصلہ کرو بیٹا، تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تم اس طرح روؤ!“

”ماسی ان ظالموں کو ذرا ترس نہیں آیا، میرے ماما جی تو کسی چیونٹی کو بھی نہیں مار سکتے تھے اور ان ظالموں نے ماما جی کو کس بے رحمی سے مار ڈالا......“

”حوصلہ کرو میری بچی......“ معراج کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں، وہ کیا نہیں جانتی تھیں کہ چوہدری مراد علی کتنے شفیق انسان تھے۔ گاؤں بھر کے لیے شفیق باپ جیسے۔ ان کی موت سے پیدا ہونے والا خلا کوئی پُر نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے رابعہ کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، وہ سوچ رہی تھیں کہ کسی کو کہہ کر رابعہ کی اماں کو بلوا لیں گی، عابدہ بیگم کے لیے تو ممکن نہ تھا کہ اس وقت شہر آتیں مگر رابعہ کی اماں بھی آ جاتیں تو بڑا حوصلہ ہو جاتا۔

عابدہ بیگم کا پورا وجود ہی غم کے اتھاہ سمندر کی طرح ہو گیا تھا، بے یقینی کی کیفیت میں وہ سب کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں، ان کا نقصان ناقابلِ تلافی تھا، شوہر کو کھو دیا تھا، اب بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے علیحدگی

...اگر جہانگیر سے کہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شجاع کو شہر بھجوا دیں، جہانگیر نے رابعہ کی طبیعت کا بہانہ کر کے اسے زبردستی بھجوا دیا تھا حالانکہ رابعہ کب جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

”شام کو میرے کچھ دوست آ رہے ہیں، جلدی میں نکاح پر انہیں بلا نہ سکا اور اب وہ شکوہ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ بھابی سے ملنا چاہتے ہیں!“ پرویز نے مریم سے کہا تھا، اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کچھ تیاری وغیرہ کر لینا، چائے کے لیے کچھ لے آؤں گا، تم اپنا حلیہ وغیرہ درست کر لینا......“

”جی ٹھیک ہے......“ ہولے سے اس نے کہا تھا۔ اس نے گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر فہرست بنا کر پرویز کو دی کہ وہ سامان لے آئے تو وہ چائے کے ساتھ لوازمات تیار کر لے گی۔

”کہاں تیار ہو کر باورچی خانے میں مصروف رہو گی، میں اسی وقت جا کر تیار اشیا لے آؤں گا!“ اس نے محبوبیت سے کہا تھا۔ ”تمہارے ہاتھ کوئی کام کاج کرنے کے لیے تھوڑی ہیں......“

”دنیا کی ہر عورت اپنے گھر کا کام کرتی ہے...... اور عورت کی اصل خوب صورتی بھی یہی ہے کہ وہ کتنی سلیقہ مند ہے نہ کہ اس کی شکل صورت کی خوب صورتی......“

”بھئی آج تو میرے یار دوست پہلی دفعہ تم سے ملنے آ رہے ہیں، انہیں تمہاری خوب صورتی سے متاثر کرنا ہے، سلیقہ شلیقہ بعد میں دکھا لیں گے......“ مریم اس کی اس بات پر ہنس دی تھی۔ پھر اس نے ایک نئی فہرست تیار کی ان چیزوں کی جو کہ اسے بنی بنائی لے کر آنا تھیں، پرویز نے فہرست لے کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

”اب آپ جا کر سامان لے آئیں نا، مغرب کی اذان ہونے والی ہے!“

”جاتا ہو جانِ من...... آج تو تم اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ اٹھ کر جانے کو دل ہی نہیں کر رہا!“ اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ”میرے دوست تو آج اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں گے......“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کے دوستوں کے حواس اڑانے کی!“ مریم کو بہت برا لگا تھا۔ ”آپ جائیں جا کر سامان لے آئیں!“ پرویز کو اس نے زبردستی گھر سے نکالا، اذان ہوتے ہی اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔ جانے اس کا دل کیوں چاہنے لگا کہ وہ اس شوخ سے لال لباس کو بدل لے جو پرویز نے اصرار کر کے اسے پہنایا تھا، فقط عورتیں ہوتیں تو اور بات تھی مگر ساتھ پرویز کے دوست بھی تھے اور پرویز کا کہنا تھا کہ چونکہ انہوں نے مریم کو دلہن بنے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ ان کے سامنے پہلی دفعہ لال جوڑے میں ہی آئے۔ وہ ابھی سوچوں میں ہی گم تھی کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹائے جانے کی آواز آئی۔ دستک کا انداز پرویز کا نہ تھا، اس نے اپنا دوپٹا سر پر درست کیا اور جا کر باہر کی چٹخنی گرا دی اور خود ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”اندر آ جائیں......“ اس نے آہستگی سے کہا، دروازہ کھلا اور دو سے تین لوگوں کے اندر آنے کا اندازہ ہوا، پھر کسی نے مڑ کر کنڈی بھی لگائی تھی۔ ”السلام علیکم!“ اس نے ہولے سے کہا۔

”سولہ آنے صحیح...... پرویز سولہ آنے صحیح کہتا تھا......“ گھٹیا سے لہجے میں کسی نے کہا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا، تین خرانٹ صورت مرد کھڑے اسے دیکھ رہے تھے، کتوں کی طرح رالیں ٹپکاتے اور ان کے ساتھ کوئی عورت نہ تھی۔

”نہیں یار...... پرویز بالکل غلط کہتا تھا، اسے اندازہ ہی نہیں کہ یہ اس کے بیان سے کہیں بڑھ کر خوب صورت ہے!“ ایک اور آواز آئی تھی۔ مریم کا سارا وجود لرزنے لگا۔

”کون ہیں آپ لوگ؟“ اس نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ پرویز بھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور اس نے یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ اس کے دوست اکیلے ہوں گے وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی، میں خوامخواہ اتنا تیار ہوئی، مجھے تو اس جیسے دوستوں کے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔

''ہم وہی ہیں جن کے لیے تم لال جوڑا پہن کر تیار ہوئی ہو، پرویز کہتا تھا کہ گلاب کے پھول جیسی ہے مگر تم اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہو.....'' ان میں سے ایک نے کہا اور اس کی طرف قدم بڑھایا، وہ اس کے پیچھے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو جب سے آئی تھی خود کو اس چار دیواری میں محفوظ سمجھ رہی تھیں، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ محفوظ چار دیواری اس کے لیے قید خانہ بھی بن سکتی تھی۔ چلاتی تو کیا ہوتا، اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ سے التجا کرنا شروع کر دی۔

''میرے مالک..... میرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے اور اس بات کو صرف تو ہی جانتا ہے!''

☆☆☆

''میں کہاں ہوں.....'' شجاع نے غنودگی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

''سرکار آپ اپنے گھر پر ہی ہیں!'' ملازم نے اسے بتایا۔

''کون سے گھر پر.....'' اس نے بصد کوشش آنکھیں کھولیں اور کمرے کا جائزہ لیا۔ ''میں نے تو یہ کمرا اپنے گھر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟''

''سرکار آپ اپنے شہر والے گھر میں ہیں!''

''جہانگیر لالہ کے گھر پر؟''

''جی سرکار.....''

''لیکن میں یہاں کیسے آیا اور مجھے ہوا کیا ہے، کمزوری سی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟''

''سرکار.....'' ملازم کچھ کہتے کہتے رکا۔ ''بڑے سرکار کی وفات کے بعد، آپ کو جہانگیر سرکار نے شہر بھجوا دیا تھا کیونکہ بی بی صاحبہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی..... ان کا اپنا گاؤں میں رہنا ضروری تھا اس لیے انہوں نے آپ کو بی بی صاحبہ کے ساتھ شہر بھجوا دیا اور پھر شیر علی سرکار کا امتحان بھی ہونے والا ہے..... ان کا شہر آنا بھی ضروری ہے، وہ بھی آج کل میں شہر آ جائیں گے!'' جس دکھ کو وہ اپنی بیماری اور غنودگی میں بھولا ہوا تھا وہ پوری ہولناکیوں کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا، بابو جی کا قتل.....

''مگر مجھے کیا ہوا تھا؟''

''سرکار آپ کو گاڑی میں ہی اتنا تیز بخار ہو گیا تھا کہ یہاں پہنچنے تک آپ اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے..... ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ گہرے صدمے سے آپ بیمار پڑ گئے تھے!''

''کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے؟'' اس کی آواز میں تاسف کے ساتھ نقاہت بھی تھی۔

''سرکار..... زیادہ نہیں، بس تین دن ہوئے ہیں آپ کو یہاں آئے ہوئے!''

''تو پھر اب مجھے جانا چاہیے.....'' اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے بابو جی کے جنازے کو کندھا دیا تھا، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں اتارا تھا اور کس طرح بلکتے ہوئے شیر علی کو اپنے ساتھ لگا کر اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر دم لے گا۔

''ڈاکٹر نے آپ کو سفر سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دے، آپ گاؤں نہیں جا سکتے!'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں وضاحت کی تھی۔

''کس مائی کے لال میں جرات ہے کہ وہ مجھے گاؤں جانے سے روک سکے؟'' اس نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ناطاقتی اس قدر تھی کہ وہ جیسے واپس ڈھے سا گیا تھا۔

''سرکار آپ آرام کریں، جونہی آپ کا بخار اترے گا اور آپ بہتر محسوس کریں گے تو میں آپ کو خود گاؤں لے کر چلوں گا.....'' ملازم نے اسے تسلی دی اور دل ہی دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ چوہدری صاحب ابھی غصے سے کہیں گے کہ تو کیا

میرا باپ ہے جو مجھے لے کر جائے گا گاؤں مگر اس کو حیرت ہوئی شجاع نے جواب میں کچھ نہ کہا، خاموشی سے لیٹ کر کروٹ بدل لی۔

''آپ آرام کریں سرکار.....'' ملازم نے کہا اور الٹے قدموں کمرے سے باہر نکلنے لگا۔ ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے!'' تھوڑی دیر رک کر اس نے چوہدری شجاع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا مگر جواب نہ آنے پر وہ سمجھا کہ شاید وہ سو چکے ہیں۔

☆☆☆

''دلی تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کی سب تمہاری بہنیں ہیں، پھر بھی تم نے.....'' جہاں آرا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی، اس سے زیادہ کھل کر وہ اور کیا کہتیں۔

''اماں..... میں جانتا ہوں کہ یہ کون ہیں سب..... اور اب میں جوان ہوں اماں، اگر تم اس بات کا احساس نہ کرو تو میں کیا کروں، میں کیا اپنی جوانی یونہی ضائع کر دوں؟''

''کس نے کہا ہے تم سے بیٹا کہ یہ تمہاری بہنیں نہیں ہیں؟'' جہاں آرا نے ٹوہ لی۔ جانتی تھیں کہ کبھی نہ کبھی یہ بھید تو کھل ہی جائے گا مگر انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کس نے ان کا راز فاش کیا ہے۔ ''الماس تمہاری بہن ہے بیٹا!''

''ہاں اس لیے کہ اسے تم نے جنم دیا ہے۔ مگر اس کا باپ کون ہے اماں، کیا اس بات کا کسی کو علم ہے؟''

''تم حد سے زیادہ بدتمیز ہو گئے ہو دلی.....'' ان سے اتنی براہِ راست چوٹ برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ''جانے کون تمہارے کان بھرتا رہتا ہے؟''

''میرے کان کون بھرے گا اماں..... یہ تمہاری بھانت بھانت کی جمع کی ہوئی ''چیزیں'' مجھ پر مرمٹتی ہیں اماں، میں تو انہیں بہنیں ہی سمجھتا تھا!'' خرانٹ پن اس کے انداز سے نمایاں تھا۔

''سب جانتی ہوں جو تم ان کو بہنیں سمجھتے ہو.....'' دانت کچکچا کر انہوں نے کہا۔

''کہیں نہ کہیں تو میرا بھی کانٹا اٹکانا ہے نا اماں تم نے، تو انہی میں کسی سے اٹکا دو اماں، جس سے تم چاہو!'' اس نے جیسے ماں کو اپنے لیے انتخاب کا اختیار دے دیا تھا۔

''جسے تم نے چننا تھا چن چکے ہو، اب تمہیں ماں کا خیال آیا ہے.....'' ان کے اندر ایک روایتی ماں نے سر اٹھایا تھا۔

''ارے نہیں اماں.....'' اس نے لاڈ سے کہا۔ ''قسم لے لو اپنی جو میں نے ابھی تک کسی کو چنا ہو، ابھی تو میں ان کو باری باری جانچ رہا ہوں، شادی اسی سے کروں گا جس سے تم کہو گی!'' اس کی اس بات نے جہاں آرا کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

''کیا تم ان سب سے.....'' سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے پوچھیں۔

''یونہی ذرا تفریح کے طور پر اماں..... تیرا لال ہے ہی ایسا خوبرو جوان کہ اس پر ساری مرتی ہیں!'' اس نے اترا کر کہا۔ جہاں آرا نے اسے دو ہتڑوں پر رکھ لیا۔

''بے غیرت، بے حیا..... دلال..... کتے، سؤر.....'' جو جو ان کے منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہی تھیں۔

''یہ دن دیکھنے سے کہیں اچھا تھا کہ میں مر جاتی.....'' وہ تھک ہار کر رونے لگیں۔

''ایسا کیا ہو گیا ہے اماں.....'' دلی نے مار کھا کر بھی ڈھٹائی سے کہا تھا، اسے بھلا ماں کے دو ہتڑوں سے کون سی کوئی گہری چوٹ لگ گئی تھی۔

''تو پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا ہے..... تو نے تو میری عمر بھر کی پونجی لوٹ لی ہے دلی، کاش میں نے تجھ جیسی اولاد کو نہ جنا ہوتا، کاش میں نے اپنی ماں کے کہنے پر تجھے اپنے پیٹ میں ہی ختم کر دیا ہوتا.....'' وہ اپنا سینہ پیٹ پیٹ کر بین کر رہی تھیں، اوپر ساری کی ساری یہ سب کچھ سن رہی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نیچے آتی، الماس نے اس لمحے اپنی

ماں کے دکھ کو دل سے محسوس کیا تھا اور جانتی تھی کہ ایک طوائف کی متاع کیا ہوتی ہے۔

"میں ہر وقت ان کی اتنی نگرانی کرتی تھی، ان کا خیال بھی رکھتی تھی، انہیں سمجھاتی بھی تھی...... پھر بھی انہوں نے اماں کو دھوکا دیا......" وہ سوچ رہی تھی۔ "صرف انہوں نے ہی کیوں، میں نے بھی تو اماں کو دھوکا دیا ہے......" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آپا......" نیلم کی آواز آئی تھی۔ "کیوں رو رہی ہو؟"

"اپنی ماں کے نصیب کو رو رہی ہوں...... جس نے تم سب کو سہارا دیا، ماں کا پیار دیا، تم سب کو بتایا کہ دلی تم سب کا بھائی ہے اور تم سب نے مل کر اماں کی ناک کے نیچے کیا کھیل کھیلا ہے......" وہ چلّائی۔

"نہ رو آپا...... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...... ادھر زمرد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں!"

"کیا ہوا اسے؟" الماس نے آنسوؤں سے بھری نظر سے اسے دیکھا چاہے وہ کتنی بھی بری ثابت ہو جاتیں الماس نے انہیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھا تھا۔

"جو کچھ تمہیں ہوا ہے!" نیلم نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے تو اماں کی تکلیف اور دکھ کا سوچ کر رونا آ رہا ہے، کسی اور کو اس جیسی تکلیف کیسے ہو سکتی ہے؟" اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا......" نیلم کچھ کہتے کہتے رکی۔ "میرا مطلب اس کی حالت سے ہے، جو تمہاری طرح سے ہے!"

"کیا مطلب؟" الماس چونکی مگر کچھ سمجھ نہ سکی۔

"وہ بھی......"

"کچھ پھوٹو گی بھی منہ سے یا پہیلیاں ہی بجھواتی رہو گی؟" الماس نے چڑ کر پوچھا۔

"اسے بھی کئی روز سے الٹیاں آ رہی ہیں آپا اور اسے شک...... بلکہ یقین ہے کہ......!"

"کیا بکواس کر رہی ہو تم...... کیسے ہو سکتا ہے یہ؟" وہ اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھی، کتنی بڑی کوتاہی ہوئی تھی اس سے جو اُن پر نظر نہیں رکھ سکی تھی۔

اماں کے لیے اس سے بڑی اور کیا قیامت ہوگی، وہ کیسے اس بات کو سن سکے گی...... ان تینوں پر تو اماں نے خاص محنت کی ہے تاکہ یہ بالکل خاص ہوں اور ان کے پاس وہ ہتھیار ہوں جو کسی کی سانس روک دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ میں اماں کے اس دکھ کا کیا مداوا کروں؟ وہ خود سے پوچھ رہی تھی، زیادہ دیر نہیں لگی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

شجاع کا بخار ختم ہونے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا تھا، اسی دوران جہانگیر بھی ایک چکر لگا کر گیا تھا اور اس کے ساتھ رابعہ کی اماں بھی آ گئی تھیں اور شیر علی بھی۔ شیر علی کے امتحان سر پر تھے اور اس کا اسکول جانا ضروری تھا...... تین چار دن کے بعد اجازت لے کر ڈرائیور کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھیں جہاں سے انہیں زرتاج کو ساتھ لے کر گاؤں چلے جانا تھا۔ معراج بی بی

رابعہ کا خوف شیر علی اور اپنی ماں کے آ جانے سے قدرے کم ہو گیا تھا اور یوں بھی اپنی شعوری کوشش کے باعث وہ شجاع کا سامنا ہی نہ کرتی تھی۔ جہانگیر دنوں باپ کے قتل کی تحقیقات کے باعث مصروف تھا، شہر آتا بھی تو الجھا ہوا ہوتا۔ اس رات بھی وہ دیر تک اپنی پھوپی (رابعہ کی ماں) کے پاس دیر تک بیٹھا رہا تھا اور مقدمے کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں بتا رہا تھا، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی میں اس کے پاس اپنے ہر

چھوٹے بڑے مسئلے کے سلسلے میں آنے والے لوگ، اس سے دوستی کے دعوے کرنے والے...... یوں اس کے آنکھیں موندتے ہی طوطا چشمی کریں گے۔

نور علی اور اس کے بیٹوں کی دہشت، اس کے ترلے منتوں سے کہیں زیادہ تھی۔ نہ صرف اس کے بلکہ تفتیشی افسر کے سامنے بھی انہوں نے اس واردات کے عینی گواہان ہونے کا اعتراف کیا تھا مگر یہ بات بھی اسی وقت واضح کر دی تھی کہ وہ عدالت میں کوئی گواہی نہیں دیں گے۔ تفتیشی افسر نے ذرا زور زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے بیان سے اس کے سامنے بھی پھر گئے تھے۔

"تم پریشان نہ ہو بیٹا...... میرا بھائی دنیا میں فرشتہ تھا، اس کو قتل کرنے والے اسی دنیا میں سزا پائیں گے، ہم اور تم دیکھیں یا نہ دیکھیں مگر دنیا دیکھے گی!"

"مگر پھوپی اماں...... میرے دل کو بڑی بے چینی ہے کہ بابو جی کا قتل کر کے ان کے قاتل دندناتے پھریں اور ہم کچھ نہ کر سکیں!" اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

"جانتی ہوں بیٹا! صرف تم ہی نہیں ہم سب بھی بہت بے چین ہیں مگر کیا کیا جائے...... انتقام لینے کا ارادہ کرو تو بھی اپنے ہی بھینٹ چڑھتے ہیں!"

"یہی تو میں نہیں چاہتا پھپو...... اور پھر ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیسے لے سکتے ہیں؟"

"بہتر یہی ہے کہ گواہوں کو کسی نہ کسی طرح مناؤ!"

"وہ اپنی جان و عزت کی خاطر ڈرتے ہیں پھپو...... کوئی اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کو تیار نہیں!"

"ہم شجاع کو ہمیشہ غلط کہتے اور سمجھتے ہیں مگر میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت ہمیں اس کی بہت ضرورت ہے!" رابعہ کی ماں ریشم نے کہا۔

"کس لیے پھپو؟" کچھ نہ سمجھتے ہوئے جہانگیر نے پوچھا۔

"نور علی اور اس کے بیٹوں کے خوف سے لوگ گواہی دینے کو تیار نہیں ہو رہے، مگر شجاع کا گاؤں میں ہونا انہیں تقویت دے گا کہ ان کی پشت پر بھی کوئی ایسا ہے جو نور علی اور اس کے بیٹوں کی ٹکر کا ہے......"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھپو، مگر میں نے شجاع کو اس سارے قصے سے اسی لیے تو باہر رکھا ہے کہ بات بڑھ نہ جائے!"

"میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شجاع انتقام لے۔ مگر شجاع کے گاؤں میں ہونے سے نور علی اور اس کے بیٹوں کی ہیبت کم ہو جائے گی...... اگر ایک قتل پر کچھ نہ ہوا اور وہ سستے چھوٹ گئے تو ان کا اگلا نشانہ کوئی بھی ہو سکتا ہے، ان لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز ہے نہ انہیں اپنے پیارے اور خونی رشتوں کا کوئی احساس......"

"میں ڈرتا صرف اس بات سے ہوں کہ شجاع جذباتی ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ خود کو خطرے میں ڈال لے یا قانون کو ہاتھ میں لے لے......"

"مجھے یقین ہے کہ تم اسے ساری بات بتاؤ گے اور اسے سمجھاؤ گے تو وہ سمجھ جائے گا، اسے بھی علم ہے کہ ہم نے اتنا نقصان اٹھایا ہے مزید نقصان کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے اور پھر بھابی جان سمجھائیں گی اسے!"

"چلیں دیکھتا ہوں، اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو میں کچھ دنوں میں آ کر اسے لے جاؤں گا!" ریشم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ جذباتی سا ہو گیا...... "پھپو...... مجھے تو خود یقین آتا ہے نہ صبر، میں کسی کو کیسے صبر کرنے کو کہوں، سب ٹوٹے بکھرے ہوئے ہیں، اماں، شجاع، رابعہ، شیر علی...... آپ!"

"حوصلہ کرو میرے بیٹے...... تم تو بہت بہادر ہو، تم نے اب لالہ جی کی گدی سنبھالنی ہے، ان کی جگہ اس خاندان اور اس گاؤں کے لوگوں کا خیال رکھنا ہے!" اس کا سر انہوں نے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ "میرا بچہ!" باپ کی موت

کے بعد پہلی بار اس کا غم آنسو بن کر اس کی آنکھوں کے بند توڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

"تم نے تو مجھے اور بچی کو مارنے کا پورا بندوبست کر دیا تھا عباس......" اس نے اس کے کندھے دباتے ہوئے شکوہ کیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ "میں تو کمزوری سے بے ہوش پڑی تھی جب محلے والوں نے باہر سے تالا کھول کر ہمیں قید سے نجات دلائی تھی......" اس نے اس کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

جانے اماں مجھے معاف کریں گی کہ نہیں؟ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا...... ان کا دل بہت بڑا ہے اور وہ مجھے فوراً معاف کر دیں گی۔ جانے اماں نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہو گی مگر کہاں ڈھونڈتیں، ہم نے تو جانے کتنے ہی ٹھکانے بدلے ہیں۔ میں نے ان کا کتنا دل دکھایا ہے...... سوچ سوچ کر وہ نادم ہوتا۔

زہرہ نے اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود محلے میں لوگوں کے گھروں میں چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے گھر کا چولہا جلانے کی کوشش جاری رکھی۔ محلے والے غریب جان کر یوں بھی مدد امداد کر دیتے تھے اور اب تو عباس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے نے لوگوں کو عباس کا برا اور رویہ بھی بھلا دیا تھا۔

میں نے خواہ مخواہ زہرہ پر اتنی پابندی لگا رکھی تھی، اسے گھر میں قید کر دیتا تھا، جو میں مر جاتا تو وہ تب بھی تو جو چاہے کرتی پھرتی...... میں کون سا پلٹ کر آ کر اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس حادثے نے نہ صرف اس کا ذہن تبدیل کیا تھا بلکہ اس کا اعتبار بھی بادلِ ناخواستہ سہی مگر زہرہ پر تھوڑا سا قائم ہوا تھا۔

کچھ اس تکلیف کے دوران زہرہ نے اس کی اتنی خدمت کی تھی کہ وہ اس کی قدر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اللہ کا کرم اور ڈاکٹروں کی محنت اور زہرہ کی دعائیں...... ان سب نے مل کر اسے ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑا تو کر دیا تھا مگر اب وہ مزدوری کی مشقت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو کر...... اس کمزور اور نحیف سی کلثوم نے ایک بچے کو جنم دیا تھا جس کی صحت بھی ماں کی صحت سے بڑھ کر نہ تھی۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ماں کو اچھی خوراک ملی تھی نہ آرام جس کے باعث بچہ بھی کمزور سا تھا اور ماں بھی۔ مگر کلثوم کی خوشی دیدنی تھی، وہ معراج کے گھر پر ہی تھی، معراج نے اس کے گھر جا کر زچگی کروانے سے انکار کر دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ وہیں آ جائے۔ اپنی پڑوسن کی مدد سے وہ معراج کے گھر پر ہی آ گئی تھی، وہیں بچہ پیدا ہوا تھا، معراج نے کلثوم کا اتنا خیال رکھا کہ اس کی ماں بھی ہوتی تو اس کا اسی طرح خیال رکھتی۔ زرتاج اپنی سہیلی کی حالت دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی مگر بچے کی ولادت خیریت سے ہو جانے پر بہت خوش تھی۔

"اس کے باپ کم بخت کو اطلاع کروانا ہو گی...... مگر اس وقت کیا فائدہ۔ آدھی رات بیت چکی ہے یوں بھی وہ نشہ کر کے پڑا ہو گا!" معراج نے اپنا غصہ نکالا تھا۔ زرتاج نے دودھ گرم کر کے اس میں دیسی گھی ملایا اور زبردستی کلثوم کو پلایا۔ بچے نے رو کر اپنی بھوک کا اظہار کیا، معراج نے پہلے کلثوم کو اس کے لیے گھٹی دی، جو کلثوم نے اصرار کر کے زرتاج کے ہاتھوں سے دلوائی اور پھر اللہ کا نام لے کر بچے کو دودھ پلانا شروع کیا۔ بچہ اس کی آغوش میں ہی سو گیا تھا، اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے۔ معراج نے اسے تسلی دی اور رونے سے منع کیا۔

"اچھا چلو بتاؤ اس کا نام کیا سوچا ہے تم نے؟" زرتاج نے اس کا دھیان بٹانے کو کہا۔

"مجھے تو کبھی یہ سوچ ہی نہیں آئی کہ یہ دنیا میں آ بھی سکے گا اور آ گیا تو اسے کوئی نام بھی دینا ہو گا!"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا؟" زرتاج نے بے یقینی سے کہا، ابھی چند دن قبل ہی تو وہ شہر سے لوٹی تھی جہاں اس کی چھوٹی ممانی کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی تھی اور ہمہ وقت مختلف ناموں پہ بحث ہوتی رہتی تھی۔ وہ لوگ انگلینڈ سے آئے تھے اس لیے ممانی کو تو یہ بھی علم تھا کہ بیٹا آنے والا تھا۔ مگر زرتاج کو یہ بھی علم تھا کہ شہر اور انگلینڈ میں بہت فرق

تھا اور اسی طرح گاؤں اور شہر میں بھی۔

"جو نام تم بتاؤ گی یا ماسی، وہی رکھ لیں گے!" کلثوم نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں اچھا سا نام سوچ کر بتاؤں گی!" زرتاج نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں مزے کی ایک بات بتاؤں کلثوم......" زرتاج نے اس سے کہا۔ "میرے ماموں لندن سے آئے ہیں، تین ماہ کے بعد ان کے ہاں بچے کی ولادت متوقع ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں پر ایسی مشینیں ہیں جن کے ذریعے انہیں یہ علم ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں بیٹا ہو گا!"

"ہیں...... کیا واقعی؟" حیرت سے کلثوم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟" معراج نے حیرت سے پوچھا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"واقعی اماں...... سچ کہہ رہی ہوں!" زرتاج نے جوش سے کہا۔ "اور انہوں نے تو سب کے ساتھ مل کر اس کا نام بھی سوچ کر فیصلہ کر لیا ہے اور اب سب لوگ اس آنے والے بچے کو اسی نام سے پکارتے ہیں......"

"یہ موئی میموں کے چوچلے بھی عجیب ہی ہیں، جانے کیسی کیسی کفر کی باتیں کرتی ہیں!" معراج نے خفگی سے کہا، انہیں یہ بات بہت بری لگی تھی۔

"ایسا نہیں کہتے اماں! انہوں نے ماموں سے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور باقاعدگی سے نماز بھی پڑھتی ہیں اور باقی سارے احکامات کی پابندی بھی کرتی ہیں۔ سچ اماں...... ہم سب کا روزہ ہوتا تھا اور انہیں معافی تھی مگر وہ ہم سب کے ساتھ اٹھ کر سحری کھاتی تھیں اور دن بھر کچھ نہیں کھاتی تھیں، اگر کچھ کھاتی بھی ہوں گی تو کسی کو علم بھی نہیں ہوتا تھا!" زرتاج نے تفصیل سے اپنی ممانی کی تعریف کی۔

"اچھا؟" کلثوم بہت متاثر ہوئی تھی۔ "ان کا نام کیا ہے؟"

"ان کا اسلامی نام عائشہ ہے!" زرتاج نے کہا۔ "اور وہ اس پر بہت فخر محسوس کرتی ہیں!"

"اور ان کے بیٹے کا کیا نام ہو گا، آنے والے بیٹے کا؟" کلثوم نے تجسس سے پوچھا۔

"اس کا نام......" وہ ہنسی۔ "اس کا نام حاتم ہو گا، انشاء اللہ!"

"بہت پیارا نام ہے......" کلثوم نے تعریف کی۔

"تو یہ کیسا اسلام قبول کیا ہے اس نے اور اسے شرم نہیں آتی یوں سب کے سامنے اشتہار لگاتے ہوئے؟" معراج نے ناراضی سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے اماں کہ ماموں کے ہاں ان کی شادی کے کتنے برسوں کے بعد اولاد کی امید بندھی ہے اور اس لیے وہ بہت پُرجوش ہیں، کسی کی خوشیوں میں ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تنقید نہیں کرتے!"

"اچھا اب تم مجھے نہ زیادہ سمجھاؤ......" معراج نے کہا۔

"جب سب لوگ بہت سے نام تجویز کر رہے تھے تو مجھے جواد نام بہت اچھا لگا تھا!" زرتاج نے کہا۔ "میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ کلثوم کے اس چھوٹو کا نام ہم جواد رکھ لیں؟"

"ارے رہنے دو...... ایسے لگتا ہے کہ جیسے کوئی بڑا سا آدمی ہو!" معراج نے فوراً اس تجویز کو جھٹلایا۔ "اچھا چلو جو نام بھی کلثوم کو پسند ہو......" معراج نے کہا۔

"بہت پیارا نام ہے ماسی اور آسان بھی، بس یہی رکھ لیتے ہیں......" کلثوم نے فوراً کہا۔

"اس کا مطلب ہے، سخی!" زرتاج نے کلثوم کو بتایا۔

"بہت اچھا مطلب بھی ہے اس کا......" کلثوم نے پیار سے اپنی گود میں سوئے ہوئے، ہونٹ بسورتے بچے کو دیکھا، جس نے اسے چند گھنٹوں میں ہی سمجھا دیا تھا کہ کلثوم کی زندگی کا کوئی مقصد تھا۔ "جواد......" وہ زیرِ لب بڑبڑائی،

اس کے سارے وجود میں سرشاری کی لہر دوڑ گئی۔ زرتاج نے اس کی طرف دیکھا اور حیران رہ گئی، کیسے اس عورت کی زندگی کی ساری پریشانیاں اور زندگی کے مسائل پس پشت چلے گئے تھے، صرف ممتا کا نور اس کے چہرے پر نظر آ رہا تھا اور محبت کا سمندر اس کے وجود میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

☆☆☆

آنکھیں موند کر اس نے دعا کی اور محسوس ہوا کہ اس کا اللہ اس کے پاس ہے، وہ اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا، اس نے صرف چند لمحے سوچا اور آنکھیں کھول دیں۔

''آپ یقیناً پرویز کے دوست ہیں.....'' اس نے بات کرتے ہوئے ذرا سا ہچکچا کر خود کو اس شخص سے بچایا جو کسی بری نیت سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ''پرویز نے آپ سب کی بہت تعریف کی ہے اور آپ لوگوں کے لیے چائے کے لیے لوازمات لینے کے لیے گئے ہیں.....'' اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ ان تینوں کے سامنے مزاحمت میں کامیاب نہیں ہو سکے گی اس لیے کسی نہ کسی طرح انہیں باتوں میں لگا کر اپنی حکمت عملی مرتب کرے۔

''اچھا..... پرویز نے بتایا ہے تمہیں؟'' وہ خباثت سے ہنس کر پوچھ رہا تھا۔

''تو پھر کیسے لگے ہم لوگ تمہیں؟'' مریم کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''آپ لوگ آئیں نا، آپ کا اپنا گھر ہے!'' اس نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا۔ ''میں سمجھی کہ آپ سب کی بیویاں بھی آپ کے ساتھ ہوں گی.....''

''تمہارے ہوتے ہوئے ان کی کیا ضرورت ہے!'' اس نے ایک آنکھ بھینچ کر کہا تھا۔

''چلو جی.....'' ایک نے کہا۔ ''چلتے ہیں اندر، اپنا ہی تو گھر ہے.....''

''جس طرح تیری مرضی یار..... تو استاد ہے!'' باقی دونوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ ''چلو بھابی جی، اندر چلتے ہیں!'' مریم نے خاموشی سے اس کی تقلید کی اور ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔

''چائے بناؤں آپ کے لیے بھائی صاحب؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں..... کیوں نہیں!'' ایک نے ٹانگیں صوفے پر پھیلائیں اور دوسرے کو آنکھ مار کر اشارہ کیا کہ وہ مریم کے ساتھ باورچی خانے میں چلا جائے۔ مریم چائے بناتے ہوئے ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح بیرونی دروازے تک جا سکے یا کسی اور طرح بھاگنے کی کوشش کرے۔

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ''میرے اللہ نے میری سن لی!'' وہ بڑبڑائی، اس نے چونک کر مریم کی طرف دیکھا اور مریم نے اس کی طرف..... ''پرویز ہوں گے، چائے کا سامان لینے گئے تھے، میں دروازہ کھولتی ہوں!''

''چپکی کھڑی رہ.....'' اس نے اسے ڈپٹا۔ ''میں دیکھتا ہوں، خبردار جو تم باورچی خانے سے باہر آئیں یا کوئی آواز نکالی.....'' اسے دھمکا کر وہ باہر نکلا تو مریم کا ذہن اور ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے، اس نے فوراً باورچی خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا لی، بڑی سی میز کو جلدی سے کھینچ کر دروازے کے آگے رکھا اور اس پر وزنی چیزیں رکھنے لگی، مٹی کے تیل والے چولہے کی تیل والی ٹنکی اٹھا کر اس میز اور دروازے پر تیل ڈالا اور اگلے ہی لمحے باورچی خانے کے اندر آگ کے شعلے لپکنے لگے۔

آگ کی لپٹیں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھیں، اندر ایک کونے میں مریم دم سادھے زمین پر بیٹھی تھی، اسے اس وقت کا انتظار تھا جب آگ اس تک پہنچ کر اس کے اس وجود کو جلا ڈالنے جسے پامال کرنے کو تین شکاری باہر کھڑے تھے، وہ اللہ سے مدد کی بھیک مانگ رہی تھی..... اور تھا بھی کون جس سے مانگتی!

☆☆☆

شجاع کے لیے خود کو شہر میں روکے رکھنا ممکن نہ تھا، اسے اندازہ تھا کہ گاؤں میں جہانگیر یقیناً مقدمے کی کارروائی

میں مصروف ہو گا مگر اس کے اندر تو اور ہی طرح کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ تو اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا چاہتا تھا بلکہ اس کا ارادہ تھا کہ شیر علی اس تمام کارروائی میں اس کے ہمراہ ہو۔ جہانگیر اس کے گاؤں واپس جانے پر تو مان گیا تھا، اس میں زیادہ ہاتھ ریشم پھپھو کا تھا جنہوں نے جہانگیر کو سمجھایا تھا اور وہ اسے گاؤں لے جانے پر تیار ہوا تھا ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ جب تک ممکن ہوا سے شہر میں رکھے۔ اس کے گاؤں جانے کے فیصلے سے سب سے زیادہ خوشی اور سکون رابعہ کو ملا تھا۔ شیر علی کے سالانہ امتحانات بھی سر پر تھے جو کہ اس کے گاؤں نہ جانے کا بڑا اہم جواز تھے، شجاع نے سوچا کہ اسے اس کے امتحانوں کے بعد لے کر جائے گا۔

رابعہ کی اماں کو بھی واپس جانا تھا اس نے جہانگیر سے کہا کہ وہ بے فکر ہو کر جائیں، مگر اس کی اماں کو اس بات سے اختلاف تھا۔ وہ اسے یوں اس حالت میں اکیلا چھوڑنے کے حق میں نہ تھیں.....

''آپ جائیں بے فکر ہو کر اماں! چند دنوں تک میں زرتاج کو بلوا لوں گی!'' اس نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی، وہ بھی جانتی تھی کہ معراج نبی کی اس طرح زرتاج کو بھی اکیلے شہر نہ بھیجیں گی۔

''اماں بھی عدت میں ہیں.....'' جہانگیر نے کہا۔

''اچھا، میں نادرہ سے بات کروں گی اگر وہ چند دنوں کے لیے آ جائے، جب تک جہانگیر واپس نہ آ جائے، لالہ جی کے چالیسویں کے وقت تک.....''

''ٹھیک ہے اماں!'' رابعہ نے ماں سے کہا اور یوں وہ ذرا اطمینان سے واپس لوٹیں۔ گاؤں تک کے سفر میں جہانگیر نے مختصراً شجاع کو مقدمے کی بابت بتایا۔

''آپ ہی چاہتے تھے کہ اس مسئلے کا قانونی حل ہونا چاہیے، میں جانتا ہوں لالہ جی کہ اس طرح کے لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے.....'' اس نے غصے سے لال ہوتے ہوئے چہرے سے کہا۔

''میں کسی قسم کا دنگا فساد نہیں چاہتا شجاع.....'' جہانگیر نے سر نڑش کی۔

''لالہ جی..... دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ دس لوگوں کے سامنے میں اپنے باپ کے قاتلوں کو ماروں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی کوئی میرے خلاف گواہی دینے کو تیار نہ ہو..... پھر میں ان لوگوں کو دیکھوں!'' اس کی آواز میں جوش تھا جو جہانگیر کو خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

''تم بہت زیادہ جذباتی ہو رہے ہو.....''

''لالہ جی، جس آگ میں جل رہا ہوں، اس کی تپش سے آپ واقف نہیں ہیں!''

''مجھے اس سے میرے بھائی! میں اب بھی کوئی غیر قانونی قدم اٹھانے کو تیار نہیں، تمہیں گاؤں بلانے کا فقط ایک مقصد ہے کہ تم چشم دید گواہوں کو کوئی ضمانت دو تا کہ وہ گواہی دینے کو تیار ہو جائیں.....''

''گواہی تو ان کا باپ بھی دے گا لالہ.....'' اس نے جوش سے کہا۔ ''مجھے صرف یہ بتا دیں کہ کون لوگ ہیں جنہوں نے یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اگر ایسا کوئی آدمی نہیں بھی تو مجھے بتائیں لالہ کہ کتنی گواہیاں میرے باپ کے قاتلوں کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوں گی؟''

''جب سچے گواہ موجود ہیں تو کسی جھوٹی گواہی کی کیا ضرورت ہے!'' جہانگیر نے کہا۔

''میں جلد از جلد اپنے باپ کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کو اپنے انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں قانون کو ہاتھ میں لے رہا ہوں یا قانون مجھے ہاتھ میں لیتا ہے.....'' اس نے جس عزم سے کہا تھا اس نے جہانگیر کو اس پچھتاوے میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ خواہ مخواہ اسے شہر سے گاؤں لے آیا ہے۔

☆☆☆

سیما کو سلمٰی کے پاس چھوڑ کر شاذ کر چند دنوں کے لیے اپنی دونوں بہنوں سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ مگر شاذ کر بہت سی

باتیں دونوں بہنوں سے چھپا گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر جب سب لوگ لیٹنے کو چلے گئے تو دونوں بہنیں بھائی کے پاس آبیٹھیں۔

”اب تم شادی کرلو شاکر......“

”آپ لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی اور بات آتی ہے کہ نہیں؟“ وہ ہنسا تھا۔

”ہم دونوں گئے تھے گاؤں تمہاری خیریت پوچھنے کو......“

”اچھا، کب؟“ شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہاں تمہارا گھر بند تھا تو ہم معراج خالہ کی طرف چلے گئے تھے، زتاج کو بھی دیکھا ہم نے!“

”اچھا؟“ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”کیسی تھیں خالہ؟“ بے چینی کے باوصف وہ ان سے سیدھے سبھاؤ زرتاج کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا۔

”خالہ تمہاری طرف سے پریشان بھی تھیں اور گاؤں کے حالات سے خوفزدہ اور چاہ رہی تھیں کہ تم جب بھی لوٹو تو وہ زرتاج کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں!“

”کیسی لگی زرتاج آپ لوگوں کو؟“ اس نے ان سے سوال کیا۔

”بہت پیاری ہے لالہ! سچ میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ فوراً سے پہلے اسے اپنے گھر لے آؤں!“ چھوٹی بہن نے کہا۔

”بس اب کوئی بہانہ چلے گا نہ عذر......“ بڑی بہن نے کہا ــــ ”کسی ماں کی جوان بچی یوں گھر میں بیٹھی ہو تو اسے پریشانی تو ہوتی ہے نا اور پھر تمہیں علم ہے کہ گاؤں کے چوہدریوں نے کیا گند مچا رکھا ہے!“

”سب جانتا ہوں آپا! مگر شہر میں کاروبار جمانے میں مجھے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ اب کام چل نکلا ہے تو پہلی فرصت میں گاؤں جاؤں گا اور سارے معاملات طے کرلوں گا!“

”میں سونے کے کنگن لوں گی بھیا!“ چھوٹی بہن نے کہا۔

”ہاں وہ تو دونوں بہنوں کا حق ہے، ضرور ملے گا......“ نکلتے وقت اس نے کچھ رقم دونوں بہنوں کو زبردستی تھمادی، جانتا تھا کہ ان کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ کافی تحائف لایا تھا مگر پھر بھی نقد رقم ان کی کئی ضرورتیں پوری کرسکتی تھی۔

”جب میرا گاؤں جانے کا پروگرام بنے گا تو آپ لوگوں کو خط لکھوں گا، آپ لوگ بھی جائیں تو خالہ سے بات کر لیں گے!“

”جس طرح تم کہو گے میرے بھائی!“ بڑی بہن نے وعدہ کیا، ”کیا رکو گے نہیں آج؟“

”نہیں رک سکتا آپا، کام بہت ہے......“ چاہتے ہوئے بھی وہ بہنوں کو اپنے راز میں شریک نہیں کرسکا تھا۔ وہ ان سے رخصت ہوکر آیا اور واپسی کے سفر میں انہی خیالوں میں رہا کہ اگلا مرحلہ اب اس کی اپنی شادی کا ہے جس کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ انہی سوچوں میں گم اسے نیند آنے لگی اور چھم سے سیما کا خیال آ گیا جانے سلمٰی آپا کو تنگ نہ کررہی ہو...... یہ میں کیوں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بارے میں اسی طرح سوچتا ہے جیسے کہ وہ اس کی بیٹی ہو، اتنے عرصے سے وہ اس کے ساتھ تھی...... اتنا عرصہ تو جانور بھی ساتھ ہو تو اس سے مانوسیت ہونے لگتی ہے۔

”کتنا اچھا لگتا ہے جب وہ اپنی توتلی سی آواز میں مجھے ابا کہتی ہے......“ وہ سوچ کر مسکرایا۔

☆☆☆

باہر کوئی محلہ دار تھا اور نیاز دینے کے لیے آیا تھا، اس نے حیرت سے اس مکروہ صورت آدمی کو دیکھا جو اس سے قبل کبھی اس محلے میں نظر نہیں آیا تھا۔

”کیا آپ اس گھر میں رہتے ہیں؟“ آنے والے نے پوچھا۔

”نہیں تو...... ہاں ہاں!“ دروازہ کھولنے والا سٹپٹا گیا تھا۔

”اور کون کون رہتا ہے اس گھر میں؟“

”تم نیاز دینے آئے ہو یا تفتیش کرنے؟“ اس نے جھلا کر کہا۔

”لڑنے کو کیوں آرہے ہیں بھائی صاحب، محلے دار ہوں، پوچھ رہا ہوں!“ آنے والے نے تحمل سے کہا......

”چلو جاؤ اب، برتن بعد میں آ کر لے جانا!“ اس نے اسے ٹالا۔

”برتن تو مجھے ابھی چاہیے......“ اس نے جان بوجھ کر کہا۔

”پکڑو یار اسے، ابھی واپس لے جاؤ......“ اس نے بدتہذیبی سے برتن اسے لوٹاتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں نہیں...... میرا ہرگز یہ مقصد نہ تھا!“ اس نے فوراً صفائی دی۔ ”یہ آپ کے سامنے والے کمرے سے دھواں کیوں نکل رہا ہے؟“ گھبرا کر اس نے مڑ کر دیکھا اور چیخ کر اندر والوں کو پکارا۔

”رشید...... غفور...... بھاگو!“ پڑوسی کو فوراً اندازہ ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہے ورنہ اگر کسی آدمی کے گھر میں آگ لگی ہو تو وہ بجائے آگ بجھانے کے کیا بھاگنے کا کہتا؟ اس نے باہر گلی میں کھڑے کھڑے چلا چلا کر لوگوں کو متوجہ کیا اور جونہی یہ تینوں گھر سے بھاگنے کو نکلے، لوگوں نے انہیں مکوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اندر سے ڈری ڈری نسوانی چیخوں کی آواز نے انہیں معاملے کی سنجیدگی کا احساس دلایا۔

”دروازہ کھولو بہن......“ ایک نوجوان نے کہا۔ ”ہم تمہاری مدد کو آئے ہیں!“

”کون ہو تم لوگ؟“ مریم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

”ہم تمہارے ہمسائے ہیں، دروازہ کھولو......“

”میں دروازے تک نہیں پہنچ سکتی......“ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”اندر ہر چیز کو آگ لگ چکی ہے!“ اس کی آواز سے اردگرد سنسنی پھیل گئی، آگ کے شعلے بڑھتے ہی چلے جارہے تھے۔

”دروازہ توڑ دو......“ ایک آواز آئی اور اندر مریم کا دل دھڑ دھڑانا شروع ہوگیا۔

☆☆☆

وہی عباس تھا جو ہر روز زہرہ کو تالے میں بند کر کے جاتا تھا اور اب ہر روز زہرہ اسے گھر پر چھوڑ کر کام کرنے کو جاتی تھی، نہ نکلتی تو گھر میں فاقوں کی نوبت آجاتی۔

چند دن کے بعد جب لوگوں کا ترس کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا تو گھر میں ٹھنڈا چولہا زیادہ شدت سے ٹھنڈا لگنے لگا، ”اب کیا ہوگا؟“ خاموش نگاہوں سے وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے، مگر کوئی جواب نہ پاتے۔ ابھی تو یہ بھی شکر تھا کہ عباس کے علاج کے اخراجات اس تعمیراتی کمپنی نے اٹھائے تھے جہاں وہ کام کرتا تھا، ورنہ ان سے تو علاج کروانا بھی ممکن نہ ہوتا۔ ”میں کچھ کام وام کرلوں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے عباس سے پوچھا تھا۔ عباس نے جس نظر سے اسے دیکھا تھا، وہ اندر تک سہم گئی تھی۔

”تم کیا کام کرو گی؟“ اس کے لہجے میں شکست تھی۔

”کچھ بھی کرلوں گی!“ اس نے نظر نیچی کی، عباس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی تاب کہاں تھی اس میں۔

”ہے بھگوان......“ اس نے سوچا۔ ”عباس کو جلد ٹھیک کردے!“ جب بھی وہ کسی مصیبت میں ہوتی، اسے مانگنا فقط بھگوان سے ہی آتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کررہی تھی، شکر ہے کہ اس کی بڑبڑاہٹ عباس نے سنی تھی نہ وہ اس کی سوچوں تک رسائی رکھتا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ عباس نے پوچھا۔

"دعا کر رہی تھی تمہارے لیے......" اس نے کہا۔ "اللہ تمہیں صحت دے، جلد ہی تم اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ!"

"کیوں...... تم میری مٹھی چاپی سے تھک گئی ہو؟" طنز میں ڈوبا ہوا انداز، سڑا ہوا لہجہ...... "دفع ہو جاؤ تم کہیں اگر تمہیں بوجھ لگنے لگا ہوں میں!"

"میں نے یہ کب کہا......" آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"جانتا ہوں، سب جانتا ہوں......" اس کی آواز میں بھی کچھ بھیگا بھیگا سا تھا۔ "بوجھ بن گیا ہوں میں تجھ پر، تنگ آ گئی ہے تو میری بیماری سے......"

"نہیں نہیں...... بالکل نہیں عباس......" اس نے اٹھ کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "کاش میں اپنا دل چیر کر تمہیں دکھا سکوں، میں تو تمہیں دیکھ کر جیتی ہوں!" عباس کو دل سے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر وہ اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔

"روٹی ملے گی کیا؟" اس نے ایک بالکل بے تکی سی بات کی۔ زہرہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور رسوئی کی طرف بڑھی۔

"تو پھر میں کہیں کام کے لیے چلی جایا کروں؟" اسے روٹی دے کر وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھی تھی۔

"کہاں؟" اس نے روٹی سے دھیان بھی نہ اٹھایا تھا۔

"ساتھ والی خالہ سے کہوں گی تو وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیں گی!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیا کام آتا ہے تجھے؟" اس نے سوال کیا۔

"مشین پر سیدھا سادہ سلائی کا کام تو آتا ہے مجھے، مگر آہستہ آہستہ ہاتھ کھل جائے گا، تب تک کوئی اور کام کر لوں گی!"

"اور کیا کام؟" اس نے جرح کی۔

"یہ تو خالہ سے بات کر کے ہی علم ہوگا نا کہ وہ کیا کام دلوا سکتی ہیں؟" اس نے اپنے اندر ابھرنے والے غصے کو دبایا۔

"اچھا اس سے پوچھنا، پھر مجھے بتانا...... میں پھر ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا!" اتنے شاہانہ انداز سے کہہ رہا تھا جیسے کوئی نواب ہو اور اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔

"ٹھیک ہے!" اس سے بہتر اور تسلی بخش جواب اس کے پاس اور کوئی نہ تھا۔

"اور ہاں......" اس نے کہا، "کوئی ایسا کام نہ ہو جہاں تو آدمیوں سے آنکھ مٹکے کرتی پھرے!" اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جو عورت اس کی خاطر اپنے اتنے پیار کرنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر آ گئی تھی، اب اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ بھی جا سکتی تھی...... "میں کبھی قابلِ اعتبار نہ ٹھہروں گی عباس تمہاری نظر میں!" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

"کیسا پیارا ہے کلثوم تمہارا بیٹا......" زرتاج نے اسے گود میں اٹھا رکھا تھا۔

"پیارا تو ہے مگر ہے کیسا بدقسمت کہ جس کے باپ کو علم ہی نہیں کہ اس کا بیٹا پیدا ہوا ہے!" کلثوم نے کہا۔

"پتا نہیں کم بخت کہاں جا مرا ہے......" معراج بی بی نے غصے سے کہا۔

"آپ نے کسی سے کہہ کر پتا کروایا ہے ماسی؟" کلثوم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"کسی ایک سے نہیں کلثوم! میں نے بہت لوگوں سے پوچھا ہے پتر......" معراج نے کہا۔ "کسی نے اسے چند دن پہلے کچھ لوگوں کے ساتھ دیکھا تھا جو اس گاؤں کے نہیں تھے!"

"تو کون لوگ تھے وہ؟"

"ہوں گے کوئی اسی کی طرح کے نشئی......" معراج نے تسلی دی۔ "تو فکر نہ کر، جائے گا کہاں، لوٹ کر یہیں آئے گا نا!"

"وہ تو ہے ماسی، مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں، جانتی ہوں میں کہ تو کیا سوچ رہی ہے، چپکی پڑی رہ، جب تک وہ نہیں آتا تو آرام سے یہیں رہ اور ٹھیک ہو جائے گی اور وہ لوٹ آئے گا تو تو چلی جانا!" اس کے بعد کلثوم کی بحث کرنے کی مجال نہ تھی، خاموش ہو گئی۔ اسے جواد زندگی کی ایسی خوشی بن کر ملا تھا کہ اسے سارے دکھ ہیچ نظر آ رہے تھے...... گھوٹو کی ساری زیادتیاں بھلا کر وہ دل سے منتظر تھی کہ ایک بار آ کر اپنے بیٹے کو دیکھے۔ شاید وہ اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ وہ سدھر جائے گا، بیٹے کو دیکھے گا تو اس کا دل خود بخود کام کرنے کو چاہنے لگے گا۔

"ماسی میں اپنے گھر چلی جاتی ہوں، ممکن ہے کہ وہ وہاں کسی نہ کسی وقت آ جائے، اگر وہ آئے تو اسے کیسے علم ہوگا کہ میں یہاں ہوں؟"

"سارا گاؤں جانتا ہے کہ تو یہاں ہے اور وہ کسی سے پوچھے گا تو اسے علم بھی ہو جائے گا!" معراج نے اسے گھُرکا۔

"مگر خالہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

"اگر مگر کیا لگا رکھی ہے تم نے؟"

"میں کب تک آپ پر بوجھ بن کر رہوں گی خالہ؟" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، آنسو جو ہر وقت اس کی پلکوں پر ستاروں کی طرح سجے رہتے تھے۔

"آفرین ہے بیٹا، شاباش...... میں تو تمہیں اپنی بیٹی کہتی ہوں اور تم نے بتا دیا کہ تم میری بیٹی نہیں ہو!" معراج نے تاسف سے کہا۔

"ارے نہیں خالہ...... ایسی بات نہیں ہے!" وہ شرمندہ سی ہو گئی اور اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ "مجھے معاف کر دیں خالہ اگر میں نے آپ کا دل توڑا ہے!"

"چل اب زیادہ ڈرامے بازیاں نہ کر، اس کو دودھ پلا...... ہر وقت چنختا رہتا ہے، پورا باپ پر پڑا ہے!" معراج نے بات ٹالی اور اسے اپنے ہمیشہ کے انداز میں ڈانٹا۔ زرتاج اور کلثوم کھلکھلا کر ہنسیں، جواد بلند آواز میں رو رہا تھا۔

معراج تو اصل بات جانتی تھی کہ گھوٹو کو اس کے کسی نشئی باز یار بیلی نے غصے میں آ کر کسی تیز دھار آلے سے قتل کر دیا تھا مگر یہ بات تو وہ لڑکیاں تب سن پاتیں جو وہ پچھلے کئی روز سے گھر سے باہر نکلی ہوں، کچھ قریبی لوگوں کو معراج نے منع کر دیا تھا کہ یہ خبر فی الحال کلثوم تک نہ پہنچے کہ اس کا دل دکھے گا، جیسا بھی تھا، تھا تو اس کا شوہر۔

☆☆☆

رانی کا غلیظ سا وجود لوگوں کو کسی بھوت کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس سے خوف کھانے لگے تھے اور اس کے سامنے آ جانے سے کتراتے اور اپنا راستہ بدل جاتے تھے۔ وہ ہر کسی سے سوال کرتی تھی، چوہدری اکبر علی کے بارے میں، لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا مجرم چوہدری اکبر علی ہے مگر کوئی اس کے لیے کیا کر سکتا تھا...... قدرت ہی اسے سزا دے سکتی تھی، اس کے گرد دائرہ تنگ ہو رہا تھا مگر کس وقت اس پر گرفت ہونا تھی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

چوہدری شجاع ایسا نہ تھا کہ وہ اکبر علی اور اس کے بھائی بابر کو اپنے باپ کا خون یوں ہضم کرنے دیتا، اس کے اندر کی آگ بھڑک رہی تھی۔

شکیلہ...... جو کبھی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اب دوسروں کے رحم و کرم پر پڑی تھی۔ فالج نے اس کے پورے جسم کو بری طرح متاثر کیا تھا، صرف اس کا ذہن کام کرتا تھا جس میں کبھی بھولے سے بھی اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی

مانگنے کا خیال تک نہ آتا تھا۔ کتنے جرائم، کتنی سازشیں اور کتنے قتل اس کے کھاتے میں درج تھے مگر اسے ان کا احساس تک نہ تھا، یہ احساس ہونا اور توبہ کی توفیق ...... اس کے نصیب میں نہ تھے۔

اس کا شوہر جو اپنے باپ جیسے بھائی کے جنازے پر بھی نہ گیا تھا، اسے کوئی ان دیکھا پچھتاوا گھیرے ہوئے تھا، کہیں بھی بیٹھا ہوتا تو اپنے وجود سے کوئی ان دیکھے تاگے کھینچ کھینچ کر نکالتا رہتا، یہ تاگے اس کے وجود سے لپٹے وہ گناہ تھے جن کا کوئی کفارہ تھا نہ ان معصوم اور مظلوموں کی آہیں اور چیخیں اسے اس سے نجات دلا سکتی تھیں۔

☆☆☆

کوئی گواہ تھا نہ کوئی بیان دینے والا ...... نہ کسی پر کوئی شک ظاہر کرنے والا۔ بظاہر تو یہی لگا کہ دونوں بھائیوں کے مابین جھگڑا ہوا اور دونوں نے بیک وقت فائر کیے کیونکہ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور انہی کی انگلیوں کے نشانات ریوالور پر پائے گئے تھے۔ پولیس کو تفتیش کے لیے کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا کیونکہ جن پر شک کیا جا سکتا تھا وہ تو اپنے باپ کے قتل کے مقدمے کی پیروی تمام تر قانونی تقاضوں کے مطابق کر رہے تھے۔ پولیس معمول کے سوالات جوابات کرنے کو آئی، دونوں بھائیوں سے کچھ سوالات کیے گئے اور تسلی بخش جوابات کے بعد روانہ ہو گئے۔

"تم نے ایسا کیوں کیا فیضی؟" جہانگیر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کیا سرکار؟"

"فیضی، میں نے تمہیں دس برس کی عمر سے لے کر اب تک دیکھا ہے، میں تمہاری ہر ہر حرکت کا مطلب سمجھتا ہوں ...... کاش تم ایسا نہ کرتے!" فیضی کے پاس اس کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، شجاع نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی کہ لالہ نے فیضی کو اس کا ذمے دار سمجھا تھا، اس پر شک نہیں کیا تھا۔ جہانگیر کیا کرتا، جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا اور شجاع کو نہیں جتلایا کہ وہ جانتا تھا کہ فیضی کس کے حکم کا بندہ تھا اور کس کے اشاروں پر اس نے یہ کام کیا تھا۔ گاؤں کے حالات اب اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہاں رہا جاتا، ہجرت کا وقت آن پہنچا تھا، اب گاؤں کی گدی شجاع کو ہی سنبھالنا تھی اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر تھا۔

"اصولاً تو تمہیں پولیس کی تحویل میں چلے جانا چاہیے فیضی ...... مگر میں اس کا فیصلہ شجاع پر چھوڑتا ہوں، ان معاملات کو وہ مجھ سے بہتر سمجھتا ہے ......" جہانگیر نے کہا تو شجاع کو اپنا آپ اہم محسوس ہوا۔

"اسے ایک موقع دے کر دیکھنا چاہیے لالہ جی، مجھے امید ہے کہ یہ اس کا آخری جرم ہوگا!" شجاع کی یقین دہانی پر اسے اعتبار کرنا ہی تھا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

"ماں جی کا خیال رکھنا شجاع ...... میں بھی آتا جاتا رہوں گا!"

"آپ فکر ہی نہ کریں لالہ جی ......" دونوں بھائی ایک عرصے کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملے تھے۔

"آپ شیر علی کا خیال رکھیں، اسے بہت بڑا آدمی بنانا ہے، اس کے اخراجات کی فکر نہ کریں یہ سب کچھ اسی کے لیے ہے۔"

☆☆☆

جہانگیر کے دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تو مدت کے بعد حویلی میں خوشیاں جاگیں، انہی خوشیوں کے بیچ عابدہ بیگم نے رابعہ کے کہنے پر ایک اور خوشی کی خواہش کا اظہار کیا۔ امید تو نہ تھی کہ وہ مانے گا مگر شاید وہ بھی اندر سے تبدیل ہو چکا تھا، ایک سادہ سی تقریب میں شجاع کا نکاح کلثوم سے کر دیا گیا۔ شجاع دنیا میں ہر شخص سے اکھڑ ہو سکتا تھا مگر اپنی ماں سے نہیں اور پھر انہوں نے اسے اپنی ممتا کا واسطہ دیا تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد ماں کو ہر وقت دکھ کی کیفیت میں دیکھتا تھا، اسے ماں کے چہرے کی مسکراہٹ کی یہ قیمت بڑی نہ لگی، بیاہ تو اسے کسی نہ کسی سے کرنا ہی تھا۔

ایک دفعہ اس کے دل میں آیا کہ وہ ایک برتی ہوئی عورت تھی مگر اگلے ہی پل جیسے اس کا اپنا ضمیر بول اٹھا۔ "تم کیا

ہو ......" باپ کی موت اور ذمے داریوں کے احساس نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔

اتنا کہ اس نے رابعہ کے پیروں میں گر کر اپنی غلطی کی معافی مانگی، رابعہ کا دل تو یوں بھی بہت بڑا تھا، اس نے اتنے برس اس بات کو اپنے شوہر سے بھی چھپایا تھا، اپنے ماموں کا مان رکھا تھا۔

"تم کلثوم کا خیال رکھنا، وہ بہت دکھی ہے ...... اس پر بہت ظلم ہوا تھا!" رابعہ نے اس سے درخواست کی۔ "اس کے بیٹے کو اپنے بیٹے جیسا نہ بھی سمجھ سکو تو اسے دھتکارنا نہیں، وہ ایک یتیم بچہ ہے، جس کا اس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں!" شجاع نے اس کی بات تحمل سے سنی اور وعدہ کیا کہ وہ اچھا شوہر اور اچھا باپ ثابت ہونے کی کوشش کرے گا۔ ماں کو شجاع اور کلثوم کے ساتھ چھوڑ کر وہ مطمئن ہو کر شہر لوٹے تھے جہاں ایک نیا جہاں ان کے لیے اپنی بانہیں وا کیے ہوئے تھا۔

☆☆☆

"اماں جب میں پچھلی دفعہ شہر آئی تھی اور امتحان دے رہی تھی تو امتحان کی ایک نگران مجھے بہت غور اور حیرت سے دیکھ رہی تھیں، بلکہ مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میرا نام کیا ہے اور میرا تعلق کہاں سے ہے۔" زرتاج ماں کو بتا رہی تھی۔

"ہوتی ہیں شکلوں جیسی شکلیں ......" معراج نے بے دھیانی سے کہا۔ "کئی لوگوں کو یوں بھی عادت ہوتی ہے ... خوامخواہ ایسے سوال کرنے کی اور شہر کی عورتیں تو یوں بھی جہاں پیاری شکل دیکھی، اس کا اتا پتا پوچھنے بیٹھ جاتی ہیں!"

"نہیں اماں ...... وہ ایسی نہیں لگتی تھیں اور ہاں یاد آیا ......"

"کیا یاد آیا۔" معراج نے پوچھا۔

"وہ پوچھ رہی تھیں کہ خوشحال نگر سے تمہارا کوئی تعلق ہے ......" زرتاج نے کچھ یاد آنے پر بتایا۔

"اچھا ......" معراج متوجہ ہوئی۔ "پھر تو تم پوچھتیں اس سے، شاید وہاں کی رہنے والی ہو!"

"آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ اجنبیوں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے!" زرتاج نے فوراً کہا۔

"اچھا چل اب باتیں چھوڑ اور اپنے امتحان کی تیاری کر ......" معراج نے کہا۔ "پڑھائی ختم ہوتے ہی اب تیری رخصتی ہونے والی ہے!" زرتاج شاکر کے تصور میں کھو گئی، جس کا چہرہ اب اسے کتابوں میں نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

"جالی ......" الماس نے اپنی ملازمہ کو بلایا۔ "جا ذرا دکان سے چوہے مارنے والی گولیاں تو لیتی آ، اب تو کمروں میں جا بجا چوہے نظر آنا شروع ہو گئے ہیں!"

"آپی میں کھیر بنا رہی ہوں، اماں نے خاص طور پر کہا تھا کہ بے پروائی نہ کرنا!"

"تو جا ...... میں دیکھ لیتی ہوں!" الماس نے اسے اٹھایا اور خود اس پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں ہی جالی چوہے مار گولیوں کا پیکٹ لے آئی۔

"دکان دار نے کہا ہے کہ آٹے اور چینی میں ملا کر جگہ جگہ رکھ لیں اور اپنے ہاتھوں کو نہ لگنے دیں، بہت زہریلی ہے ......" اس نے پیکٹ الماس کے حوالے کیا۔ "اب اٹھیں اور مجھے کھیر بنانے دیں!"

"کام میں کر لیتی ہوں جالی، تو میرے کپڑے تو ذرا مل کر سکھا دے ......" الماس نے اس سے کہا۔

"اماں مجھے جوتے ماریں گی جو انہوں نے آپ کو کام کرتے دیکھ لیا!" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"میں کہہ دوں گی اماں سے ...... تو فکر نہ کر، جا جلدی سے میرے کپڑے مل دے، میں کھیر پکا کر چوہوں کے لیے کھانا تیار کر دیتی ہوں وہ جگہ جگہ رکھ دینا ......" اس کی بات پر جالی کھلکھلا کر ہنسی۔ جالی کے جاتے ہی اس نے پیکٹ کھولا۔

"اماں ...... ہم سب نے تجھے بہت دکھ دیے ہیں، ہمیں جینے کا حق نہیں، کسی کو بھی نہیں، ہم میں سے جو بھی جوانی کی دہلیز کو چھوئے گی وہ تجھے اسی طرح دکھ دے گی، ہماری عمر کے تقاضے اور تیرے کاروبار کے تقاضے آپس میں میل نہیں کھاتے اماں ......" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کھیر میں اس نے اور بھی چینی کا اضافہ کر دیا تھا۔

پیالوں میں اس نے کھیر ڈالی، سادہ آٹے کی گولیاں بنائیں اور انہیں جالی کے حوالے کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے کھانے سے پہلے اس نے مصلیٰ بچھایا اور اپنے اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی، اپنے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگی جو وہ کر چکی تھی اور جو وہ کرنے جا رہی تھی۔

رات کے کھانے کے لیے بلاوا آ رہا تھا، سب اس وقت اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد سب کو کھیر کھانا تھی۔ وہ دستر خوان پر کھانا کھاتے ہوئے کھوئی کھوئی سی تھی، ماں نے پوچھا بھی کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے، وہ چونک گئی۔ وہ انجانے میں ان سب صورتوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ اپنے بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی..... آخری بار..... اس کے بعد اسے یہ سب کہاں دیکھنا تھا۔ ماں اپنے ہاتھوں سے کھیر کے پیالے بھر بھر کر سب کو تھما رہی تھی، اس نے اپنا پیالہ پکڑا اور اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے، اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روک لو..... سب کو روک لو مگر اس وقت دل و دماغ کی کٹھن جنگ تھی اور اس میں کون جیتنے والا تھا..... اس کا فیصلہ لمحوں میں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

مریم اس روز پرویز کے گھر ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی سے بھی نکل گئی تھی، یہ بھی شکر تھا کہ ان کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا ورنہ ایک بے قصور نفس زندگی کو سزا کے مانند بھگتنے آ جاتا۔ پرویز کئی بار اسے ڈرانے دھمکانے آیا مگر وہ اپنے ارادوں میں اٹل رہی، ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر اس نے ملازمت کی تلاش کی اور اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے لگی۔ باہر کی دنیا میں بڑے بھیڑیے اور عفریت سہی مگر جو اللہ کا نام لے کر زندگی گزارنا اپنا مقصد بنا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

اس روز کمرہ امتحان میں اس نے جس چہرے کو دیکھا اس نے اسے گھنٹے بھر تک کشمکش میں مبتلا رکھا تھا مگر اچانک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا..... ہاں..... وہ لڑکی ستارہ جیسی لگ رہی تھی..... بغیر سوچے سمجھے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا تمہارا تعلق خوشحال نگر سے ہے؟'' اسے یاد تھا کہ اس اسٹیشن کا نام یہی تھا۔

لڑکی نے جواب میں خاموشی اختیار کی تو وہ سمجھ گئی کہ وہ لڑکی اس نام کی کسی جگہ کو جانتی نہ تھی مگر اس کی مشابہت حیرت انگیز تھی۔ ''کیا میں اس سے پوچھوں کہ اس کی کوئی بہن.....' اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر پھر اپنی سوچ پر اسے ہنسی آ گئی، کیسی عجیب سی بات لگے گی جیسے کوئی کہانی ہو یا ڈراما۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ چند نہ پوچھے گئے سوالات پوچھ لیے جاتے تو حالات مختلف ہوتے مگر قدرت کو معراج سے اس کی کھوئی ہوئی بیٹیوں کو ملانا مقصود ہی نہ تھا، نہ زندہ نہ مردہ.....

☆☆☆

پورے شہر میں اس خبر کا شہرہ تھا، اس وقت میڈیا اتنا ''باخبر'' اور طرار نہ تھا مگر پھر بھی قائم علی ایک عزت دار آدمی تھا اور اس بات سے بچنا چاہتا تھا کہ اس خبر سے اس کا تعلق کسی بھی طرح ظاہر ہو۔ چند دن قبل ہی تو معراج واپس آئی تھی اور وہ چاہ رہا تھا کہ وہ نہ شہر میں رہے نہ خوشحال نگر میں..... کسی اور جگہ، جہاں ماضی کی یادیں نہ ہوں۔

اس گھر سے اس کا ایسا تعلق تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے وہاں گیا، ساری لاشیں تدفین کے لیے تیار تھیں، سات پیاری پیاری صورتیں، ان کا اکلوتا بھائی اور ان کی ماں اور وہ ملازمہ..... جو باورچی خانے میں بیٹھی کھیر سے لطف اندوز ہو رہی تھی، اس کی موت نے تو اس خاندان کی موت کو معما ہی بنا دیا تھا۔ ایک دکان دار نے بتایا تھا کہ وہ چوہے مار گولیاں لینے کے لیے آئی تھی، مگر اسے ان گولیوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا..... کس کو علم تھا؟

آخری لاش کے پاس پہنچ کر قائم علی ٹھٹک گیا تھا، چھوٹی سی بچی، معصوم سا چہرہ مگر جس چیز نے قائم علی کی توجہ کھینچ لی تھی وہ اس کا کفن سے باہر نکلا ہوا ہاتھ تھا۔ وہ ہاتھ اس کے لیے ناامیدی کی ایک علامت تھی، وہ معصوم چہرہ..... اتنے برسوں کے بعد

اس کے لیے آشنا نہیں رہا تھا مگر اس ہاتھ کو وہ خوب پہچانتا تھا جس کی پشت پر نیلے رنگ کا چاند کھدا ہوا تھا۔ نین تارا اور حسن آرا جڑواں تھیں اور ان کی شکلیں بھی بالکل ایک جیسی، اسی لیے معراج نے ان کی پشت پر چاند اور تارا بنوائے تھے۔ نین تارا کے ہاتھ پر چاند بنا ہوا تھا اور حسن آرا کے ہاتھ پر تارا...... اسی لیے حسن آرا کا نام مریم نے ستارہ رکھا تھا۔

نیلے چاند والا وہ ہاتھ اسے بتا رہا تھا کہ اس نے اس اجتماعی قتل کی واردات میں ایک بیوی، ایک بیٹی اور ایک ایسا بچہ کھویا تھا جسے دنیا میں آنا بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ اس غم کو اپنے دل میں ہی لے کر رہ گیا، معراج کو نہیں بتا سکتا تھا نہ اسے سمجھا سکتا تھا۔ ان دونوں کے مابین عمر کے وہ تین چار برس آئے تھے جنہوں نے ان سے بہت کچھ چھین لیا تھا، اب اعتبار اس طرح قائم نہیں ہو سکتا تھا، اس کی دوسری شادی قدرت کو راز میں رکھنا مقصود تھی ورنہ وہ طلاق کا فیصلہ کیے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

”میں تم سے کچھ مانگوں شاکر؟“ سعید نے سر جھکا کر اس سے سوال کیا تھا۔

”بھائی صاحب...... شرمندہ کیوں کرتے ہیں!“ شاکر نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں جو کچھ تم سے مانگ رہا ہوں، اگر تمہیں برا لگے تو مجھے معاف کر دینا......“

”یوں نہ کہیں بھائی صاحب! مجھے خود پر شرمندگی ہو رہی ہے......“

”میری بہن کو سہارا دے دو شاکر......“ انہوں نے رک رک کر کہا۔ ”اس کی لاوارث بیٹی کو باپ اور تمہاری بیٹی کو ماں مل جائے گی!“

”وہ...... وہ!“

”میری بہن بہت اچھی ہے شاکر، اسے قدر کرنے والے لوگ نہیں ملے......“

”وہ بات نہیں ہے بھائی صاحب......“

”مجھے افسوس ہے شاکر، میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی سوچ لیا کہ تمہیں میری اس تجویز سے کوئی اختلاف نہ ہوگا، تاہم اگر تم برا نہ مناؤ تو کیا میں اس انکار کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”میں نے انکار نہیں کیا......“ وہ ہکلایا۔ ”اصل میں......“ وہ رکا۔ ”آپا جانتی ہیں کہ کیا وجہ ہے!“ اس نے جھجک کر کہا۔

”مجھے سلمٰی نے بتایا تھا مگر......“ سعید نے کہا۔ ”تم اس سے بات کر لو اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو، میری بہن دکھی ہے، تمہارے گھر کے کسی کونے میں پڑی رہے گی شاکر، مجھے تم جیسا اچھا آدمی کہاں سے ملے گا!“

”میں سوچ کر بتاؤں گا بھائی صاحب......“ شاکر تذبذب میں تھا۔ اسے ناہید اچھی لگی تھی، اس کے بھائی کے گھر کا ماحول بھی اچھا تھا مگر اتنے عرصے وہاں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس نقطہ نظر سے سوچا تک نہ تھا۔ ’کیا زرتاج کسی عورت کا وجود برداشت کر سکے گی؟‘ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے ناہید کو سہارا دینے پر اعتراض نہ تھا...... مگر وہ زرتاج کو کیونکر بھول سکتا تھا، وہ تو جیسے ایک ’سی سا‘ پر بیٹھا تھا جس پر کبھی کوئی اوپر جاتا تھا کبھی کوئی۔

☆☆☆

”لازم نہیں کہ تم اسے پڑھائی پر مجبور کرو نینا...... اگر اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تو اسے کسی اور کام میں لگا دو!“ ڈاکٹر شگوفہ نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”کون سا کام ہے جو وہ کرے گا، کیا کوئی دکان کھولے گا یا ریڑھی لگائے گا؟“ نینا نے زچ ہو کر پوچھا۔

”دکان یا ریڑھی کوئی ایسے معیوب کام نہیں ہیں نینا، کم از کم اس ملازمت سے بہتر ہیں جو تمہارا شوہر کرتا ہے اور حرام کی کمائی اس کے وجود میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ اسے کوئی کام حرام نہیں لگتا!“

”مگر اس دور میں لوگ باگ لڑکوں کی ملازمت کا سب سے پہلے پوچھتے ہیں!“

”اگر تمہیں میری کرن کو بہو بنانے میں کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے تمہارے بیٹے کے دکان دار ہونے پر کوئی اعتراض

نہیں......“ نینا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں!“

”کرن شادی کر لے گی سہیل سے؟“ نینا نے پوچھا۔

”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے منانا میرا کام ہے!“ دونوں کے مفادات اس رشتے سے وابستہ تھے، شگوفہ کی ایک بیٹی ٹھکانے لگ جاتی اور سہیل کو ایک ایسی بیوی مل جاتی جو کہ اس کی نفسیاتی معالج بھی تھی۔

”میں تمہارا یہ احسان کبھی بھی نہ بھولوں گی، تم نے اپنی بیٹی کو میری بیٹی بنانے کا سوچا!“ نینا نے احسان مندی سے مغلوب ہو کر کہا۔

”اصل میں یہ ترکیب میں نے استعمال کی ہے تمہارے بیٹے کو اپنا بیٹا بنانے کے لیے......“ اس رشتے کی نیم رضا مندی سے دونوں سہیلیاں کھلکھلا کر ہنسیں اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

☆☆☆

”مجھے کسی کے گھر پر کام مل رہا ہے......“ زہرہ نے اسے استفسارانہ انداز میں اطلاع دی۔

”گھروں پر کس طرح کا کام ہوتا ہے، تمہیں علم ہے نا......“ اس نے فوراً اعتراض کیا۔ ”میری بیوی ہو کر تم لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھا کرو گی؟“

”بچوں کو سنبھالنے کا کام ہے......“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”بس تب تک جب تک میں اپنے قدموں پر نہ کھڑا ہو جاؤں!“ اس نے گویا حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی، جس دن میں خود کام پر جانے لگا تو تمہیں کام چھوڑنا ہوگا!“

”جب تم کام کرنے لگو گے تو پھر میں کیوں کام کروں گی؟“ اس کے چہرے پر سکون اتر آیا۔

اگلے ہی روز ساتھ والی خالہ اسے ایک قریبی گھر میں لے گئیں، جہاں اسے دو بچوں کو سنبھالنے کا کام کرنا تھا کیونکہ ان کی ماں کے ہاں تیسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ کبھی کبھار بچے سوئے ہوتے تو وہ بیگم صاحبہ کی کمر وغیرہ دبا دیتی تھی، جو وہ منع کرتیں کہ اس کی اپنی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ کام کر سکتی۔ مگر وہ بیگم صاحبہ اس کا بہت خیال رکھتیں، ان کے چھوٹے چھوٹے شریر بچے جب تک جاگ رہے ہوتے تھے تب تک اسے بہت مصروف رکھتے تھے۔ صاحب سے اس کا سامنا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اس کے آنے سے قبل گھر سے جا چکے ہوتے تھے اور اس کے لوٹ آنے تک واپس نہ آتے تھے۔

مگر اس روز آنے والے مہمانوں کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی تھی...... بلکہ آنے والی مہمان ہی اسے دیکھ کر چونکی تھی کیونکہ زہرہ تو شاید اسے یوں اچانک راہ چلتے دیکھ کر پہچان بھی نہ پاتی۔ ”دیا؟“ اس تعارف کو تو وہ خود بھی بھول چکی تھی۔

”مم......“ وہ ہکلا کر رہ گئی۔

”یہ میری دیورانی ہے کلثوم......“ رابعہ نے تعارف کروایا جس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ زہرہ اسے پہچان گئی تھی......

”اور یہ زہرہ ہے!“ زہرہ کا اس تعارف پر زمین میں سمانے کو دل چاہنے لگا، کلثوم ایک لمحے کو ٹھٹک گئی۔ اس کے دل کے اندر کتنے ہی زخموں کے ٹانکے اُدھڑنے لگے، اس کی زندگی کی کتنی ہی سختیاں اور تلخیاں اس کی مرہونِ منت تھیں۔

”کہاں ہوتی ہو آج کل...... لالہ کہاں ہے، کیا تمہیں چھوڑ کر کہیں چلا گیا یا تم اسے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ آ گئی ہو......“ سوال تھے یا نشتر۔

”کیا بات ہے کلثوم! سانس تو لو...... کیا تم جانتی ہو اس کو؟“ رابعہ نے اسے تھاما جس کا وجود ہچکولوں کی زد میں نظر آ رہا تھا۔ ”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور اس کا شوہر بیمار ہے......“ رابعہ کچھ کچھ بات کو سمجھ گئی تھی مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ زہرہ ’دیا‘ ہے اور اس کا زخمی شوہر عباس ہے یا کوئی اور۔

”اب تک سانسیں رکی ہوئی تھیں رابعہ آپی...... میں نے اس لمحے کا کب انتظار نہیں کیا، جب میں اس کا گریبان

تھام سکوں...... میں نے ان کے کیے کی سزائیں بھگتی ہیں!"

"اچھا بیٹھو ذرا سکون سے، تم جاؤ زہرہ بچوں کے پاس......"

"میں گھر چلی جاتی ہوں!"

"ہرگز نہیں......" کلثوم اٹھی۔ "تم نہیں جاؤ گی، مجھے میرے سوالوں کے جواب دیے بغیر!"

"اپنے سوالوں کے جواب کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا!" اب زہرہ نے اعتماد سے کہا۔ "تمہارا بھائی معذور ہو کر بستر پر پڑا ہے اور یہی سزا ہمارے لیے کافی ہے۔" کلثوم بھائی کا سن کر تڑپ اٹھی اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر زہرہ کے ساتھ ہولی۔

گلے شکوے...... معافی تلافی ہوئی اور اس کے بعد تو عباس کے لیے آسانیاں اور خوشیاں تھیں، جس کے لیے گاؤں واپس جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کے سر پر پورے مان سے ہاتھ رکھا۔ "میں اب جا کر تمہارے میکے کے گھر کا دروازہ کھولوں گا!"

☆☆☆

"آپ کو کیوں لگا کہ میرا ظرف اتنا چھوٹا ہے؟"

"ماسی سے بات کی تو انہوں نے تو صاف انکار کر دیا تھا!" اس نے کہا۔

"ان کا اعتراض بھی بجا تھا، کوئی بھی ماں اپنی بیٹی کو دوسرے رتبے کی حیثیت میں دیکھنا پسند نہیں کرتی!" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر تم نے کس طرح اس حیثیت کو قبول کر لیا؟" شاکر نے پیار سے پوچھا۔

"محبت......" وہ ہنسی۔ "مجھے آپ سے محبت ہے اس لیے مجھے آپ کا ساتھ قبول تھا اور جس عورت نے اپنا خون سینچ کر اس بچی کو پالا جو اس کی نظر میں آپ کی بیٹی تھی حالانکہ وہ بچی میری امانت تھی آپ کے پاس۔ جس طرح آپ نے اس امانت کا پاس رکھا اور اس نے پیار سے اسے پالا اسے اپنا دودھ تک پلایا...... کیا میرے دل میں اس کے لیے کوئی خاص مقام پیدا ہونا کوئی انہونی بات ہے؟"

"مگر ماسی کو کس طرح منایا تم نے؟"

"ماسی کو علم ہے کہ جب کوئی لڑکی کسی کو اپنے دل میں بسا لیتی ہے تو پھر اسے پا کر ہی دم لیتی ہے!"

"ماسی کو کیسے علم ہوا؟" شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

"ماسی بھی کبھی لڑکی تھی نا......" وہ ہنسی، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"تم رو رہی ہو کیا؟" اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"میں کیوں روؤں گی؟" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"تم اپنے کیے پر پشیمان تو نہیں ہو؟" شاکر نے سوال کیا۔

"ہرگز نہیں......" زرتاج نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اس کا پیشہ ہی مسیحائی تھا اور اسے علم تھا کہ بیماروں کی مسیحائی تو کوئی بھی کر سکتا ہے، شیشوں کی مسیحائی مشکل کام ہے...... عورتیں جو شیشوں کی طرح نازک ہیں، آبگینوں کی طرح جلد ٹوٹ جانے والی...... انہیں مرد توڑتا ہے اور وہی جوڑ سکتا ہے مگر کبھی شیشوں کی مسیحائی صنفِ نازک کے ہاتھوں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ شاکر کی بانہوں میں تھی اور ساتھ والے کمرے میں ناہید دونوں بچیوں کو اپنی آغوش میں لیے گہری نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔ دو بچیوں کو باپ مل گیا تھا اور اسے چھت...... جس چھت تلے سکون ہی سکون تھا اور اس میں رہنے والوں کے دل بہت بڑے تھے...... جن میں دوسروں کے لیے پیار ہی پیار تھا...... کون کہتا ہے کہ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں...... کبھی کبھار شیشے ہی شیشوں کو جوڑنے کے کام آتے ہیں!

(ختم شد)

باتِ تو سمجھ کی ہے

سکینہ فرخ

اللہ کے جو بندے اس موجودہ عہد میں پیدا ہوئے ہیں اور زندہ بھی ہیں اگر ان کو تاریخ کی سب سے بہادر قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پتھروں کے زمانے کا انسان تو شاید صرف بھوک، دشمن اور درندوں کے خوف کا ہی شکار ہوا ہوگا مگر اس دور کا...... الامان...... گھر میں بیٹھو تو لائٹ جانے اور کام ادھورے رہ جانے کا خوف تو کبھی گیس بند ہو جانے کا ڈر...... سارے دروازے کھڑکیاں لاک کر کے، تازہ ہوا اور روشنی سے محروم ہونے کے بعد بھی اچانک ڈاکوؤں کے آجانے کا خوف نہیں جاتا...... گھر سے باہر نکلے ہوؤں

کی واپسی تک الگ جان سولی پر لٹکی رہتی ہے...... جہاں فون کی گھنٹی بجی یا کوئی کھٹکا ہوا لوگ ایسے دہل جاتے ہیں جیسے موت کے فرشتے کو دیکھ لیا ہو۔

گھر سے باہر نکلو تو الگ اندیشے...... گن پوائنٹ پر لُٹ جانے کے ڈر سے لے کر بے ہنگم ٹریفک میں پھنس جانے یا کسی سمت سے آتی ہوئی تیز رفتار گاڑی یا گولی کا نشانہ بن جانے کا خوف باہر نکلنے والوں کی جان سولی پر لٹکائے رکھتا ہے۔ اس ہر وقت کے خوف نے زندگی کا مزہ ہی چھین لیا...... کوئی کرے بھی تو کیا کرے...... اوپر سے نت نئی بیماریاں جو کبھی نہ پہلے سنی نہ دیکھیں۔ اب خالہ بی ڈرتی نہ تو کیا کرتیں...... ان کو جو خوف لاحق تھا وہ تو سب سے برا ثابت ہوا۔ اب انسان نظر آنے والی چیزوں کا تو مقابلہ بھی کر لے...... اَن دیکھے جن بھوت سے بچنے کا ٹوٹکا بھی کر لے لیکن ان کم بخت جراثیموں کا کیا کیا جائے جو نہ نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان سے بچنا ممکن...... کتنی بھی احتیاطیں کر لی جائیں ہونی تو ہو کے رہتی ہے۔

خالہ بی کا دل پسند ٹی وی چینل وہ تھا جہاں خطرناک بیماریوں کا سبب بننے والے جراثیموں کا قلع قمع کرنے کی تراکیب ہمہ وقت بتائی جاتی رہتی تھیں۔ رہی سہی کسر وہ اشتہارات پوری کر دیتے جن میں فرش پر جراثیم، ہوا میں جراثیم، ہاتھوں میں جراثیم اور دانتوں میں جراثیم کی موجودگی کا اعلان کر کر کے ان سے بچاؤ کے ہتھیار بیچنے کے حربے استعمال کیے جاتے...... وہ تو شکر ہوا کہ جراثیم نہ تو بول سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور خیر سے نظر بھی نہیں آتے ورنہ عین ممکن تھا کہ اس عہد کی ہوا انہیں بھی لگتی اور اپنی اس کردار کشی پر احتجاجاً وہ بھی روڈ بلاک کر کے مظاہرے شروع کر دیتے۔

مگر خالہ بی تو خالہ بی ہی تھیں' انہوں نے اپنے اس خوف کا سدِباب کرتے ہوئے ان کے خلاف جو ہتھیار اٹھائے تو اپنے ساتھ ساتھ باقی کے گھر کو بھی اپنی سپاہ کا درجہ دیتے ہوئے خود کمانڈر بن بیٹھیں۔ وہ شروع سے ایسی تھیں اور ان کی طبیعت کی اس نزاکت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ہزار کوشش کے بعد خود ڈاکٹر تو نہ بن سکیں مگر ایک عدد ڈاکٹر سے شادی کرنے میں کامیاب ضرور ہو گئیں۔ اپنے دونوں بچوں کو آلودگی سے پاک ماحول میں پالنے کے بعد جب ان کے لیے بیویاں ڈھونڈنے نکلیں تو ہماری بدقسمتی کہ ان کی نگاہِ انتخاب اپنے ولی عہد بہادر کے لیے ہم پر آن رکی۔

ہم جو شروع ہی سے ان کے گھر جانے سے بدکتے تھے...... اپنی اماں سے سو سو بہانے کر کے ان کے ہاں جانا ٹال دیا کرتے تھے کہ وہاں پابندیاں بہت تھیں۔ اپنے جوتے گھر سے باہر اتارنے پڑتے تھے...... کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی مطلق اجازت نہ تھی، کھانا کھانے سے پہلے ان کی نگرانی میں ہاتھ دھونا سب سے زیادہ برا لگتا تھا۔ اماں کی تو مجبوری تھی، ان کی وہ اکلوتی سگی بہن تھیں، وہ کلیجے پر پتھر رکھ کے اپنی آپا سے ملنے چل دیتی تھیں۔ ہم تو آزاد شہری تھے...... جانے سے انکاری ہو جاتے...... کبھی خالہ اپنے نورِ نظر اور لختِ جگر کو لے کر ہمارے ہاں آتیں تو اور مصیبت...... موصوفہ ہاتھ باندھے نزاکت سے ایک صوفے کے کونے پر جو ٹکتیں تو پھر وہاں بت بن کے براجمان ہو جاتیں...... ان کے نورِ نظر اور لختِ جگر دونوں ناک بھوں چڑھائے دوسرے دو کونوں میں جا ٹکتے' ہم بچوں کے ساتھ کھیلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو ہمارے ''جراثیم'' لگ جاتے تو......؟

ان کے سو سو نخرے دیکھ کر ہم دانت کچکچا کے رہ جاتے۔ دل تو چاہتا کہ انہیں بہانے سے اٹھا کے پیچھے بنی کیاریوں کے پاس لے جا کر دھکا دے دیں...... مگر اماں کا خوف اس پُرمسرت خیال پر حاوی آ جاتا۔ بڑے ہونے کے بعد تو ان لوگوں نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا صرف

خالہ کبھی کبھار آ جایا کرتیں...... یا یہاں سے اماں چلی جاتیں۔ نہ جانے کب اس آنے جانے میں انہوں نے ہمیں تاڑ لیا۔ ہم نے اشاروں کنایوں میں انہیں لاکھ سمجھایا کہ ہم سے زیادہ غیر صفائی پسند اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہو گا...... مگر انہیں اپنے ہونہار جو نہ جانے کون کون سی ڈگریاں لے کر خدا معلوم کس ادارے کے سینے پر مونگ دل رہے تھے' کے لیے ہم سے بہتر اور کوئی نہیں لگا۔ انہیں ہماری غلافی آنکھوں یا چٹی چمڑی سے زیادہ ہمارا ڈاکٹر ہونا بھایا تھا...... اور ہم اس گھڑی کو کوس رہے تھے جب ڈاکٹری کی ڈگری ہمارے ہاتھ آئی تھی...... ہماری ایک نہ چلی اور ہمیں انہوں نے بڑی بہو کا درجہ دیتے ہوئے اپنے گھر کی زینت بنا کے چھوڑا۔ ان کے اسپتال نما گھر کا گوشہ گوشہ ڈیٹول اور فینائل کی بو سے آباد تھا...... باتھ رومز میں خوشبودار ہینڈ واش یا صابن کی جگہ جراثیم کش محلول ہاتھ دھونے کے لیے رکھا ہوا تھا۔

صبح صبح ہماری اماں جان تو نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے بعد ہم سب بھائی بہنوں پر اور گھر کے گوشے گوشے میں پھونکیں مار کے ہم سب کو اللہ کی حفاظت میں دے دیا کرتی تھیں لیکن خالہ بی صبح صبح سارے گھر میں جراثیم کش ادویہ کا اسپرے کرتی تھیں۔ پھر اپنے زیرِ نگرانی ماسی سے فینائل کے ٹب میں بھگو بھگو کر پونچھے لگواتی تھیں...... شام میں بلاناغہ مچھر مار اسپرے کا ہونا ضروری تھا جو اتنا زیادہ ہوتا جس سے مچھر ہی تو کیا ہر ذی روح کا بھاگنے کا دل چاہتا۔

گھر میں پہننے کے جوتے الگ باہر پہننے کے الگ...... گھر میں داخل ہونے والے پر لازم تھا کہ وہ اپنے گندے سندے جوتے باہر لگے ریک میں رکھ کے ننگے پیر اندر داخل ہو اور اندر رکھے دھلے دھلائے اسپرے شدہ جوتے پہن لے اور ہاں دروازے کے ساتھ لگے واش بیسن سے ہاتھ دھونا ہرگز نہ بھولے......

اب اس کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ گھر میں رکھے ساز و سامان کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے اور جہاں مرضی آ جا بھی سکتا ہے...... خالو میاں تو بے چارے دس برس پہلے ہی جراثیم سے اتنا زیادہ پاک وصاف ہوئے کہ پھر ان کا اس دنیا میں رہنا بہت بھاری ہو گیا اور وہ راہیِ عدم آباد ہوئے...... دونوں سپوت جراثیم کش مہم کا چلتا پھرتا سلوگن تھے اور اب ہماری باری تھی۔ مستقلاً اس ماحول میں رہائش پذیر ہونے کا سوچ کے ہماری روح فنا ہونے لگی۔

الحمدللہ ہم کافی پاک وصاف پنج وقتہ نمازی ضرور تھے مگر جراثیموں کو بھی اللہ کی مخلوق ہی گردانتے ہوئے ان سے بے جا محاذ آرائی سے گریز کے فارمولے پر کاربند تھے...... مگر خالہ کو کون سمجھاتا؟ شادی کے ڈیڑھ دو مہینے تک جب خالہ نے ہم پر ''جراثیم کش'' حربے استعمال کرنے کے بعد اچھی طرح یقین کر لیا کہ اب ہم جراثیم سے پاک ہو چکے ہیں تو ہمیں اس گھر کی باقاعدہ شہریت مل گئی۔

☆☆☆

کچن میں داخلے کی اجازت ملی تو ایک نیا امتحان شروع ہوا۔ جیسے اسپتال میں سب سے اہم درجہ آپریشن تھیٹر کو حاصل ہوتا ہے بالکل یہی اسٹیٹس اس گھر میں کچن کا تھا۔ یہاں داخل ہونے پر سب سے پہلے ہاتھ دھونا لازمی تھا۔ اس کے بعد وہیں رکھے تولیے سے ہاتھ خشک کر کے ایپرن پہننا پڑتا اور پھر سر کے بالوں کو ٹوپی سے ڈھانکنا ہوتا تھا...... گویا اس طرح کی تیاری ہوتی جیسے کوئی سرجن آپریشن کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے...... سرجن کا تو پتا نہیں لیکن اتنی تیاریوں کے بعد ہم پر خوف کا جو عالم طاری ہوتا اس میں ہم اکثر کھانا بنانے کی ترکیب ہی بھول جاتے۔ ایک دفعہ پیاز کاٹتے کاٹتے ہمیں ایک زوردار چھینک آ گئی۔ چھینک نہ تھی گویا بم بلاسٹ تھا۔ خالہ کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے

اوراس پر خوف کے لرزتے سائے دیکھ کر ہمیں یہی محسوس ہوا۔

اگلے ہی لمحے ہم تو کچن سے باہر تھے اور بے چاری خالہ کچن میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان جراثیموں کا قتلِ عام کرتی رہیں جو ہماری چھینک کے ذریعے وہاں پھیل گئے تھے۔

نہ جانے خالہ کی جراثیم دشمنی کی وجہ کیا تھا اور یہ کتنی پرانی تھی یہ تو ہم نہیں جانتے تھے...... اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ خالہ اپنے دشمنوں کا کس حد تک قلع قمع کرنے میں کامیاب رہی تھیں۔ البتہ ہمیں یہ اندازہ ضرور تھا کہ... عنقریب ہم اپنی جان سے جانے والے ہیں۔ بات اگر خالہ کی حد تک ہوتی تو شاید کوئی توڑ نکل بھی آتا مگر شومئ قسمت یہاں ان کے ولی عہد اس معاملے میں بالکل ان کے ہم پلہ ثابت ہوئے۔ خالہ نے اپنا سارا زورِ علم ان ہی پر صرف کر دیا تھا، سو جو کسر رہ جاتی وہ بیڈروم میں آنے کے بعد وہ پوری کر دیا کرتے تھے، جلد ہی ہم خود کو ایک خطرناک مریض تصور کرنے لگے۔

خیر بات ہو رہی تھی موصوف کی...... موصوف کا سارا بچپن نہا دھو کے اپنے صاف ستھرے کمرے کی صاف ستھری کرسی پر بیٹھے ہوئے گزرا...... جہاں ان کے پاس کتابوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ سو کرسی پر بیٹھ کے ہاکی تو کھیلی نہیں جا سکتی تھی اس لیے مجبوری تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر عالم فاضل بن گئے۔ غنیمت تھا کہ خالہ نے ان کو اسکول جانے سے نہیں روکا...... اب اسکول کو تو جراثیم کش محلول سے نہلانا ان کے بس میں نہ تھا مگر اپنے بیٹے کو اسکول سے لانے کے بعد یہ شوق پورا کر لیا کرتی تھیں...... اس صاف ستھرے بچے کے لیے انہوں نے ہمیں کیوں منتخب کیا شاید ہمارا خیال یہی تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ایک مستقل ڈاکٹر کا بندوبست کر رہی ہیں۔ اب ہم ڈاکٹر تو تھے لیکن ڈاکٹرز اور جراثیم کا تو چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے...... یوں سمجھ لیں کہ ایک کانٹے دار مقابلہ جس میں کبھی ڈاکٹر کو جراثیموں پر فتح ہوتی ہے تو کبھی جراثیم ڈاکٹر کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ وہ بے چارے شاید ہم سے اس توقع میں تھے کہ ہم ان کی اماں جان کی طرح ان کا خیال رکھیں گے اور انہیں پہلی فرصت میں مایوسی ہوئی۔ لاکھ احتیاطوں کے باوجود کچھ نہ کچھ گڑ بڑ تو ہو جاتی تھی۔ کبھی ہم ہاتھ دھونا بھول جاتے تو کبھی سینڈل باہر چھوڑنا...... کبھی چھینک آجاتی تو کبھی کھانسی...... اور پھر ایک طویل لیکچر...... بہت جلد ہم اس صورتِ حال سے اوب گئے۔ ایک دن ہم نے ان سے کھل کے بات کرنے کی کوشش کی۔

''دیکھیے، کیا آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا طرزِ زندگی کچھ عجیب سا ہے میرا مطلب ہے عام لوگوں سے تھوڑا ہٹ کے؟'' ہم نے بات کا آغاز کیا۔

''کیا مطلب؟'' ان کی روشن پیشانی پر کئی بل آگئے۔ ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ''نک چڑھا پن'' بھی تھا۔

''میرا مطلب ہے صفائی ستھرائی بہت اچھی عادت ہے۔ انسان کو اپنا وجود، اپنا گھر بلکہ پورا محلہ صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔ صفائی نصف ایمان بھی ہے اور ہماری اچھی صحت اور اچھے ماحول کی ضامن بھی......'' ہم نے زورِ خطابت کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ ان کے ماتھے کے بلوں میں سے آدھے غائب ہو گئے مگر چہرہ بدستور سوالیہ ہی رہا۔

''ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہر چیز ایک حد میں ہو تو اچھی بھی لگتی ہے اور کرنا بھی آسان ہوتا ہے...... بحیثیت ایک ڈاکٹر میں جانتی ہوں کہ ہمارے اردگرد بے شمار جراثیم موجود ہیں جن میں سے کچھ نقصان دہ ہیں تو کچھ بے ضرر اور کچھ ہمارے لیے فائدہ مند بھی ہیں...... یہ قدرت کے نظام کا حصہ ہیں، ان کے ساتھ ضرورت سے زیادہ محاذ آرائی بیکار ہے۔'' ہم نے دبے دبے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے بالآخر منہ سے کچھ کہا۔

''یہی کہ گھر اور اسپتال میں فرق ہونا چاہیے۔ آپ کسی گھر کو آپریشن تھیٹر کی طرح جراثیم سے پاک کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے...... ٹی وی پر اپنی پراڈکٹ بیچنے والوں نے عوام کو ایک انجانے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ اتنا کہ لوگ دوسرے سے ہاتھ ملانے سے بھی خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ کہیں اس کے ہاتھ پر ''مہلک جراثیم'' تو نہیں چپکے ہوئے ہیں۔ مناسب حد تک صفائی ستھرائی اور پاکیزگی بہت اچھی بات ہے لیکن حد سے گزرتے ہوئے یہ چیز بہت تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا ہماری بات؟'' ہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن آج کل اتنی بیماریاں پھیل رہی ہیں...... اس کا بھی تو سدِ باب ضروری ہے......'' ان کی کمزور سی آواز ابھری۔

''کیا آپ ساری زندگی بیمار نہیں پڑے......؟'' ہم نے اچانک پوچھا۔

''بیمار...... ہاں کیوں نہیں...... بچپن میں تو بہت زیادہ بیمار پڑتا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد کچھ بہتری آگئی۔'' انہوں نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔

''اتنے ''جراثیم کش'' ماحول میں آپ کو تو بالکل بیمار ہی نہیں پڑنا چاہیے تھا...... آپ نے کبھی سوچا کہ آپ اتنے بیمار کیوں پڑے؟'' ہم نے سوال پوچھا۔

''یہی تو کبھی نہ اماں کی سمجھ میں آیا نہ میرے۔'' انہوں نے فوراً کہا۔

''بات صرف اتنی سی ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک مدافعتی نظام ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے ہر وقت چوکس رہتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ خود ہی سوچیں قدرت تو توازن قائم رکھتی ہے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کو ان جراثیموں کے رحم و کرم پر چھوڑ کے نعوذ باللہ وہ غافل ہو جائے......؟ گڑبڑ تو ہوتی ہی تب ہے جب ہم اس نظام میں اپنے غلط طرزِ زندگی کی وجہ سے خلل پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نظام کو کمزور کر دیتے ہیں...... جو واقعی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ صاف ستھرا ماحول، سادہ زندگی اور سادہ خوراک...... اس مسئلے کا حل صرف یہی ہے...... آپ خالہ کو سمجھائیں نا...... تاکہ ہم سب ایک نارمل زندگی گزار سکیں۔''

صاحب بہادر کی خاموشی اور ماتھے پر ہلکی ہلکی لکیروں سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ کچھ قائل ہو رہے ہیں...... ہم نے بھی اتنی ہی ڈوز کافی سمجھی اور باقی کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا۔ قطرہ قطرہ کر کے ہی سمندر بنتا ہے ناں......

☆☆☆

پھر قطرہ قطرہ کرتے ہوئے سمندر تو نہیں بن سکا لیکن شادی کے اس ایک سال میں کم سے کم ایک مٹکا تو بھر ہی گیا۔ یہ سال کیسے پلک جھپکتے گزرا کہ پتا بھی نہیں چلا۔ صاحب بہادر تو جلد ہی رام ہو گئے تھے مگر خالہ کو رام کرنا زیادہ آسان نہیں تھا، ان کی سوچ کو بدلنے کے لیے جو پاپڑ بیلنا پڑے وہ ایک الگ کہانی ہے...... لیکن ایک ڈاکٹر کچھ کچھ نفسیات داں بھی تو ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا فائدہ حاصل تھا۔

رفتہ رفتہ کر کے خالہ کا یہ خوف ختم تو نہیں ہوا لیکن قدرے کم ضرور ہو گیا۔ وہ ملنے ملانے والوں سے ہاتھ ملانے لگیں، اکثر بازار بھی چلی جاتیں یہ اور بات کہ گھر آ کے اچھی طرح نہاتیں مگر ان کا گھر سے نکلنا ہی بڑی بات تھی۔ خالہ میں تبدیلیاں گھر کے ماحول کو تبدیل کرنے کا سبب بن گئیں۔ صفائی ستھرائی تو اپنی جگہ تھی کہ وہ تو ضروری ہے لیکن جو گھر ہر وقت جراثیم کش دواؤں کی بدبو کے زیرِ اثر رہتا تھا اب ائرفریشنر کی اور پھولوں کی تازہ خوشبو میں بسا رہنے لگا۔ ساری احتیاطیں اپنی جگہ درست لیکن ذہنی صحت بھی تو بہت ضروری ہے۔

ہماری شادی کو پہلا سال مکمل ہونے کو آیا اور

اینورسری سے تین دن قبل ہمارے مُنّے میاں دنیا میں تشریف لے آئے۔ خالہ کی تو خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ خوش تو مُنّے میاں کے پاپا اور چاچو بھی بہت تھے۔ چاچو کی تو بتیسی مہینے بھر سے نکلی ہوئی تھی کہ عنقریب ان کے سہرے کے پھول بھی کھلنے کو تھے، بس مُنّے میاں کا انتظار تھا کہ وہ بھی دنیا میں آجائیں اور چاچو کی شادی میں شریک ہوسکیں۔

"چلو بھئی اسپتال سے جلدی چھٹی کرواؤ..... گھر چلو..... یہاں تو نہ جانے کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور بچے کو ہاتھ لگاتے ہیں..... کہیں جراثیم لگ گئے اور بیمار پڑ گیا تو....." خالہ دوسرے ہی دن لوگوں کے آنے جانے سے بیزار ہو کے بولیں اور ہمارے گرد خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں..... یہ ٹھیک تھا کہ خالہ کافی بدل چکی تھیں مگر پھر بھی اگر پرانا مسئلہ عود کر آیا تو بھلا ہم کیا کر لیں گے اور اب تو ان کے پاس مضبوط جواز بھی ہوگا۔ وہ مُنّے کو "جراثیموں" سے بچانے کی ہر ممکن کوشش پھر سے نہ شروع کردیں.....؟

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما ویسے بھی ہماری شادی کی سالگرہ ہے، صبا کا گھر پر ہونا تو بہت ضروری ہے۔" میاں صاحب نے شوخ نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔

"ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم سے باسط، جلدی کرواور گھر چلو۔" وہ فوراً بولیں۔

"ہوسکتا ہے کل تک چھٹی ہوجائے۔" باسط نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی کل نہیں..... آج ہی..... خدا معلوم یہاں کون کون سے نت نئے جراثیم موجود ہوں گے۔ تم نے سنا نہیں کل اسی اسپتال کی نرس کیا کہہ رہی تھی....." وہ پریشان کن لہجے میں بولیں۔

"کیا کہہ رہی تھی.....؟" باسط بھی پریشان ہو گئے۔

"ارے یہی کہہ رہی تھی کہ جلدی چھٹی کروالیں..... اسپتال میں تو اتنے مریض ہوتے ہیں اور بے شمار اقسام کے انفیکشن بھی پھیلے ہوئے ہیں، چھوٹے بچوں پر تو فوراً اٹیک ہوجاتا ہے، یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اب کچھ نئے قسم کے انفیکشن بھی دیکھنے میں آرہے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ امریکا جراثیموں پر تجربات کرکر کے نت نئے جراثیم دنیا میں پھیلا رہا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ نئی اقسام کے جراثیم مریخ سے زمین پر وارد ہوئے ہیں..... اے لو بھلا بتاؤ..... اب ان کا کیا کریں جو کم بخت نہ ڈیوٹل سے مریں نہ ان پر کوئی اینٹی بایوٹک اثر کرے۔" خالہ بی ہول کے بولیں۔

"خالہ پریشان نہ ہوں..... ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔" ہم نے انہیں دلاسا دیا۔ وہ حیران ہو کے ہمیں دیکھنے لگیں۔

"خالہ کچھ باتیں صرف اللہ پر چھوڑنے والی ہوتی ہیں۔ یہ نئے دور کا بچہ ہے..... نئے دور کے ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کی طاقت اسے اللہ ضرور دے گا۔" ہم مسکرائے۔

خالہ بی کے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور صاحب بہادر تو دیکھ ہی اپنے ولی عہد کی طرف رہے تھے جس کے چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ امید کی چمک بھی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ، ہر دن اور ہر سال کا آغاز ایک نئی امید کی نوید تو دیتے ہی ہیں اور ہر نئی زندگی بھی اس چیز کی گواہ ہوتی ہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا..... اور ساتھ یہ بھی کہ جس ہستی نے نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں اس وجود کی حفاظت کی ہے جہاں تک رسائی کے لیے خود ماں بھی بے بس ہوتی ہے۔ دنیا میں لانے کے بعد بھی اس کا ذمے اسی کا ہے..... کہ سب کچھ اسی کی مرضی کے تابع ہے، بات تو صرف سمجھ کی ہے۔

ابلیس

نمرہ احمد

یہ کہانی جو میں آپ کو سنانے جارہی ہوں، یہ میری کہانی نہیں ہے بلکہ میں تو صرف اس کہانی کی ایک خاموش تماشائی ہوں۔ میرا یعنی حلیمہ داؤد کا نام تو اس داستان کے کسی پڑھنے والے کے لیے شاید یاد رکھنے کے لیے قابل نہ ہو مگر ان دو کرداروں کا ضرور ہوگا جنہیں میں ان کے خوب صورت ناموں سے جانتی ہوں۔

فلزہ ابراہیم اور رضا حیات خان۔

میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ایسے دیکھا ہے جیسے کسی نے نہ دیکھا ہوگا اسی لیے آج میں ایک بات کہنے کے قابل ہوئی ہوں۔ وہ بات جس کو میں ہمیشہ جھٹلاتی تھی کہ شک کا فائدہ ہر

ایک کو نہیں دینا چاہیے۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ حد پار کر لی جائے تو اس اسفل السافلین کو شک کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اصولوں پر سمجھوتے نہیں کیا کرتے اور جو یہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بہت غلط کرتے ہیں۔

ہماری یہ کہانی قریباً سال بھر پہلے سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے ماسٹرز کے پہلے روز سائیکالوجی کی کلاس لینے گئی تھی۔

☆☆☆

میں نے زندگی میں کبھی اتنا پن ڈراپ سائلنس نہیں دیکھا تھا جو اس روز کلاس میں چھایا تھا۔ گردنیں سحر زدہ سی اس شخص کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جو ہمارے سائیکالوجی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر...... جو وہ کہیں سے نہیں لگتے تھے۔ میں بھی اس مسحور ہوئی اکثریت کے ساتھ تھی اور ان سب کی طرح میں بھی کچھ نہیں لکھ پا رہی تھی۔ نوٹس لینے کا ہوش ہی کسے تھا۔ وہ تھے ہی ایسے شخص کہ جن کے سامنے نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔

وہ روسٹرم پہ کھڑے، اپنے سنجیدہ انداز میں لیکچر دے رہے تھے۔ تیکھے نقوش، خوب صورت آنکھیں، صاف رنگت، جیل سے پیچھے کیے بال، قیمتی اور نفیس ایش گرے ٹو پیس میں ملبوس، وہ بلا کے ہینڈسم تھے۔ صرف وجاہت نہیں ایک اور کشش بھی ان کے اندر تھی جو مقابل کو اوندھے منہ گرا دیتی تھی۔ وہ کشش کیا تھی، میں اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ بس کوئی مقناطیسی اثر تھا جو ان کے گرد پھیلا تھا اور اس مقناطیسیت سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کلاس ختم ہوئی تو سب کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ سر رضا حیات خان۔

اس روز مجھے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ ینگ تھے، اسمارٹ تھے اور ان کی حسِ مزاح بہت زبردست تھی۔ ان کے لیکچر میں کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ان کی شخصیت کا فسوں تھا اور کچھ کمالِ گفتار، وہ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ کبھی لاجواب نہیں ہوتے تھے۔ ان سے پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب سائل کو ہمیشہ بروقت ملتا تھا۔ عمر میں وہ زیادہ نہ تھے۔ ایم فل کیے ہوئے بھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور یونیورسٹی سے وہ پانچ برس سے منسلک تھے۔ ہم تو ان کے پرستار بن ہی گئے۔ ہمارے سینئرز کا تو اور برا حال تھا۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اگر کسی کا چرچا تھا تو وہ سر رضا تھے۔

ان سے میرا باقاعدہ تعارف ان کی دوسری کلاس میں ہوا جب انہوں نے تمام طلبا سے اپنا نام بتانے کی درخواست کی۔ جب میری باری آئی تو میں قدرے جھجک کر کھڑی ہوئی۔ ''سر میرا نام حلیمہ داؤد ہے۔''

انہوں نے جواباً مجھے ہلکی نرم سی مسکراہٹ دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ واپس نشست پر بیٹھی۔ ان کی وہ مسکراہٹ میری متاعِ جاں بن گئی۔ وہ میرے لیے مسکرائے، میرا نام سن کر مسکرائے...... مجھے لگتا تھا میں کبھی اس لمحے سے نکل نہیں سکوں گی۔ مگر صبر اے دل...... ابھی اور بہت سے لمحے آنے تھے۔

☆☆☆

اس روز باہر زوروں کی بارش ہو رہی تھی اور اندر ہماری کلاس جاری تھی۔ آج وہ سائیکالوجی سے ہٹ کر بات کرنے کے موڈ میں تھے اور ہم مسحور لوگ تو بند آنکھوں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

''کون بتائے گا کہ انسان کی شناخت کن چیزوں سے ہوتی ہے؟'' وہ چہرہ قدرے جھکا کر مائیک میں بولے تو بہت سے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔

''انسان کی شناخت اس کے نام سے ہوتی ہے سر۔''

''اس کے ملک سے۔''

''قبیلے یا ذات سے۔''

''رسم و رواج سے۔''

''زبان سے۔''

''اس کے کردار کی خصوصیات سے۔''

''کسی اچھے یا بُرے کارنامے سے۔''

وہ مسکرا کر ایک ایک کی سنتے گئے۔ دفعتاً میں نے اپنا کمزور سا ہاتھ بلند کیا، جانے اتنے لوگوں میں انہیں میرا ہاتھ کہاں سے نظر آ گیا۔

''جی حلیمہ داؤد...... آپ بتائیں، انسان کی بنیادی شناخت کس شے سے ہوتی ہے؟'' بہت سی گردنیں میری جانب گھومیں، میں نے بہ مشکل تھوک نگلا۔ سب کے سامنے بولنا میرے لیے ہمیشہ کٹھن رہا تھا مگر پروفیسر رضا کی ہمت افزا مسکراہٹ میرے اندر نئی روح پھونک گئی۔

''د...... دین سے۔'' میں ہکلا کر بولی تو ان کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

''فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔ ہم شناخت کے معاملے میں دین کو کیسے اسکیپ کر سکتے ہیں؟ دراصل یہ سوشل سائنسز کا ایک اہم سوال ہے کہ جب ہم انسانی شناخت کی بات کرتے ہیں تو دین کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟'' وہ اپنے مخصوص پُرکشش انداز میں ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اور میں بس اس ایک فقرے پر ہی ٹھہر گئی۔

''فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔'' باہر گرتی بارش کے قطرے میرے دل کو بھگونے لگے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میں ابھی رو دوں گی۔

میں وہ تھی جسے ہجوم تو کیا دو لوگوں میں بھی کھڑی ہوں تو کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ چہرے پر چشمہ پہنے، کڑھائی والی چادر اوڑھے، میں بے حد معمولی شکل کی لڑکی تھی...... اگر کوئی میری موجودگی کو نوٹ کرتا بھی تھا تو شاید میری...... بیساکھی کے باعث جس کے سہارے میں چلتی تھی۔ ایک حادثے میں کئی برس قبل میری دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی اور اب میرا واحد سہارا میری بیساکھی تھی۔ ایک کم شکل، معذور لڑکی کو کسی نے لمحے بھر کو تعریفی نگاہوں سے نوازا تھا، میں خود کو بادلوں میں تیرتا محسوس کرنے لگی تھی۔

شام کو جب میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تو خود سے باتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خود کلامی کرتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ خود کلامی نہیں کرتا، وہ جھوٹ بولتا ہے، تنہائی میں، میں نے بھی اپنی ایک دنیا بنا رکھی تھی۔ جہاں میں معذور اور کم شکل نہ تھی۔ جہاں میری ہتک اور تذلیل نہیں ہوتی تھی اور جہاں مجھے کوئی احساسِ کمتری نہیں ہوتا تھا۔ وہاں اس دنیا میں میں حلیمہ داؤد نہیں تھی۔ میں اینا یاور تھی۔ یہ نام بھی خود کو میں نے...... ہی دیا تھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا۔ اپنا نام بدلنے کا اختیار نہ تھا مجھے اگر ہوتا تو بھی حلیمہ داؤد کے ساتھ میرا وجود بھی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور میں خود کو کبھی اینا کا نام نہ دیتی۔

اینا بہت خوب صورت تھی، بے تحاشا امیر اور شاہی خاندان کی اکلوتی اولاد۔ باپ کے اربوں کے بزنس کی اکلوتی جانشین اور یونیورسٹی کے ہر اسٹوڈنٹ کے دل کی دھڑکن روکنے کا سبب۔ وہ جب چلتی تھی تو لوگ سحر زدہ سے ٹھہر کر اسے دیکھتے تھے۔ اس کے حسن، ذہانت اور دولت کے قصے ہر جگہ پھیلے تھے۔ وہ راجدھانی کی شہزادی تھی اور اس جیسا کوئی نہ تھا۔

اماں کی آواز آئی تو میں چونکی پھر بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی باہر آئی۔ اماں کی آواز یونہی اکثر میرے اردگرد تیرتے ''اینا یاور'' کے ست رنگے بلبلے میں چھید کرا کے پھاڑ دیا کرتی تھی۔

''جی اماں!'' میں نے کچن کے کھلے دروازے

سے جھانکا۔ وہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی تھیں۔ آواز پر پلٹیں۔

''تمہارے ماموں آئے تھے آج پھر کرایے کا تقاضا کر رہے تھے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔'' ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے اس کا کرایہ باقاعدگی سے ماموں کو ادا کر دیتے تھے کہ نانا کی ملکیت تھا اور ان کے بعد اب ماموں اس کے مالک تھے۔ اماں کی بیوگی کے آغاز کے چند برسوں میں جب میں بہت چھوٹی تھی، ماموں نے ازراہِ ہمدردی ہمیں اس گھر میں مفت رہنے دیا تھا۔ (تب وہ خود بھی ادھر ہی مقیم تھے۔ ایف سکس والے نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو انہیں پانچ، چھ، برس ہی ہوئے تھے) بعد ازاں وہ ہم سے کرایہ وصول کرنے لگے اور اب وہ ان چند سالوں کی مفت کی رہائش کا کرایہ بھی سکہ رائج الوقت کے پیمانے پر طلب کر رہے تھے۔ ابو کی چھوڑی دو دکانوں کے کرایے سے ہمارے گھر کا خرچ، مکان کا کرایہ اور میری تعلیم کے اخراجات بہ مشکل پورے ہوتے تھے۔ اب یہ اضافی خرچ کہاں سے لاتے؟

کوئی اور دن ہوتا تو میں اماں کو تسلی دیتی مگر آج میں خود بھی خاموش ہوگئی۔ شاید میں ذہنی طور پر اماں کے پاس کچن میں تھی ہی نہیں بلکہ ابھی تک کلاس روم میں تھی۔ جہاں بارش کے تڑا تڑ گرتے قطرے بند کھڑکیوں کے شیشوں پر لڑھک رہے تھے۔ اماں کافی دیر اپنے مسائل کا رونا روتی رہیں مگر جب میں خاموشی سے خلا میں گھورتی رہی تو وہ شکست خوردہ سی اپنے کاموں کی جانب پلٹ گئیں۔

ایک روز میں کلاس کے بعد لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی جب مجھے سامنے کھڑے بُک ریک کے پیچھے سے مدھم سی آوازیں سنائی دیں۔ لاشعوری طور میں ان کی جانب متوجہ ہوگئی۔ وہ کسی اور کی نہیں بلکہ پروفیسر رضا کی ہی آواز تھی۔

''آپ روئیں مت، آپریشن ہو جائے گا، میں کہہ رہا ہوں نا کہ ہو جائے گا۔'' میں نے گردن ذرا سی ترچھی کی۔ وہ بُک ریک کے عقب میں کھڑے ہاتھ اٹھا کر کسی کو تسلی دے رہے تھے۔

''سر آپریشن نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر نے آج کی آخری تاریخ دی تھی۔ میری بہن مر جائے گی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ رندھی آواز میں بولتا ذورین تھا۔ میرا کلاس فیلو، میں نے سنا تھا اس کی بہن کی کوئی پیچیدہ سی سرجری ہونی ہے، کبھی وقت ہی نہیں ملا کہ مزید تفصیل پوچھتی۔ ویسے بھی میں ان شریف لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکوں سے مخاطب نہیں ہوا کرتی تھیں۔

''اچھا روم نمبر کیا ہے اس کا؟'' وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے اپنے ازلی نرم انداز میں پوچھنے لگے۔ ذورین نے روم نمبر بتایا اور سر جھکائے، آنکھ کا کنارہ انگلی کی نوک سے پونچھا۔ میں نے دیکھا، پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں، میں دھیرے سے سر جھٹک کر پڑھنے لگی مگر اب کتاب کی طرف ذہن کہاں متوجہ ہونا تھا۔

بہ مشکل تین دن گزرے تھے کہ مجھے ذورین کیمپس میں ایک جگہ سیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ ساتھ اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ اور وہ کسی بات پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ مجھے ذرا اچنبھا ہوا مگر خیر...... میں سر جھکائے، بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی ان کے قریب سے گزر رہی تھی جب ذورین کے دوست کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بہت مبارک ہو ذوری، میں گھر پر آنٹی کو مبارک باد دینے بھی آؤں گا۔''

''ہاں یار! میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا پُرسکون ہوں۔'' ذورین کے چہرے پر سچی خوشی بکھری تھی۔

''ارے ہاں، کچھ پتا چلا کہ آپریشن کی پے منٹ

کس نے کی تھی؟''

''نہیں...... مگر وہ جو بھی تھا، فرشتہ تھا میرے لیے، اللہ اسے اجر دے۔'' اور ان سے دور جاتے ہوئے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ''آمین۔'' ذورین بھلے نہ جانتا ہو مگر میں جانتی تھی کہ وہ کون تھے۔

☆☆☆

کچھ بدلتے موسم کا اثر تھا اور کچھ میری نازک طبیعت، مجھے ایسے نزلے زکام نے گھیرا کہ میں تین روز تک یونیورسٹی نہ جا سکی۔ چوتھے روز جب کلاس میں گئی تو بھی زکام کی باقیات باقی تھیں۔ لیکچر کے اختتام پہ جب میں کلاس سے نکلی تو رضا حیات خان کاریڈور میں جیسے کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر رشک آیا جس کے انتظار میں وہ تھے۔ ان لمحوں کے انتظار نے اس نامعلوم شخص کو کتنا معتبر کر دیا تھا۔

''حلیمہ داؤد...... کدھر تھیں آپ؟ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' میں ان کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ مسکرا کر میری طرف بڑھے۔ میں ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے؟

''جج...... جی پروفیسر؟'' میں سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ رکے۔ ان کے شاندار وجود سے کسی قیمتی پرفیوم کی مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔

''تین دن کدھر غائب رہیں؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔''

''مم...... میں ذرا...... وہ فلو ہو گیا تھا۔''

''اوہ...... اپنا خیال رکھا کرو، اسٹوڈنٹ کو بیمار نہیں پڑنا چاہیے اور اتنے برائٹ اسٹوڈنٹ کو تو ہرگز نہیں۔'' وہ مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے...... اور میں حلیمہ داؤد اپنے ست رنگے بلبلے میں مقید فضا میں تیرنے لگی....

ذورین کہتا تھا کہ وہ فرشتہ ہے، مجھے لگتا تھا وہ کوئی یونانی دیوتا ہے جو آسمانوں سے اترا ہے مگر شاید وہ اس سب سے بڑھ کر کچھ اور تھے۔ وہ ساحر تھے ان کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپ بن جایا کرتی تھیں اور مجھے سحر کہاں آتے تھے؟

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ دنیا میرے بلبلے کے آس پاس کہیں تحلیل ہو گئی ہے، سب فنا ہو چکا ہے اور

پاکیزہ سالگرہ مبارک

تیرے یومِ ولادت پر
میری مسکان کہتی ہے
تجھے ایسی بہت سی اور بھی خوشیاں مبارک ہوں
تیرے دستِ حنائی پر
لکھا مکتوب ''پاکیزہ''
میں پڑھتی ہوں تو پھر میرا
تخیل گدگداتا ہے
تیرے اندر لکھے قصے
مجھے محظوظ کرتے ہیں
تیری غزلیں تیرے نغمے
میرے اندر کے احساسات کو مہمیز کرتے ہیں
تیرے اقوال، افسانے
میں پڑھتی ہوں تو پھر خود کو
نئی دنیا میں پاتی ہوں
ادارت ہے تیرا نقشِ کہن جو یاد رہتا ہے
میری جانب سے تجھ کو اور
تیرے ارکانِ مجلس کو
شمارے کی بلوغت کا
سعادت مند یہ لمحہ
تہِ دل سے مبارک ہو

شاعرہ: سیدہ ہما شاہ، ہارون آباد، پنجاب

اگر کچھ باقی ہے تو میرا انتظار...... ہر روز رضا حیات خان کی کلاس کا انتظار۔ انہیں ایک نظر دیکھنے، ان کی ایک مسکراہٹ حاصل کرنے کا انتظار اور پھر کلاس کے اختتام کے بعد اگلے روز کلاس کا انتظار شروع...... کبھی وہ مجھے دیکھتے، کبھی مسکرا بھی دیتے اور کبھی وہ اپنے اردگرد لگے جمگھٹے میں اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں میں دکھائی نہ دیتی۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ جب ان کی نگاہ میری جانب نہ اٹھتی۔ اس دن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں عجیب بیزاریت کی لپیٹ میں رہتی۔

وہ دسمبر کا ایک سرد دن تھا جب میں اماں کے ساتھ کسی کام سے شاہین کیمسٹ تک آئی۔ دکانوں کے سامنے سڑک پر خاصا رش تھا اور پُرہجوم جگہوں پر مجھے ویسے خوف آتا تھا۔ میں اپنی بیساکھی کے سہارے خود کو گھسیٹتی فٹ پاتھ پر چلتی جارہی تھی جب مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک منظر دکھائی دیا۔

ایک جھلک، ایک گمان...... میں چونکی۔ وہ بلاشبہ رضا حیات ہی تھے۔ اپنے مخصوص حلیے سے ہٹ کر وہ جینز اور جیکٹ میں ملبوس سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے سفید اسٹک پکڑے، کچھ بولتا ہوا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے رضا کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ رضا اثبات میں سر ہلاتے اسے بغور سن رہے تھے پھر وہ اس عمر رسیدہ شخص کا ہاتھ تھام کر آگے آئے اور احتیاط سے دوطرفہ بہتی ٹریفک کے درمیان سے گزرتے اسے سڑک پار کرانے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سڑک کے اس طرف پہنچ گئے۔ بوڑھے کو نرمی سے کچھ سمجھا کر، اب وہ جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ نابینا شخص دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں دعا دینے لگا۔ رضا بہت ممنون، بہت شرمندہ سے واپس پلٹے۔ میری نگاہوں نے اس وقت تک ان کا تعاقب کیا جب تک کہ وہ واپس اپنی کار میں نہ بیٹھ گئے پھر میں مسکرا کر ہولے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

کہاں ہوتے ہیں آج کل ایسے لوگ؟

☆☆☆

”شک کا فائدہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“ کلاس میں سکوت چھایا تھا اور وہ اپنے ازلی سحر انگیز انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ہر ذی نفس خاموش، ساکن بیٹھا رہا کسی کو ان سے اختلاف نہیں تھا، سوائے میرے۔

”میں ہوں۔“ میں نے اپنا کمزور ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ وہ ذرا چونکے شاید حیران ہوئے تھے۔

”حلیمہ داؤد؟“ وہ جیسے یاد کر کے بولے۔ ”ہماری یہ سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ اس بات سے کیوں متفق ہیں، ہمیں بتائیں پلیز؟“

یہ مبالغہ آرائی تھی، میں بہت ایوریج سی طالبہ تھی اور یہ بات سب جانتے تھے معلوم نہیں وہ کیوں مجھے اتنی اہمیت دیتے تھے۔ یا پھر وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے لگا میں بھی وہی دیکھ رہی ہوں۔

”سر میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو شک کا فائدہ دیا جانا چاہیے اگر آپ نے کچھ آنکھوں سے دیکھا یا نہیں دیکھا تو بھی بجائے کسی کو فوراً موردِ الزام ٹھہرانے کے اسے شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ قرار دینا چاہیے۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے حلیمہ کہ آپ کا یہ آرگومنٹ کن جگہوں پر اپلائی ہوتا ہے؟“ ہال میں خاموشی چھائی تھی اور وہ ڈائس پہ کہنیاں رکھے پوری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ تھے۔ اوہ خدایا، وہ کتنے ہینڈسم تھے۔

ہر اس جگہ پہ جہاں کسی انسان پر ہمیں کسی گناہ کا شک ہوتا ہے۔“

صرف انسان؟“ وہ ہولے سے مسکرائے۔ میں اندر سے گڑبڑائی۔

”آف کورس، ہم انسانوں کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔“

”مگر آپ نے گناہ کا ذکر کیا تو گناہ ایک اور مخلوق سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔“ میں الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جانور، درندے، پودے، حشرات الارض...... میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے کئی نام آتے گئے۔

”جنات!“ میری خاموشی پر انہوں نے کہا تو پورے ہال میں ایک عجیب سنسنی سی دوڑ گئی۔

”جنات؟“ میں ہولے سے بڑبڑائی۔

”جی ہاں، جنات...... اور یہ جو بیک بینچرز ہیں ان کو منہ بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میں یہاں آپ کو کوئی ہارر اسٹوریز نہیں سنانے لگا۔“ ان کے چہرے کے تاثرات جیسے ہی سخت ہوئے آخری نشستوں پر بیٹھے سارے لڑکے تیر کی طرح سیدھے ہوئے پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں سختی کی جگہ نرم تاثر نے لے لی۔

”تو حلیمہ داؤد اگر گناہ کی بات ہے تو کیوں نہ جنات کا ذکر کیا جائے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہے تھے اور مجھے لگا میں نے اختلاف میں غلط سائڈ لے لی ہے۔

”ہزاروں برس پہلے ایک جن ہوا کرتا تھا، ابو الجن، جنات کا باپ۔ اس کا نام عزازیل تھا۔ وہ فرشتوں کا سردار تھا۔ مکرم تھا، محترم تھا۔ اس سے زیادہ نیک اور پارسا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے بڑا عبادت گزار تھا پھر کیا ہوا؟ آپ بتائیے حلیمہ داؤد پھر کیا ہوا کہ اس عزازیل کو آج آپ ابلیس کے نام سے یاد کرتی ہیں؟“

میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

”اس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا...... یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا، نہیں؟“

”ج...... جی۔“

”اس نے کیوں کیا وہ سب؟ کیوں وہ انسان سے حسد کا شکار ہوا؟ کیا، اس کے تکبر بھرے انکار کی کوئی وجہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔“

ہال میں سناٹا چھایا تھا۔ سب دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

”ابلیس نے جو بھی کیا وہ میں ہی کیا اور وہ آج بھی بہت سے انسانوں کو اپنے جیسا ”ابلیس“ صرف اس لیے بنانا چاہتا ہے کہ اللہ انسان سے محبت نہ کرے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ شک کا فائدہ اللہ نے ابلیس کو کیوں نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سے بڑھ کر مہربان کوئی نہیں ہے؟“

وہ مجھے دیکھ کر استفسار کر رہے تھے اور میں بنا پلک جھپکے سانس روکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا میری آواز کبھی نہیں نکل پائے گی۔

”وہ اس لیے ڈیئر اسٹوڈنٹس کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پار کر لی جائے تو پھر اس شخص کو رعایت نہیں دی جاسکتی۔ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جن پر سمجھوتا ناممکن ہوتا ہے۔ سو اپنی زندگی میں ایسے اصول بنائیں کہ اگر کوئی انہیں توڑے تو آپ اس ابلیس کو کوئی رعایت نہ دیں۔ عزازیل ہر کوئی بن سکتا ہے مگر جو عزازیل سے ابلیس بنے وہ بندگی کی جنت سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی کبھی واپسی نہیں ہوتی۔“

میں نے بے اختیار دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر تالی میں ملائیں اور ایک دم پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔

”اوہ کم آن اسٹوڈنٹس!“ وہ جھینپ کر ٹیبل پر رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت پرانے پروفیسر، سر عثمان راؤ ان دنوں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار سی فیئر ویل پارٹی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس پر تمام فیکلٹی ممبران اپنے ازواج کے ساتھ مدعو تھے۔ اس شام میں نے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کی بیوی کو دیکھا۔

اس کا نام علینا تھا۔ وہ دراز قد اور بھورے گھنگرالے بالوں والی بے تحاشا حسین لڑکی تھی۔ جیسے موم کی گڑیا۔ رضا بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس تھے اور وہ ان کے ساتھ سیاہ اسٹائلش لباس میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا حسین بھی ہوسکتا ہے؟ پانچ برس کا پیارا سا بیٹا ماں کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ اتنے مکمل لگ رہے تھے کہ میں پوری تقریب انہیں تکے گئی۔ مجھے ان کی بیوی اچھی لگی تھی، وہ انہی کی طرح بے حد ملنسار اور شائستہ تھی البتہ میرا ان سے تعارف نہ ہوسکا کہ یہ وہ موقع تھا جب رضا کے اردگرد لگے جمگھٹے کے پیچھے میں چھپ جایا کرتی تھی۔

وہ تینوں ایک تصویر کھنچوانے کے لیے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کیمرا پکڑے ذورین کے کہنے پر مسکرائے فلیش کی روشنی میں ان کی کاملیت اور بھی دمکنے لگی۔ کھٹا کھٹ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی تصاویر لینے لگے اور وہ ریڈ کارپٹ پہ فوٹو شوٹ کروانے والے اسٹار سلیبریٹیز کے مانند ہر طرف کیمروں اور فلیش کی چکاچوند روشنیوں سے گھر گئے۔ اپنے موبائل سے بہت دور سے ایک تصویر میں نے بھی لی تھی۔

اس رات میں اس تصویر کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیوں؟

☆☆☆

کاریڈور میں اسٹوڈنٹس آجا رہے تھے۔ میں اپنی بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی آہستہ آہستہ اس آخری دروازے کی جانب بڑھنے لگی جس پر رضا حیات خان کے نام کی تختی لگی تھی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دو دفعہ کھٹکھٹایا پھر جواب ... نہ پا کر ذرا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

ان کی کرسی خالی تھی۔ البتہ ایک خالی کونے میں وہ جانماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس پل میں نے دروازہ کھولا وہ اسی پل سجدے میں گئے۔ میرا دل احترام سے بھر گیا۔

ان کے سلام پھیرنے تک میں چوکھٹ میں کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہوئے تو سر اٹھایا۔ چہرے پر حیرت آگئی۔

''میری اتنی برائٹ اسٹوڈنٹ اتنے تکلف سے ابھی تک دروازے پر کھڑی ہے، اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ آئیں، بیٹھیں نا۔'' وہ تاسف وندامت سے جانماز تہ کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے لیے کرسی کھینچی۔

''سوری پروفیسر!'' میں لب کاٹتی دروازہ بند کر کے کرسی تک آئی۔ وہ اب گھوم کر میز کے پیچھے جا کر اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ رہے تھے۔ ان کا کوٹ کرسی کی پشت پر لٹکا تھا اور وہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک موڑے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے بہت بے تکلف اور ریلیکسڈ لگ رہے تھے۔

''لائیں کتاب دکھائیں، کون سا ٹاپک سمجھنا تھا آپ نے؟'' وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر صفحے پلٹنے لگے۔ صبح کلاس کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک موضوع کے سمجھنے میں دشواری ہے تو انہوں نے فوراً مجھے ایک بجے اپنے آفس میں ملنے کو کہا تھا۔

''تو اس میں کیا سمجھ نہیں آیا آپ کو؟'' مطلو

ول کر اب وہ اس پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے
رہے تھے۔
"سر یہاں سے آگے......" میں آگے ہو کر انگلی
رکھ کر بتانے لگی۔ بہ مشکل دس منٹ لگے انہیں مجھے
سمجھانے میں، اور ساری باتیں میری سمجھ میں
آگئیں۔
"اب بتائیں چائے لیں گی یا کافی؟" کتاب
بند کر کے انہوں نے ایک طرف رکھ دی۔
"دونوں نہیں۔"
"پھر جوس تو لیں گی ہی۔" وہ اٹھے اور سائڈ پر
رکھی ٹی ٹرے سے ایک کین اٹھا کر کھولا اور ایک شیشے
کے گلاس میں انڈیلا۔
"تھینک یو...... آپ کی وائف بہت اچھی ہیں
پروفیسر۔" میں نے اورنج جوس کا ایک گھونٹ بھر کر
گلاس میز پر رکھا۔
"جانے بھی دو حلیمہ داؤد۔" انہوں نے ایک
اداس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ میں شل رہ گئی۔
"کیوں پروفیسر...... کیا ہوا؟"
"اچھی مسلمان لڑکی وہ ہوتی ہے جو سر ڈھانپے،
حجاب پہنے۔ اب آپ ہیں، مجھے آپ بالکل اپنی چھوٹی
بہن کی طرح لگتی ہیں۔ اور سر ڈھکے تو آپ بہت اچھی
لگتی ہیں۔ مگر میری بیوی......" ایک تلخ مسکراہٹ ان
کے چہرے پر بکھری تھی۔ "میری بیوی میری نہیں
سنتی۔" ان کا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہنا مجھے معتبر کر گیا
اور ان کی بیوی کا رویہ دکھی۔
"وہ ایسے کیوں کرتی ہیں؟"
"غرور...... اپنی ذات کا زعم، کچھ اپنے باپ کی
دولت کا تکبر، ایک عام سے پروفیسر سے اتنے بڑے
باپ کی بیٹی شادی کرے گی تو وہ برابری پہ تو کبھی نہیں
آئے گی۔"
"ارینج میرج تھی؟" میں اس وقت سب کچھ
سوچنا چاہتی تھی سوائے اس کے کہ میں بہت پرسکون
ہو رہی ہوں۔
"اونہوں...... لو میرج! بور کے لڈو۔" ان کا
وجیہہ چہرہ حزن و اداسی سے پُر تھا۔ میرا دل کٹنے لگا۔
"میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"
"پتا نہیں حلیمہ...... میں اپنے لیے خود کچھ نہیں
کر سکتا تو تم کیا کرو گی...... بعض دفعہ زندگی ایک مقام
پر ٹھہر جاتی ہے، سمجھ نہیں آتا کہ کس طرف کو نکلیں۔
آگے یا پیچھے، ایسے میں اگر کوئی دل کا بوجھ ہلکا کر دے
تو اچھا لگتا ہے۔ تم سے بات کر کے بھی اچھا لگا۔ اللہ
تمہیں خوش رکھے۔" پھر وہ میرے ساتھ ہلکی پھلکی
دوسری باتیں کرنے لگے۔
وہ ساعتیں میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع
بن گئیں۔ ان کے آفس سے نکلتے وقت میرے اردگرد
میرا ست رنگا بلبلہ تن چکا تھا۔ میں اسی میں مقید فضا
میں تیرتی رہی تھی۔ میں جاگتی آنکھوں سے دن کی
روشنی میں پہلی بار اپنا یاور بن گئی تھی۔
اس روز میں نے پہلی دفعہ ایک بچھڑا بنایا تھا۔
البتہ یہ بات میں اس وقت نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو اماں رو رہی تھیں۔ ماموں آج بہت
سی باتیں سنا کر گئے تھے۔ ان کی مطلوبہ رقم کا انتظام
نہیں ہو سکا تھا۔ اور وہ اب مجھے اور اماں کو سامان
سمیت مکان سے باہر پھینکنے کی دھمکی دے کر گئے
تھے۔
"خون سفید ہو گیا ہے کرامت بھائی کا۔" اماں
کو ماں جائے کی بے حسی رلا رہی تھی۔ میرا دل بھی دکھ
میں گھرتا گیا۔ عجیب مایوسی کا عالم تھا۔ پریشانی کے
باعث رات میں اماں کی حالت بگڑتی گئی تھی۔ بخار
نے ایسا آن گھیرا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔
رات کے تیسرے پہر وہ بہ مشکل دوا سے کچھ

سنبھلیں تو میں باہر برآمدے میں آبیٹھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پریشانی در پریشانی ہر مسئلے کے آخر میں اگر مجھے کوئی ایک شخص نظر آتا جو میری مدد کر سکے تو وہ رضا حیات تھے۔ کیسے اور کیوں، میں نہیں جانتی تھی۔ صبح کے چار بجے بالآخر دل کے ہاتھوں ہار کر میں نے موبائل اٹھایا اور رضا کا نمبر ملایا جو انہوں نے مجھے آفس میں دیا تھا۔ دوسری گھنٹی پہ فون ریسیو کرلیا گیا۔

''حلیمہ داؤد نے اتنی جلدی مجھے کیسے یاد کرلیا؟'' وہ اتنا ہشاش بشاش تھے کہ میں لمحے بھر کو اپنا مسئلہ بھول گئی۔

''آپ جاگے ہوئے تھے؟''

''ہاں، ابھی تہجد پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟'' جواباً میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو دل بھر آیا۔ گلا رندھ گیا۔

''حلیمہ..... تم رو رہی ہو؟'' وہ فکر مند ہوگئے تھے۔ میں آنسوؤں اور سسکیوں میں سب کہتی چلی گئی..... آخر میں وہ دھیرے سے ہنسے۔

''اتنی سی بات.....؟ اور میں سمجھا کہ پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔''

''ہے..... بالکل ہے..... اور یہ مسئلہ صبح تک حل ہوجائے گا۔'' ویسے کدھر رہتے ہیں تمہارے ماموں؟'' بے خیالی میں، میں نے ماموں کا ایڈریس اور نمبر دے دیا۔ پتا نہیں وہ ان کو کیسے سمجھائیں گے۔

''بس صبح تک میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ اچھا بتاؤ، تم نے رات سے کچھ کھایا یا نہیں؟''

''نہیں۔''

''پھر میں ہولڈ کرتا ہوں، جاؤ کچن میں اور کچھ پلیٹ میں لے کر آؤ پھر باتیں کرتے ہیں۔''

''اچھا۔'' میں نے فون رکھا اور مسکراتے ہوئے اٹھی۔ مجھے اپنے بھاری کندھے ہلکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس صبح ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن کی، اسکول کے زمانے کی، اپنی اپنی فیملیز کی، گھر اور دوستوں کی۔ مجھے وہ بھی اپنی طرح اکیلے اور اندر سے زمانے کے ڈسے ہوئے لگے تھے۔ میں بہت آہستہ ان کے بہت قریب آگئی۔

اور پھر اس صبح وہ یونیورسٹی نہیں آئے۔ شام کو ماموں نے اماں کو شکریے کا فون کیا کہ ان کو ہمارے بھیجے بندے نے پیسے ادا کردیے تھے۔ اماں حیران تھیں ان کو تو نہیں البتہ مجھے ضرور کہا۔

''کس نے ادا کیے پیسے؟''

''ایک دوست نے مدد کی ہے۔ میں اسے لوٹا دوں گی۔''

''مگر.....''

''آپ آم کھائیں، پیڑ کیوں گنتی ہیں؟'' چپ ہوگئیں مگر اگلے روز جب میں نے رضا سے پیسوں کی واپسی کی بات کی تو وہ ''ارے چھوڑو'' کہہ کر بات ٹال گئے۔ میں نے اصرار کیا تو وہ شرمندہ ہونے لگے۔

''اگر اب تم نے پیسوں کی کوئی بات کی تو میں سمجھوں گا کہ حلیمہ داؤد میری سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔'' اور پھر میں نے پیسوں کی کوئی بات نہیں کی مگر..... واقعی..... دیکھیں میں نے واقعی پیسوں کی کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی..... پھر کیوں..... کیوں چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ میں ان سب سے برائٹ اسٹوڈنٹ نہیں ہوں؟ یا شاید نہیں رہی؟

کیوں نہیں رہی اور کب سے نہیں رہی؟

ہاں، تب سے جب فلزہ ابراہیم میری زندگیوں میں آگئی۔

فلزہ..... وہ ہیرا جو ڈھلا نہیں، صرف نوٹا

استاد کی قدر و عظمت

فاتح عالم سکندر ایک مرتبہ اپنے استاد ارسطو کے ساتھ گھنے جنگل سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا برساتی نالا آگیا۔ نالا بارش کی وجہ سے طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد میں بحث ہونے لگی کہ خطرناک نالا پہلے کون پار کرے گا۔ سکندر بضد تھا کہ پہلے وہ جائے گا یا آخر ارسطو نے اس کی بات مان لی۔ پہلے سکندر نے نالا پار کیا پھر ارسطو نے نالا عبور کر کے سکندر سے پوچھا۔ ''کیا تم نے پہلے نالا پار کر کے میری بے عزتی نہیں کی؟'' سکندر نے ادب سے جواب دیا۔ ''نہیں استاد مکرم، میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ارسطو ہے تو ہزاروں سکندر تیار ہوسکتے ہیں لیکن سکندر ایک بھی ارسطو تیار نہیں کرسکتا۔''

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

ایک دفعہ ٹوٹے تو پھر کبھی جڑ نہیں سکتا۔

☆☆☆

''فلزہ ابراہیم، نائس نیم..... مگر کلاس کو یہ تو بتائیں کہ فلزہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'' پوری کلاس میں سناٹا چھایا تھا اور بہت سی نگاہیں رشک و حسد سے رضا حیات کی مخاطب کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ لیٹ ایڈیشن تھی۔ دیر سے آنے والے مگر جانے والوں میں سے تھی۔ کامنی سی لڑکی، بے حد گوری ملائم جلد اور لانبی آنکھوں کی مالک۔ اس کے بال کرنک کرتے تھے۔ سیدھے، سلکی سیاہ بال اور وہ ہمیشہ انہیں سمیٹ کر دائیں شانے پر آگے کو ڈال دیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بہت جدید تراش خراش کا، کورے بے باک سا تھا۔ آستین، غائب، کھلا گلا اور گردن سے لپٹا دوپٹا..... وہ بہت خوب صورت تھی، نازک سی کسی ادھ کھلے پھول کے مانند جسے چھونے سے بھی میلے ہونے کا خدشہ ہو۔

''فلزہ یعنی ڈائمنڈ!'' وہ اپنی نازک، لمبی گردن کو اٹھائے بولی تو رضا حیات دھیرے سے مسکرائے۔

''ڈائمنڈ..... جو ڈھلا نہیں صرف نوٹا ہے؟''

''اور اگر ایک دفعہ ٹوٹے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔''

وہ اعتماد طریقے سے بولی۔

''آپ نے اتنا لیٹ ایڈمیشن کیوں لیا فلزہ؟'' جواباً فلزہ نے نزاکت سے شانے اچکائے۔ اس کے شانے اچکانے کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔

''موڈ نہیں بنا، بس۔''

''چلیں، اچھا ہے کہ اب موڈ بن گیا تو کلاس اٹینڈ کریں۔ فلزہ ابراہیم سے۔ ہماری مستقبل کی برائٹیسٹ اسٹوڈنٹ سے۔''

میں بُری طرح چونکی مگر رضا حیات میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وہ فلزہ کی جانب متوجہ تھے۔ آج

''کیونکہ بندر کو درخت سے لٹکنا ہوتا ہے۔ سو وہ اپنی دم کو شاخوں پر رول کر کے لٹکتا ہے۔'' رضا بہت

صبر سے، مسکراتے ہوئے ہر بات کی وجہ بتاتے تو میں انہیں داد دیے بغیر نہ رہ سکتی مگر پھر......

''بندروں کا درختوں پر لٹکنا کیوں ضروری ہے، وہ ایسے ہی کیوں نہیں رہ سکتے؟''

''اُف......'' میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی تھی۔ فلزہ سے سب ہی اب کوفت کھانے لگے تھے۔ اس کے سوال وقت کا زیاں تھے اور کچھ نہیں، یہ بات سب پہ عیاں تھی پھر بھی رضا اسے جواب ضرور دیتے۔

اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس روز میں رضا کے آفس کس کام سے گئی تھی شاید کوئی اسائنمنٹ جمع کرانا تھا۔ دروازہ نیم وا دیکھ کر میں نے دھکیلا تو سامنے کا منظر عیاں ہوا۔ فلزہ، رضا کے مقابل کرسی پر بہت بیزار سی بیٹھی تھی۔ کہنی میز پر ٹکا کر ہتھیلی ٹھوڑی تلے جمائے، وہ بلند آواز سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور پھر لب بھینچ لیے۔

''آیئے حلیمہ!'' رضا نرمی سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی فلزہ کی کرسی تک آئی۔ اس کے ساتھ ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ رضا نے اس خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''بیٹھیں۔'' فلزہ ایک دم کھڑی ہوئی، ایک تیکھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولی۔

''آپ مصروف ہیں تو میں اپنا سوال پھر کلیئر کرلوں گی۔''

''ارے نہیں فلزہ، آپ بیٹھیں، میں نے حلیمہ سے چند ایک......''

''رہنے دیں، جا رہی ہوں میں۔'' ایک کڑی نگاہ مجھ پر ڈال کر اس نے میز پر رکھا پرس اٹھایا اور ٹھک ٹھک کرتے ہوئے کمرے سے نکلی پھر اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

''ناسمجھ ہے، بچی ہے، تم برا مت ماننا بیٹھو۔''

''نہیں پروفیسر، بس یہ اسائنمنٹ......'' میں نے کاغذوں کا پلندہ ان کی طرف بڑھایا۔

''اوکے...... میں دیکھ لیتا ہوں۔ چائے پیو گی پھر کافی؟''

''کچھ نہیں، مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔'' میں بنا کچھ سنے شکستہ قدموں سے پلٹ گئی۔ میں کیوں بیٹھی اور کس کے لیے۔ مجھے اپنا آپ رضا پہ ایک بوجھ لگنے لگا تھا۔ ان کی زندگی کی مکمل تصویر میں میری کوئی جگہ نہیں تھی۔ آہستگی سے میں نے ان کے کمرے کا دروازہ بند کیا تو دیکھا فلزہ دیوار سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے کھڑی ہے، میں سر جھکائے آگے بڑھنے لگی تو وہ ایک دم میرے ساتھ چل دی۔

''کیا ہے تم میں حلیمہ داؤد کہ رضا حیات ہر وقت تمہاری باتیں ہی کرتے ہیں؟''

میں ٹھٹک کر اس کی جانب پلٹی، وہ عجیب ترسی ہوئی نگاہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''حلیمہ یہ ہے، حلیمہ وہ ہے، انہیں حلیمہ سے آگے اور پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے جب تک تم ہو، وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔'' اس کے لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تھا کہ میں دنگ رہ گئی۔

''فلزہ! میرا اور تمہارا کیا مقابلہ؟''

''ہے نا! تبھی تو وہ میری ہر شے کو تم سے کمپیئر کرتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ میں تم جیسی بن جاؤں حلیمہ؟'' پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''مجھے اپنے جیسا بنا دو حلیمہ داؤد شاید تب وہ مجھے ایک نظر دیکھ لیں۔'' مجھے لگا اس کی لانبی آنکھوں میں نمی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسی بے بسی اور کرب تھا کہ میں یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ زندگی میں پہلی دفعہ وہ مجھے بری نہیں لگی تھی۔

''اچھا! میرے ہاتھ چھوڑو لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' میں آگے چل دی تو وہ نخریلی نازک مزاج، شاہانہ سی لڑکی سر جھکائے میرے پیچھے ہولی۔

اس ہیرے کو توڑنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی روح، دل اور احساسات، سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ وہ، وہ نہیں تھی جو کلاس میں لگتی تھی۔ وہ رضا کو زچ کرنے کے لیے سوال نہیں کرتی تھی۔ وہ وقت ضائع کرنے کے لیے بحثیں نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف توجہ کی طالب تھی۔ اسے رضا کی توجہ چاہیے تھی۔ اسے صرف ان کی اپنے لیے کہی گئی چند باتیں چاہیے تھیں۔ وہ اپنا اور کے روپ میں حلیمہ داؤد کا پرتو تھی مگر یہ بات میں اسے بتا نہ سکی۔

اس کے والدین آسٹریلیا میں تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے پاکستان آئی تھی۔ پڑھنے کے لیے عموماً لوگ پاکستان سے آسٹریلیا جاتے ہیں مگر فلزہ کا ہر کام الٹا ہوتا تھا۔ وہ والدین سے دور رہنے کے لیے ادھر اپنی خالہ کے پاس رہنے آئی تھی۔ پڑھائی کا تو بس بہانہ تھا۔ اس کے پیرنٹس کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی اور نہ بننے کا امکان تھا۔ وہ ان کی روز، روز کی بک، بک سے ذہنی مریض بن گئی تھی اور پھر ادھر ارسل تھا۔ اس کا خالہ زاد، اس کے عشق میں پاگل...... مگر فلزہ کو اس سے نفرت کی حد تک کوفت تھی۔ وہ سارا وقت ارسل سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی مگر اس کی آتشِ عشق نہ بھڑکتی۔ شادی پہ اصرار سے لے کر مووی پہ ساتھ جانے تک۔ ارسل ہر بات پہ اس کی منت کرتا اور وہ انکار کرتی رہتی۔ اب تو اس کا گھر جانے کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ توجہ کی طالب تھی اور من چاہی توجہ اسے صرف ایک ہی شخص دے سکتا تھا۔ رضا حیات خان......

''مجھے ہر طرف رضا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر دیوار، ہر کھڑکی، ہر درخت پہ۔ میں آسمان کو دیکھوں تو بھی وہ نظر آتا ہے۔ ایک دن میں ان کو کیمپس میں نہ دیکھوں تو میری سانس بند ہونے لگتی ہے...... میں کیا کروں حلیمہ؟'' اور مجھے جو لگتا تھا کہ اس مرض عشق میں، میں اکیلی ہی مبتلا ہوں تو غلط لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔

اس روز ہم دونوں دوست بن گئے۔ ایک قطعاً بھدا سا جوڑ...... مگر خیر جوڑ تو بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان ایک ہی اشتراکیت تھی اور کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا تھی؟

☆☆☆

رات کو فلزہ کی کال آگئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''ارسل نے کچھ کہا ہے کیا؟'' میں پریشان ہوگئی۔

''بھاڑ میں گیا ارسل...... میری زندگی میں ارسل سے زیادہ مسائل ہیں۔'' وہ چلائی تو میں نے گہری سانس لی۔

''پھر......؟''

''پروفیسر رضا...... وہ میری کال نہیں اٹینڈ کر رہے۔''

''تو رو کیوں رہی ہو؟''

''اگر تمہاری کال اٹینڈ نہیں کریں تو تم روؤ گی نہیں؟''

''نہیں۔'' حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں بھی رو دوں گی مگر گھٹ گھٹ کے اس کی طرح بہ آواز بلند نہیں۔

''تمہیں ان سے ویسی محبت نہیں ہے پھر جیسی

مجھے ہے۔"

"محبت کے پیمانے اپنی مرضی سے مت بھرو فلزہ۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جانو۔"

"پر وہ تمہیں مجھ سے زیادہ محبت دیتے ہیں، زیادہ عزت دیتے ہیں، تمہیں چھوٹی بہن بولتے ہیں اور میں تو کہیں نہیں ہوں۔"

"بہن بولیں، بیٹی بولیں یا اسٹوڈنٹ...... ہم دونوں کا رشتہ برابر ہے۔" میں اسے سمجھانے لگی مگر وہ ضدی لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

"پتا ہے حلیمہ...... میری امی میرے ابو سے جب بہت لڑتی تھیں تو انہیں کہتیں کہ سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور تب میں سوچتی شاید واقعی ایسا ہے مگر اب رضا سے مل کر مجھے لگتا ہے کہ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔ کچھ مرد رضا جیسے بھی ہوتے ہیں۔ عورت کو احترام اور عزت دینے والے، نگاہیں جھکا کر رکھنے والے، مضبوط کردار کے سچے مرد۔"

"بالکل!" میرے لبوں پر ایک معصوم مسکراہٹ بکھر گئی۔ رضا ایسے ہی تھے۔ نگاہیں جھکا کر بات کرنے والے۔ عموماً جب وہ میرے ساتھ مخاطب ہوتے تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں رہے ہوتے تھے۔

"لیکن پتا نہیں کیوں حلیمہ...... میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔" فون رکھنے سے قبل اس نے کہا تو میں بے اختیار چونکی تھی۔

☆☆☆

بہت دن بعد رضا کا فون آیا تو میں بہت خوش ہوئی۔

"ہمیں کیسے یاد کرلیا، پروفیسر؟"

"کر تو لیا!" وہ دھیرے سے ہنسے۔

"گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں، تم سناؤ، اسپیچ کمپیٹیشن میں حصہ لے رہی ہو؟"

"میں کہاں اچھا بول سکتی ہوں، پروفیسر؟"

"کوشش تو کرسکتی ہو۔"

"جانے دیں بلکہ فلزہ کا نام دے دیں نا۔ وہ اچھا بول لیتی ہے۔"

"یہ تم دونوں کی دوستی کیسے ہوئی؟" وہ ذرا حیران ہوئے۔

"بس ہوگئی...... آپ کو برا لگا؟"

"نہیں...... فلزہ نیگلیکٹڈ چائلڈ ہے۔ اسے تو... دیا کرو مگر......" وہ جیسے لمحے بھر کو جھجکے۔ "تھوڑا احتیاط کرنا، فلزہ میں بہت ٹینڈینسی ہے۔" انہوں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تو میں چونکی۔

"کس چیز کی ٹینڈینسی؟"

"بس یونہی......"

"بتائیں نا......؟"

"بس یہی جھوٹ بولنے کی...... اور باتیں گھڑنے کی۔"

"ریئلی!" میں شاکڈ رہ گئی۔ "آپ کو کیسے پتا؟"

"مجھے پتا ہے، اس نے مجھے اپنے کزن کے بارے میں بتایا تو......"

"ارسل؟"

"ہاں، ارسل۔" وہ دھیرے سے ہنسے۔

"کیوں؟ ارسل کیا اس کو اس طرح پسند نہیں کرتا جیسے وہ دعویٰ کرتی ہے؟"

"حلیمہ داؤد، تم بہت سیدھی ہو۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "تم نے اس کی ارسل والی بات پر یقین کرلیا؟"

"کیوں نہ کرتی؟"

"حلیمہ...... ارسل کوئی نہیں ہے، فلزہ کا کوئی خالہ زاد کزن نہیں ہے۔ اس کی خالہ تو میرڈ ہی نہیں ہے۔"

سالگرہ کی بہار

بہار آئی گلاب مہکے
ہماری آنکھوں کے خواب مہکے
مہکتی کلیوں کو دیکھ کر پھر
محبتوں کی وہ سوئی خواہش
چہک کے بیدار ہوگئی ہے
گلوں کے شانے پہ سر ٹکا کر
صبا بھی سرشار ہوگئی ہے
وہ بھولے بسرے تمام لمحے
وہ ساعتیں وہ تمام جذبے
جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے
خود اپنے اندر سمٹ گئے تھے
وہ لے کے انگڑائیاں جی اٹھے ہیں
ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہیں
اے کاش! دل کی ویراں زمیں پر
محبتوں کی پھوار برسے
برستی برکھا کہاں مقدر
دو بوند ہی تیرا پیار برسے
تو دیکھنا پھر کہ جانِ جاناں
ہماری آنکھوں کے ٹمٹماتے
چراغ یوں لو دے اٹھیں گے
کہ چاند تارے مدھم لگیں گے
دلوں کے غنچے یوں کھل اٹھیں گے
کہ پھول بھی مسکرا کے اپنی
قباؤں کو پھر سمیٹ لیں گے

شاعرہ: فاطمہ نجیب، کراچی

"کیا......؟" میں ششدر رہ گئی۔

"اس کے اندر باتیں گھڑنے کی بہت گنجائش ہے، ذرا احتیاط کرنا۔ وہ بس توجہ لینے کے لیے ایسا کرتی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے فون بند کیا اور سوچ میں ڈوب گئی۔ چند لمحوں بعد ہی فون دوبارہ بجا۔ میں چونکی۔ فلزہ کالنگ......

"ہاں فلزہ؟" میں نے فون کان سے لگایا۔

"تمہارا نمبر بزی تھا، میں نے رضا کو ٹرائی کیا۔ ان کا نمبر بھی بزی تھا۔ تم لوگ آپس میں بات کر رہے تھے کیا؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے فلزہ؟" باوجود اس کی شدت پسندی کے مجھے اس کی فکر رہتی تھی۔ اگر اس نے ارسل کو گھڑا تھا تو اپنا یاور کو میں نے گھڑا تھا۔ اگر وہ جھوٹی تھی تو میں بھی اتنی ہی جھوٹی تھی۔

"فرق یہ پڑتا ہے کہ مجھے کال کرنے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہے مگر تمہارے لیے وقت نکل آتا ہے۔" وہ حسد کا شکار نہیں تھی، اسے صرف احساسِ محرومی تھا۔

"انہوں نے صرف تقریری مقابلے کا پوچھنے کے لیے فون......"

"دیکھا...... دیکھا......" وہ اندازے کی درستی پر چلائی اور کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

چند ساعتیں گزریں تو پھر اس کی کال آئی۔

"حلیمہ......" وہ رو رہی تھی۔ "میں پاگل ہونے لگی ہوں۔"

"خود کو سنبھالو فلزہ...... وہ تمہارے ٹیچر ہیں، تمہارے لیے کتنا کر سکتے ہیں؟"

"بس ایک نظر...... ہر دن میں ایک نظر کی تڑپ ہوتی ہے مجھے۔" وہ اپنے آپ میں نہیں تھی، اس کی تڑپ زیادہ تھی۔

"تم ان کے بارے میں دوسرے طریقے سے مت سوچو۔"

"نہیں سوچتی...... اور وہ ایسے بندے ہیں بھی نہیں۔ وہ تو نظر بھر کر بھی مجھے نہیں دیکھتے۔ کوئی مرد اتنا

پارسا بھی ہو سکتا ہے؟''

''وہ تو ہیں نا۔''

''ہاں!'' وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دی۔

''پتا ہے حلیمہ، اس روز میں ان کے آفس گئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ سجدے میں جھک گئے تو میں سانس روکے ان کے اٹھنے کا انتظار کیے گئی۔ ان کی نماز اتنی آہستہ، دھیمی اور خوب صورت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

''سو تو ہے۔'' اور پھر ہم دونوں گھنٹوں رضا کی باتیں کیا کرتے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لائق کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے واحد بوٹنے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور پھر میں اور فلزہ الگ ہو ہی نہ سکے۔

☆☆☆

مجھے شدید ٹائیفائڈ نے آن گھیرا اور میں کئی دن تک بستر پر رہی۔ دوائیوں کا ایک ڈھیر تپائی پر دھرا رہتا اور میں نیم بے ہوشی کی حالت سے کبھی نکل پاتی اور کبھی نہیں۔

شاید مجھے یونیورسٹی سے ناغہ کیے چھٹا روز تھا جب فلزہ مجھے دیکھنے آئی۔

''دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے؟'' اس کی آواز میں خوشی کی رمق تھی۔ میں نے بہ دقت آنکھیں کھولیں تو دیکھا رضا حیات چوکھٹ میں کھڑے تھے۔

''پروفیسر!'' میرے لب پھڑپھڑائے، آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

''اب رضا آئے ہیں نا تمہیں دیکھنے، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' وہ بے تکلفی سے کہتی میرے سرہانے آ بیٹھی پھر رضا کے لیے ساتھ ہی کرسی کھینچی۔

''آئیں رضا، بیٹھیں نا۔'' وہ اسی طرح ان کو نام سے پکارتی تھی۔

''کیسی ہیں آپ حلیمہ داؤد؟ ہم سب کو پریشان ہی کر دیا۔'' وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھے۔ دھیمے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''بس!'' میرا گلا رندھ گیا۔ میں لیٹی ہی رہی اٹھنے کی سعی بھی نہیں کی۔

''اللہ آپ کو صحت دے گا۔ یہ بیماری کچھ نہیں سوائے اس کے کہ یہ پاک کرنے والی ہے۔''

''تھینک یو پروفیسر۔'' میری آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''رضا..... آپ تو اتنے نیک ہیں، اتنے عبادت گزار ہیں، کچھ پڑھ کر پھونکیں نا حلیمہ پر کہ یہ ٹھیک ہو جائے۔''

''اتنا بھی نیک نہیں۔'' وہ جھینپ گئے۔

''ہیں نا..... حلیمہ تمہیں پتا ہے رضا چھ سال کی عمر سے تہجد پڑھ رہے ہیں اور آج تک ان کی کوئی تہجد نہیں چھوٹی۔''

''جانے دو فلزہ۔'' وہ شرمندہ ہو گئے اور میں سوچنے لگی کہ جس شخص کی ستائیس سال تک کوئی تہجد نہ چھوٹی ہو، اس کا مقام اللہ کے نزدیک کیا ہوگا؟ میرا دل رعب سے بھرنے لگا۔

پھر وہ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے کوئی آیت پڑھنے لگے۔ ان کا عربی لہجہ بہت خوب صورت تھا۔ چند لمحے بعد وہ خاموش ہوئے اور ہاتھ ہٹا دیا۔

''اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' جاتے ہوئے رضا نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

رات تک وہ ٹائی فائڈ جو پہلے اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا، یوں غائب ہوا جیسے کبھی چڑھا ہی نہ ہو۔ اگلی صبح میں ہشاش بشاش سی کیمپس میں تھی..... مگر حیران نہیں تھی۔

جس شخص نے ستائیس سال اللہ کی عبادت

ہو۔ اللہ اس کی بات کیوں ٹالتا حلیمہ؟'' اور میں اس سے متفق تھی۔

☆☆☆

ان دنوں فلزہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک اور الوہی مسکراہٹ ہمہ وقت رہتی۔ اب وہ رضا کو زچ کرنے والے سوال بھی نہیں کرتی تھی بلکہ ہر دم میرے ساتھ رضا کی باتیں کرتی۔ ان کو کھانے میں یہ پسند ہے، ان کو پرفیوم کی یہ برانڈ اچھی لگتی ہے، ان کا پسندیدہ لباس یہ ہے، وہ قرآن کے حافظ ہے اور ہر وہ بات جو میں نہیں جانتی تھی فلزہ کو معلوم ہوتی تھی۔ رضا کے بارے میں وہ مجھ سے کچھ غلط نہیں کہتی تھی۔ گو کہ ارسل کے قصے اب بھی اس کی زبان پہ ہوتے لیکن اب وہ بہت کم ہی وہ قصے سناتی۔ رضا اس کی ہر بات کا آغاز و اختتام ہوتے تھے۔

شاید رضا اس کی ذہنی حالت اور دیوانگی بھری طبیعت کو سمجھ چکے تھے۔ تبھی اس کو زیادہ وقت دینے لگے۔ وہ اکثر کلاس آف ہونے کے بعد بھی گھنٹوں رضا کے آفس میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فلزہ گھر لیٹ جانے لگی تھی اور جب گھر جاتی تو بھی رضا کو فون پر مصروف رکھتی۔ پڑھائی پر سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ نہ امتحان قریب ہونے پر دھیان دیتی، نہ اسائنمنٹس پر وہ تو اب لیکچر نوٹ کرنے کا تکلف بھی نہ کرتی تھی۔ رضا کی کلاس میں قلم ہونٹوں میں دبائے ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے یک ٹک رضا کو دیکھے جاتی۔ دوسری کلاسز بنک کر دیتی۔

پہلے ہفتے میں ایک بار رضا کے آفس چلی جایا کرتی تھی کوئی موضوع سمجھ نہ ہوتا یا ایسے ہی دل بھاری ہو جاتا تو ان سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ مگر اب سے وہ فلزہ کو زیادہ وقت دینے لگے، میرے لیے وقت کا خانہ تنگ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کلاس میں لیکچر کے علاوہ مہینہ گزر جاتا اور میں شاید ہی ان کی شکل دیکھ پاتی۔

میں نے بھی پھر انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اس سے آگے کہاں جا سکتا تھا بھلا؟ مجھے یہ بات سمجھ آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے میں ان کی طرف دیکھتی۔ میرے دل میں ایک امید جاگ اٹھی تھی کہ اگر رضا میرے لیے دعا کریں تو میری مفلوج ٹانگ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بھاگنے اور دوڑنے کو میرا دل چاہنے لگا تھا۔

مگر ایک اذیت بھی تھی۔ عشق لاحاصل.....

کدھر لے جائے گا یہ عشق لاحاصل مجھے؟ میری روح تھکنے لگی تھی۔ میں رضا کی محبت میں فلزہ کی طرح ڈوب چکی تھی مگر اس کا انجام کار کیا تھا؟ اس دوڑ کی آخری لکیر کدھر تھی؟ لیکن اپنے بارے میں اب میں کہاں سوچتی تھی۔ میں تو فلزہ اور رضا کی فلم کی خاموش تماشائی بن چکی تھی۔

☆☆☆

چند ہفتے مزید گزرے تو مجھے فلزہ میں ذرا فرق محسوس ہوا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوتی تو وہ پکارے جانے پر بری طرح چونک جاتی۔ کبھی ڈر جاتی۔ بات بے بات رونے لگ جاتی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بہنے کو تیار ہوتے۔

''فلزہ تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''ہوں، کچھ نہیں، کچھ نہیں.....'' وہ پھیکا سا مسکرا کر کہتی تو میں مطمئن نہ ہوتی۔

''کوئی مسئلہ ہے فلزہ؟''

''نہیں نا.....'' اس کی رنگت اب زرد رہنے لگی تھی۔ میں بہت پوچھتی مگر وہ چھپا جاتی۔

پھر ایک روز وہ ہوا جو مجھے ساری زندگی اذیت

دیتا رہے گا۔ میں جو فلزہ کے لاکھ چھپانے پر بھی کرید میں لگی رہی۔ ایک روز سب کچھ ایک دم سے جان گئی اور وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔

☆☆☆

''پروفیسر رضا کہتے ہیں کہ میں ان کی چھوٹی بہنوں کی طرح ہوں حلیہ..... کتنا معتبر کردیتا ہے یہ رشتہ آپ کو۔ اب میں انہیں رضا بھائی بلانے لگی ہوں۔ وہ خالی رضا بلانے پر ٹوکتے ہیں۔'' ہم دونوں لائبریری کے باہر سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ جب وہ از خود بتانے لگی۔ ہمارے درمیان اس موضوع کے علاوہ کسی دوسرے پر بھی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''مگر میں ان کی بیوی سے بہت جیلس ہوتی ہوں حلیہ۔''

''ایسا مت سوچو رضا کے بارے میں، تمام مرد ایک سے نہیں ہوتے۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے اور رضا بھائی جیسا تو کوئی نہیں ہے۔ جس شخص نے ستائیس برس تک اللہ کی عبادت کی ہو اس کو تو سب معاف ہے نا؟''

''ہاں! نہیں، پتا نہیں۔'' میں نے ناسمجھی میں سر ہلایا۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

''اچھا چلو، کینٹین چلتے ہیں۔'' وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوئی تو ایک چھوٹا سا تہ شدہ کاغذ اس کی فائل سے گرا اور میرے قدموں میں آن ٹھہرا۔

وہ اپنی دھن میں آگے بڑھ گئی۔ ویسے بھی وہ ذرا غائب دماغ رہنے لگی تھی۔ آگے پیچھے کا ہوش اسے نہیں رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھایا اور اسے پکارا۔

''فلزہ۔'' مگر وہ دور نکل چکی تھی۔

میں نے کاغذ کی تہیں کھولیں شاید اس کا کوئی اسائنمنٹ ہو میں جمع کروادوں گی یہی سوچ کر میں نے وہ کاغذ کھولا تھا۔

وہ ایک پرنٹڈ کاغذ تھا۔ میں اسے پڑھتی گئی، بار بار پڑھتی گئی یہاں کہ میرے وجود سے جان نکل گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا لیکن پھر میں نے ہمت مجتمع کی اور کاغذ اپنے بیگ میں رکھ کر اٹھی۔

''فلزہ۔'' میں نے اسے جالیا۔ ''کینٹین نہیں، لائبریری چلو۔''

''کیوں؟'' وہ کسی خیال سے چونکی۔

''چلو نا.....'' میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے زبردستی لائبریری کی طرف لے آئی۔

اندر سناٹا چھایا تھا۔ ہم دونوں کتابوں کے ایک ریک کے پاس جا کھڑے ہوئے اور مجھے پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے کونے میں رکھی ایک کتاب اٹھائی اور فلزہ کی طرف مڑی۔

''ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ بتانا۔'' میں نے بائیں ہاتھ میں اس کا موہی ہاتھ سختی سے جکڑ لیا تھا کہ وہ بھاگنے نہ پائے۔

''ہاں بولو۔'' وہ حیران سی کھڑی تھی۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟''

''کیا؟'' اس نے الجھ کر مجھے دیکھا۔

''تم کس کے بچے کو جنم دینے والی ہو؟ تمہاری پریگننسی رپورٹس پازیٹو آئی ہیں۔''

''نہیں!'' اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکالنا چاہا مگر میں نے گرفت اور مضبوط کردی۔

''بولو..... یہ بچہ کس کا ہے؟'' میں سرخ آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''نن..... نہیں.....'' اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ وہ بے جان لاش بنی پتھرائی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''نام بتاؤ مجھے اس کا۔ کون ہے وہ؟''

وہ بار بار لب کھولتی..... پھر بند کرلیتی۔

''فلزہ..... جواب دو۔'' میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''ار..... ارسل کا!'' بہ مشکل وہ بول پائی۔

''جھوٹ! تمہارا ارسل نام کا کوئی کزن نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

''یہ قرآن ہے، اس پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ یہ بچہ کس کا ہے، کس کے ساتھ کیا ہے تم نے گناہ۔'' میں نے اس کا ہاتھ زبردستی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب پر رکھا تو وہ ایک دم وحشت زدہ سی ہو کر تڑپنے لگی۔ وہ محض ایک عام سی کتاب تھی مگر فلزہ اسے قرآن سمجھ کر لرز اٹھی تھی۔

''نہیں..... نہیں.....'' وہ خود کو چھڑانا چاہتی تھی مگر چھڑا نہیں پا رہی تھی۔

''نام بتاؤ فلزہ..... بس نام۔'' وہ رونے لگ گئی۔ میری منتیں کرنے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں مگر جب میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی تو ایک دم اس کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔

''میں نے جان بوجھ کر نہیں..... اس نے مجھے مجبور کیا..... زبردستی.....''

''کون ہے وہ؟'' اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کا جواب جانتی تھی۔

''رضا..... رضا حیات..... خان۔'' میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بے دم سی پیچھے دیوار سے جا لگی اور وحشت سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ شاید خود بے یقین تھی۔

میری بینائی زمین پر گر گئی۔ میں خود بھی آہستہ سے فرش پر آبیٹھی اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے رونے لگی۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ میرا پارس پتھر جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔

لوگ میرے اردگرد اکٹھے ہونے لگے اور میں روتی گئی، کوئی وجہ پوچھتا اور کوئی تسلی دیتا۔ سب حیران پریشان تھے کہ یہ بدصورت لنگڑی لڑکی یوں زمین پر بیٹھی کیوں رو رہی ہے۔

''شاید اس کا کوئی مرگیا ہے۔'' کسی نے ہمدردی سے تبصرہ کیا۔ بات ٹھیک تھی میرا عزازیل مرگیا تھا۔ میں یونہی بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں کا ہجوم چھٹتا گیا اور میں لائبریری میں تنہا رہ گئی۔ تب میں اٹھی اور وہ کتاب اٹھائی اور اپنی۔ بیساکھی کے سہارے خود کو گھسیٹتی باہر جانے لگی۔

گھر تک کا سفر اس روز بہت طویل، بہت کٹھن لگ رہا تھا۔ میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتی، بے خودی سی چلتی جارہی تھی۔ وہ ساحر تھا..... اس کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپوں کی طرح دکھتی تھیں۔ مگر سحر اور معجزے میں یہی تو فرق ہوتا ہے، سحر سے رسیاں سانپوں کے مانند دوڑتی ہوئی لگتی ہیں مگر سانپ بن نہیں جاتیں۔ جلد یا بدیر جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور معجزہ عصا کو واقعی اژدہا بنا دیا کرتا ہے۔ ایسا فرقان عطا کرتا ہے کہ ہر شے یوں الگ الگ ہو جاتی ہے جیسے سمندر میں اکٹھا بہتا کڑوا اور میٹھا پانی جو بھی ایک دوسرے میں داخل نہیں ہو پاتا۔

میں اندھیرے میں ڈوبتے فٹ پاتھ پر چلتی جارہی تھی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک مغرب کی اذانوں میں گم ہو رہی تھی۔

کتنا عرصہ ہوا میں نے ہر مسئلے کے حل کے لیے رضا کا چہرہ دیکھنا شروع کردیا تھا۔ میں سمجھی تھی مجھے ان سے عشق ہے مگر نہیں..... میں نے تو انہیں اپنا خدا.....

مجازی خدا بنالیا تھا۔ صدیوں پہلے جب نیل کا دریا پار کر کے اسرائیلؑ کی اولاد ایک بستی پر سے گزری تھی تو ان ناخلف لوگوں نے بستی والوں کے جھوٹے معبودوں کی عبادت دیکھ کر موسیٰؑ سے کہا تھا کہ ہمیں بھی ایک ایسا الہ (معبود) بنادو۔ میں نے بھی یہی کیا تھا جب رضا حیات کو دیکھا تو دل نے خواہش کی کہ میں بھی اس پر نچھاور ہوسکوں..... پھر جب موسیٰ کوہِ طور سے نہ لوٹے اور بنی اسرائیل پہ مدت لمبی ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ موسیٰ کا الہ اس سے گم ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی مدت لمبی ہوگئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر یہ سمجھا تھا کہ میری مدد کرنے والا میرا الہ مجھ سے کھو گیا ہے اور پھر میں نے بچھڑا بنالیا، جیسے بنی اسرائیل نے بنایا۔ ایک سونے کا چمکتا، دمکتا، بے حد خوب صورت بچھڑا۔

مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، میں نہیں جانتی مگر میرا، حساب شروع ہو چکا تھا، کوئی میرے اندر بار بار مجھ سے پوچھتا رہا تھا کہ کہاں ہے تمہارا وہ مددگار مجازی خدا؟ پکارو رضا حیات کو۔ وہ آئے اور تمہیں اس اذیت سے نکالے جس میں فلزہ کے اعتراف نے تمہیں دھکیل دیا ہے۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی مگر وہ چہرے جو ہر مصیبت کی گھڑی میں میرا مشکل کشا بن کر سامنے آتا تھا۔ آج مجھ سے گم ہو چکا تھا۔

میرا عزازیل، ابلیس بن گیا تھا۔

☆☆☆

''میرا قصور نہیں تھا..... انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ تعلق مذہب اور معاشرے کی پابندیوں سے ماورا ہے۔'' وہ درخت سے ٹیک لگائے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے مطمئن کیا اور میں مطمئن ہوگئی۔ تم جانتی ہو وہ لفظوں کے ساحر ہیں۔ ان کو انکار کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔''

میں ویران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فلزہ کا چہرہ بیماری کی حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں تلے حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ اتنی کمزور اور اجڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں بتایا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ لاش بن چکی ہے۔

''حلیمہ میں انہیں کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کرلیں مگر وہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ شادی کی بات ٹال دیتے ہیں۔ وہ بات ادھر ادھر گھما دیتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے شادی کرلیں گے؟''

''شاید نہیں..... ایک پرفیکٹ فیملی کے ہوتے ہوئے وہ کیوں یہ رسک لیں گے جبکہ انہیں بغیر شادی کے بھی سب مل رہا ہے۔''

''حلیمہ!'' اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ ''جب سے میری رپورٹس آئی ہیں میں ان سے نہیں ملی۔ بس فون پر ہی زور دیتی ہوں شادی پر۔''

''اور اب تم ان سے ملوگی بھی نہیں..... سنا تم نے؟'' میرے سختی سے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند روز گزرے اور اس نے اپنی خالہ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ میرے گھر آکر رہنے لگی۔ اماں کو اعتراض ہوا مگر میں نے انہیں منالیا کہ شوہر نے طلاق دے دی ہے، وہ بے چاری کدھر جائے؟ اور جب اماں کو میری زبانی علم ہوا کہ ماموں کو کرائے کی رقم دینے والی فلزہ ہی تھی تو ان کے سارے اعتراض اور شکوک وشبہات دور ہوگئے۔

میرا ہیرا ٹوٹ چکا تھا اور میں پُرامید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کبھی جڑ بھی پائے گا یا نہیں۔

زرد چہرہ اور نڈھال وجود لیے وہ یا تو بستر پر پڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتی۔ زندگی فلزہ کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

رضا اب اس کی کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی آواز سننے کو تڑپ گئی تھی۔ مردانی تھی مگر وہ بہت مصروف تھے۔ آج کل وہ ایک مائیگریشن کروانے کے آنے والی لڑکی ردا قاسم کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ مگر اتنے نیک، شریف اور پارسا پروفیسر کے ساتھ ظاہر ہے ردا قاسم صرف اس لیے دیکھی جاتی تھی کیونکہ وہ اسے آنے والے ڈی بیٹ کمپیٹیشن کی تیاری کروا رہے تھے اور اسی لیے اکثر جب ردا ان کے آفس میں ہوتی تو دروازہ اندر سے لاکڈ ملتا تھا۔

''میں جانتی ہوں وہ لڑکیوں کو اپنے آفس میں گھیر کر کیا کرتے ہیں۔'' فلزہ درد سے روپڑتی تھی۔

''میں سب جانتی ہوں مگر میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔'' وہ یونہی ہلکتی رہتی اور میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتی۔ دنیا صرف اس کی نہیں لٹی تھی۔

☆☆☆

''سر ہم نے سنا ہے کہ آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پلیز ہمیں بھی سنائیے۔'' ردا قاسم ہمیشہ کی طرح چہک رہی تھی اور رضا جو کتاب کھول کر لیکچر شروع کرنے ہی والے تھے ذرا سا جھینپ گئے۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔''

''پلیز سر.....''

''پلیز پروفیسر سنا دیں نا!''

''سر رضا پلیز.....''

بہت ساری منت بھری آوازیں گونجیں اور لڑکیوں نے دوپٹوں سے سر ڈھکنا شروع کر دیا تو وہ گہری سانس لے کر مائیک کے قریب ہوئے۔

میں بنا پلک جھپکے، ویران نگاہوں سے ان کا ہینڈسم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی ملال، کوئی شرمندگی، کوئی احساسِ گناہ، کیا کچھ بھی تھا ادھر؟ وہ ذرا سا کھنکھار کر تسبیہ پڑھنے لگے۔

ان کی خوب صورت آواز کا سحر پورے ماحول پر چھانے لگا۔ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہر شخص اس سماں میں بندھ گیا تھا سوائے میرے..... میں بہت غور سے ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی احساسِ گناہ رقم تھا یا نہیں؟ یا کیا واقعی انسان کے اعمال اس کی پیشانی پر نہیں لکھے جاتے؟

وہ اتنے ہی پُرسکون، نیک اور پارسا لگ رہے تھے جتنا پہلے لگتے تھے۔ یہی تو فرق ہے سحر اور معجزے میں۔ سحر صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے اور میری آنکھیں اب دھوکے کی عادی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

فلزہ الجھ کر میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''اگر وہ میری منتوں ترلوں کے باوجود مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوئے تو اس طرح کیسے ہوں گے؟''

''تم کوشش تو کرو۔ تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ کبھی جا کر تم ان کی بیوی کو سب کچھ بتا دو گی۔''

''میں تو غصے میں کہتی تھی۔ بھلا ان کی بیوی میرا یقین کیوں کریں گی؟'' وہ میری تجویز پر حیران تھی۔

ان کی بیوی تمہارا یقین کیوں نہیں کرے گی؟ یہ شک بھی رضا نے ڈالا ہے تمہارے ذہن میں۔ تم پر اعتماد ہو کر ان سے بات کرو۔ وہ اس دھمکی پر ضرور ڈریں گے۔'' اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر میں اسے سمجھانے لگی۔ بہت دیر بعد اسے میری بات سمجھ میں آئی۔

''تمہارے نمبر سے کال اٹینڈ نہیں کر رہے تو تم میرے پی ٹی سی ایل سے کال کر لو۔'' فون کا ریسیور کریڈل سے اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں تھمایا اور اسے الجھتا چھوڑ کر باہر چلی آئی۔

اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں برآمدے میں تنہا بیٹھ

گئی۔ سامنے میز پر ایکسٹینشن دھرا تھا۔ چند لمحے میں سوچتی رہی پھر آہستہ سے ریسیور اٹھا لیا۔ میرے اندر موجود رضا حیات کی محبت میں ڈوبی لڑکی مسلسل فلزہ کو جھوٹا کہہ رہی تھی۔ شک کے باعث مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے ساعت ان کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ غیر اخلاقی حرکت تو تھی مگر شاید اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

''کس نمبر سے کال کر رہی ہو فلزہ۔''

''حلیمہ کے لینڈ لائن سے۔ میں آج کل اس کے پاس رہنے لگی ہوں۔'' وہ چند ثانیے کو خاموش ہو گئے۔

''رضا! مجھ سے شادی کر لیں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔'' (تم برباد ہو چکی ہو فلزہ) میں نے دل میں سوچا تھا۔

''فلزہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''آپ مجھ سے شادی کر لیں۔'' وہ میری ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔

''ساری زندگی پڑی ہے شادی کے لیے۔ ابھی کوئی اور بات کرو۔''

''ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے تو میں آپ کی وائف کو سب کچھ بتا دوں گی، یہ بھی کہ میں آپ کے بچے کی.....''

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔'' وہ تیزی سے بولے۔

''پھر مجھ سے شادی کر لیں۔'' وہ اصرار کر رہی تھی۔

رضا چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

''تم نے حلیمہ کو تو کچھ نہیں بتایا؟''

''بے فکر رہیں..... آپ کے اس ڈارک سیکرٹ سے کوئی واقف نہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''ٹھیک ہے، ہم کل شادی کر رہے ہیں، کل رات آٹھ بجے تم بلیو ایریا پہنچ جاؤ۔ وہاں مرسڈیز بنز کے شوروم کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جانا، میں تمہیں وہیں سے پک کر لوں گا۔ وہاں سے ہم میرے دوست کے گھر چلیں گے جہاں نکاح ہو گا، ٹھیک؟''

''جج..... جی۔'' وہ گنگ سی ہو گئی۔

''لیکن اگر تم نے حلیہ سمیت کسی کو بھی بتایا کہ کل رات تم مجھ سے ملنے آ رہی ہو تو شادی تو چھوڑو، میں تم سے بات بھی نہیں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ دس منٹ بعد جب میں واپس کمرے میں آئی تو فلزہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

''وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔''

''کب؟''

''کچھ دن تک!'' وہ مسکرا کر نال گئی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آج بھی رضا حیات کی داسی تھی۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی ان کے فرمان کے مطابق مجھ سے جھوٹ بولنے والی۔

☆☆☆

''مجھے خالہ کی طرف چھوڑ دینا، میرے پیٹرنس آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔''

اگلی شام جب میں نے اسے دانستہ بتایا کہ میں ماموں کی طرف جا رہی ہوں تو وہ فوراً بولی پھر تیار ہونے لگی۔

ہلکے گلابی رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے گلابی شیفون کا دوپٹا پھیلا کر لے لیا تھا۔ بال کھول کر دائیں شانے پر آگے کو ڈالے اور آنکھوں کو کاجل سے دہکایا۔ کانوں میں ننھے ننھے ٹاپس پہنے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

میں نے ٹیکسی میں اسے اس کی خالہ کے گھر کے

قریب مارکیٹ میں چھوڑا۔

"تم جاؤ، میں آگے خود چلی جاؤں گی۔" وہ اتر کر بولی تو میں نے سر ہلا دیا پھر میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی والا ایک راؤنڈ لے کر واپس ادھر آیا تو فلزہ دور ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی۔

میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال ٹیکسی والے کی طرف بڑھایا۔

"اس لڑکی کا پیچھا کرو۔ یہ بلیو ایریا جارہی ہے۔" کافی فاصلے سے اس کے تعاقب کے بعد میں فریسکو بیکری کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں میں تھی وہاں اندھیرا تھا۔ فلزہ مجھ سے دور مرسڈیز بنز کے شو روم کے سامنے منتظر کھڑی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

رات گہری ہورہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی آٹھ بج کر ایک منٹ تھا اور تبھی میں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار مخالف سمت سے بہت تیزی سے آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آخری حد تک روشن تھیں۔ اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔

"فلزہ!" میرے لب پھڑپھڑائے، بے اختیار میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

تیز رفتار کار زن سے فلزہ کے قریب آئی۔ فلزہ اور میں نے ایک ساتھ ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر فلزہ کی آنکھوں کی جوت جل اٹھی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے سڑک پر آئی۔

"نہیں..... فلزہ....." میں چیخنا چاہتی تھی مگر میری آواز حلق میں دم توڑ گئی۔ فلزہ اسی طرح سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ تیز رفتار کار قریباً اڑتی ہوئی عین سامنے آئی اور فلزہ کو ایک زوردار ٹکر مار کر آگے بڑھ گئی۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ فلزہ لہرا کر نیچے گری۔ میں نے چلاتے ہوئے بھاگنا چاہا مگر بیساکھی گرگئی۔ میں خود اوندھے منہ زمین پر جا گری۔

دور فلزہ خون میں لت پت گری وحشیانہ انداز میں چلا رہی تھی اس کے اردگرد لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ بہ مشکل اپنی بیساکھی، سنبھال کر میں لنگڑاتے ہوئے اس تک پہنچ پائی لوگوں کے ہجوم میں سے بہ دقت راستہ بنا کر میں نے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کا بے دم وجود خون میں نہایا تھا اور اس کی نگاہیں بے یقینی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ٹکر لگنے سے زیادہ وہ شاید اس آخری لمحے رضا حیات کے چہرے پر چھائی سفاکی کو دیکھ کر بے یقین ہوئی تھی۔

دور ایمبولینس کا سائرن بجنے لگا ..... مگر میں جانتی تھی کہ اب دیر ہوچکی تھی۔ میرا ہیرا چکنا چور ہوچکا تھا۔

☆☆☆

فلزہ مرگئی اور اپنے پیچھے بہت سے آنسو چھوڑ گئی۔ رضا حیات کو اس کی موت کا کلاس میں پتا چلا تھا۔ وہ بے حد حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے وہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآن کی تلاوت کے بعد ایک رقت آمیز دعا کروائی۔ آخر میں ان کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر فلزہ کی موت کے تیسرے روز انہوں نے فلزہ کی یاد میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام میں فلزہ کی ایک خوب صورت تصویر پیچھے اسٹیج پر آویزاں کی گئی اور فلزہ کے تمام جاننے والوں نے اس کے متعلق تاثرات بیان کیے۔

جب مجھے بلایا گیا تو میں نے ایک ویران نگاہ سب پر ڈال کر بس اتنا کہا۔

"فلزہ وہ ہیرا تھی جسے جوہری تراش نہ سکا۔ جوہری نے ایسی ضرب لگائی کہ وہ ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔ ہیرا سب سے سخت کو کہتے ہوتا ہے۔ اگر ٹوٹ

جائے تو جڑ نہیں سکتا۔ وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔"

چند روز گزرے تھے کہ میں نے سنا، رضا حیات نے اپنا ٹرانسفر کروالیا ہے۔ وہ سندھ چلے گئے اور اپنے پیچھے اپنے چاہنے والوں کو اداس چھوڑ گئے۔

میں نہ کبھی پولیس اسٹیشن گئی۔ نہ کبھی اس ہٹ اینڈ رن ایکسیڈنٹ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ فلزہ کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ پھانسی مل جاتی؟ ایسے تو وہ اگلے جہاں اپنے گناہ سے بری ہوجاتے۔ میں نے اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ قتل ان کے نامۂ اعمال کا واحد گناہ نہیں تھا۔ سو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور انہیں شک کا فائدہ بھی نہ دے۔ یہ دنیا ابلیسوں کے لیے سزا کی جگہ نہیں ہے۔

☆☆☆

کلاس میں پن ڈراپ سائلنس تھا، سب دم بخود، بھرزدہ سے سر ہاشم آفندی کو سن رہے تھے۔ وہ ہمارے سائیکالوجی کے نئے پروفیسر تھے۔ ہینڈسم، اسمارٹ، جینئس، حاضر جواب اور مہربان۔ وہ سب کچھ تھے۔ کوئی منتر تھا ان کے پاس کہ چند ہی دنوں میں ساری کلاس ان کی طرف کھنچی چلی آئی تھی۔ ان کی گرویدہ ہوگئی تھی۔

"کتنے اچھے ہیں نا سر آفندی....." کلاس کے بعد جب میں اپنی کتابیں سمیٹ رہی تھی تو میری کلاس فیلو فاطمہ یوسف نے آہ بھر کر کہا تھا۔

"ہوں گے۔" میں نے فائل میں صفحے ترتیب سے لگاتے ہوئے سرسری سا کہا۔

"بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں حلیمہ، اتنے نیک اور مہربان ..... جانتی ہو ان کا تعلق علما کے خاندان سے ہے۔ بلکہ برصغیر میں اسلام کو متعارف ان کے پرکھوں نے ہی کروایا تھا۔"

"میں نے انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے فاطمہ۔ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ انسان وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں۔" میں بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاطمہ نے خفگی سے مجھے دیکھا۔

"سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔"

"ہاں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔ جو محرم ہے، وہ مرد آپ کے لیے اچھا ہے اور جو محرم نہیں ہے، وہ چاہے آپ کو جس رشتے سے بھی پکارے، وہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوسکتا۔ جو محرم نہیں، اس سے تنہائی میں ملنے کی اجازت میرے رب نے نہیں دی۔ چاہے وہ تنہائی ٹیلی فونک گفتگو تک ہو یا کسی پروفیسر کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی حد تک۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے فاطمہ مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔" ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میں پلٹ گئی۔ میری بیساکھی کی ٹک ٹک خالی کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں لنگڑاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں جانتی ہوں کہ پیچھے بیٹھی فاطمہ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی مگر شاید آپ کو آگئی ہو۔ مجھے قدرت کا یہ اصول اس وقت سمجھ آیا تھا جب میں فلزہ کو کھو چکی تھی۔ ہاں میرا مددگار..... مجازی خدا رضا حیات تھا۔ وہ جس کے صرف خیال نے ہی مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اللہ سے دور کردیا تھا۔

میں نے اس سونے کے پنجرے کو توڑ کر جلا کر نیل کے پانیوں میں بہا دیا ہے اور اب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کا بھی کوئی ایسا جھوٹا خدا ہے جس نے آپ کو باندھ رکھا ہے اور آپ کو اللہ سے دور کردیا ہے؟ اگر ہے تو اسے ابھی توڑ ڈالیں۔ نصیحت پھر بعد میں آپ کے پاس نہیں آئے گی..... بعد میں صرف عذاب آتا ہے۔

مکمل ناول

پھر کوئی خواب بنو

عذرا بیگ

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو کمرے میں مختلف آوازوں کا شور یکدم تھم سا گیا۔

''عالیہ بیٹی ذرا دیکھنا......'' منصور احمد نے کہا۔

''جی اچھا......'' عالیہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ٹرن ٹرن بجتا فون اٹھا کر کان سے لگالیا۔ کمرے میں بیٹھا چھوٹا بڑا ہر شخص ہمہ تن گوش ہوگیا۔

''جی بہتر! میں ابھی بتا دیتی ہوں، آپ فکر نہ کریں، جی سب خیریت ہے، خدا حافظ۔'' عالیہ وقفے وقفے سے کہہ رہی تھی اور جب گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا اور وہ فون رکھ کر مڑی تو کتنی ہی سوالیہ نظریں اس کے

چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے بیٹی......؟'' منصور احمد نے اس کے بیٹھتے ہی پوچھا۔

''جی کل فلک آرہا ہے۔'' عالیہ نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور پیشتر اس کے کہ منصور احمد کچھ اور پوچھتے، کوئی اور سوال کرتے کمرے میں جیسے شہد کی مکھیوں کا پورا چھتا آن گھسا، کمرے میں جتنے لوگ تھے سب یک زبان ہو کر بول رہے تھے۔

''فلک......فلک انکل، بھائی فلک...... فلک بیٹا۔'' ہر کوئی اس کا نام لے کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کتنے دن رہیں گے؟'' کسی نے براہِ راست منصور احمد سے پوچھا۔

''انہیں یہاں ایک بینک میں بڑی اچھی جاب مل گئی ہے۔ اب وہ یہیں رہیں گے۔'' منصور احمد نے وضاحت کی۔

''ایسے ہونہار بچے کو اس کی محنت کا پھل ملنا ہی چاہیے۔'' دادی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ان کا سب سے لاڈلا نواسا جو تھا۔

''جی امی، آپ درست فرماتی ہیں اور پھر جنید اور بچوں کے امریکا چلے جانے سے گھر میں جو خلا سا پیدا ہو گیا ہے اس کی کمی بھی کچھ نہ کچھ پوری ہو جائے گی اور سہیل کو بھی کوئی ساتھی مل جائے گا۔'' ساجدہ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ان کی ساتھی میں جو ہوں۔'' عالیہ نے ماں کو تسلی دینے کے خیال سے کہا۔

''وہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی۔ ویسے سہیل مردانہ کمپنی کی کمی تو محسوس کرتا ہوگا۔ اب سارا وقت تمہارے پاپا کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھنے سے تو رہا۔'' ساجدہ بیگم کی آواز پُر دردی تھی۔ شاید بچھڑے بچوں کی یاد آ گئی تھی۔

''سوری امی جی، میں نے خوامخواہ آپ کو رنجیدہ کر دیا۔'' عالیہ نے شرمسار ہو کر کہا۔

''نہیں نہیں، بیٹی، ایسی کوئی بات نہیں، اب تم علیحہ اور مدیحہ کے ساتھ مل کر آنے والے مہمان کے قیام کا بندوبست کر دو۔ نور کا کمرا ٹھیک رہے گا۔ دونوں بھائی مل کر رہ لیں گے۔''

''مگر امی آپ تو جانتی ہیں نور آدھی آدھی رات تک کمپیوٹر کے آگے بیٹھا رہتا ہے اس طرح تو فلک بھائی بے سکون نہیں ہوں گے۔'' علیحہ نے دخل اندازی کی۔

''میں نور سے کہہ دوں گی کہ بھائی کے آرام کا خیال رکھے۔'' اب تم بھی اٹھو اور عالیہ کی مدد کرو۔'' ان کی آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں کہ انہیں بیٹی کی یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی تھی۔

''ویسے علیحہ ٹھیک کہہ رہی ہے امی۔'' عالیہ نے علیحہ کی ہاں میں ہاں ملانی چاہی۔

''اب ختم کرو یہ بیکار کی بحث...... جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔'' ساجدہ بیگم نے تحکمانہ کہا اور علیحہ، عالیہ کا انتظار کیے بنا کمرے سے نکل گئی۔

''امی آپ نے خوامخواہ علیحہ کو ڈانٹ دیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔'' عالیہ نے آہستگی سے کہا۔

''وہ میری بیٹی ہے عالیہ، جو اس کے دل میں ہے میں بخوبی جانتی ہوں اور اس کی ضد اور ہٹ دھرمی کو بھی خوب پہچانتی ہوں، بس تم ذرا فلک کو پیار سے سمجھا دینا کہ وہ اپنے آپ میں بند رہنے والی لڑکی ہے۔ اس کی کسی بات کو دل پر نہ لے۔'' ساجدہ بیگم کچھ رنجیدہ سی ہو گئیں۔

''میں سمجھا دوں گی امی، فلک آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔'' عالیہ نے ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار دیکھ کر تسلی دی۔

اگلے روز شام کو جب برخوردار فلک محسن علی دو بڑے بڑے رنگ برنگ سفری بیگ اٹھائے سر پر امریکن کیپ اور ہاتھ میں واٹر بوتل پکڑے ماموں منصور کے گھر پہنچا تو لگا جیسے ساہیوال سے نہیں کسی ائر پورٹ سے آرہا ہو۔ سب سے زیادہ حیرت زدہ علیحہ ہوئی۔ اس نے تو ذہن میں اس کا کوئی اور ہی حلیہ بنا رکھا تھا۔ سفید گھیر دار شلوار پر ڈھیلا ڈھالا سفید کرتہ، گریبان میں چمکتے ہوئے سونے کے بٹن، آنکھوں میں سرمے کی دھاریاں اور لمبے لمبے بال تیل میں چمکتے ہوئے لیکن یہاں تو زمین آسمان کا فرق تھا۔ تین سالوں میں وہ کافی بدل گیا تھا۔ خاصا رنگ روپ اور قد کاٹھ نکالا تھا۔ فیشن کے مطابق جدید لباس اور چہرے پر اگا ہلکا ہلکا سا گھاس پھوس کافی زیب دے رہا تھا۔

''تو یہ ہے وہ دشمنِ جان جس سے نبرد آزما ہونا ہے......؟ وہ ساحر آنکھوں والا ساحر جس کے سحر سے اپنے آپ کو بچا کے رکھنا ہے؟ وہ محمود غزنوی جو سارے کوہسار، دشوار گزار راستے، ندی، نالے عبور کر کے تمہاری سرحد پر آن پہنچا ہے اور تم اطمینان سے اپنے کاموں میں الجھی رہیں اور اپنے بچاؤ کا کچھ نہ سوچا؟'' اس کا دماغ جانے اس سے کیا کیا پوچھ رہا تھا۔

''خیر اب ایسا راج کمار بھی نہیں کہ دیکھتے ہی خاک کا ڈھیر بن جاؤں۔ میرا نام بھی علیحہ ہے، ساری جادوگری دھری کی دھری رہ جائے گی۔'' اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

فلک یوں بھی ہر دلعزیز تھا اور سب اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ وہ کیا آیا لگتا تھا خوشیوں اور قہقہوں کے سارے قافلے اس کے ساتھ چلے آئے ہوں۔ چھوٹے بڑے سب ہی اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بھی سب کے لیے درجہ بدرجہ کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لایا تھا۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اس نے ایک کلر فل شاپر علیحہ کی طرف بڑھایا جو اس نے شکریہ کہہ کر لے لیا۔

''مجھے امید ہے آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔''

علیحہ نے شاپر کھول کر دیکھا اندر کئی کتابیں تھیں۔ اس نے دوبارہ تھینکس کہا۔ کتابیں دیکھ کر وہ واقعی خوش ہو گئی تھیں۔

وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ سب چائے پیتے ڈھیروں باتیں کرتے ہوئے مزے مزے کے لوازمات کھاتے رہے جو اس پُرمسرت موقع کے لیے خاص طور پر ارینج کیے گئے تھے۔

''تمہارے آنے سے تمہاری ماما تو ضرور اداس ہو جائیں گی۔'' ساجدہ بیگم نے برسبیل تذکرہ کہا۔

''کوئی ایسی ویسی، وہ تو میرے آنے پر رضامند ہی نہیں تھیں۔ وہ تو ابو اور کچھ میں نے روشن مستقبل کے لشکارے دکھا دکھا کر راضی کیا۔ حالانکہ شفق بھائی نے وہاں دبئی میں میرے لیے جاب بھی ڈھونڈ لی تھی لیکن ماما نے اپنا وہ برا حال کیا کہ کیا بتاؤں۔'' فلک اپنے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تو پھر تمہیں لاہور بھیجنے پر کیسے رضامند ہوئیں؟'' منصور احمد بولے۔

''انہوں نے سوچا ہوگا لاہور کم از کم قریب تو ہے اور پھر آپ سب بھی یہیں ہیں......'' فلک نے چمکتے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی صحیح ہے۔'' ساجدہ بیگم بولیں۔

''آپ کو دبئی نہ جانے کا افسوس تو ہوا ہوگا؟'' شایان نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''سچ پوچھو تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ زندگی میں اور مواقع بھی آسکتے ہیں لیکن والدین کو چھوڑ کر اتنی دور جانا مجھے خود پسند نہیں۔ میرے لیے لاہور دبئی سے کم نہیں......'' فلک نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں تم سے متفق ہوں فلکی۔" سہیل نے پوری سچائی سے کہا۔

"تو اور کیا، جب چھٹیاں ہوں گی' میں چلا جایا کروں گا۔ جب ان کا دل چاہے گا، وہ آجایا کریں گے۔" فلک خوش دلی سے بولا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے' دونوں شہروں میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔" منصور احمد خوشدلی سے بولے۔

"میرا خیال ہے اب فلک کو اس کا کمرا دکھا دو، دن بھر کا تھکا ہوا ہے، کیوں فلک' میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟" ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' کچھ تھکن ہو ہی گئی ہے۔" فلک نے ذرا جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو چلو پھر آرام کرو، انشاء اللہ صبح ناشتے پر ملیں گے اور ہاں تمہاری جوائننگ کب سے ہے؟" منصور احمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"جی منڈے کو رپورٹ کرنی ہے۔" فلک نے کہا اور یوں ہنستے مسکراتے ایک دوسرے کو شب بخیر کہتے سب اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف چلے گئے۔ سب جا چکے تھے لیکن علیحہ اپنی سوچوں میں گم تھی۔

"ویسے تو بندہ بے ضرر سا نظر آتا ہے۔ جولی اور کھلا ڈلا لیکن دل کا حال کون جانے، یہ جو کسی وقت اس کی آنکھوں کے کونوں میں ستارہ سا نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے' ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ جھلکنے لگتی ہے جیسے کوئی وارننگ ہو، دراصل یہ سب اداکار ہوتے ہیں' ان کے چالاک اور مکار چہروں پر بھولپن اور معصومیت کے نقاب پڑے ہوتے ہیں۔ ان کی ظاہری شخصیت اور چکنی چپڑی باتوں کے جال فولادی ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ بے تکلف اور مہربان ہونے کی ضرورت نہیں۔" علیحہ کا چاق و چوبند دماغ کڑے انداز میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"بس تم دیکھتے جاؤ جو سوچ کر وہ آیا ہے یا سوچ رہا ہے، وہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ میں ابو، امی عالیہ بھابی اور دادو کے داؤ پھیر خوب جانتی ہوں، جو جال وہ میرے لیے بچھا رہے ہیں' سارے کے سارے نہ کاٹ دیے تو میرا نام بھی علیحہ نہیں۔" اس کے حسین چہرے پر ثابت قدمی کی ہلکی سی مسکان تھی۔

"کیا ساری رات یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟" عالیہ بھابی نے اچانک کمرے میں آکر پانی کی ٹرے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھابی، بس اٹھ ہی رہی تھی۔" علیحہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کوئی کام ہو تو مجھے بتائیں۔"

"نہیں ایسا تو کوئی کام نہیں بس ذرا فلک کو سیٹل کرنا ہے۔" عالیہ نے واپس مڑتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا لوری سنانی ہے؟ فیڈر دینی ہے؟" علیحہ نے چھیڑا۔

"نہیں بھئی، نئی جگہ ہے نا ذرا چیزیں وغیرہ سنبھالنے میں ہیلپ کر دوں تو اچھی بات ہے نا، آخر میرا بھائی بھی ہے اور مہمان بھی۔" عالیہ نے نرمی سے سمجھایا۔

"یہ تو ٹھیک ہے بس آپ جائیں اپنا کام کریں۔" علیحہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی ساتھ چلوں' کچھ مدد ہو جائے گی۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ!"

"علیحہ ایک بات تو رہ ہی گئی۔" عالیہ کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔

"کہیے....." علیحہ جاتے جاتے رکی۔

"تمہیں فلک کیسا لگا؟"

"کیسا لگا؟" علیحہ نے حیرانی سے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے تم نے اس کی باتوں سے'

مہرز سے، پرسنالٹی سے کیا اندازہ لگایا، اچھا مہذب انسان ہے یا ایویں ہے؟"

"دیکھیں بھابی اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرنا، اندازے لگانا، ذرا مشکل ہی ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ معقول انسان ہیں۔ ہنس مکھ، گھل مل جانے والے، دوسروں کی طرح شوشا والے نہیں۔"

"تمہارا اندازہ صحیح ہے، فلک ایک نیک دل اور سلجھا ہوا انسان ہے۔" عالیہ نے پوری سچائی سے کہا۔

"آپ کے بھائی ہیں آخر جیسی آپ ویسے وہ۔" علیحہ نے چھیڑا۔

"یہ میری تعریف ہو رہی ہے یا خوشامد۔" عالیہ نے چھیڑا۔

"دونوں ہی سمجھ لیں آخر میری پیاری دلاری بھابی ہیں آپ۔" علیحہ نے پیار سے کہا۔

"واہ بھئی آج تو کوئی نیک دن چڑھا تھا جو سب اچھا ہی اچھا ہے۔"

"انشاء اللہ آگے بھی ایسا ہی ہوگا۔" علیحہ نے اطمینان دلایا۔

☆☆☆

"ایمان سے باجی آپ کی نند صاحبہ تو بے حد مغرور ہیں یا پھر ایٹی کیٹس سے بالکل پیدل...... اور کہنے کو محترمہ بڑے ہائی فائی کالج میں زیر تعلیم ہیں۔" اپنی چیزیں سیٹ کرتے ہوئے فلک نے عالیہ سے شکایتاً کہا۔

"کیا خاطر داری میں کچھ کمی رہ گئی ہے؟" عالیہ اس کا اشارہ سمجھ کر بھی بھولی بنی رہی۔

"خاطر داری......؟ اب رہنے بھی دیں باجی، میرا جو مطلب ہے وہ آپ بخوبی سمجھ گئی ہیں۔" فلک ذرا تلخی سے بولا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ویر جی، ہاں ذرا طبیعت خاموش پائی ہے اور پھر شرم و حیا ادب لحاظ بھی کوئی چیز ہے۔ خاص کر جب گھر کے سبھی بزرگ ایک جگہ موجود ہوں، کیا وہ سب کے سامنے پوچھتی آپ کی پسندیدہ ایکٹریس کون سی ہیں۔ سنگر کون سا اچھا لگتا ہے۔ عاطف اسلم یا جگجیت سنگھ وغیرہ وغیرہ۔" عالیہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔" فلک کچھ شرمسار سا ہو گیا۔

"تو پھر کیا مطلب ہے سمجھاؤ نا مجھے۔" عالیہ بے ساختہ بھڑک اٹھی۔

"آرام سے باجی، اتنی خفا نہ ہوں، میرا مطلب ہے کوئی نیا مہمان آیا ہو تو بندہ ایک آدھ بات کر ہی لیتا ہے تاکہ مہمان کو محسوس ہو کہ وہ ویلکم ہے اور کچھ نہیں تو وہ نگی کے متعلق ہی ایک آدھ سوال پوچھ سکتی تھی۔ آخر اس کی ہم عمر ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم سب اپنے ہی تو ہیں لیکن نہیں' وہ تو یوں تشریف فرما تھیں جیسے وہ مہمانِ خصوصی ہوں اور سامنے مابدولت نہیں hunch back of noter dame بیٹھا ہو۔ مجال ہے جو ایک دفعہ بھی کوئی ڈش پاس کی ہو سوائے ٹشو پیپر کے ڈبے کے......

کیا یہ مہرز کے خلاف نہیں، کیا وہ میزبان نہیں تھی؟ آج پہلے ہی دن یہ رویہ ہے تو آگے کیا ہوگا۔ آپ خود ہی سوچیں۔" فلک نے جیسے شکایتوں کا دفتر کھول رکھا تھا۔

"اب تم زیادتی کر رہے ہو فلک، کچھ لڑکیاں ذرا کم گو ہوتی ہیں۔ بڑوں کے سامنے ذرا خاموش رہتی ہیں۔ دراصل تمہیں وہ لفٹ نہیں ملی جو پانے کے تم عادی ہو۔ اس لیے احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے ہو اور کوئی بات نہیں۔" عالیہ نے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ تو سراسر میری توہین ہوئی نا، آپ چاہے کچھ بھی کہیں اور کچھ نہیں تو آپ کے ناتے سے ہی کوئی ایک آدھ اخلاقی صفت دکھا دیتی، کم از کم نگی کے

بنائے ہوئے دوپٹے ہی کی تعریف کردیتی۔ بے چاری نے دن رات کر کے ایک ایک موتی لگایا ہے۔ رہنے دیں بس، محترمہ ایسی سبز پری بھی نہیں، خوب صورت ہوتی تو پتا نہیں کن آسمانوں میں ہوتی۔'' وہ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے بڑے رعب سے کہہ رہا تھا۔

''خوب صورت نہیں ہے؟'' عالیہ کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ''ہاں...... ؟'' وہ شاہانہ انداز میں کہتا پلنگ پر دراز ہوگیا۔

''یہ سب تمہاری نظر کا قصور ہے، کل سب سے پہلے اپنی آنکھوں کا معائنہ کراؤ اور...... ''ذرا کھڑے تو ہونا۔'' عالیہ کا انداز بھی نادر شاہی تھا۔

وہ حیران سا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

عالیہ نے چند لمحے اس کا اوپر سے نیچے تک اور نیچے سے اوپر تک معائنہ کیا۔ اس کے چاروں طرف ایک مختصر سا چکر لگایا۔ اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کی حیران حیران آنکھوں میں جھانکا۔ ہاتھ کے ذرا سخت جھٹکے سے اس کے چمکتے سیاہ بالوں کو اِدھر اُدھر کیا پھر اسی نادر شاہی لہجے میں بولی۔ ''ذرا یہ تو بتاؤ، یہ ہوائی کس دشمن نے اڑائی ہے کہ تم کہیں کے گلفام ہو؟ بس لے دے کے ذرا نین نقش ٹھیک ہیں۔''

''صرف ٹھیک......؟'' اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''تو اور کیا صرف ٹھیک اور قد کتنا ہے؟''

''چھ فٹ دو انچ۔''

''کچھ زیادہ ہی ہے۔'' عالیہ بے حد سیریس تھی۔

''اور......؟'' انہیں چپ پا کر وہ بے چینی سے بولا۔

''رنگ ذرا گوارا ہے۔'' عالیہ کی سیاہ آنکھوں سے شرارت جھانک رہی تھی۔

''گوارا ...... یعنی صرف گوارا۔'' وہ تڑپ کر بولا۔

''چلو تمہارا دل رکھنے کو مان لیتی ہوں کہ گوارا نہیں گورا ہے، خوش؟ ویسے سچی بات ہے تمہارا اور علیحہ کا کوئی مقابلہ نہیں، میرا کوئی کنوارا بھائی ہوتا تو ضرور اپنی بھابی بنا لیتی۔''

''اور میں کیا ہوں...... آپ کا دشمن......؟'' وہ غصیلے انداز میں بولا۔

''تو اتنی بھا گئی علیحہ؟'' عالیہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے یوں بولی جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

''ایمان سے آپ بھی بس کسی ہٹلر سے کم نہیں ہیں۔ ایسے ایسے نشانے لگائے ہیں کہ بندہ لہولہان ہوگیا ہے۔'' وہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بولا۔ ''جانے جذبات میں آ کر زبان سے کیا پھسل گیا۔''

''یہاں بیٹھو فلکی...... یہاں میرے پاس......'' عالیہ نے نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر پلنگ پر بٹھا لیا۔

وہ بڑی فرمانبرداری سے بیٹھ گیا۔

''سنو فلک، تم میرے حسب سے پیارے دلارے مُنّے سے بھیا ہو، تمہیں میں بھول سکتی ہوں؟ یقین کرو میرے دل میں تم دونوں کی تصویر بجی ہے اگر کوئی میری رائے پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ تم سے بہتر علیحہ کے لیے کوئی دوسرا جیون ساتھی نہیں ہوسکتا لیکن علیحہ کو یہ باور کرانا کنوینس کرانا دنیا کا دشوار ترین کام ہے۔'' عالیہ کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ سچائی کا آئینہ دار تھا۔

''لیکن کیوں بھابی؟'' آپ خود حساب لگائیں، دنیا میں ایسا کون سا بندہ بشر ہے جسے کسی نہ کسی کے ہاتھوں سے، زبان سے، رویّے سے، کسی نہ

کسی وقت کوئی چوٹ نہ پہنچی ہو لیکن پھر وقت ہر زخم بھر ہی تو دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ساری مخلوق ایک جیسی تو ہو نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا انسان ہوسکتا ہے جو اس نے خاص توجہ سے بنایا ہو۔ اس کے اندر اچھے اچھے جذبات اور خیالات بھرے ہوں۔ شیشے جیسا صاف شفاف دل دیا ہو۔ پاکیزہ اور روشن دماغ دیا ہو۔ اس کے جسم میں نورانی روح ڈالی ہو۔ ہوسکتا ہے نا ایسا......؟'' اس کا دل اس کی روح جیسے اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ فلک کی آواز کی لرزش اور چہرے پر پاکیزگی کا نور دیکھ کر عالیہ کی اور آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف فلک کی آنکھوں سے پھوٹتے سچائی کے دھارے دیکھے گئی۔

''منگنی کا ٹوٹنا کسی بڑے حادثے سے کم نہیں، میں مانتا ہوں لیکن ایسی قیامت بھی نہیں کہ انسان دنیا ہی تیاگ دے، زندگی تو تب بھی نہ رکتی اگر وہ موصوف دنیا سے ہی رخصت ہو جاتے۔'' فلک نے جلے بھنے انداز میں اضافہ کیا۔

''دنیا سے رخصت ہو جانے کو اللہ کی رضا سمجھ کر صبر آ جاتا ہے لیکن کسی کا دیا ہوا فریب، کسی کے کردار کی کوئی نا قیامت نہیں بھولتی۔ تمہارے لیے شاید یہ کوئی بڑی بات نہ ہو لیکن ایک لڑکی کے لیے خصوصاً علیحہ کے لیے اس کی زندگی کا عظیم ترین حادثہ ہے بغیر کسی وجہ ٹھکرائے جانے کا جانگسل صدمہ، ناکامی اور بدنامی کا بھاری بوجھ اٹھا کر جینا کوئی معمولی بات نہیں، تم نے بس آرام سے کہہ دیا کہ کوئی قیامت تو نہیں۔ منگنی کا ہے کوئی فلائٹ تھی جو مس ہوگئی یہ نہ ملی تو دوسری کا انتظار کرلیا۔ ایک معصوم پاک و شفاف لڑکی جس کے دل میں نئے نئے جذبوں نے ابھی سانس ہی لی ہو، جس کی منتظر آنکھوں میں پہلا روپہلا ستارہ جھلملایا ہو، اس کے ساتھ یہ ناروا سلوک ہو اس کے جذبات کیا ہوں گے، اس کی زندگی کیا ہوگی۔ اسے مستقبل پر یقین کیسے ہوگا؟'' عالیہ کا لہجہ پُردرد تھا۔

فلک یوں کھڑا ہوگیا جیسے الیکٹرک شاک لگا ہوا۔ وہ جھلائے انداز میں پینٹ کو ذرا اوپر کھینچتے ہوئے چنگیزی لہجے میں بولا۔ ''بھابی مجھے بتائیں وہ انسان کہاں ہے، پہلے میں اس کا تیا پانچا کر کے آؤں۔''

عالیہ نے اس کے جوش اور جذبے پر ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور محبت بھری آواز میں بولی۔ ''دھیرج میرے بھائی، دھیرج، یہ جوش کا نہیں ہوش کا مسئلہ ہے جو ہمیں ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے حل کرنا ہے، تبھی تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔''

''ہاں یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔'' اس نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں اور تم بھی دماغ پر زیادہ زور ڈالے بغیر آرام سے سو جاؤ۔ گھبراؤ نہیں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''i hope so'' اس کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔

''خدا حافظ!'' عالیہ نے نرمی سے اس کی پیشانی سہلائی۔

''خدا حافظ! آپ واقعی بہت ہی اچھی ہیں عالیہ بھابی کتنی ڈھارس بندھائی ہے آپ نے۔'' وہ ممنونانہ لہجے میں بولا۔

''اور تم بھی فلکی......'' عالیہ جاتے جاتے بولی اور آہستگی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی اور فلک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے سامنے لگی پینٹنگ کو دیکھتا رہا، جہاں بادلوں میں ابھرتے سورج کا ایک حصہ دکھایا گیا تھا۔ سورج کا ہر روز یوں روشنیاں لے کر نکلنا بھی تو نئی امیدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فلک نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں جہاں ایک دل رُبا چہرہ اس کا منتظر تھا...... جم سا گیا تھا اور جو ہٹائے نہیں ہٹ رہا تھا۔

☆☆☆

لاہور آنے سے پہلے اس نے کیا کیا نہ سوچا تھا، سپنوں کے کیسے کیسے رنگ برنگ تانے بانے بُنے تھے۔ لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ اس کے اپنے گھر کے ہلکے پھلکے آزاد ماحول کے بجائے، ہنستے مسکراتے چہروں کے بجائے یہاں کے گھر کی فضا کتنی گھٹی گھٹی سی تھی۔ سب کچھ برعکس تھا، سپنے تو سپنے رنگین نہ سہی سادے سے تانے بانے بُننے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا لیکن وہ بھی اپنی قسم کا ایک ہی تھا...... آج نہیں تو کل، کل نہیں تو اس سے اگلے دن کبھی تو کوئی کرن چمکے گی، کبھی تو کلی مسکرائے گی اور اس کبھی کبھی کی گردان کے پیچھے کوئی اور ہی جہاں تھا۔ جانے کب اپنے دل سے اپنی سوچوں سے اپنے آپ سے لڑتے لڑتے وہ گہری نیند کی خوب صورت دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

دوسرا دن بڑی آب و تاب اور امیدوں سے ابھرا۔ پھر وہی خاطر داریاں، وہی محفلیں، وہی ہنسی، وہی مذاق وہی چھیڑ چھاڑ لیکن خوشی اور راحت کی وہ لہر دور دور تک نہ تھی، جو وہ چاہتا تھا اس کا دل چاہتا تھا جس کا وہ منتظر تھا۔ محفلیں تو تھیں لیکن بجھی بجھی سی پژمردہ سی، جانِ محفل ہی غیر حاضر ہو تو محفل کیا سجتی...... لیکن پھر اس پر خود بخود یہ راز کھل گیا۔ سب کچھ روزِ روشن کی طرح آشکار ہو گیا کہ خواب خواب ہی رہیں گے اور آرزوئیں آرزوئیں ہی رہیں گی۔ اس کا دماغ ایک سچے دوست کی طرح رہنمائی کر رہا تھا لیکن پاگل نادان ضدی دل اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

اس بیکار کی جنگ سے گھبرا کر اس نے راحیل کو راز دار بنانے کے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔

"یوں کرو فلک جان ذرا موقع نکال کر آ جاؤ اور آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرو تو سوچ بچار کر کے راستہ نکال لیتے ہیں۔ اتنے اہم مسئلے فون پر تو حل ہو نہیں سکتے۔" راحیل نے بڑے پُرامید لہجے میں سمجھایا۔

"تو بس ٹھیک ہے، میں پہنچتا ہوں تم گھر پر ہی رہنا۔" فلک کی آواز میں نئی کھنک تھی۔

جب وہ راحیل کے گھر پہنچا تو اس نے پُرجوش استقبال کیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں، موسم کا حال سنانے کے بعد بڑے چوہدریوں کے انداز میں صوفے پر دونوں بازو پھیلا کر بڑے غور سے ہمدردانہ انداز میں اس کی روداد سنتا رہا، پھر سنجیدگی سے بولا۔

"اس سارے مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگر وہ محترمہ جھانسی کی رانی بنی تمہیں نظر انداز کر رہی ہیں تو تم بھی مٹی پاؤ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے راحی، زندگی موت کا سوال اور مٹی پاؤ؟" فلک کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ راحیل جیسا مار دھاڑ سے بھرپور بندہ اور بزدلانہ مشورہ۔

"تو پھر اٹھاؤ نہ پہلا قدم، سوچتے کیا ہو؟" راحیل نے اسے مضبوط پا کر حوصلہ دلایا۔

"میں اور پہلا قدم یعنی......؟" فلک سے کہا نہ گیا، راحی شاید اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھا ہی نہیں تھا۔

"ہاں میرے دوست، شیر جوان بنو اور اٹھاؤ پہلا قدم، ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ذرا حوصلے اور جذبے سے کام لو، ہمت دکھاؤ، جس ٹریجڈی سے گزری ہے پہلے آہستہ آہستہ اسے اس سے نکالو۔ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ عزم اور ہمت سے پٹڑی سے اتری گاڑی پٹڑی پر واپس آ سکتی ہے لیکن ہتھیلی پر سرسوں نہیں جم سکتی۔"

"یعنی پہلے زمین کا ٹکڑا ڈھونڈوں، ہل چلاؤں، سرسوں کے دانے بکھیروں پھر کنارے پر بیٹھ کر سرسوں کے پھولنے کا انتظار کروں۔ یعنی......" فلک نے مایوس ہو کر بات نامکمل چھوڑ دی۔ اس کے وجیہہ چہرے پر فکر مندی اور پریشانی کے آثار تھے۔

"ہاں، کچھ ایسا ہی کرنا پڑے گا ابھی تو شکر کرو دودھ کی نہر نہیں کھودنی......" راحیل نے پزا کا ایک پیس اٹھا کر پلیٹ میں رکھا۔

"تم کہو گے تو شاید وہ بھی کر لوں۔" وہ سیریس ہونے کے باوجود ہلکے سے مسکرا دیا۔

"اس میدان میں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کوئی ٹی وی پلے نہیں کہ ایک سین میں ہیروئن ہیرو کے قدموں میں قیمتی گلاس توڑتی نظر آتی ہے تو دوسرے سین میں چھت پر چڑھی اس کے ساتھ پتنگ اڑا رہی ہوتی ہے، ڈور پیٹی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ یہ زندگی ہے میری جان زندگی سب کچھ اصلی۔" راحیل نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ رکھ کر پیپسی کا گلاس اٹھا لیا۔ فلک نے اس کے ہاتھ سے گلاس واپس لے کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔

"تم کسی سیریس مسئلے میں بغیر کھائے پیے بات نہیں کر سکتے؟"

"شکر ہے کہ تم آئے اور اس بہانے یہ عیاشیاں ہو رہی ہیں۔ ورنہ امی نے ہر چیز کو تالا لگا کر چابی اپنے دوپٹے سے باندھ رکھی ہے، ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینا ہو تو سو منتوں سے فریج کی چابی ملتی ہے۔" وہ دکھی انداز میں بولا۔

"بہت اچھا کرتی ہیں، کبھی آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا ہے، پورے فٹ بال لگ رہے ہو، میرے اندازے سے تین سو پونڈ سے زیادہ ہی ویٹ ہو گا۔" فلک نے ڈائریکٹ حملہ کیا۔

"آج تو خاص موقع ہے...... پھر اپنی پسندیدہ چیزیں کھانے پینے سے میرا ذہن جگمگا اٹھتا ہے اور جب ذہن روشن ہو تو سارے راستے صاف نظر آنے لگتے ہیں۔" راحیل ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، خوب کھاؤ پیو، کھل کر مزے اڑاؤ، سموسے کھاؤ، چکن روسٹ بغیر ڈکار کے ہضم کرو، بس کسی صورت میری یہ پرابلم حل کرنے میں میری مدد کرو۔" فلک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"پلیز بھی تو کہو۔" راحیل نے آنکھیں چمکائیں۔

"پلیز راحیل جی......" فلک نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"فلکی میرے بھائی میری موٹی عقل تو یہ کہتی ہے کہ ایک دم حملہ کرنے سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ میری مانو تو پہلے چند دن مہمانداری کے مزے لوٹو، ہو سکے تو مجھے بھی انوائٹ کر لیا کرو...... نظر انداز کرتی ہے تو کرنے دو، تم بھی نوٹس نہ لو۔ اس کے سامنے ٹی وی کے سارے رنگین پروگرام پوری دل جمعی سے دیکھو اور......"

"تاکہ ماموں دوسرے دن کان سے پکڑ کر گیٹ سے باہر کر دیں۔" فلک نے جل کر کہا۔

"اچھا یہ لائن کاٹ دو، رنگین پروگرام یہاں آ کر میرے ساتھ دیکھ لینا۔" راحیل نے شوخ نظروں سے دیکھا۔

"نہ میں تمہاری طرح رنگین مزاج ہوں اور نہ رنگین پروگرام دیکھنے کا شوقین، تم مجھے بگاڑنے کی کوشش مت کرو۔ جو مسئلہ ہے اسے حل کرو، نہیں تو میں جا رہا ہوں۔" فلک بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر ابھی اصل مسئلہ اور حل باقی ہے دوست۔" راحیل نے پیار سے فلک کا ہاتھ پکڑ کر

دوبارہ بٹھالیا۔

''اب اگر لائن سے اِدھر اُدھر ہوئے تو آنٹی کو آواز دے کر میز کا یہ حشر دکھادوں گا۔'' فلک نے اپنی استعمال شدہ پلیٹیں بھی اس کی طرف کردیں۔

''کیوں مرواتے ہو فلک جان، اب میں واقعی سیریس ہوں، ہاں تو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک دم حملے کے بجائے اس کی نظروں میں بھولے بھالے نفیس سے بندے بن کر رہو، تاکہ اسے یقین ہوجائے کہ تم کوئی دانہ نہیں ڈال رہے بلکہ بہتر یہی ہوگا کہ کوئی براہِ راست سوال جواب ہی نہ کرو۔ بلکہ گفتگو کا زیادہ رخ بزرگوں، بھائیوں اور بھابی کی طرف رکھو اور جب محترمہ کو یقین ہوجائے کہ تم تو بہت نیک بچے ہو تو پھر کچھوے کی طرح آہستہ آہستہ پاؤں نکالو، کبھی سب کو ڈنر پر لے جاؤ، کبھی چھوٹے موٹے گفٹس لے آؤ، مثلاً کتابیں، میگزین، سی ڈی گیمز، آئس کریم وغیرہ...... کچھ ہاتھ پاؤں چلاؤ، کچھ جیب ڈھیلی کرو، خودداری انا جیسی خطرناک چیزوں کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دو، جتنی پھٹکری لگاؤ گے اتنا ہی رنگ چوکھا آئے گا۔ یہ میرا فائنل فیصلہ ہے۔'' راحیل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''لیکن مجھے یہ بتاؤ یہ سارا کھڑاگ پھیلانے سے ہوگا کیا؟'' فلک کو راحیل کا یہ لمبا چوڑا پلان ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''اس سے یہ ہوگا میرے بھائی کہ تمہارے اور علیجہ صاحبہ کے درمیان شیشے کی جواَن دیکھی دیوار حائل ہے وہ خود بخود دور ہوجائے گی اور جب ایک دفعہ وہ دیوار ہٹ گئی تو ساری رکاوٹیں، اندیشے، وسوسے دور ہوجائیں گے۔ اور پھر موجاں ہی موجاں، کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا فلک مہاراج؟'' راحیل، فلک کی پُرفکر آنکھوں میں مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں صرف یہ سوچ رہا ہوں پلان بنانا، منصوبہ بندی کرنا ایک مشکل کام تو ہے ہی لیکن اس پر عمل کرنا ذرا جان جوکھوں کا کام ہے۔'' فلک سنجیدگی سے بولا۔

''کیا کسی کو کڈنیپ کرنے جارہے ہو؟'' راحیل کو تاؤ آگیا۔

''توبہ توبہ کیسی باتیں کررہے ہو راحی؟'' فلک نے سرشاری سے کہا۔

''تو پھر تذبذب کیسا...... کیا ڈرتے ہو؟'' راحیل نے چوٹ کی۔

''ڈر......! توبہ توبہ......''

''کیا توبہ، توبہ کا وِرد کررہے ہو، ایک لڑکی ہی تو ہے، معصوم سی نازک سی، بھولی بھالی سی۔'' اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر راحیل نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''جی ہاں، معصوم سی، نازک سی، بھولی بھالی سی؟'' فلک نے سر ہلا کر کہا۔ ''جی ہاں، بالکل ایسی ہی ہیں جیسی آپ نے فرمایا۔''

''تمہاری جگہ میں ہوتا تو......'' راحیل بڑے زعم سے بولا۔

''ہاں بتاؤ، میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟'' فلک نے چیلنج کیا۔

''کھڑے کھڑے دو لفظوں میں پوچھ لیتا منظور یا نامنظور......؟'' راحیل نے بڑی شان سے سینہ تان کر کہا۔

''جی ہاں...... ایسی کچی مٹی کی بنی ہوئی ہے۔ دور سے پہاڑ اچھے لگتے ہیں قریب جاؤ تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا ہے۔'' فلک جل بھن گیا۔

''تو ابھی سے اُچان، نچان اور بھاؤ تاؤ کا اندازہ ہوگیا۔'' راحیل نے جلتی پر اور تیل چھڑکا۔ فلک کی غصیلی نظریں دیکھ کر اسے معاملے کی نزاکت کا زیادہ احساس ہوگیا دوستانہ انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''فلک پیارے میں نے نہ تو کوہ پیمائی کرنی ہے نہ کوئی کریانے کی دکان کھولنی ہے، ہاں ہوئی تو ڈیل اینڈ گڈ نہ ہوئی تو نہ سہی ایک ہی تو جان ہے وہ بھی کروادوں۔ ایک ضدی اور سرپھری لڑکی کے لیے نیور اور پھر تم ثابت قدم نہیں ہو تو پھر فوجیں ہٹالو۔ شاندار پسپائی اختیار کرلو۔ خوامخواہ محاذ کھولنے سے کیا فائدہ...... خوامخوہ بزرگوں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف ہوجائے گا۔'' راحیل اس کی پُرفکر آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

''تمہارا مشورہ بھی اپنی جگہ درست ہے راحیل لیکن اب اس پر عمل کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔'' فلک نے دھیرج سے کہا۔

راحیل نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھوں کی دونوں انگلیاں جوڑے جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔

''اچھا کہو تو اور پزا کا آرڈر دے دوں؟'' فلک نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

''گولی مارو پزا کو ایک لڑکی تو پٹا نہیں سکتے اور چلے ہو عشق کرنے۔ مجھے نہیں پتا تھا تم اس قدر جلد ہتھیار پھینک دو گے۔'' راحیل نے پزا کے خالی ڈبوں کو فٹ بال کی طرح کک لگائی جیسے سارا قصور ان خالی ڈبوں کا ہو۔

''اب جانے بھی دو غصہ...... کوشش تو بہرحال تم نے اچھی کی۔''

''غصہ تمہاری حالتِ زار پر آرہا ہے، میرا اتنا پیارا اور عزیز از جان دوست اتنی پریشانی میں ہو، دکھی ہو اور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں۔'' راحیل نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''میرا خیال ہے وہ فرینڈشپ گفٹ اسکیم اچھی ہے، اسی سے ابتدا کرتا ہوں۔ دو ایک دن میں اس منصوبے پر عمل کرکے رزلٹ سے تمہیں آگاہ کروں گا۔'' فلک نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر زور سے ہنس دیے کوئی اتنا گمبھیر مسئلہ تو نہ تھا کہ فضول دماغ پچی کرتے رہے۔ اتنے نفیس اور لذیذ پزا بدمزہ کرتے رہے۔

جانے آج کون سا لکی ڈے تھا وہ راحیل سے اچھی خاصی مغز ماری کرنے کے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا سامان لیے جیسے ہی کاریڈور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ دشمنِ جان کچھ کتابیں اٹھائے ادھر ہی آرہی تھی۔ آئینے کی طرح صاف شفاف چہرے پر کائنات کا سارا حُسن سمیٹے لان کا ہلکے کاسنی رنگ کا سوٹ پہنے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ فلک کی روح وجاں اندر ہی اندر لرز کر رہ گئی۔ رعبِ حُسن ہی ایسا تھا کہ محبت میں ڈوبا دل ساری چوکڑیاں بھول گیا تھا۔

''ذرا رکیں پلیز۔'' جانے کیسے وہ بول پایا۔

''جی کہیے۔'' علیجہ کی آواز میں ہلکی سی نرمی تھی۔

''یہ دیکھیں، میں آپ کے لیے لایا ہوں۔'' اس نے ایک رنگین شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

''کیوں؟ خاص طور پر میرے لیے ہی کیوں، آج میری برتھ ڈے ہے؟'' اس نے ذرا تنے تنے ابروؤں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے سب کے لیے ہیں، کھول کر دیکھیں تو سہی۔'' فلک نے بڑی ہمت سے کہا۔

علیجہ نے اس کے ہاتھ سے شاپر یوں لیا جیسے کوئی بہت بڑا احسان کررہی ہو پھر بے دلی سے کھولا۔ اندر درجن بھر ڈی وی ڈیز کے علاوہ چاکلیٹ کے پیکٹ اور کئی دوسری چیزیں تھیں، اس نے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ شاید اخلاقاً نکال کر شاپر فلک کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''سوری میں نے یہ دیکھی ہوئی ہیں۔''

''لیکن یہ تو بالکل نئی ہیں۔'' فلک کی نظریں اس

کے جلالی چہرے پر تھیں۔

''دراصل میں ایگزامز کی تیاری کر رہی ہوں، چاکلیٹ کے لیے تھینکس۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔

''تو اب میں ان کا کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولا۔

''مزے سے بیٹھ کر آپ، سہیل بھائی اور شایان دیکھیں۔ خاص کر سہیل بھائی کو تاریخی اور کلاسک موویز دیکھنے کا بہت کریز ہے۔'' وہ مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہ حیران پشیمان دل کی چوٹ دباتا شاپر پکڑے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ پھر بہ مشکل تمام اپنے کمرے تک آیا۔ شاپر ایک ٹیبل پر پٹخا اور جیب سے موبائل نکال کر راحیل کو کال کی۔

''ہاں بولو۔'' راحیل کے بولنے کا انداز کمپنی کمانڈر جیسا تھا۔

''مشن فیل۔''

''واٹ ڈو یو مین؟'' راحیل چیخ کر بولا۔

''کیا فیل کا مطلب نہیں آتا؟ یعنی ناکام......''

فلک بھی زور سے بولا۔ ''اتنے ارمانوں سے میری لائی ہوئی ڈی وی ڈیز میرے منہ پر مار کر چلی گئی۔''

''کوئی وجہ؟''

''وہی جانے۔''

''صاف ظاہر ہے تمہیں بد دل کر رہی ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں ایسے ہی کھیل کھیلتی ہیں۔'' راحیل نے تسلی دی۔

''لیکن میں تو کوئی کھیل نہیں کھیل رہا۔ کسی کا لایا ہوا گفٹ یوں واپس کرنا بدتمیزی نہیں ہے......؟'' اس کی آواز میں دلی چوٹ کا درد تھا۔

''تم بھی پروا نہ کرو جانی، سب کے ساتھ مل کر کھاتے پیتے ہوئے شور مچاتے ہوئے مزے سے مووی دیکھو، ساؤنڈ خوب زوردار ہو تاکہ محلے والے بھی سن سکیں۔'' راحیل نے مزید اضافہ کیا۔

فلک نے کچھ کہے بغیر موبائل آف کر دیا اور دل شکستہ، مضمحل سا بستر پر دراز ہو گیا۔ بعض انسانی رویے سامنے والے کو کس قدر پژمردہ اور کمزور کر دیتے ہیں کہ سارے حوصلے ریت کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ موبائل بجتا رہا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ راحیل سے پھر بحث کرنے یا اس کے کسی مشورے پر عمل کرنے کا اب ذرا بھی موڈ نہ تھا۔

اس نے اپنے آپ کو بہت تسلیاں دیں، علیحہ کو چڑچڑی اور مغرور کہہ کر دل میں جلتی آگ ٹھنڈی کرنی چاہی لیکن بے سود۔ دماغ تھا کہ چکی کی طرح گردش کر رہا تھا۔ دل تھا کہ آنسوؤں کے بجائے خون کی بوندیں ٹپکا رہا تھا۔ ادھر غیرت کا تقاضا تھا کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائے اور سیدھا کسی ریسٹ ہاؤس چلا جائے اور سکون سے رہے لیکن پھر اس زخمی دل اور چُور چُور انا نے آرام سے ٹکنے دیا تھا۔ سب سے اہم یہ کہ اماں کو کیا بتاتا۔ ان کو تو بس بھائی کی محبت بے حال کیے رکھتی تھی۔ اماں سے بھلا کبھی کوئی جیتا تھا جو وہ جیت جاتا؟

یہ سارا قصور ہی میرا ہے۔ الگ تھلگ رہوں اپنے کام سے کام رکھوں تو یہ جلنے کڑھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ وہ کتنی ہی دیر بستر پر پڑا اپنے آپ کو ہمت دلاتا رہا۔ ارادے باندھتا رہا توڑتا رہا۔ دو دفعہ ملازم کھانے کے لیے بلانے آیا لیکن اس نے ''بھوک نہیں ہے۔'' کہہ کر ٹال دیا۔

''کیا بات ہے بیٹے طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' آخر ساجدہ بیگم خود چلی آئیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں مامی جی۔'' وہ شرمندہ شرمندہ سا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''دراصل وہ راحیل سے ملنے گیا تھا تو پزا کھا لیا تھا۔ اب ذرا بھی گنجائش نہیں۔''

''اچھا تو پھر ٹھنڈا دودھ لے آتی ہوں۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''آپ تکلف نہ کریں مامی جی، میں خود آ کر لے لیتا ہوں۔'' وہ شرٹ ٹھیک کرتا ان کے ہمراہ ڈائننگ روم میں آ گیا۔ اتفاق سے ابھی کمرا خالی ہی تھا۔ اس لیے کسی کے سوال جواب سے پہلے ہی ساجدہ بیگم کا دیا ہوا دودھ کا مگ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا دودھ پی کر طبیعت کافی پُرسکون ہو گئی تھی لیکن دماغ میں اب بھی شکست کی چبھن تھی جو بے قرار کر رہی تھی۔

کیا اس سارے معاملے میں اس کا کوئی قصور نہ تھا؟ آخر وہ اسے اتنی اہمیت ہی کیوں دے رہا تھا۔ جب ایک دفعہ جان لیا تھا پرکھ لیا تھا تو پھر اسے نظر انداز کیوں نہیں کر رہا تھا۔ کیوں شرافت کا پُتلا بنا اپنی کم گوئی سے اپنی رواداری سے اسے شہ دیے جا رہا تھا اور خوامخواہ ذلیل ہو رہا تھا؟ اور سب سے بڑی بات وہ کون سی ایسی حور پری تھی جسے دیکھ دامنِ ہوش ہی ہاتھ سے جاتا رہے؟ اس کا روشن دماغ اب بھی سیدھی راہیں دکھا رہا تھا۔

''اس سے تو انکار نہیں کہ بہت لائق فائق ہے۔ سگھڑ سیانی ہے، کھانا غضب کا پکاتی ہے اور بھی اس میں کئی گن ہیں۔'' اس دفعہ دل نے ڈرتے ڈرتے دخل اندازی کی۔

''اور میں کیا ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہوں، گھاس کھود رہا ہوں؟ تم اس کی زیادہ طرف داریاں مت کرو۔'' اس نے اپنے بھولے بھالے دل کو بری طرح جھڑکا۔ ''اور ایسی سگھڑ سیانی بھی نہیں، ٹی وی پر دیکھی، کتابوں میں پڑھی ریسپیز سے کوئی الا بلا ڈش بنا لی تو اسے کھانا پکانا تھوڑی کہتے ہیں، اس سے اچھا تو میں خود پکا لیتا ہوں۔''

''آپ کیا، کیا پکا لیتے ہیں۔'' دماغ نے آہستگی سے سوال کیا۔

''میں...... میں بہت کچھ پکا لیتا ہوں مثلاً چائے بنا لیتا ہوں، جیم ٹوسٹ بنا لیتا ہوں۔ انڈا فرائی کر لیتا ہوں اور...... اور......'' اچانک وہ رکا اور...... ''اور یہ اتنی پیاری سی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے ضرور کوئی پکوڑے تل رہا ہے۔ ذرا دیکھوں......'' اس نے اٹھنا چاہا۔

''ہاں کھانے کے بعد پکوڑے ہی تو کھائے جاتے ہیں، کوئی ضرورت نہیں آرام سے پڑے رہو۔ یہاں مہا بھارت چل رہی ہے اور جناب کو

میرے دل کی آواز

پاکیزہ ہے سب کی چاہت
سب کرتے ہیں اس سے محبت
اس کے انتظار میں ہے اک راحت
مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم جی کی
چھپی ہوئی ایک پیاری نصیحت
بہنوں کی محفل میں شریک ہو کر
مل جاتی ہے سب کی خیریت
پاکیزہ ڈائری پڑھنے سے
اتر جاتی ہے ساری تھکاوٹ
لبوں پر سب کے دوڑتی مسکراہٹ
صرف اور صرف جلترنگ کی بدولت
روحانی مشوروں پر عمل کر کے
سنور جائے گی دنیا و آخرت
ہومیو کلینک کے نسخے آزما کر
حاصل ہوتی ہے ایک دن صحت
خوش ذائقہ کی ترکیبیں آزما کر
دسترخوان کی بڑھ جاتی ہے زینت
اے پاکیزہ تو رہے سلامت
یونہی بڑھے تیری شہرت

شمائلہ سہیل، جاوید، کراچی

پکوڑوں کی خوشبو ستا رہی ہے جو مسئلہ زیرِ بحث ہے اس پر غور کرو کوئی حل تلاش کرو تاکہ یہ ہر وقت کی جھک جھک ختم ہو اور مجھے شانتی ملے۔'' اس کا بپھرا ہوا دماغ بے تحاشا گرجا۔

''اور مجھے بھی۔'' دل نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو، یہ واقعی مہابھارت سے کم نہیں۔ ہاں تو میں کیا سوچ رہا تھا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''کبھی اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے؟'' اب اس کا دماغ معاملے کی سنگینی سمجھانے پر مُصر تھا۔

''صورت.....؟'' وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

''ہاں یہ بھی تو ہوسکتا ہے آپ جناب اس کے معیار پر ہی پورے نہ اترتے ہوں۔ یوں بھی آج کل ماڈلز اور سنگرز کا زمانہ ہے، ایک سے بڑھ کر ایک اور تم ٹھہرے ایک عام سے سیدھے سادے انسان، نہ اسٹائل کا پتا ہے نہ بدلتے ٹرینڈ کا۔ آج کل کی یہ تیز طرار لڑکیاں دور بینی نظروں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی ہیں یہاں تک کہ ٹیبل منرز آتے ہیں یا نہیں، کھاتے کیسے ہو؟ ٹشو استعمال کرتے ہو یا ہاتھ کی پشت سے منہ پونچھ لیتے ہو۔'' سوالوں کی بوچھاڑ فلک کو بے حال کیے دے رہی تھی۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' فلک نے بے بسی سے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''تو اب سوچو نا۔ اپنا تنقیدی جائزہ لو، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔'' اس کے دماغ نے بڑے شانت انداز میں سمجھایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو بڑے میاں، میں تمام تفصیلات چیک کر لیتا ہوں لیکن مجھے یقین تو نہیں آرہا کہ میری کھوپڑی میں ایک ایسا بھیجا فٹ ہے جو میرا ہی دشمن ہے، اب کیا کروں دوست ہے یا دشمن، اپنا ہی۔'' وہ تیزی سے اٹھا اور ڈریسنگ کے بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ناقدانہ نظروں سے اپنا جائزہ لینے لگا۔

اس کی خوش خلقی اور قد کاٹھ کے تو لوگ گن گان کرتے تھے۔ اور بڑی باجی تو ہمیشہ کہا کرتی تھیں فلک اپنی یہ دودھیا رنگت تھوڑی سی مجھے بھی دے دو پلیز۔ وہ تو دادا ابو، بابا جانی اور اماں کا ڈر نہ ہوتا تو اب تک ملک کا نامور ماڈل بن چکا ہوتا اور معصوم معصوم سی نازک نازک لڑکیوں نے اس کے یہ بڑے بڑے پوسٹر اپنی الماریوں کے اندر چوری چوری لگائے ہوتے۔

اتفاق سے آج وہ بڑی اسٹائلش سی نیلی جینز پر سیاہ سی بلیک ٹی شرٹ میں کہیں کا ٹورسٹ لگ رہا تھا۔ اس پر نئے انداز میں کٹے ہوئے ڈارک براؤن بال..... ہر نقش اللہ میاں کا بنایا ہوا شاہکار..... پھر کس چیز کی کمی تھی جو علیحہ بی بی ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اماں ہوتیں تو اس حلیے میں دیکھ کر پہلے تو ذرا گرم ہوتیں کہ کیا روز روز بدیسی پہناوا پہن لیتے ہو؟ پھر خود ہی نظر اتارنے کا سامان کرنے لگتیں۔

''پھر وہ تمہیں گھاس کیوں نہیں ڈالتی؟'' اس دفعہ ذہن کے کسی گوشے سے چبھتا ہوا سوال ابھرا۔

''یہی تو سوال ہے میرے بھائی آخر اس ناچیز میں کیا کمی ہے جو اس نے ماتھے پر نو لفٹ کا ان دیکھا اسٹیکر لگا رکھا ہے۔ آخر وہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ کسی نگاہ کا جادو، کسی مسکراہٹ کا طلسم، اخلاق کا سحر اس پتھر کے صنم کو موم بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

''بہتر ہوتا اگر کسی سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤ۔'' اس کے ذہن میں کرن سی پھوٹی۔

''مشورہ.....؟ لیکن کس سے؟'' وہ حیران سا تھا۔

''عالیہ بھابی کس دن کام آئیں گی۔''

''عالیہ بھابی؟'' وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

''نہیں یہ بہت جلدی ہو جائے گا، ابھی میں اور راحیل جو تدابیری جنگ لڑ رہے ہیں شاید اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نکل آئے۔ ورنہ بہ صورت دیگر عالیہ بھابی تو ہیں ہی......'' اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، کر لیتے ہیں انتظار......'' دماغ، دل جگر سب دبک گئے اور اس نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

''راحی......؟'' اس نے موبائل اٹھا کر نمبر ملایا۔

''ہاں کہو۔''

''میں ذرا تمہاری طرف آ رہا ہوں، مصروف تو نہیں ہو؟''

''میری کیا مصروفیت ہونی ہے بھلا......؟'' وہ ہنسا۔

''پزا کا اسٹاک ہے یا ختم ہو گیا ہے؟''

''بس ختم ہی سمجھو۔''

''تو لے آؤں دو چار؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ......''

''اچھا......بس پہنچتا ہوں۔''

''چٹورا کہیں کا، کھانے کے سوا کوئی کام نہیں۔'' فلک موبائل آف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

کچھ دیر بعد وہ راحیل کے ہاں پہنچا تو وہ دو چار نرم و گداز کشنوں کے سہارے بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ سینٹر ٹیبل پر خوب صورت پلیٹیں گلاس اور ڈرنکس کی بوتلیں سجی تھیں۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔'' راحیل نے ایک استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ کر کہا۔

''بس ذرا دیر ہو ہی گئی۔'' وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''پزا کی وجہ سے......؟'' راحیل کو وہ کچھ تھکا تھکا پُرخیال سا لگا۔

''نہیں...... دراصل گھر سے نکلنے میں ہی دیر ہو گئی تھی۔ امی کا فون تھا۔''

''ٹھیک تو ہیں آنٹی؟'' راحیل نے ہمدردی سے پوچھا۔

''بس ذرا اداس ہیں۔''

''تو ایک چکر لگا آؤ نا......'' راحیل بڑے ایکسپرٹ انداز میں پزا کاٹ رہا تھا۔

''ابھی نہیں، شاید دو ایک ہفتے بعد۔'' فلک نے ایک کوارٹر پلیٹ اٹھائی اور اس میں پزا کا ایک سلائس رکھ کر کیچپ کی بوتل اٹھائی یہ سب کچھ وہ بڑے چپ چپ انداز میں کر رہا تھا۔

''کوئی خاص مسئلہ ہے؟'' راحیل نے سنجیدگی اختیار کی۔

''یوں تو کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوگا، خاص کر تمہارے لیے لیکن میرے لیے بہت بڑی پرابلم ہے یعنی لاینحل مسئلہ......'' وہ بڑے غور سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

''یعنی کوئی پرابلم ستا رہی ہے باقی جو تم نے کہا وہ تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔'' راحیل نے بڑے دوستانہ انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ ہچکچاتے ہوئے کچھ شرمساری سے سارا واقعہ سنا ڈالا۔

''اور اب میں نے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' یہ جیسے اس کا پکا ارادہ تھا۔

''ایک مغل اس قدر آسانی سے ہار مان لے وہ بھی ایک کامنی سی لڑکی سے، ڈوب مرنے کا مقام ہے۔'' راحیل نے غیرت دلائی۔

''وہ بھی کر سکتا ہوں، راوی کون سا دور ہے اور

ڈوبنا کون سا مشکل۔" اسے بھی تاؤ آ گیا۔

"او کے، او کے، فی الحال یہ راوی چناب کی باتیں چھوڑو، تمہارے منہ سے یہ بزدلانہ الفاظ اچھے نہیں لگتے۔ کچھ لڑکیاں ٹیوب لائٹس قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کے بھیجے میں کوئی بات ذرا دیر سے آتی ہے۔ اور تم اتنے سیریس ہو گئے۔" راحیل نے نرمی سے سمجھایا۔

"تو تم سمجھتے ہو میں اب تک واہی تباہی بک رہا تھا، بکواس کر رہا تھا؟ میرے لیے تو یہ غیرت اور عزت کا معاملہ ہے۔ اینڈ فار یور کائنڈ انفارمیشن، میں بے حد سیریس ہوں اور بے حد کا مطلب ہے بے حد۔" فلک بہ مشکل اپنے کھولتے ہوئے غصے پر قابو پا کر بولا اور جھنجلایا جھنجلایا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"کنٹرول میری جان، میں سب سمجھ گیا ہوں، معاملہ بہت نازک اور سیریس ہے اور مجھے ایک وفادار دوست کی حیثیت سے نہ صرف تمہارا ساتھ دینا ہے بلکہ اس معمے کا حل ڈھونڈنے میں تمہاری مدد بھی کرنی ہے۔ تو بس سوچتے ہیں کچھ اور خدا کے واسطے یوں قطب مینار بن کر میرے سر پر مت کھڑے ہو۔ یہاں آرام سے بیٹھو، کہیں کھڑے کھڑے میرے دماغ کی رہی سہی بتی بھی نہ گل کر دو۔" وہ اپنے مخصوص چلبلے لہجے میں بولا۔

"کہو تو دو چار پزا اور منگوا دوں تاکہ ذہن کو کچھ تقویت ملے۔" فلک کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ لہرا گئی خوامخواہ اتنے پیارے دوست پر گرم ہو گیا۔

"نہیں...... اب میں پوری طرح الرٹ رہنا چاہتا ہوں۔" وہ بے ساختہ ہنس دیا۔ چند لمحے کمرے میں سکوت چھایا رہا۔ راحیل پیشانی پر انگلیاں پھیرتا کسی سوچ میں گم تھا اور فلک منتظر نظروں سے اس کی صورت دیکھے گیا۔

"سو گئے کیا؟" فلک نے مضطربانہ اس کا کندھا ہلایا۔

"صبر میرے دوست صبر......" راحیل نے تسلی دی۔

"اس کا مطلب ہے کوئی ٹیوب لائٹ آن نہیں ہوئی۔ کوئی جگنو نہیں چمکا؟"

"ایک ضدی اور سر پھری لڑکی کے پتھر دل میں پیار کا دیپ جلانا ہے کوئی تتلی نہیں پکڑنی جو جگنو کی ضرورت پڑے گی۔" راحیل نے ٹھیک ٹھیک جھڑکا۔

"اب ایسی اموشنل باتیں نہ کرو کہ میں رو دوں۔" فلک کو ہنسی آ گئی۔

"تمہارا تو وہی حساب ہے نہ تپتے چین نہ ٹھنڈے چین۔ پہاڑ سے مسائل کا حل بھی ڈھونڈوں، تتلیوں اور جگنوؤں کے پیچھے بھی دوڑ لگاؤں اور اموشنل باتیں بھی نہ کروں۔" راحیل نے گھور کر دیکھا۔ مجبوراً فلک صبر کر کے بیٹھ گیا۔ راحیل کچھ دیر سوچ کے سمندروں میں غوطے کھاتا رہا اور جب کچھ دیر بعد سر اٹھا کر فلک کی طرف دیکھا تو بڑی بڑی آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔

"میرے پاس ایک بہترین آئیڈیا ہے سنو گے تو پھڑک اٹھو گے۔"

"تو کیا میں یہاں پزا کھانے بیٹھا ہوں، جلدی بتاؤ کیا حل نکالا ہے تم نے اس معمے کا؟" وہ بے تابی سے بولا۔

راحیل نے دھیرے دھیرے سارا پلان اس کے سامنے رکھا۔

"لیکن راحی یہ تو بہت لمبا چوڑا پلان ہے اور مجھ میں اتنا حوصلہ کہاں......؟" فلک دل شکستگی سے بولا۔

"مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہو۔ اگر منزل پانا چاہتے ہو تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ صبر، حوصلہ، عزم، ہمت ان سے ہی تو سرخرو ہونا ہے۔ پتھر کو موم بنانا آسان تو نہیں؟ اب فیصلہ تو تمہیں ہی

کرنا ہے، ہاسٹل، ماموں جان کا گھر یا پھر راوی...... انتخاب تمہارا ہی ہوگا نا......؟" راحیل پکا منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔

"عالم پناہ اگر جان کی امان پاؤں تو کیا یہ غلام آپ سے ایک چھوٹا سا سوال کر سکتا ہے؟" فلک نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ کہا۔

"بے شک کر سکتے ہو آخر تم ہمارے پرانے نمک خوار ہو اور ہمارے اس کالے دھندے میں برابر کے شریک ہو۔" راحیل نے پزا کے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔

"میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اس خادم کے لیے جو جان لیوا منصوبہ بنایا ہے، کیا یہ آپ کے کسی تجربے پر مبنی ہے؟"

"یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس کا لہجہ جلال آمیز تھا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ذاتی تجربے پر مبنی منصوبے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔" فلک نے بڑی معصوم صورت بنا کر پوچھا۔

"تجربہ......؟" راحیل نے آنکھیں پھاڑیں۔ "ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے کہ ایسے رنگ برنگے دردناک تجربوں سے گزرتے البتہ لوگوں سے سنا ہے کہ ایک بہترین درس گاہ اسٹار پلس ہے، اس میں داخلہ تو لے رکھا ہے اور آہستہ آہستہ نالج بھی بڑھا رہے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم بھی ایسے دو چار تجربوں سے گزر جائیں گے۔" راحیل جیسے اسے چڑا رہا تھا۔

"راحی کے بچے تم کسی دن میرے ہاتھ سے کہیں ضائع نہ ہو جاؤ۔" فلک کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے ڈھیٹ انسان کا کیا کرے۔

"آخر آزمانے میں حرج کیا ہے، کچھ نہ کرنے سے کچھ کر لینا ہی بہتر ہے۔ تجربے خود نہ کیے ہوں تو کیا ہوا سنے سنائے تجربوں پر عمل تو ہو سکتا ہے ناں......؟" راحیل نے مضبوط لہجے میں سمجھایا۔

"نتیجہ میری مرضی کے خلاف نکلا تو ہاسٹل بھی یہیں ہے۔ راوی بھی یہیں ہے اور ...تم بھی۔" فلک نے اچانک اٹھ کر اس کی گردن پکڑ کر دو تین جھٹکے دیے۔ "چھوڑوں گا نہیں یاد رکھنا۔" اس نے گردن چھوڑتے ہوئے دھمکایا۔ "میکڈونلڈ یہیں ہے، تمہاری بسیار خوری سے ابھی اجڑا نہیں بلکہ زیادہ فلرش کر رہا ہے۔"

کچھ دیر دونوں دوست چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ بنائے گئے منصوبے کی باریکیاں سوچتے رہے، بحث کرتے رہے۔ جب کچھ دیر بعد فلک وہاں سے نکلا تو اپنے آپ کو بادل کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ پُرسکون اور خوب صورت خوابوں او رسنہرے ارادوں میں ڈوبا ہوا۔

☆☆☆

فلک نے راحیل کے مشورے سے بنائے گئے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کمر مضبوطی سے کس لی۔ اب کی دفعہ اس نے نوازشات اور عنایات کا زبردست چارا لگایا۔ دل میں آس و امید کے لاکھوں دیے جلائے، اللہ کا نام لے کر ڈور پھینکی اور صابر و شاکر ہو کر کنارے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

کبھی رنگا رنگ فیشن میگزین لے آیا تو کبھی ہور اسکوپ کی بکس...... کبھی آئس کریم، کبھی قلفہ فالودہ اور کبھی کباب تکے کی پارٹی دے ڈالی تو کبھی گھیر گھار کر چائنیز ریسٹورنٹ میں الا بلا کھلانے لے گیا۔ کبھی سینڈ وچز، آلو کے پراٹھے اور چائے سمیت لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ کبھی گوالمنڈی کی خستہ کراری مچھلی اور سوندھے سوندھے گرما گرم نان لے آیا۔ لیکن جس کے لیے وہ یہ کھڑاگ پھیلاتا تھا، وہ جل پری اس کے دام میں نہ آنی تھی نہ آئی۔ البتہ پاپا کا خونخوار قسم کا

فون ضرور آگیا۔

’’یہ تم لاہور جاب کرنے گئے ہو یا پاکستان کا ٹور کرنے نکلے ہو؟‘‘ وہ انتہائی غصے میں تھے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ ان کے لہجے کی گرمی اور آواز کی کڑک سے فون نہیں جل گیا۔ فلک بے چارہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

’’دراصل وہ پاپا، ماموں کہہ رہے تھے......‘‘

’’ہاں، ہاں مجھے پتا ہے تھوڑی دیر پہلے ہی منصور کا فون آیا تھا۔ بچوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں اس لیے آؤٹنگ کا پروگرام بن رہا ہے لیکن تم تو گھر میں ٹکو اور جاب کی طرف توجہ دو۔‘‘ ان کا لہجہ بدستور آتشی تھا۔

’’جی وہ میرا ابھی لانگ ویک اینڈ ہے۔‘‘ وہ بہ مشکل کہہ سکا۔

’’اچھا......؟ اچھا ٹھیک ہے۔‘‘ وہ بڑبڑائے۔

’’سوری پاپا، آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔‘‘ وہ شرمساری سے بولا۔

’’you better‘‘ اور ساتھ ہی فون کھٹ سے بند ہوگیا۔

’’اوہ میرے خدا!‘‘ اس نے جلتے جھنجھناتے کانوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ سب کے درمیان بیٹھا ہوتا اور ایسی ہیبت ناک بمباری سب کے سامنے ہوتی تو کیا عزت رہتی۔

کتنی ہی دیر وہ سینے کی ہلچل سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن جذبات تھے کہ اتھل پتھل ہو رہے تھے شاید پاپا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بچوں کی تو چھٹیاں تھیں اسے ساتھ نتھی ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنا دھیان صرف اور صرف کام پر ہونا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے راحیل کو دکھ بھری داستان سنائی۔

’’بھلے آدمی تم سے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ استادوں سے مشورہ کیے بغیر ایک ہی جست میں ہمالیہ سر کرلو یا بحیرہ عرب کو تیر کر پار کرلو۔ میرے بھائی نوازشات اور مہربانیوں کے انبار ذرا آہستہ آہستہ لگاتے ہیں، جال ذرا دھیرے دھیرے پھیلاتے ہیں تاکہ......‘‘

’’تاکہ کیا......؟‘‘ فلک نے بے صبری سے اس کی بات کاٹی۔ ’’جب نسخہ عنایت فرمایا تھا تو اس کے ساتھ احتیاطی تدابیر بھی تو بتانی چاہیے تھیں نا......تاکہ ردِعمل کی صورت میں بندہ اپنا بیچ بچاؤ کر سکے۔ جب لوگ ڈی وی ڈیز، میگزینز، چائنیز فوڈ، کباب پارٹی اور کتابوں سے خوش نہیں ہو رہے تھے تو سہیل بھائی کے ساتھ مل کر آؤٹنگ کا پروگرام بنالیا۔ اس امید پر کہ ٹھنڈی ٹھنڈی معطر اور ہری بھری وادیوں میں گھومتے پھرتے کوئی مائل بہ التفات ہوجائے اور یوں سرد مہری اور بے رخی کی دیواریں ٹوٹ کر گر جائیں۔ سیاہ بادلوں میں چھپا امید کا کوئی ننھا سا تارا ٹمٹمانے لگے۔ گھنگھور گھٹائیں......‘‘

’’خدا کے لیے فلک میرا دماغ پچی مت کرو، میں سب سمجھ گیا ہوں، میرا مطلب صرف یہ تھا کہ پہلے آپس میں مشورہ کر لیتے، پکا پروگرام سیٹ کر لیتے تو تمہیں شکایت کا موقع نہ ملتا۔ اور انکل اتنے ہائپر نہ ہوتے۔ اور ہاں تم مجھ سے اتنی گاڑھی گاڑھی اردو نہ بولا کرو کہ مجھے لغت ڈھونڈنی پڑے۔ مائل بہ التفات یہ کیا ہوا بھلا؟ اور اوپر سے شاعر بھی ہوتے جا رہے ہو، سرد مہری کی دیواریں، سیاہ بادلوں سے جھانکتے ستارے، گھنگھور گھٹائیں...... کہیں ٹی وی پر موسم کا حال سنانے کا کوئی پروگرام تو جوائن نہیں کرلیا؟‘‘ راحیل نے چوٹ کی۔

’’نہیں بھئی، بس آج کل ذرا خواتین کے معصوم معصوم سے بھولے بھالے میگزین سے استفادہ کر رہا ہوں تاکہ زبان ذہن کا ساتھ دے سکے۔‘‘ فلک نے ایک اور شوشہ چھوڑا۔

’’کون سے میگزین؟‘‘ راحیل بے تابانہ بولا۔

’’کئی بلند پایہ میگزین ہیں۔‘‘

’’تمہیں یہ کہاں سے ملتے ہیں؟‘‘ راحیل پھر بے صبری سے بولا۔

’’عموماً عالیہ بھابی کے کمرے سے اور کبھی کبھی بھائی کے تکیے کے نیچے سے۔‘‘

’’سہیل بھائی off all people‘‘ راحیل حیرت سے بڑبڑایا۔

’’ویسے ہر بک اسٹال پر بھی مل جاتے ہیں، کہو تو تمہارے لیے بھی لا دوں؟‘‘

’’میں تو حیران ہوں آج کل کیا کیا نکتے سوچ لیتے ہو، ثقیل اردو، خواتین کے میگزینز، سرسبز وادیاں، سیاہ بادل...... آپ پہلے تو ایسے نہ تھے؟‘‘ راحیل نے چھیڑا۔

’’واقعی پہلے ایسے نہ تھے بس حضور کی صحبت اور کیبل کا اثر ہے۔‘‘

’’ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست، یار فلک میری ایک بات غور سے سنو، عمل کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔ سب کے چہروں پر دو دو آنکھیں نہیں دوربین لگی ہوتی ہے اور سروں میں کمال کا بھیجا۔ تمہاری طرح بھس نہیں بھرا ہوا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے فلک جی کہ کہیں تمہارا بھانڈا سرِراہ نہ پھوٹ جائے اور تم لیلیٰ، لیلیٰ پکارتے بال بکھرائے گریبان چاک کیے مال روڈ پر چلتے پھرتے نظر آؤ۔‘‘

’’کیا تم مطلب کی بات مختصر اور ذرا سیدھی نہیں کر سکتے؟ بس کرو اپنی یہ نصیحتیں، کیا تم نے مجھے بالکل بچہ سمجھ رکھا ہے اگر تم میرا یہ مسئلہ حل کرنے میں میری رہنمائی نہیں کر سکتے، مدد نہیں کر سکتے تو سیدھے سیدھے بتادو نا۔ میں خود مرکھپ لوں گا۔‘‘ فلک واقعی [illegible] میں آکر بولا۔

مہکی ہوئی اِک شام تیری سالگرہ ہو

آج کے روز تیری نظر کیا کروں جاناں
جان تو پہلے ہی تیرے نام لگا رکھی ہے
اے میری صبح کے تارے تیری خاطر میں نے
اپنی ہر سانس کے ہونٹوں پہ دعا رکھی ہے
چاہت ہو، خوشی ہو، تیرے دامن میں وفا ہو
مہکی ہوئی اک شام تیری سالگرہ ہو
اس دن کے تصور سے سنور جائیں نظارے
اس دن تیرے قدموں میں بکھر جائیں ستارے
اس دن یہ میری زیست کا ہر لمحہ فدا ہو
مہکی ہوئی اک شام تیری سالگرہ ہو
ہے آج کے دن میری دعا اب نہ کبھی ہوں
افسردہ میری جاں تیرے لب نہ کبھی ہوں
غم کی نہ کبھی چہرۂ جاں پہ گھٹا ہو
مہکی ہوئی اک شام تیری سالگرہ ہو
پُرزور ہواؤں میں دیا جلتا ہوا رکھے
اللہ جہاں میں تجھے ہنستا ہوا رکھے
بوجھل نہ کبھی غم تیری پلکوں کی ردا ہو
مہکی ہوئی اک شام تیری سالگرہ ہو
تو بھی نہ ہو میری طرح ناکامِ محبت
اچھا ہو میری جاں تیرا انجامِ محبت
محبوب کی آنکھوں میں تمہاری ہی ضیا ہو
مہکی ہوئی اک شام تیری سالگرہ ہو
چاہت کے دلوں سے کبھی جذبات نہ کم ہوں
ایسے ہی اگر ہوں تو یہ دن رات نہ کم ہوں
اللہ کرے عمر میری تجھ کو عطا ہو
مہکی ہوئی شام اک شام تیری سالگرہ ہو

شاعر: ظہیر احمد

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

''یہ مسئلہ تم سے اکیلے حل نہیں ہوگا فلکی، تمہیں میرے جیسے سیانے دوست کی ضرورت پڑے گی۔'' راحیل سنجیدگی سے بولا۔

''ضرورت ہے تو تمہارے سامنے دامن پھیلایا ہے۔'' فلک نے ذرا نرمی سے جواب دیا۔

''اب میرے سامنے دامن پھیلایا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ تو ڈالنا ہی پڑے گا۔ مشوروں کے پھول، نصیحتوں کی کلیاں...... بتاشے......''

''آ گئے نہ اپنی اوقات پر...... پھول اور کلیوں کے بعد آ گئے بتاشوں پر...... کوئی نہ کوئی کھانے پینے کا ذکر نکال ہی لیتے ہو۔'' فلک نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''اب اتنا تو حق بنتا ہے نا یار......'' راحیل ڈھٹائی سے ہنسا۔

''کبھی انسان صبر بھی کر لیتا ہے، تصور میں ہر وقت دیگیں چڑھی رہتی ہیں۔'' فلک نے جھڑکا۔

''اچھا...... اچھا اب اپنا پریشر زیادہ نہ بڑھاؤ، میں تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہا ہوں، کل کو کہیں یہ نہ ہو دو گوش و یک بنی......''

''اور دو آنکھیں......'' فلک نے لقمہ دیا۔

''محاورے میں آنکھوں کا ذکر نہیں ہے، بس کہنا یہ ہے کہ احتیاط لازمی ہے۔ ابھی تم بھی یہیں ہو اور وہ محترمہ بھی، وہ تم نے سنا نہیں۔

لے میرے تجربوں سے سبق اے میرے دوست
دو ایک سال عمر میں تجھ سے بڑا ہوں میں

''اتنے پیارے شعر کو یوں بے موقع پڑھتے ہوئے شرم تو نہیں آتی اور تم کن تجربوں کی بات کر رہے ہو، تم تو کہتے تھے ابھی تم زیرِ تعلیم ہو طفلِ مکتب ہو اور یہ تم مجھ سے دو سال بڑے کب سے ہو گئے؟ مجھ سے پورے تین سال بڑے ہو پیارے جب میں پانچویں میں تھا تو تم......'' اس دفعہ فلک نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

''اچھا بابا جان بخشو، غلطی ہو گئی مجھ سے جب تم بے بی کاٹ میں تھے تو میں کلاس فور میں تھا۔ بس اب خوش......؟ مجھے تجربوں کا نہ سہی مشاہدوں کا تو علم ہے، جدھر دیکھو لو اسٹوری چل رہی ہوتی ہے، بندہ تجربے کے بغیر بھی بہت کچھ سیکھ لیتا ہے، انسان کہاں تک اپنے آپ کو بچا سکتا ہے؟''

''تم صحیح کہتے ہو راحی، انسان اپنے اردگرد کے ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ اب کوئی آخری ٹپ...... کوئی نصیحت، کوئی مشورہ...... I hope no bad feeling''

''کیسی باتیں کرتے ہو فلک؟'' راحیل نے اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلا کر پیار سے کہا۔

''او کے، اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ ڈیئر فرینڈ۔''

☆☆☆

وہ کالج سے تھکی ہاری گھر پہنچی تو گھر میں جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا یا شاید اس کی غیر موجودگی میں گھر والوں نے کہیں اور شفٹ ہونے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ ناقابلِ فہم سی افراتفری کا ماحول تھا۔ سفری بیگ، سوٹ کیس، جیکٹس، شالیں، سوئٹر، کمبل، جاگرز غرضیکہ ہر قسم کی بے موسمی چیزیں جلتی دھوپ کا مزہ لے رہی تھیں۔ ایک طرف کولر، کین کی ٹوکریاں، فولڈنگ چیئرز اور پتا نہیں کیا کیا..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس پر بچوں اور بڑوں کی یکساں آمد و رفت، کچن اور ڈائننگ روم میں تو جیسے فسادات برپا تھے۔

یہ چند گھنٹوں میں کیا ماجرا ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ایسے سمے میں جب وہ کڑی دھوپ میں کھڑی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دھڑ..... سے داخلی دروازہ کھلا اور سہیل اور فلک کئی شاپرز اٹھائے آندھی طوفان بنے پاس سے گزرے، ان کا رخ بھی کچن کی طرف تھا۔

''بھیا، خیریت، کون آ رہا ہے؟'' سلام کے بعد علیحہ نے ان کے ہاتھوں سے دو تین شاپر پکڑ لیے۔

''کوئی نہیں آ رہا بلکہ ہم جا رہے ہیں۔'' سہیل نے کرائے چکرائے سے مختصراً کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے فلک سے پوچھنا پڑا۔

''دراصل بچوں کی کل سے چھٹیاں ہیں اس لیے پکنک کا ذرا تفصیلی پروگرام ہے۔'' عجلت میں فلک اتنی ہی انفارمیشن دے سکا۔ ایک تو گرمی نے جیسے سیخ کباب بنایا ہوا تھا۔ اوپر سے علیحہ کا غیر متوقع سامنا اور براہِ راست سوال، لگتا تھا ہوش و حواس رخصت ہونے کو تھے، بہ عجلت جواب دیتا اندرونی جذبے اور گرمی سے سرخ چہرہ لیے وہ بھی کچن کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''پکنک......؟'' حیران پریشان علیحہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''آپ بھی تیاری کر لیں۔ علی الصباح روانگی ہے۔'' اس نے جاتے جاتے کہا۔

''جی میں سمجھ گئی۔'' علیحہ نے سہیل کے ہاتھ کے لیے شاپر بھی فلک کو پکڑائے اور کچن کی طرف جانے کے بجائے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ باہر کی نسبت کمرے کی قدرے ٹھنڈی فضا میں سانس لی تو جان میں جان آئی۔ چپل اتار کر ایک طرف پھینکے اور پلنگ کے کونے پر ٹک گئی۔ ایک تو کالج آنے جانے کی تھکن اس پر جسم کی ہڈیاں پگھلاتی ہوئی گرمی اس پر آنے والی آؤٹنگ کا مسئلہ وہ سخت ٹینشن میں تھی۔

سب سے بڑی پرابلم فلک کی تھی۔ اب پتا نہیں کتنے دن ہر وقت کا ساتھ رہے گا۔ اس کی ملتجی نگاہوں کا گھیراؤ ہوگا۔ زبردستی گفتگو میں شامل کرنے کی ان تھک کوشش ہوگی، اس پر عالیہ بھابی کی آنکھوں کی چنچلتا اور کبھی اماں کی تنبیہی نظروں کا حصار وہ کیسے بچا پائے گی اپنے آپ کو ان سب سے؟ یہاں تو وہ کچن میں یا اپنے کمرے میں مقید ہو جایا کرتی تھی۔ واجبی سا آمنا سامنا ہو جاتا تھا اور بات چیت نہ ہونے کے برابر لیکن اب تو ہر وقت کا ساتھ ہوگا باقاعدہ مہمان نوازی ہوگی، خاطر تواضع الگ، الگ تھلگ رہنا، سرد مہری سے پیش آنا۔ سب کے سامنے کیسے ہوگا؟ خیر اب جو ہو سو ہو سر نے کڑھنے کا کیا فائدہ؟

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی کہ عالیہ بھابی کا بلاوا آ گیا۔ وہ اسے مدد کے لیے بلا رہی تھیں۔ اس نے واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے ڈال کر اپنے آپ کو ذرا نارمل کیا۔ بالوں کو اِدھر اُدھر سے سمیٹا اور دوپٹا درست کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی جہاں وہی شور ہنگامہ برپا تھا۔ ہر کوئی کسی سے اپنی کسی چیز کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ جیسے چند دنوں کے لیے نہ جا رہے ہوں کہیں نقل مکانی کر رہے ہوں۔

عالیہ ہر ایک کو ہر چیز کا پتا بتاتے بتاتے تھک چکی تھی۔ اس لیے علیحہ کو دیکھتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ ایک اسٹول پر ٹک گئی۔ علیحہ نے عالیہ کا چارج سنبھال لیا۔

''بھابی آخر بیٹھے بٹھائے یہ شوشہ اٹھایا کس نے...... سب کام پلان بنا کر کرتے تو اتنی آفت تو نہ مچتی۔'' علیحہ شکایتاً بولی۔

''شوشہ کس نے اٹھانا تھا، یہ سب کیا دھرا ان بچوں کا ہے۔ اسکول سے واپس آتے ہی ماموں جان کے گرد ہو گئے ہمیں کہیں لے چلیے۔ ہماری چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ ہمارے سب فرینڈز جا رہے ہیں بس اٹھیے چلیے...... ان بیچاروں کو بے حال کر کے رکھ دیا۔ ایک نہ سنی آخر منا کر ہی دم لیا۔ اب کھڑے پاؤں اتنے دنوں کے لیے گھر سے نکلنا کتنا مشکل ہے۔''

عالیہ بھابی نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"چلیں، آپ یوں ہمت نہ ہاریں۔ میں ہوں نا، اب آپ تھوڑی دیر ریسٹ کریں تب تک میں یہ چیزیں سنبھال لیتی ہوں۔" علیجہ نے پیار سے ان کے کندھے دبائے۔

"ابھی فلک بھی آتا ہی ہوگا تمہارا ہاتھ بٹا دے گا۔" عالیہ نے یوں کہا جیسے یہ روز کی بات ہو۔

"بھابی ایک بات پوچھوں؟" علیجہ نے فریج میں سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"پوچھو......" عالیہ نے بڑے دھیرج سے کہا۔

"کیا مسٹر فلک کے بغیر ہم لوگ سیر وتفریح کے لیے نہیں جاسکتے؟" علیجہ کے سوال میں ہلکا سا طنز تھا۔

"جا تو سکتے ہیں گڑیا۔ لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا کہ ہم سب تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہری بھری فضاؤں کے مزے لوٹتے رہیں اور وہ غریب اکیلا ایک نوکر کے سہارے گرمی میں جلتا رہے۔ آخر وہ ہمارا مہمان بھی تو ہے۔ خود سوچو سہیل کس کس کو سنبھالیں گے اور پھر ایک ایکسٹرا ڈرائیور کی بھی تو ضرورت ہوگی۔" عالیہ نے شریر نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" علیجہ فوراً مان گئی۔

"تم مجھے ایک بات بتاؤ علیجہ، تم فلک سے اتنی الرجک کیوں ہو؟" عالیہ نے بڑی بھاوج کے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

"الرجک اور میں؟ اور وہ بھی مسٹر فلک سے، توبہ کریں، میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔ آخر پہلے بھی تو ہمارے سارے کام ان کے بغیر ہوا کرتے تھے۔ اب گھر کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو ہر کام کے لیے ان کے مشورے اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ آخر کیوں......" علیجہ نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیونکہ اب وہ اسی گھر کا ایک فرد ہے، تھوڑی بہت ہیلپ کرنا اس کا فرض ہے اور اس کی دیکھ ریکھ ہمارا۔" جانے کیوں علیجہ کو عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا کھردراپن محسوس ہوا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک کہتی ہیں، میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔" اچانک علیجہ کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی تھی۔

"یہ جو ایک لفظ یونہی ہے نا، یہ یونہی نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی سوچ، کوئی خیال ضرور ہوتا ہے۔" عالیہ نے مسکراتے ہوئے جتایا۔

"آپ بھی نا بھابی بات کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں۔" اس نے شرمساری سے نظریں جھکالیں۔

"دیکھتی ہوں اس جادوگر کے جادو سے کب تک بچوگی۔" عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا ماموں اور ممانی کا پتا کروں، دھلائی کا کچھ سامان ہو تو واشنگ مشین میں ڈال دوں۔" عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ بیٹھیں میں پتا کر کے آتی ہوں۔" علیجہ نے پیشکش کی۔

"تم رہنے دو میں جاتی ہوں، جب تک تم اچھی سی چائے بنا کر رکھو پھر مل کر پیتے ہیں۔" عالیہ نے جاتے جاتے کہا۔ وہ چھوٹی کیتلی میں چائے دم کر رہی تھی کہ فلک بلائے ناگہانی کی طرح آن پہنچا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں چائے پینے آرہا ہوں؟" اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

علیجہ نے فٹافٹ ایک مگ میں چائے بنا کر فلک کی طرف بڑھایا تاکہ اس کا دھیان کھلتی ابلتی چائے کی طرف ہو اور غیر ضروری سوالات سے پرہیز کرے۔

"جب تک چائے ذرا ٹھنڈی ہو، مجھے کچھ کام بتادیں۔" اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

علیجہ جو بیسن کی طرف منہ کیے تھرماس دھو رہی تھی، ایک گہری سانس لے کر مڑی، اسے پتا تھا کہ یہ بندہ بشر یوں نہیں ٹلے گا اور اسے اپنے ڈرامے کا پہلا سین بھی تو شروع کرنا تھا جس کی وہ ریہرسل کر رہی تھی۔

"آپ یوں کیجیے فلک صاحب کہ جو بیکری کا سامان ہے اس نیلی باسکٹ میں احتیاط سے رکھ دیں اور یہ جو شاپر ہیں یہ فی الحال فریج میں رکھ دیں، ان کو صبح پیک کرلیں گے۔" علیجہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر کسی کمپنی کمانڈر کی طرح آرڈر دے رہی تھی۔

بت بنے کھڑے فلک کے کانوں میں جیسے مُنّی مُنّی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں آج پہلی بار علیجہ نے اس سے براہِ راست گفتگو کی تھی، وہ بھی اتنی لمبی اور خوب صورت محرابی ہونٹوں پر بڑی سوئٹ سی مسکراہٹ بھی تھی۔ اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ زمین پر کھڑا تھا یا آسمان کی نیلاہٹوں میں محوِ پرواز تھا۔

"اس کے علاوہ گوشت اور قیمے کے پیکٹ فریزر میں رکھ دیجیے، صبح یاد سے آئس بکس میں رکھنے ہیں۔" یہ دوسرا ڈوز تھا' میٹھا میٹھا شہد جیسا۔

"جی میں سمجھ گیا جو آپ کہہ رہی ہیں۔ ویسا ہی ہوگا پہلے یہ چائے پی لوں۔" وہ دل کی لرزشیں سنبھالتا کرسی نشین ہوگیا۔

"میرا خیال ہے چائے کے ساتھ یہ بھی نوشِ جان فرمالیجیے تاکہ اتنا جان لیوا مشن شروع کرنے سے پہلے کچھ جان میں جان آجائے۔" علیجہ نے ایک لفافے میں سے خستہ پیٹیز نکال کر پلیٹ میں رکھے' فریج سے کیچپ کی بوتل نکالی اور دونوں چیزیں فلک کے سامنے رکھ دیں۔

"وہ......وہ...... جی......" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن حیرت کے پہاڑ کچھ اس طرح ٹوٹ کر اس پر گرے تھے کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ شکریہ بھی نہیں۔

"بس اب شروع ہوجائیں ورنہ چائے ٹھنڈی ہوجائے گی اور ابھی کتنا سارا کام بھی ہے۔" علیجہ یوں نرمی سے اور کج کج بول رہی تھی جیسے ہمیشہ ایسے ہی بولتی رہی تھی۔

ادھر فلک کا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا حساب تھا۔ وہ سخت نروس ہو رہا تھا۔ کتنا لکی ڈے تھا آج۔ علیجہ نے اسے نہ صرف کمپنی دی تھی بلکہ اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دی تھی۔ بڑے مہذبانہ انداز میں بات کی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ آج سورج مخالف سمت سے نکلا تھا یا وہ کوئی سہانا سپنا دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ علیجہ کی مدھر آواز نے چونکا دیا۔

"آپ فارغ ہوجائیں تو کام شروع کریں۔"

"جی بتائیں کیا کرنا ہے؟" اس نے جلدی سے خالی مگ ایک طرف رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب بتائیے کون سے شاپر کون سی باسکٹ......" اس نے ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

علیجہ کے دل میں آئی شاپر سارے پکڑ کر ان کے اندر کا چورا فلک کے سر پر الٹا دے اور باسکٹ کھول کر سر پر اوندھی رکھ دے۔ اس کی گھبراہٹ' ریشہ خطمی اور پریشانی دیکھ کر سچ مچ اسے اپنی ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔

فلک کا دل چاہ رہا تھا، سارا دن کچن میں گزار دے، چاہے وہ پیکنگ کروائے، برتن دھلوائے' کھری کھری سناتی رہے لیکن رہے اسی طرح آرڈر دیتی' ہدایات دیتی، روک ٹوک کرتی بس آنکھوں کی پیاس بجھتی رہے، ترستا دل بہلتا رہے لیکن ہر چیز کا اینڈ تو ہونا ہی ہوتا ہے، وہ ابھی حسب ہدایت نیلی باسکٹ میں سامان ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ عالیہ آگئی

اور دونوں کو مل کر کام کرتا دیکھ کر حیرت سے بڑی بڑی آنکھیں کھولے یہ کایا پلٹ دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑا دھندلی صبح کا ملیح حسن دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک سرمئی سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ نئی نویلی کرنیں دھند کے نازک پردے اٹھا کر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گھر کے اندر سے بھی اب مدھم مدھم سی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا سارے لوگ گہری نیند سے اٹھ کر روز مرہ کے معمولات کا آغاز کر رہے تھے اور پھر آج تو بہت خاص دن تھا، کیسے لمبی تان کر سوتے رہتے؟

اس نے ایک نگاہ کمرے میں ڈالی...... اس کا بیگ اپنے اندر چار پانچ جوڑے کپڑے اور ضرورت کی دوسری اشیا سمیٹے تیار پڑا تھا۔ اس کی نظر وال کلاک پر... پڑی، چھ بج رہے تھے۔ ان کی روانگی میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ کیوں نہ ذرا دیر کے لیے کمر سیدھی کر لے۔ یوں بھی ساری رات جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں گزری تھی۔ ایک لمحے کو بھی پلک سے پلک نہیں جڑی تھی۔ نہ اس نے سونے کی کوشش کی نہ اسے نیند آئی اور یہ بھی تو ڈر تھا کہ کہیں وہ آنکھوں کے پردوں سے چپکی من موہنی صورت ..... گم نہ ہو جائے۔ کہیں کانوں میں گونجتی مدھری آواز بند نہ ہو جائے۔ کہیں علیحہ کے نام کا جاپ کرنے والا مسرتوں کے جھولے جھولتا دل تھک کر سو نہ جائے لیکن اب ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد سب نے اکٹھا ہونا تھا۔ ان میں وہ بھی ہوگی اور وہی اس کے ارمانوں بھرے دل کی سرشاریاں‘ یہی سوچ کر وہ بیڈ پر آ کر لیٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے نیند کا سرسراتا آنچل اس کی آنکھوں پر پھسل گیا۔ پتا نہیں ایک لحہ گزرا تھا یا ایک پل علیزہ کی آواز نے آنکھوں پر پڑا غفلت کا پردہ کھینچ لیا۔

”انھیں انکل بابا بلا رہے ہیں، سب تیار ہو گئے ہیں۔“

”میں بھی بالکل تیار ہوں بے بی، تم چلو میں پانچ منٹ میں آیا۔“ اس نے علیزہ کے نرم گالوں کو پیار سے چھوا۔

”اچھا اب دیر نہ کریں ورنہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔“ علیزہ لاڈ سے بولی۔

”میں آ رہا ہوں جانی۔“ اس نے علیزہ کو تسلی دی اور خود واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ منہ پر جلدی جلدی ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے اور بالوں کو درست کر کے باہر آیا۔ اپنا بیگ اٹھایا اور جلدی جلدی نیچے آ گیا جہاں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب وہ سب کی ہمراہی میں دل میں ایک نئی لگن اور حوصلہ لیے آنکھوں میں سنہرے اور سہانے خواب سجائے ایک نئے سفر پر روانہ ہوا تو زندگی کے خوب صورت نقرئی تھال میں رکھی مہکتی ملیح کلیوں میں اس کا بھی شیئر تھا۔ اس نے جھجکتے ہاتھ بڑھا کر وہ پاکیزہ کلیاں اٹھا لیں اور ان کی حیات آفریں خوشبو اور ملاحت سے اس کی روح کی سونی سونی وادی مہک اٹھی۔

بے نشان منزل کا کوئی ہلکا سا نشان مل جائے تو......؟ بے قرار دل کی ساری چنتائیں مٹ جائیں تو......تو...... کیسے بے تاب دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں۔ ذہن میں فکر و اندیشے کے اٹھتے طوفان جب شانت ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے آپ کو کتنا فری اور ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ کتنی جلدی بہل جاتا ہے۔ آرزو کی کوئی ننھی سی کرن جگمگائے تو کیسے اس کا نور پکڑنے کو لپکتا ہے۔

نہ راستے کے سراب نظر آتے ہیں، نہ دھند نہ کنکر نہ کانٹے، فلک کی ذہنی اور روحانی حالت کچھ

ایسی ہی سرشاری کی منزلیں طے کر رہی تھی کہ آس پاس کی کوئی چیز ہی متاثر نہیں کر رہی تھی۔ علیحہ کے رویے میں ہلکی سی لچک کیا نظر آئی ساری دنیا ہی بدلی بدلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ بھیرہ پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے راحیل کو فون کیا تھا۔

”اب اٹھ بھی چکو یار! آدھا دن گزر گیا لیکن تمہاری نیند ہی ختم نہیں ہو پاتی۔“ اس کی غنودہ ”ہیلو“ فلک کا دل ہی جلا گئی۔

”تم بھی تو صبح صبح سر پر سوار ہو جاتے ہو۔“ لگتا تھا راحیل اب بھی پوری طرح بیدار نہیں تھا۔

”صبح صبح...... غضب خدا کا تمہیں پتا ہے کیا وقت ہوا ہے؟“ فلک کلبلایا۔

”اچھا...... اچھا...... بتاؤ کیا ایمرجنسی ہے، کوئی زلزلہ...... کوئی سونامی...... یا پھر...... قیامت......؟“ راحیل کی فطری شوخی اچانک ہی عود آئی تھی۔

جواباً فلک نے موٹی موٹی ہیڈ لائنز سنا دیں۔

”خدا کا شکر ہے کوئی کوشش تو رنگ لائی بہت بہت بدھائی......“

”بس دعا کرو راحی، جو میں نے سمجھا، محسوس کیا کوئی خواب نہ ہو۔ اچھا پھر بات کروں گا سہیل بھائی کافی کے مگ لیے ادھر ہی آ رہے ہیں۔“ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”ساتھ میں کوئی اسنیک شنیک بھی ہے یا خالی خولی کافی۔“ راحیل نے للچائی آواز میں کہا۔

”پتا نہیں، ویسے دو تین شاپر تو ہیں۔“ فلک نے سرگوشی کی۔

”اللہ، اللہ ابھی سے یہ خاطر داریاں، گرم، گرم کافی اور goodies مزے ہیں تمہارے۔“ راحیل نے چھیڑا۔

”تم بھی اٹھ کر چار چھ پراٹھوں اور درجن بھر انڈوں کا ناشتا کر لو۔ ترس تو یوں رہے ہو جیسے ازلی بھوکے ہو۔“ فلک نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔

”کہہ لو، کہہ لو، جو کہنا ہے، ابھی تمہارا وقت ہے نا۔ واپس تو یہیں آؤ گے پھر پوچھوں گا۔“ لہجہ کافی دھمکی آمیز تھا۔

”to be continued“ فلک نے فون آف کر دیا۔ واقعی سہیل اس تک پہنچ گئے تھے۔

☆☆☆

دوسری کار میں بیٹھی علیحہ کے خیالات، جذبات اور احساسات فلک سے بہت مختلف نہ تھے۔ وہ بھی سوچوں کے سیاہ گرداب میں پھنسی ہوئی تھی، کیا تھا اگر اس طویل مہم پر روانہ ہونے کے بجائے آرام سے گھر میں رہتی۔ اپنے روز کے معمولات میں مصروف رہتی اور اس امتحان اس الجھن میں نہ پڑتی۔ ایک معصوم اور شریف انسان کو غلط امپریشن دیے بغیر اپنے ضمیر پر بھاری پتھر نہ رکھتی۔ لیکن اسے یہ سب کرنا پڑ رہا تھا۔ سب کی خوشی کے لیے۔

سب سے زیادہ غصہ تو اسے فلک پر ہی آ رہا تھا۔ بالکل آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا تھا۔ سب سے زیادہ حماقت تو اس نے پنڈی میں دکھائی۔ جب نعمی آپی‘ ان کے شوہر سلمان بھائی اور بچوں سے ملنے ملانے کے بعد اپنی اپنی کاروں میں بیٹھنے لگے تو فلک اپنی کار کے بجائے سہیل کی کار میں بیٹھنے لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کار میں وہ بیٹھی تھی۔

”فلکی انکل، آپ کی کار تو وہ ہے۔“ بچوں میں سے کسی نے پیچھے اشارہ کیا تھا۔ فلک نے ایک چھلکتی نظر کار کے مکینوں پر ڈالی پھر سوری کہہ کر کھسکنے ہی میں عافیت سمجھی اور عالیہ کی مدھم سی ہنسی نے علیحہ کا چہرہ گلاب رنگ کر دیا۔ خیال تو یہی تھا کہ دونوں کاریں سلور رنگ کی تھیں ماڈل ایک تھا اس لیے فلک کو مغالطہ ہوا ہو گا لیکن علیحہ خوب جانتی تھی کہ ایک غیر محسوس کشش اسے کھینچ کر ادھر لے آئی تھی۔ وہ صرف ایک

جھلک اس کی دیکھ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ عالیہ شرارتی نظروں سے پیچھے دیکھتی علیحہ نے ہاتھ میں پکڑا میگزین کھول کر آنکھوں کے سامنے رکھ لیا۔

''اچھا ہوا سلمان اور نغمی بھی وقت پر پہنچ گئے۔ ابو انہیں بہت مس کر رہے تھے۔'' سہیل نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم بھی بہت مس کر رہے تھے پاپا......'' علیحہ کے ساتھ بیٹھے بچے ایک زبان بولے۔

''چلو اچھا ہے۔ آپ کو بھی کمپنی مل گئی۔'' سہیل نے جواب دیا۔

علیحہ چند منٹ بچوں کی باتیں سنتی رہی پھر ہاتھ میں پکڑے میگزین کے صفحات میں گم ہو گئی جہاں ایک دلچسپ ہی نہیں پُرفکر بحث چل رہی تھی اور حسبِ حال تھی۔

''میں جانتی ہوں خاور کی بے وفائی نے تمہیں گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔'' نگہت ہمدردانہ بولی۔

''ہاں اس کی بے وفائی میری آرزوں، ارمانوں اور خوابوں کی موت تھی۔'' روحانہ بہ مشکل کہہ سکی۔

''میں مانتی ہوں یہ درست ہے مگر قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟ یہ چوٹ یہ زخم سب نصیب کی بات ہوتی ہے۔ انسان تو صرف صبر کر سکتا ہے۔'' نگہت نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''ہاں، یہ سب قسمت کے کھیل ہیں لیکن چوٹ دکھ تو دیتی ہے، دل تو خون کے آنسو روتا ہے۔ انسان کب تک اور کیسے صبر کرے۔'' روحانہ کے آنسو تھم ہی نہیں رہے تھے۔

''ہاں، یہ سب زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ جس سے مفر نہیں لیکن اس سے زندگی کا رنگ اور کائنات کا حسن پھیکا نہیں پڑتا۔ چاہے انسان اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائے کچھ بھی نہیں بدلتا۔ وہی شب و روز، وہی معمولات، وہی رنگ بدلتے موسم، وہی ذمے داریاں' وہی فرائض سب کو ساتھ لے کر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے جس کی حفاظت ہر انسان کا فرض ہے بس اپنے حوصلے، ہمت اور قوتِ برداشت کو نئی قوت دینی پڑتی ہے۔'' نگہت نے کسی اسکالر کی طرح سمجھایا۔

''اور یہ سب کہاں سے آئے گا۔ بلند حوصلہ، نئی ہمت، وغیرہ آئے گا کیسے؟'' روحانہ طنزاً بولی۔

''کوئی مشکل نہیں، صرف اپنی سوچ بدلنی پڑتی ہے۔ اپنا زاویۂ نگاہ بدلنا پڑتا ہے۔ ماضی کا بوجھ پھینک کر آنچل میں تازے پھول بھرنے پڑتے ہیں۔ بس ذرا اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے خوابوں پر آنسوں بہانے کے بجائے نئے خواب بُننے پڑتے ہیں۔'' نگہت جانے کون سا فلسفہ جھاڑ رہی تھی۔

''لیکن کیوں......؟'' روحانہ جیسے پھٹ پڑی۔ ''یہ تبدیلی میں ہی کیوں لاؤں؟ میں خود ٹوٹی پھوٹی، زخموں زخم، رسوائیوں اور بدنامیوں کے سیاہ رنگ میں رنگی ہوئی، میں ہی کیوں یہ سب کروں؟''

''صرف زندہ رہنے کے لیے اور اللہ کی دی ہوئی امانت زندگی کے لیے۔ ہر دکھ ہر سکھ کے ساتھ زندہ رہنا انسانیت کی معراج ہے۔ اس کی سرخروئی ہے، اس کی عظمت ہے۔''

جوں جوں وہ پڑھتی جا رہی تھی، توں توں پہلو میں کوئی چیز ٹوٹے کانچ کی طرح چبھے جا رہی تھی اور پلکوں کے نیچے نمی جمع ہوتی جا رہی تھی۔ میگزین میں لکھی ہوئی تحریر اسے اپنے ماضی اور زندگی کا عکس محسوس ہو رہی تھی۔ مصنف نے جو بھی حقیقت بیان کی تھی جانے کیوں اسے اپنی زندگی کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اسی سے مخاطب ہو، اسے ہی سمجھا

رہی ہو۔ اس کو نئی زندگی کی راہ دکھا رہی ہو۔

''وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ زندگی ایک امانت ہے، اس کی حفاظت کرنا میرا اولین فرض ہے۔ میری زندگی میرے والدین اور بھائی بہن سے جڑی ہے اور مجھے ہر صورت یہ ذمے داریاں نبھانی ہیں۔'' علیحہ نے میگزین بند کر کے اپنے قریب رکھ لیا۔ زندگی کے فارغ لمحوں میں یہ خوش رنگ چھوٹے چھوٹے میگزین زندگی کے کتنے بڑے بڑے سبق سکھا دیتے ہیں۔ تاریک راہوں میں ننھے ننھے چراغ روشن کر دیتے ہیں۔ وہ ہاتھ میں پکڑا میگزین دونوں ہاتھوں میں دبائے کھڑکی سے باہر دوڑتے بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ گلے کی گھٹن سے سانس لینی دشوار تھی اور آنکھوں میں چنگاریاں بھری تھیں۔

''اب میری زندگی میں ہے بھی کیا...... نہ وہ جذبات نہ وہ آرزوئیں نہ وہ خواب سبھی کچھ تو برباد ہو گیا۔ دل کی سنہری خواہشیں اور آنکھوں کے جگمگاتے خواب اسی دن ریزہ ریزہ ہو گئے تھے جس دن توقیر نے نگاہیں بدلی تھیں۔ طور طریق بدلے تھے اور پھر یوکے جا کر کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ منگنی کا خوب صورت اور معصوم سا رشتہ توڑ کے نہ صرف ارمانوں بھرا دل توڑا بلکہ شفاف پیشانی پر رسوائیاں اور بدنامیوں کی سیاہی بھی مل دی۔'' شاید لوگوں کے لیے منگنی کا رشتہ ایک کھیل یا معمولی سا رشتہ لگتا ہو لیکن علیحہ جیسی خوددار... اور غیرت مند لڑکی کے لیے موت سے کم نہیں تھا۔ ٹھکرائے جانے کا احساس یا کمتر کیے جانے کی چوٹ تو زندگی کی سب سے گہری چوٹ ہوتی ہے۔

''اب میرا مقصدِ حیات صرف اور صرف اپنے پیاروں کی خدمت ان کی دلجوئی اور دیکھ بھال کرنا ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی نتھو خیرا یا فلک نہیں آ سکتا۔'' اور پھر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''نتھو خیرا اور فلک...... کیا کمبینیشن ہے۔ میں بھی اکثر ساری حدیں پار کر جاتی ہوں۔ بے چارہ فلک اب اتنا بھی برا نہیں ہے۔'' اس نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اپنے آپ کو اندر ہی اندر جھڑکا۔

''تو اس کا مطلب ہے فلک، توقیر اور نتھو خیرے سے اچھا ہے۔'' معصوم سے دل نے سرگوشی کی۔

''جی نہیں...... سب ایک سے ہیں۔'' اس نے ڈانٹا۔

اور اس کا دل گم صم سا ہو گیا۔

''ہاں سب ایک سے ہوتے ہیں پھر میں کسی کی آنکھوں کے خاموش پیغام کیوں پڑھوں؟ کسی کا التفات بھرا ہاتھ کیوں تھاموں؟ پھر نئے خوابوں کی بستی کیوں آباد کروں؟ گھنٹوں ارمانوں کی ان تتلیوں کے پیچھے کیوں سرگرداں رہوں جو ایک پل بھی نہیں ٹھہرتیں۔ کیوں کسی کی دستک پر دروازہ کھولوں؟ کیوں اندر آنے کی اجازت دوں؟ کیوں خیر مقدم کروں؟ کیوں چار دن کے کھیل کو حقیقت کا روپ دوں؟ نہیں...... یہ نہیں ہوگا مجھ سے...... کبھی نہیں ہوگا۔ اس دل کے دروازے پر انا کی زنجیر پڑی ہے جو نہ کھلے گی نہ ٹوٹے گی، چاہے دستک دینے والا فلک ہو یا آکاش، آسمان ہو یا عرش۔ یہ دروازہ ہمیشہ بند رہے گا۔ ہمیشہ...... ہمیشہ...... ہمیشہ۔''

وہ جانے کن وادیوں میں رواں دواں تھی، کن گہرائیوں میں غرق تھی کہ اچانک ہلکا سا جھٹکا لگنے سے چونک پڑی۔ تینوں گاڑیاں ایک لائن میں رکی ہوئی تھیں۔ چھوٹی بڑی آوازوں کا ملا جلا شور برپا تھا۔

امی، شالیں،
سہیل انکل، شالیں
ماموں جان، شالیں

جلدی رکیں، جلدی اتریں۔

''شالیں نہ ہوئیں گرم گرم پکوڑے ہو گئے جو پل بھر میں کوئی اٹھا کے لے جائے گا۔ دنیا بھر سے نرالے بچے ہیں۔ فلک بیٹے تم ہی اتر کر سنبھالو ان کو۔'' ماموں ایک گہری سانس لے کر بولے۔

فلک ابھی اپنا دروازہ کھول بھی نہ پایا تھا کہ خواتین لڑکیوں اور بچوں کی پوری پلٹن اتر کر سڑک کے کنارے لمبی لائن میں ٹنگی رنگ برنگ شالوں پر حملہ آور ہو چکی تھی۔

''ماموں آپ ذرا بچوں کا دھیان رکھیے گا پلیز، کہیں سڑک پر نہ نکل جائیں۔'' فلک اس افراتفری سے سخت ٹینشن میں تھا۔

''یہ گرمیوں میں گرم شالوں کی خریداری میری سمجھ سے تو باہر ہے۔'' ماموں سخت جلے ہوئے تھے۔

''یہی تو یہاں کی سوغات ہے، گفٹ دینے کے کام آتی ہے۔'' ممانی نے دوپٹا درست کرتے ہوئے پرس سنبھالا۔

ابھی پٹرول بھروانے رکے تھے تو بچے ساری ٹک شاپ ہی اٹھا لائے تھے۔ ذرا سنبھال کے ابھی آگے خرچے ہی خرچے ہیں۔''

''کسی کو خوش دیکھنا تو آپ کو آتا ہی نہیں۔'' ممانی بڑبڑائیں۔

آدھ گھنٹے کی مسلسل بک بک جھک جھک کے بعد من پسند شالوں کی خریداری مکمل ہوئی۔ شاپر ڈکی میں رکھے گئے اور سارا خاندان خوشی خوشی آگے کو روانہ ہوا۔

''قالین بھی اچھے دے رہا تھا۔ خاص کر وہ ایپل گرین اور فان کلر والا، خیر واپسی پر دیکھوں گی۔'' ممانی نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

''تو یہ نیک کام بھی آج کر لیا ہوتا۔ میرا کیا ہے میں بس پر آ جاتا۔'' ماموں نے طنزاً کہا۔ ممانی نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ ایسی بحثوں کا کوئی انت نہیں ہوتا تھا۔

ابھی بہ مشکل ایک کلومیٹر ہی چلے ہوں گے کہ گاڑیاں پھر رکنے کے انداز میں سلو ہونے لگیں۔ سہیل نے اشارہ کر کے بتایا کہ گاڑی سڑک کے کنارے پر روکیں۔

''کیوں بیٹے خیریت؟'' ماموں فکر مندی سے بولے۔

''آپ نے پھلوں سے لدے یہ اسٹال نہیں دیکھے؟'' سہیل نے تروتازہ، شاداب اور رنگ برنگ سجے پھلوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا سنہری سنہری آڑو ہیں اور سیب تو دیکھو لگتا ہے چیریز بھی ہیں۔'' ماموں خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

''آپ اتریں تو سہی بس وہیں سے مزے لے رہے ہیں۔'' اس نے ماموں کو اترنے میں مدد دی۔

جس طرح خواتین نے اپنی خریداری کی تھی اسی طرح مردوں نے پھلوں کی چیریز کے ڈبے گاڑیوں کے اندر تقسیم کر دیے گئے اور باقی کریٹ ڈکی میں فٹ کر دیے گئے۔ جب سب سیٹل ہو گئے گاڑیاں چل پڑیں تو ممانی نے اپنا پرس کھولا، چند لمحے کچھ شمار کرتی رہیں پھر کسی کو مخاطب کیے بغیر بولیں۔

''میرے پاس واپس پنڈی تک کرایہ ہو جائے گا۔''

''اور اس سے آگے۔'' ماموں ہنسی دبا کر بولے۔

''آگے اللہ مالک ہے۔'' ممانی بے اختیار ہنس دیں۔

''کوئی ایسی پرابلم ہے تو میرے والٹ میں بھی تین چار ہزار ہوں گے ہی۔'' فلک نے مودبانہ پیشکش

کی۔

''ارے نہیں بیٹے، تم فکر نہ کرو، تمہاری ممانی صرف مجھے آزما رہی ہیں۔'' اور پھر یونہی چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق میں یہ سفر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ اب جن راستوں پر یہ چھوٹا سا قافلہ چل رہا تھا، وہ سرسبز معطر اور فرحت بخش تھے۔ جھلسی ہوئی سڑکیں، گرد و غبار سے اٹی ہوائیں اور دم گھٹ کر دینے والی گرمی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ سب کے چہرے شاداب اور طبیعتیں چونچال تھیں۔

ادھر جس طرح علیجہ اندر ہی اندر اپنی سوچوں میں گم تھی۔ کبھی جو ہو گا دیکھا جائے گا کے مصداق سب کچھ بھلا کر میگزین کے صفحات میں کھو جاتی یا بچوں سے ہنسی مذاق کرنے لگتی۔ کبھی عالیہ اور سہیل کے ساتھ کسی بحث میں الجھ جاتی۔ اسی طرح دوسری طرف فلک ماموں ممانی کی نوک جھوک اور میوزک کی ہلکی لہروں پر بہتے ہوئے اندر خانے اپنے خیالوں کی وادی میں گم تھا۔ دو تین بار اتفاقاً ایسا ہوا تھا کہ اس نے علیجہ کو بچوں کی کسی پیاری سی بات پر محظوظ ہوتے دیکھا تھا یا گھر کے کسی فرد کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستے مسکراتے پایا پایا اس کے چوٹ زدہ دل کے کسی کونے سے ہلکی سی لہر ابھر کر جب اس کے خوب صورت ہونٹوں کو چھو جاتی تو اس کی آنکھیں بے اختیار ایک نورانی چمک سے لبریز ہو جاتی تھیں۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اس کے دل کا دروازہ گزشتہ جان لیوا طوفان کے بعد بھی مکمل بند نہیں ہوا تھا۔ کہیں نہ کہیں ہلکی سی درز ابھی باقی تھی، جہاں سے نکل کر کوئی بھولی بھٹکی کرن اس کے لبوں کو چھو جاتی تھی۔ گم صم آنکھوں میں نئی جوت سی جھلملانے لگتی تھی۔ یعنی ابھی امید کی رمق باقی تھی۔ شاید اس کی ان تھک کوشش سے اس کے جذبۂ راسخ سے سچی لگن سے وہ بے نشان سی درز کچھ اور وا ہو جائے اور اس کے دل میں بسی پیار کی خوشبو اس

راستے سے داخل ہو کر علیحہ کے مرجھائے دل کو گل و گلزار کردے۔ پُر بہار کردے؟

''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''کیوں نہیں.....؟'' اس کے دل سے ایک آواز ابھری۔''جب کسی کے فولادی جذبوں سے دودھ کی نہریں بن سکتی ہیں تو تمہارے چٹانی جذبوں کی شدت سے اَن مٹ ارادوں سے نازک نازک سے گواڑ کیوں نہیں کھل سکتے؟''

''ضرور کھل سکتے ہیں، صرف صبر و استقامت، جرات اور لازوال ہمت کی ضرورت ہے۔ ساتھ میں اَن تھک حوصلہ اور بے پایاں جذبہ ہو تو جیت ہی جیت ہوگی۔'' اس کا دماغ آج دل کا ساتھ دے رہا تھا۔ پارٹیاں بدلنے میں تو دونوں کو کمال حاصل تھا۔

''فلک بیٹے کن سوچوں میں گم ہو؟'' اچانک ماموں کی آواز نے اس کے خیالات کی سنہری ڈور کاٹ دی۔

''کچھ بھی نہیں ماموں بس یونہی.....'' وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔

''ضرور آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اس گلی کو رتی گلی کیوں کہتے ہیں اور اس کا مطلب کیا ہے۔'' پیچھے سے کوئی بولا۔

''ہے تو واقعی سوچنے کی بات؟'' فلک نے ذرا سا رخ پھیر کر پیچھے چمکتے چہروں کی لائن دیکھی۔

''دیکھو میں سمجھاتا ہوں، عام فہم زبان میں رتی یا رتہ سرخ رنگ کو کہتے ہیں۔'' ماموں منصور نے تمہید باندھی۔

''لیکن یہاں تو سبز ہی سبز رنگ ہے۔'' پیچھے سے کورس میں آوازیں آئیں۔

''آج پکا یقین ہوگیا کہ ان بچوں میں کوئی کلر

بلائنڈ نہیں۔'' ماموں کھل کر ہنسے۔

''اللہ نہ کرے۔'' ممانی جو سیٹ پر سر رکھے شاید سو گئی تھیں چونک کر بولیں۔

''یہاں ایک ایسا موسم آتا ہے جب سارے درخت سرخ پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور جب وہ پھول زمین پر گر جاتے ہیں تو یوں لگتا ہے سرخ پھولوں کی چادریں بچھی ہوں۔ اس لیے اس جگہ کو رتی گلی کہتے ہیں اور جہاں ہم جارہے ہیں جہاں انکل کمال احمد کا خوب صورت گھر ہے اس جگہ کو ریشم گلی کہتے ہیں۔''

''کیا وہاں ریشمی پھول ہوتے ہیں؟''

''نہیں میری جان، وہاں دراصل شہتوت کے درخت ہوتے ہیں۔ جہاں ریشم کے کیڑے ان درختوں پر رہتے ہیں اور ان پیڑوں کے ہرے بھرے پتے کھا کر زندہ رہتے ہیں اور ریشم کا دھاگا بناتے ہیں۔ جن کو جمع کر کے کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور اس ریشم سے ریشمی کپڑا بنتا ہے۔ اس لیے اس جگہ کو ریشم گلی کہتے ہیں۔'' ماموں نے پوری تفصیل سے سمجھایا اور یونہی اس علاقے اور خاص مقامات کی خصوصیات بتاتے بتاتے سفر کا اختتام ہوگیا اور منزل پر پہنچ کر سب کو یوں لگا جیسے وہ کسی اور ہی دیس میں آگئے ہوں۔ جنت میں آگئے ہوں۔

☆☆☆

کمال احمد، ماموں منصور کے اُن دیرینہ دوستوں میں سے ایک تھے جو زندگی کے الگ الگ شعبوں میں کام کرتے ہوئے الگ الگ راہوں پر چلتے ہوئے درمیان میں فاصلے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے رابطہ رکھے ہوئے تھے اور جب ایک تپتی دوپہر کو بچوں کی یلغار سے گھبرا کر منصور ماموں نے کمال احمد کو فون پر ریشم گلی جا کر دو چار دن وہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی تو کمال احمد کی خوشیوں کا

سالگرہ

سالگرہ کے موضوع سے
سا جن روٹھ جاتے ہیں
ان کو یہ بتانا ہے
سالگرہ منانے کو
تم برا نہیں جانو
یہ چھوٹا سا فنکشن تو
خوشیاں منانے کا
سب کو بلانے کا
ہنسنے مسکرانے کا
ملنے اور ملانے کا
دعائیں پیار پانے کا
تم سے تحفہ لینے کا
اور پھول دینے کا
جھوٹا سا بہانہ ہے

شگفتہ شفیق، کراچی

کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ آج پہلی دفعہ ان کے جگری دوست نے ان سے کچھ مانگا تھا۔

''بس زیادہ سے زیادہ تین چار دن ہی رہ پائیں گے۔'' منصور ماموں نے انکساری سے کہا۔

''اتنی دور سے آؤ گے تو صرف تین دن، یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی نا۔'' کمال احمد نے شکایتاً کہا۔ ''اب سالوں بعد نکلے ہو تو بچوں کو خوب گھماتے پھراتے۔''

''وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، کس کا دل چاہے گا پُرفضا مقام چھوڑ کر واپس لاہور آئے لیکن تم تو جانتے ہو سہیل کی جاب ہے، فلک اور علیحہ بھی تعلیم کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ اس سے زیادہ کا stay ممکن نہیں۔''

''تو بس ٹھیک ہے مائی فرینڈ جتنا چاہو آرام سے رہو۔ تمہیں، بھابی اور بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے ہر فن مولا بندہ وہاں موجود ہے۔'' کمال احمد نے پورے وثوق سے جواب دیا۔ منصور ماموں نے تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور فون رکھتے ہی سب کو فوری تیاری کا حکم سنایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ..... سب ہری بھری فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے آرام اور سکون کے جھولے جھولنے لگے۔

عالیہ کافی کے مگ ٹرے میں رکھے ادھر ہی آرہی تھی، جہاں سبھی چیڑ کی خوشبو دار چھاؤں میں سنہری دھوپ میں پھولوں کی باسکٹ درمیان میں رکھے پھلوں سے شغل فرما رہے تھے۔

''کافی کا اصل مزہ تو ایسے ہی موسم میں آتا ہے۔ لاہور میں تو کافی کے تصور ہی سے پسینہ پھوٹ پڑتا ہے۔'' سہیل نے کافی کے لبالب بھرے مگ دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔'' ممانی نے اپنا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سچ پوچھو تو مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ ریشم گلی جنت کا چھوٹا سا ٹکڑا ہو۔ یہ نرم گرم دھوپ..... یہ ہلکا ہلکا گلابی جاڑے جیسا موسم، ٹھنڈی ہوائیں، یہ شاہانہ آن بان سے کھڑے ہرے بھرے پیڑ پودے.....''

''ابھی پہنچے ہیں اور ابھی سے زبان ہی بدل گئی۔ گلابی جاڑا، نرم گرم دھوپ، ٹھنڈی ہوائیں، اور جب چھینکیں زکام شروع ہوگا تو وکس جوشاندے۔'' ممانی نے طنزاً ان کی بات کاٹی۔

''کچھ نہیں ہوگا ممانی جان، ہم ہیں نا سنبھال

لیں گے آپ بے فکر ہو کر گرم گرم کافی پئیں اور ماموں کو شعر و شاعری کرنے دیں۔ سرسبز فضاؤں کو سکون اور دل کو راحت ملتی ہے تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' عالیہ نے ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تو اور کیا۔ لاہور کی سڑی گرمی اوپر سے لمبی لمبی لوڈ شیڈنگ میں ایسی خوب صورت باتیں کہاں سوجھتی ہیں۔'' سہیل نے بیوی کا ساتھ دیا۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو اور ہاں عالیہ بیٹے وہ رات کے کھانے.....'' ساجدہ بیگم نے عالیہ کی طرف دیکھ کر بات بدلی۔

''جی، وہ میں نے فضل دین کو سامان دے دیا ہے اور سمجھا بھی دیا ہے۔ وہ سارے ہی کام کر لیتا ہے۔ میں اور علیزہ بھی چکر لگاتے رہیں گے۔ آپ اور ماموں کچھ گھوم پھر لیں۔'' عالیہ نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا۔ بیٹھے بیٹھے ٹانگیں تو بالکل اکڑ گئی ہیں۔'' ممانی نے ذرا ترچھی نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا جیسے سارا قصور اُن کا ہو۔

''لائیں میں دبا دوں۔'' عالیہ نے ہمدردانہ کہا۔

''اللہ تمہارا بھلا کرے، دو چار قدم چلوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' ممانی نے بڑے دلار سے کہا۔

''علیزہ نظر نہیں آ رہی، کچن میں تو نہیں رہ گئی۔'' ممانی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''نہیں، وہ تو میرے پیچھے ہی آئی تھی۔'' عالیہ نے کہا۔

''ماما، پھپھو اُدھر گئی ہیں۔'' علیزہ نے ایک انگلی اُدھر اٹھا دی جہاں کچھ فاصلے پر سبزہ زار کے بعد ڈھلان شروع ہوتی تھی۔

''فلکی میرا خیال ہے یہ مگ علیحہ کو دیں پہنچا دو اور ہاں اپنا مگ بھی ساتھ لے جاؤ ورنہ آنے جانے میں تمہاری کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' عالیہ کی ہلکی سی مسکراہٹ کچھ کہہ رہی تھی۔ راہ دکھا رہی تھی کہ وہ اُدھر اکیلی بیٹھی ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو کیوں گولڈن چانس مس کر رہے ہو۔

''جی لائیں، میں پہنچا دیتا ہوں۔'' فلک حکم کی تعمیل میں یوں اٹھا جیسے فلائٹ مس ہونے کا خدشہ ہو۔

''اور یہ بسکٹ بھی۔'' وہ دونوں مگ اور بسکٹ کا پیکٹ لیے اُدھر چل دیا جدھر علیزہ نے اشارہ کیا تھا۔

''بڑا ہی نیک بچہ ہے۔'' ممانی جاں نثاری سے اسے جاتا دیکھ رہی تھیں۔

''کہیں نہ کہیں میری اور آپ کی سوچیں مل ہی جاتی ہیں۔'' ماموں آہستگی سے بولے۔

''صرف آپ کی سوچیں ہی نہیں میری اور عالیہ کی سوچیں بھی آپ کی سوچوں سے مل جاتی ہیں۔'' سہیل نے معنی خیز نظروں سے عالیہ کی طرف دیکھا۔

''سہیل ٹھیک کہہ رہے ہیں ماموں لیکن ہماری سوچوں سے کیا ہوتا ہے۔'' عالیہ نے حوصلہ کر کے کہا۔

''مجھے تو لگتا ہے علیحہ کی عقل پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔'' ممانی بڑبڑائیں۔

''اللہ چاہے تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔'' ماموں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''عالیہ ٹھیک کہہ رہی تھی ذرا ٹانگیں سیدھی کر لیتے ہیں۔'' ممانی بھی اٹھیں۔

''آپ سب کے کیا ارادے ہیں؟'' سلمان نے ایک جنرل بات کی۔

''میرا خیال ہے ذرا کمر سیدھی کر لی جائے؟'' سہیل نے جو سدا کے ست الوجود تھے سب کی طرف دیکھا۔

ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔

(باقی آئندہ)

ناولٹ

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے
ہر لڑکی کانچ سی ہوتی ہے
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

کانچ سی لڑکی

انجم انصار

اور

ہر لڑکی اپنے والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہے۔
کیا ہمارے وہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں کے لیے ہوتے ہیں؟
دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟

پانچواں حصہ

''ابے کیا تو کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے یا اپنی اوقات بھول گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں..... تو اپنی حقیقت ہی بھول بیٹھا ہو۔ یاد کر..... ہاں یاد کر لے کہ جب ہمارے پاس آیا تھا تو کیسا تھا تو.....؟ کیا یہ بھی بھول گیا کہ ہمارے پاس آ کر مدتوں کے بعد تو نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ لگتا ہے تو سب ہی بھول چکا ہے۔''

''نہیں سر، یہ بات نہیں ہے۔'' وہ خجل سے لہجے

میں بولا۔

''ہاں تو ابھی تو نے کیا کہا تھا..... کیا کہا کہ وہ لڑکی بہت شریف ہے۔'' سرفراز صاحب نے تمسخر بھرے لہجے میں اس کا جملہ دہرایا۔ نواز نے تائید میں سر ہلایا۔

''ابے..... تو کیا اسے حقیقتاً اپنی منگیتر سمجھ رہا ہے؟''

''نہیں سر۔'' وہ خفت بھرے لہجے میں بولا۔

''نہیں، نہیں تو یقیناً کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ کہیں محبت تو نہیں ہو گئی۔ اپنے آپ کو ہیر وتو نہیں سمجھ رہا ایسے کپڑے اور ایسے حلیے لے کر جا رہا ہے ناں جو تیرے باپ نے بھی اپنے خواب میں نہیں دیکھے ہوں گے۔ تجھے لگا ہو گا کہ تو لاٹ صاحب ہے..... ہے ناں اور اتنے پیسے تجھے ماہانہ دیے جا رہے ہیں کہ کبھی تصور میں بھی نہیں سوچے ہوں گے۔''

''ہاں سر، پانچ ہزار کا نوٹ تو اسے ہمارے یہاں آ کر ہی ملا ہے۔ اس سے قبل اس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' ان کے سیکریٹری نے ہنس کر بتایا۔

''وہ لڑکی اگر بدمعاش ہوتی تو تجھے پالنے کے لیے ہمیں پیسہ تھوڑی بہانا پڑتا۔ ہماری پریشانی یہی تو ہے کہ وہ شریف ہے اور ہمیں اس کو بدمعاش ثابت کرنا ہے۔'' سرفراز صاحب ہنسے اور ہنستے ہی چلے گئے۔

''اس کے باپ نے اس کا نام نہاں رکھا ہے ناں۔ اب وہ وقت دور نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اسے عیاں کے نام سے پکاریں۔'' سرفراز صاحب مسکرائے۔

''سر میں کوشش کروں گا کہ آپ کا کام جلدی ہو جائے۔''

''اگر کام نہیں کر سکتے تو بتا دو، پولیس مقابلے میں تمہیں مروا کر ہم کسی دوسرے لڑکے کی بھی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔'' نواز اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا چلا گیا اور سرفراز صاحب کے چہرے پر ایک وحشت زدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

رات کے بارہ بجے نہاں جاگ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ نواز ضرور فون کرے گا۔ جب سے اس کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں آئی تھی، نواز اسے روزانہ ہی فون کر رہا تھا۔ آج اس کے فون کا وہ انتظار کر رہی تھی تو فون نہیں آ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے اس نے نواز کے نمبر پش کر دیے۔ پہلی ہی بیل پر اس نے فون اٹھا لیا۔

''کیا بات ہے؟'' نہاں نے پوچھا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' نواز نے پژمردگی سے کہا۔

''کیا ہوا؟'' لہجے میں بے چینی سی گھل گئی۔

''تمہیں نہ دیکھنے کی وجہ سے بیمار ہو گیا ہوں۔''

''ایسی بیماری تو میں نے کہیں نہیں سنی۔'' وہ یوں ہنسی جیسے جلترنگ سے بج اٹھے ہوں۔

''اڑا لو مذاق مگر میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں دیکھنے اور تم سے باتیں کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔''

''باتیں تو تم روزانہ مجھ سے کر لیتے ہو۔''

''تو کیا مجھے تمہیں دیکھنا نہیں چاہیے۔ سچ میرے پاس تو تمہاری ایک تصویر بھی نہیں ہے کہ جب دل چاہے اس سے باتیں کر سکوں۔''

''تو کیا میری تصویر لینا چاہتے ہو؟''

''ہاں ..... تو کیا مضائقہ ہے، آخر تم میری ہونے والی بیوی ہو۔''

''امی کہہ رہی تھیں کہ اگر زرینہ باجی تمہاری تصویر مانگیں تو اپنی شناختی کارڈ والی تصویر دے دینا۔ شناختی کارڈ اسی ماہ بنا ہے تو سب سے تازہ تصویر

میری وہی ہے۔'' نہاں ہنسی۔

''پلیز نہاں کل کالج سے واپسی پر تمہیں پک کر لوں؟''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں کہیں جاؤں۔''

''ایسا لگتا ہے کہ تمہاری وجہ سے میری جان ہی چلی جائے گی۔'' نواز اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کی جان کون لے لے گا؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہہ دے اگر میں نے تمہاری تصویریں کھینچ کر اپنے باس کو نہیں دیں تو شاید وہ مجھے قتل بھی کروا دے مگر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''تم لوگی میری جان ..... تم۔ جب تم اپنے عاشق سے ملو گی ہی نہیں تو کیا وہ اپنی جان سے نہیں جائے گا۔'' مگر نہاں تو اس کی بات ہنسی میں اڑا کر فون بند کر چکی تھی اور نواز اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔

☆☆☆

کتنے دنوں بعد وہ کسی تقریب میں شریک ہوا تھا۔ کسی دوست کے ہمراہ جانے والی تقریب میں وہ بڑا سرشار سا بیٹھا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اپنے دوست کی بات مان کر وہ اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میزبان کون تھے ان کے بارے میں بھی وہ قطعی لاعلم تھا۔ موسم سرد تھا، یہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا خوب صورت ہال تھا جو موسم کی مناسبت سے خاصا گرم تھا۔ چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔ اپنی پشت پر ایک مانوس سے قہقہے کو سن کر غیر ارادی طور پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سرفراز احمد اپنے کسی دوست کی بات پر ہنس رہے تھے۔ ریحان کے ساتھ ہی ان کی نظر بھی اس پر پڑی تو وہ ہنستے ہنستے یکدم چپ ہو گئے اور آنکھوں میں غصہ سا ہلکورے لینے لگا۔ ریحان ان کی کیفیت محسوس کر کے حیران ضرور ہوا مگر سر کے اشارے سے انہیں سلام کیا۔

''تم ابھی تک یہیں ہو؟'' وہ پاس آ کر جیسے طیش میں بولے۔

''میں تو یہیں رہتا ہوں ہمیشہ سے ہی۔'' وہ مسکرایا۔

''میرا مطلب ہے مری سے کب واپس آئے؟''

''مری سے .....؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں شاید تمہارے کسی دوست نے ہی بتایا تھا کہ تم مری گئے ہوئے تھے تو کب آئے؟'' ریحان جانتا تھا مری جانے کی بات تو صرف مالی کو بتائی گئی تھی۔

''اوہ، مری سے ..... وہاں سے آئے ہوئے تو مجھے مہینہ ہو گیا ہے اور میں پھر جانے والا ہوں۔''

''کب جاؤ گے؟'' وہ پھر چونکنے سے ہو گئے۔

''ابھی شیڈول بنا نہیں ہے جب بنے گا تب۔''

وہ اسے نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے اور ریحان سوچ میں ایک بار پھر پڑ گیا..... کیا مجھ پر قاتلانہ حملے کے ذمے دار کہیں۔ یہی تو نہیں تھے۔ مگر آ کر ظہیر حسن کو یہ سب روداد بتائی تو انہوں نے اسے محتاط رہنے کے ساتھ یہ بھی کہا۔

''سرفراز احمد ان دنوں تنکی سے ہو گئے ہیں اور ان کے بعض کاروباری دوست تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ بیٹی کی موت کے بعد وہ کافی حد تک پاگل بھی ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تمہارا شبہ ہی ہو۔''

''مگر انہیں کیسے پتا چلا کہ میں مری گیا ہوا تھا، یہ بات تو صرف مالی کو ہی بتائی گئی تھی۔''

''تم بھول رہے ہو مالی نے ہمارے محلے میں ہی نوکری حاصل کرنے کے لیے کئی لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ ریحان بھائی کے گھر والے مری جا رہے ہیں اس لیے اسے نوکری درکار ہے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے

استفسار کیا کہ میں مری کیوں جارہا ہوں یا ریحان کا وہاں ٹرانسفر تو نہیں ہوگیا۔''

''جب ہی انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا۔''

''ہاں، ان کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے کہ وہ نیم پاگل سے ہوگئے ہیں۔'' ریحان باپ کی بات سن کر تائید میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

''ایسی باتیں تو میں بھی سن رہا ہوں مگر یقین نہیں کیا تھا کہ ایسا چالاک شخص پاگل کیسے ہوگیا؟''

''صدمے تو انسان کو توڑ دیا کرتے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔'' ریحان کے لہجے میں تاسف نمایاں تھا۔

☆☆☆

آج کالج میں فن ویک کا آخری دن تھا۔ نہاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج سے باہر نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ نواز اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے اس کا انتظار کررہا تھا۔ خوب صورت، اونچے قدوقامت کا حامل، سیاہ دھوپ کا چشمہ لگائے کسی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

''کیا یہاں شوٹنگ ہونے والی ہے؟'' کئی لڑکیاں تو ٹی وی کے کیمرا مین تک کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ نہاں عبایا پہنے اس کے پاس آئی تو یکدم وہ اسے پہچان بھی نہیں پایا۔

''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟'' اس نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں لینے آیا ہوں، چلو میرے ساتھ۔''

''مگر میں تو آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاسکتی۔''

''پلیز نہاں، میرے حال پر رحم کرو۔''

''میں نے کہا ناں، میں نہیں جاسکوں گی۔'' نہاں نے کہا اور تیزی سے گھر کی سمت چل دی۔

اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی کہ کالج سے سیدھے گھر آنا ہے تو وہ کیسے کہیں اور جاسکتی تھی۔ نہاں کو جاتا دیکھ کر نواز کا دل چاہا کہ وہ اسے زبردستی اپنی گاڑی میں ڈال کر لے جائے اور جیسی دل چاہے اس کی تصویریں بنادے تاکہ ہر وقت کی مصیبت سے اس کی جان بچ جائے مگر اسے کہا گیا تھا کہ یہ کام زبردستی ہرگز نہیں ہوگا۔ صرف اور صرف محبت کے زہریلے انجکشن اس کے دل ودماغ میں لگانے ہوں گے۔ محبت کو رسوا کرنے کے لیے ایسے ہی لوگ تو کام کررہے ہیں جن کا دین ایمان پیسا بن جاتا ہے اور وہ پستی کی ہر حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ نواز بھی ایک ایسا ہی مہرہ تھا جو سرفراز صاحب کے پاس کام کررہا تھا جسے ایک معصوم لڑکی کو قعرِ مذلت میں ڈالنے کا ٹھیکا سونپا گیا تھا اور اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جلد از جلد وہ یہ کام نمٹا کر ایک موٹی رقم حاصل کرکے اپنے گھر چلا جائے مگر نہاں تو اس کے ارمانوں کو بھسم کرکے جاچکی تھی۔

''میری چڑیا کب تک میرے جال سے تم بچ پاؤ گی۔'' وہ خباثت سے مسکرایا۔

دوسرے دن نواز پھر موجود تھا۔ آج سفید پتلون، سفید شرٹ پہنے کوئی کرکٹر لگ رہا تھا۔ لڑکیاں اسے بغور دیکھتے ہوئے گزر رہی تھیں' وہ سیٹی پر کوئی فلمی دھن بجا رہا تھا۔

''یہ ہیرو کس کے انتظار میں کھڑا ہوتا ہے؟''

''ہوگی کوئی ہیروئن..... مگر بے چارے کو گھاس نہیں مل رہی، بے چارہ خوار ہو رہا ہے۔'' لڑکیوں کے جملے اس کے موڈ کو مزید تیار رہے تھے۔ نہاں نے اسے دیکھا تو اسے ہنسی کے ساتھ خفت بھی محسوس ہوئی۔

''یہ نواز میری بات سمجھ کیوں نہیں پارہا۔'' اس کے دل میں یہ احساس ہلکورے لینے لگا۔ آج وہ اس کے پاس رکنے کے بجائے اپنی سہیلیوں کے ساتھ

سیدھی نکل گئی اور جب ایک گھنٹے کے بعد نواز نے اسے موبائل کرکے پوچھا۔

''کالج سے باہر کب آؤ گی؟'' تو اس نے بتایا۔

''میں تو اپنے گھر بھی پہنچ چکی ہوں۔''

''کیا تم نے مجھے دیکھا نہیں تھا؟'' لہجے میں خفگی رچی تھی۔

''ہاں دیکھا تو تھا۔''

''پھر رکیں کیوں نہیں؟''

''اب اگر آپ روزانہ آکر کھڑے ہوں گے تو میں کیا روزانہ رکوں گی؟''

''میں کوئی غیر تو نہیں تھا۔'' لہجے میں غصہ موجود تھا۔

''امی کہتی ہیں ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگا کرتی ہے۔'' اس نے معصوم سے لہجے میں کہا۔

''تمہاری امی تو......'' اس کے حلق سے گالیوں کا طوفان باہر آتے آتے رک گیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''یہی کہ تمہاری امی میری بھی تو امی ہیں تو پھر انہیں میرا خیال کیوں نہیں آتا۔ اپنی منگیتر سے بات کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔'' وہ غصے سے اپنی مٹھیاں بند کرتے ہوئے بولا۔

''آپ ہمارے گھر آجائیں۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں تمہارے ابا کے محاصرے میں، میں تم سے بات کرسکتا ہوں۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ تب نہاں نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔

''کیا بات ہے، یہ اکیلے بیٹھی ہوئی بھی ہنس رہی ہو۔'' نسرین بیگم نے جب تیسری مرتبہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے یوں ہنستے دیکھا تو پوچھ ہی لیا۔

''امی نواز کا فون تھا۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''یہی کہ وہ میرے کالج کے گیٹ پر کھڑے تھے تو میں ان کو دیکھ کر رکی کیوں نہیں اور میں نے ان سے بات کیوں نہیں کی۔''

''بیٹا بات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔'' نسرین بیگم نے کہا۔

''یہی باتیں تو وہ کہہ رہے تھے۔''

''تمہارا منگیتر ہے ناں وہ، اس لیے وہ کہہ رہا ہوگا۔''

''جی امی۔''

''ہاں بیٹا، بات کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

''اگر وہ کل پھر آئے تو کیا میں ان سے بات کرلوں؟''

''ہاں بیٹا، بات کرنے میں تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' اور نہاں مطمئن سی ہوگئی۔

اگلے دن جب وہ سیاہ مرسڈیز کے پاس سیاہ پینٹ اور لائٹ بلیو شرٹ میں ٹیک لگائے کھڑا تھا تو لڑکیاں اس کی ڈریسنگ دیکھ کر متاثر سی ہوگئیں وہ لگ بھی تو بہت اچھا رہا تھا۔ لاابالی سا انداز...... چیونگم چباتے ہوئے وہ مستقل اپنی گھڑی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ قیمتی گاڑی لیے کوئی ہیرو بے پروائی سے کھڑا ہو تو سب ہی دیکھتے ہیں۔

''یہ کون ہیرو ہے جو روز ہمارے کالج کے گیٹ کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔'' چہ میگوئیاں اس کے کانوں تک آرہی تھیں اور وہ مسکرارہا تھا۔

''لگتا ہے اپنی سینڈریلا کی تلاش میں ہے۔'' کسی لڑکی نے ہنس کر کہا۔

"کیا ہم اس سے کہیں کہ سینڈل تو دکھاؤ شاید ہمارے پیر میں پوری آجائے۔" لڑکیوں کے تبصرے اس کی مسکراہٹ کو گہرا کررہے تھے اور جب نہاں سیاہ عبایا پہنے اس کے سامنے آکر کھڑی ہوئی تو اسے لگا جیسے آسمان کے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند طلوع ہوگیا ہو۔ سیاہ اسکارف میں اس کا روشن چہرہ مسکراہٹ لیے اس کے سامنے تھا۔

"کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے، جلدی کریں۔" اس نے کہا۔

"یہاں بات کیسے ہوسکتی ہے۔" اردگرد لوگوں کی نظریں محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیوں نہیں ہوسکتی بات؟" وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

"چپ چاپ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، کھا نہیں جاؤں گا تمہیں۔" وہ محبت سے اسے دیکھتے ہوا بولا۔ نہاں نے ایک لمحے سوچا ماں نے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

فجر کی نماز کے بعد واک کے لیے جانا اس کا ہمیشہ کا معمول تھا جو کافی عرصے سے چھٹ چکا تھا۔ آج ظہر کی نماز کے بعد وہ پارک چلا گیا مگر آج وہ جب واک کے لیے آیا تو اسے لگا جیسے اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ایک چھٹی حس اسے بار بار تنبیہ کررہی تھی کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ پارک میں بنی ہوئی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھ گیا۔ یہ پارک گنجان آباد علاقے میں ہونے کے باعث موسم سرما میں ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ خواتین، مرد، لڑکے، لڑکیاں سب ہی واک کررہے تھے۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اسے پارک میں کوئی شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو مشکوک قسم کا ہو۔

"لگتا ہے میری محتاط طبیعت کی وجہ سے یہ خیال میرے ذہن سے چپک ہی گیا ہے۔" ریحان نے سوچا۔ وہ پھر واک کے خیال سے کھڑا ہوا ہلکی ہلکی سی دھوپ اسے اچھی لگ رہی تھی کہ سامنے سے آتے ہوئے شخص سے اچانک ہی یوں ٹکرایا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ شاید گر جاتا اگر پیچھے سے دو شفیق ہاتھ اسے سنبھال نہ لیتے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو وہ سرفراز صاحب تھے جو اُن ہی ساعتوں میں پارک میں داخل ہوئے تھے اور اسے یوں گرتا دیکھ کر لپک کر انہوں نے سنبھال لیا تھا۔

"بیٹا دیکھ کر چلا کرو۔ ابھی تمہارے چوٹ لگ جاتی تو۔" انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"شکریہ انکل۔" ریحان کا لہجہ ممنونیت بھرا تھا۔ وہ انہیں سلام کر کے رکا نہیں بلکہ باہر نکل گیا کہ طبیعت میں بھاری پن سا محسوس کررہا تھا نہ جانے کیوں......؟

☆☆☆

"اب تو چائے بھی پی لی اور برگر بھی کھالیے اب تو مجھے گھر جانے دیں۔" ریستوران میں نواز کے ساتھ بیٹھی نہاں نے معصومیت سے کہا۔

"آج تم اتنی پیاری لگ رہی ہو، میں ایک دو تصویریں تمہاری بنالوں اپنے موبائل سے؟" نواز نے لاڈ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور جیب سے اپنا موبائل نکالا۔

"آپ کی تصویر میرے دل میں ہے تو کیا میری تصویر آپ کے دل میں نہیں ہے جو یہاں آپ میری تصویریں بنائیں گے۔"

"تمہارا منگیتر کیا اپنے موبائل میں تمہاری تصویر نہیں رکھ سکتا۔"

"یہ جگہ تو دیکھیں آپ۔ مجھے تو بے حد عجیب سی لگ رہی ہے۔" اس نے اپنا حجاب چہرے پر اس طرح لپیٹا کہ اب صرف اس کی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں

نظر آرہی تھیں اور نواز اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔

"نہاں تم اس طرح کیسے گھر جاسکتی ہو؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"ایسے چلی جاؤں گی خود ہی۔" وہ مسکرا کر بولی اور تیزی سے باہر آکر سامنے آتی آٹو رکشا کو ہاتھ دیا، سرعت سے اس میں بیٹھی اور ہوا ہوگئی۔ نواز جو اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے باہر آیا تھا وہ دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

"بڑی چالاک لڑکی ہے یہ نہاں بھی...... مروا کے ہی رہے گی مجھے۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے خود کلامی میں بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

"ہوگئی بات آج؟" نسرین بیگم نے پوچھا۔

"جی امی۔" وہ شرما سی گئی۔

"کوئی خاص بات تھی کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں کی انہوں نے۔"

"تو پھر کیوں بات کرنا چاہ رہا تھا؟"

"بس ایسے ہی۔" وہ پھر شرما گئی اور نسرین بیگم کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ محبت کرنے والے لوگوں کے پاس باتوں کے لیے کوئی موضوع تھوڑی ہی ہوتے ہیں بس ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی انہیں طمانیت ہوجاتی ہے اور منگنی اور شادی کے درمیان کا پیریڈ تو ہر لڑکی، لڑکے کے لیے بے حد رومان پرور سا ہوتا ہے۔" وہ سوچ رہی تھیں اور ازخود مسکراتے ہوئے دعا دے رہی تھیں۔

"یارب العالمین میری بیٹی کا جیون ساتھی اس سے سدا محبت کرتا رہے۔ کبھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئے۔"

☆☆☆

پھول سی بیٹی کے نام

اے میری بیٹی بتاتی ہوں تجھے
چند باتیں میں سناتی ہوں تجھے
زخم دل اپنا دکھاتی ہوں تجھے
قولِ زریں ہیں بوقتِ الوداع
پرورش کرتے ہیں گو ماں باپ ہی
مشکلیں بھی جھیلتے ہیں وہ سبھی
پر جدائی کی گھڑی رکتی نہیں
دل پہ پتھر رکھ کر کہتے ہیں الوداع
تو سمجھنا ساس کو ماں آج سے
رکھنا خوش تم اپنے کام کاج سے
ذکر جب بھی ہو تیرا ہو ناز سے
ہے میرا کہنا، بوقتِ الوداع
تم سسر کے مت ادب کو بھولنا
سامنے اُن کے نہ منہ کو کھولنا
میٹھی بولی ہر کسی سے بولنا
کہہ رہی ہوں میں بوقت الوداع
زندگی کا مقصد ہوتا ہے تمام
کرسکے گر تو شوہر کا احترام
اس کی ہاں میں ہاں ملانا نیک نام
کرتی ہوں التجا جا الوداع
سیرت و عصمت تیرے زیور رہیں
خندہ زن ہر دم تیرے تیور رہیں
خوش تیری سب نندیں اور بھابیاں رہیں
دل میں ساری باتیں لکھ لے الوداع
پیار سے کرتے رہے وہ پرورش
کی ادا حضرت محمد ﷺ نے اسلامی روش
آیا آخر وقت سن اے بیٹی
فاطمہؓ کو کردیا گھر سے وداع
بیٹی دنیا و آخرت میں پھولتی پھلتی رہو
عاقلہ و دیندار بن کر ہمیشہ خوش رہو
خوش رکھو تم ساس، شوہر، سسر کو
تیرے ابا بھی کہہ رہے ہیں الوداع
تیری ماں بھی کہہ رہی ہے الوداع
الوداع اے جانِ مادر الوداع

ازطرف: سیدہ بشریٰ عباس نقوی، کراچی

''میں ان باتوں کو نہیں مانتا کہ وہ کوئی آسیب تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا دشمن ضرور تھا جو شاید کسی غلط فہمی کی وجہ سے مجھے اپنا دشمن سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے تو اگر کبھی کسی کے ساتھ کوئی بھلا نہیں کیا تو کبھی کسی کو نقصان بھی نہیں پہنچایا۔ نہ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ مال سے۔ مجھے حیرت سے زیادہ دکھ اور افسوس ہے کہ آخر کس نے اور کیوں مجھے اپنے عتاب کا شکار بنایا۔'' ریاض صاحب ملول سے لہجے میں بیوی سے کہہ رہے تھے۔

''اللہ کا شکر ہے ہمارا دشمن خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ بیتی باتوں کو یاد کرنے کا کیا فائدہ؟'' نسرین بیگم نے سمجھایا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' ریاض صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب آپ یہ بتائیں کہ ان ایک ماہ کی چھٹیوں میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''میں سوچ رہا ہوں تمہیں اور نہاں کو ساتھ لے کر مری گھوم آؤں۔''

''مری کیوں جائیں؟'' نسرین نے حیرت سے پوچھا۔

''بھئی میں آج تک تمہیں اور نہاں کو کہیں گھمانے پھرانے جو نہیں لے کر گیا ہوں۔ چند ماہ بعد نہاں کی شادی ہو جائے گی، وہ اپنے شوہر سے کیا کہے گی کہ میرے ابو نے ہمیشہ مجھے اپنے گھر میں ہی رکھا۔ کبھی کراچی سے باہر تک نہیں لے کر گئے۔ جہاز تو کیا کبھی ریل میں بھی نہیں بیٹھی۔''

''مگر گھومنے پھرنے سے تو بہت خرچہ ہو جائے گا۔'' نسرین بیگم نے تفکر بھرے لہجے میں کہا۔

''ہو جانے دو، ہماری بیٹی جب خوش ہوگی تو اس کی خوشی ہی ہمارے لیے بہت کچھ ہوگی۔ کسی خرچ کا احساس تک نہیں رہے گا۔'' ریاض صاحب نے بے فکری سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' نسرین بیگم بھی مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

''کیا...... کیا کہہ رہی ہو تم؟'' نواز کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ فوراً اٹھایا اور پاگلوں سے لہجے میں بولا۔

''نہیں...... نہیں تم کہیں نہیں جا سکتیں۔ ہرگز نہیں جا سکتیں۔''

''پہلی مرتبہ تو میں ریل میں بیٹھوں گی۔ سچ بہت مزہ آئے گا۔'' نہاں نے سرشار سے لہجے میں اسے بتایا۔

''کب تک جانے کا پروگرام ہے؟'' اس کا دماغ اڑا جا رہا تھا۔

''کل ابو ٹکٹ لینے جائیں گے، کہہ رہے تھے اس اتوار کو ہم چلے جائیں گے۔ ابھی تو پورے چھ دن ہیں ہمارے جانے میں۔''

''نہیں نہاں...... نہیں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''حیرت ہے آپ کو خوشی کیوں نہیں ہو رہی۔''

''تم میرے شہر سے کہیں دور چلی جاؤ' یہ میں کیسے برداشت کر پاؤں گا۔ ایمان سے میں مر جاؤں گا اور مجھے تو اب یقین آ رہا ہے کہ میری موت تمہاری وجہ سے ہی ہوگی۔'' اس نے ملتجی سے لہجے میں کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''صرف چار ماہ بعد ہماری شادی ہے' اچھا ہے ناں میں اپنے امی اور ابو کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزار لوں۔ بعد میں کہاں موقع ملے گا مجھے یوں گھومنے پھرنے کا۔''

''ہاں بعد میں تو تمہیں واقعی کوئی موقع نہیں مل سکتا۔'' وہ بے رحمی سے ہنسا۔

''ابے ذرا سے کام پر تو کتنا خرچ کروائے گا؟'' منیجر نواز کو ڈانٹ رہا تھا۔ ''تجھے معلوم بھی ہے روزانہ تجھ پر کتنا خرچا ہو رہا ہے اور ابھی تک تو نے دھیلے کا بھی کام نہیں کیا ہے۔''

''میں کیا کروں، نہاں تصویریں کھنچوانے پر راضی ہی نہیں ہوتی۔ دو بار اسے مشکلوں سے کیفے لے جا چکا ہوں مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہوتی۔ میں کوشش تو کر رہا ہوں ناں!''

''تجھ جیسا پاگل لڑکا کچھ نہیں کر سکتا۔ بس جس دن تو اسے ہوٹل لے کر جائے تو ہمیں فون کر دینا' ہمارا آدمی اس کی تصویریں بھی بنا لے گا اور ہماری ورکر اس کا حجاب بھی اتار دے گی۔ بس تجھے اس سے لپٹ کر تصویریں بنوانی ہیں۔''

''نہاں سے لپٹ کر؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''سر وہ ایسی لڑکی نہیں ہے، میں بے حد خراب لڑکا ہوں مگر میں نے ایسی پارسا لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو مجھے اپنا ہاتھ تک پکڑنے نہیں دیتی۔ وہ بے حد شریف ہے کبھی آمادہ نہیں ہوگی۔'' نواز نے پریشان سے لہجے میں بتایا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں اس سے لپٹ کر تصاویر بنوانا ناممکنات میں سے ہے۔''

''ابے جاہل تب تو تصویریں بنواتے وقت ہوٹل کا بیرا بن جانا۔ اس کو چائے دیتے ہوئے تصویر بنوا لینا۔ اس سے ٹپ لیتے ہوئے پوز دے دینا، اس کو سلوٹ مارتے ہوئے اپنا پوز بنوا لینا۔'' منیجر نے گالیوں کی برسات برساتے ہوئے اس سے کہا۔

''سر آپ میری بات نہیں سمجھ سکے ہیں شاید۔'' وہ پھر گھگیایا۔ ''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بے حد شریف ...... آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ناں وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ تصویریں کیسے بنواؤں۔ میری تو عقل بھی کام نہیں کر رہی۔'' وہ مسلسل ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ تب منیجر نے اس کے برابر بیٹھ کر نواز کے گلے میں ہاتھ ڈال کر تیزی سے جھٹکا دے کر زانو پر لٹایا اور ماتھے پر بوسہ ثبت کر دیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

''اب کیا تجھے اور طریقے بھی بتاؤں کہ لڑکی کے ساتھ ڈرٹی پکچرز کیسے بنوائی جاتی ہیں اور طریقے بتاؤں؟'' وہ بے غیرتی سے ہنسا۔

''ٹھیک ہے سر، میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا اب غلطی نہیں ہوگی مجھ سے۔ بالکل بھی نہیں۔'' نواز اپنے کپڑے جھاڑتا...... کھسیایا ہوا سا اٹھ گیا اور منیجر اسے دوبارہ غلیظ گالیاں سنانے لگا۔

''کند ذہن، منحوس، کم بخت ذرا سے کام کو کر ہی نہیں پا رہا ہے۔''

☆☆☆

''واقعی بہت ہی اچھی کمپنی ہے یہ...... وہاں کے بڑے افسر نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں ورکرز کو سال بھر کے بعد ایک ماہ کی چھٹی لازمی دی جاتی ہے، آپ کل سے چھٹی پر ہیں۔ اس ماہ کی تنخواہ آپ کو اس وقت فوراً دے دی جائے گی جب آپ اپنی چھٹیاں گزار کر آئیں گے۔'' ریاض صاحب نے سرشاری سے بتایا۔

''ہاں، یہ سب نواز کی وجہ سے ہوا ہے اور اسی نے آپ کو جاب دلوائی ہے اور اسی نے آپ کے دل دماغ سے اس دشمن کا خوف باہر نکالا جس کی وجہ سے آپ بالکل گھر میں ہی نظر بند ہو کر رہ گئے تھے۔'' نسرین بیگم نے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم مگر ابھی بھی میں سوچتا ہوں کہ میرا دشمن ایسا کون ہے جو مجھے یوں تباہ و برباد کر رہا تھا اور اب وہ یکدم کہاں چلا گیا ہے۔''

''دنیا میں بلایات بھی تو ہوتی ہیں۔ لگتا ہے ہم لوگ کسی آسیب کے زیر اثر آ گئے تھے۔''

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ۔ کیا آپ مجھ پر پابندی لگائیں گے... میکے جانے پر؟" نہاں نے شکایتی سے لہجے میں پوچھا۔

"تم پر سے تو سب پابندیاں ختم ہو جائیں گی۔ تم سے کہا بھی جائے گا کہ چلی جاؤ تو تم نہیں جاؤ گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"جی نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" وہ اس کی بات کا دوسرا مطلب سمجھ کر شرمائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"پلیز نہاں، تم میری ایک بات مانو گی؟" لہجہ خوشامدی سا تھا۔

"ہاں، ہاں کہیے نا۔" وہ بولی۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ریاض صاحب اور نسرین اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہے تھے اور نہاں، نواز سے موبائل پر باتیں کر رہی تھی۔ نواز نے نہاں کو یہ گفٹ دیا ہی اس لیے تھا کہ اس سے بات چیت کا راستہ کھلا رہے۔

"کل تم کالج سے میرے ساتھ چائے پینے چلو گی؟"

"نہیں، مجھے دیر ہو جاتی ہے گھر جانے میں اچھا نہیں لگتا۔"

"کیا تم میری خاطر اپنے کالج سے پہلے نہیں نکل سکتیں۔ تمہیں میری جان کی قسم نہاں۔ پلیز...... کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہی ہوگا۔"

"کل ہی کیوں...... کل ایسی کیا خاص بات ہے؟" اس نے کچھ سوچا پھر بڑے باوثوق سے لہجے میں بولا۔

"کل میری سالگرہ ہے، ہاں میری سالگرہ ہے تو اس دن میں تمہیں نہ دیکھوں تو کیا میرا دن اچھا گزر سکتا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ اپنی آپا کے ساتھ ہمارے گھر آ جائیں امی آپ کے لیے آپ کی پسند کے کھانے بنا لیں گی۔ آپ کی سالگرہ ہمارے گھر میں منائی جائے گی۔"

"نہیں، نہیں کل تمہارے ابو کی پہلی پہلی چھٹی ہے، وہ کیا سوچیں گے کہ منگیتر صاحب تو بڑے کھانے چاٹنے والے لالچی سے ہیں۔ اپنی سالگرہ اپنی ہونے والی سسرال میں منانے کے لیے آ گئے۔"

"کل میرا ٹیسٹ ہے اور آخری پیریڈ میں ہے۔ میں کسی طور نہیں آ سکوں گی۔" نہاں نے جیسے فیصلہ سنا دیا۔

"کیا تم میری خاطر فیل نہیں ہو سکتیں۔" نواز نے پُرمحبت، مخمور سے لہجے میں کہا۔

"کیا کہا...... فیل ہو جاؤں!" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں ہو جاؤ ناں جانو۔ یہ تمہارے منگیتر کی سالگرہ کا دن ہے۔ اگر تم اس میں سے میرے لیے صرف ایک گھنٹا نکال لو گی تو مجھ پر یہ تمہارا احسان ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، خوش ہو جاؤ۔" کچھ سوچ کر نہاں نے کہا۔

"کیا ٹھیک ہے؟" وہ بوکھلایا ہوا سا پوچھ رہا تھا۔

"میں آپ کی وجہ سے فیل ہو جاؤں گی۔" نہاں نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

عجیب سی صبح تھی۔ ریاض صاحب فجر کی نماز پڑھ کر گھر آئے تو بجلی کے کھمبے سے کرنٹ سا لگ گیا حالانکہ نہ بارش ہوئی تھی نہ کھمبا گیلا تھا۔ نسرین بیگم دودھ گرم کرنے لگیں تو سارا دودھ ابل گیا اور ان سے چولھا تک بند نہیں ہوا۔ نہاں نے اپنے کالج کے یونیفارم پر استری کی تو اس کا دوپٹا جل گیا۔

"پتا نہیں کیوں میرا دل گھبرا سا رہا ہے۔ نہاں تم آج کالج مت جاؤ۔"

"امی آج تو میرا ٹیسٹ ہے اگر نہیں گئی تو ٹیسٹ میں فیل ہو جاؤں گی۔"

"ہو جانا فیل مگر مت جاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔" نسرین بیگم نے کہا۔ پتا نہیں ایک دم سے انہیں چکر سے بھی محسوس ہو رہے تھے۔

"آج فیل ہونے کے لیے ہی تو جا رہی ہوں۔" وہ دل میں سوچ کر مسکرائی۔ نواز کا ملتجی لہجہ اس وقت بھی اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

☆☆☆

ریسٹوران بہت خوب صورت تھا اور بے حد مہنگا بھی تھا۔ وہاں آنے والے شکلوں اور لباس سے کھاتے پیتے گھرانوں کے لگ رہے تھے۔ ریسٹوران کے عقبی حصے میں نواز اور نہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کی ڈھیر ساری چیزیں ان کی میز پر دھری تھیں۔ تبھی ایک نفسیاتی سی لڑکی ہنستی مسکراتی داخل ہوئی وہ وہاں کھڑے بیروں سے مذاق کرتے ہوئے داخل ہوئی جس کو دیکھ کر نہاں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ سی آ گئی۔

"کیسی کیسی خواتین ہوتی ہیں کہ ان کی عجیب و غریب حرکتوں پر ہنسی آ جاتی ہے۔" نہاں نواز سے کہہ رہی تھی۔ وہ لڑکی چیتے کی سی تیزی سے نہاں کے عقب میں آئی سُرعت سے اس کا اسکارف کھینچا اور عقبی دروازے سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ نہاں ہکا بکا سی رہ گئی۔ اس کے ڈارک براؤن بال سب بکھر سے گئے۔ نواز سامنے کی کرسی سے اٹھ کر اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے بالوں کو سنوارنے لگا۔

"آپ چھوڑ دیں میں ٹھیک کر لوں گی۔" اس نے نواز کے ہاتھ ہٹائے۔

میرے نسوانی حسن کا راز
بلوسم بریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹائیٹنگ کریم (ہربل)
چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
Rs.250/=
قیمت =/125
چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔
یونانی کریم
گلیسی
چینی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار کردہ۔ بدنما داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی صاف کر کے رنگ گورا کرتی ہے۔
بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی 051-5502903-5533528
042-7666264
Cell: 0333-5203553, Website: wwwdevapk.com

''تم اپنا عبایا اتار دو۔'' نواز نے کہا۔

''وہ تو میں نہیں اتار سکتی۔''

''یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم اندر سے اپنا دوپٹا نکال کر اوڑھ لو۔''

ریستوران میں اپنا عبایا اتاروں گی تو کیا اچھا لگے گا۔'' وہ حیرانی سے ادھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

''میں تمہارے سامنے کھڑا ہو جاؤں گا یوں بھی ہم اس ہوٹل کی آخری کرسیوں پر ہیں۔ لوگ پیچھے مڑ کر تھوڑی دیکھیں گے۔''

''میں دوپٹا یوں ہی کھینچ لیتی ہوں۔''

''چلو میں نکال دیتا ہوں۔'' اب وہ دونوں کھڑے ہو گئے نواز نے تیزی سے عبایا کے بٹن کھول کر سرعت سے نہاں کو اپنی آغوش میں بھرا اور اس کے چہرے پر اپنے تپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیے۔ نہاں اس اقدام سے گھبرائی تو اس نے تیزی سے دوپٹا باہر کھینچا اور نہاں کو اپنی گود میں گرا کر اس کے بالوں پر اپنا چہرہ اور اپنے ہاتھ پھیرے اور اس کو گھیرے میں لے لیا۔ منیجر کے فوٹو گرافر ہر اینگل سے تصویریں لے رہے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' وہ کسمسا کر بولی۔ ''پلیز نواز.....'' اس نے دوہائی دی۔ اس سے قبل کہ نواز اس کے ہونٹوں کو چومتا نہاں کا ایک تیز تھپڑ اس کے منہ پر پڑا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ گئے۔

''کیا میرا اتنا سا بھی حق نہیں ہے؟'' نواز نے پوچھا اور وہ نواز کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اس کا رکھوالا نہیں رہزن ہو۔

''کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے آپ؟'' اس نے بے اختیار اسے دھکا دے دیا کہ وہ کرسی سے لڑھک گیا۔ جلدی سے دوپٹا اپنے سر پر جمایا اور عبایا کے بٹن بند کیے۔ اس تمام مرحلے میں سیکنڈز ہی لگے ہوں گے مگر یہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس پر قیامت بیت گئی ہو۔ فوٹو گرافر وکٹری کا نشان دکھا کر جا چکے تھے۔ نہاں رو رہی تھی اور نواز سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''سنو۔'' نواز نے اسے پکارا۔

''اب کیا سننے کو باقی رہ گیا ہے؟''

''مجھے معاف کر دینا۔''

''کیسے معاف کروں گی میں۔ یہ سب آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ حیران سا پوچھ رہا تھا۔ ''بس تمہیں چھوا ہی تو ہے اور یہ میری سالگرہ کا تحفہ ہے۔''

''یہ تحفہ نہیں بے حیائی ہے اور ایسی حرکتیں بھی گناہ کے زمرے میں آتی ہیں۔'' وہ گلوگیر سے لہجے میں بولی۔

''نہاں ایسی باتیں مت کرو ورنہ مجھے دکھ ہوگا۔''

''آج تو شاید میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکتی۔'' اس کا آگے بڑھا ہاتھ وہ جھٹک کر بولی اور غصے سے دیکھ کر اپنے قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

☆☆☆

گھر جا کر اس نے روتے ہوئے ماں کو ایک ایک لفظ بتا دیا تھا۔ کس طرح ایک عورت نے اس کا حجاب کھینچ لیا تھا اور کس طرح نواز نے اس پر دست درازی کرنے کی کوشش کی۔ جس پر اس نے اسے ایک تھپڑ دے مارا۔ نسرین بیگم یہ سب سن کر دم بخود سی رہ گئی تھیں۔

''بیٹا مرد اور عورت کا تنہائی میں ملنا حرام ہے کہ شیطان غالب آجاتا ہے۔ میں نے تم کو کالج کے دروازے پر بات کرنے کی اجازت تو دی تھی مگر میں نے تم سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم نواز کے ساتھ ہوٹل چلی جاؤ۔ اس معاملے میں بے شک نواز کا قصور ہے مگر غلطی تو تمہاری بھی کم نہیں..... تم کیوں گئیں؟''

''اب کیا ہوگا؟'' اس کا رونا ہی نہیں رک رہا تھا۔

''تم خاموش ہو جاؤ، نواز تم سے ضرور معافی مانگے گا اور میں اسے سمجھاؤں گی۔ ہاں تمہارے ابو کو کچھ پتا نہ چلے ورنہ انہیں بے حد افسوس ہوگا کہ وہ نواز کو فرشتہ صفت انسان سمجھتے ہیں۔'' اس واقعے کے بعد نواز تو جیسے اسے فون کرنا ہی بھول گیا تھا اور وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے یقیناً اپنے کیے پر پچھتاوا ہے جب ہی تو وہ مارے شرمندگی کے اس سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔

نسرین بیگم کا بھی یہی خیال تھا کہ نواز اپنے کیے پر نادم ہے جب ہی تو اس میں ہمت نہیں ہو رہی ہے کہ فون بھی کر سکے۔

''شاباش، شاباش واجد آج تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ کیسی خوب صورت تصویریں آئی ہیں۔ اب مزہ تو جب آئے گا جب یہ تصویریں ان کے خاندان میں پہنچیں گی بلکہ یوٹیوب پر بھی ڈالی جائیں گی تا کہ سب کو پتا چلے کہ یہ شرم و حیا والے، لوگوں پر باتیں اچھالنے والے..... کسی لڑکی کو جان سے مروانے والے لوگ زندہ درگور کیسے ہوا کرتے ہیں۔'' سرفراز صاحب نے نہاں اور نواز کی تصویریں دیکھ کر کہا۔

''اب واجد کے لیے کیا حکم ہے؟'' منیجر نے سرفراز صاحب سے پوچھا۔ جو نیلی جینز اور سرخ شرٹ میں ہیرو کے سے انداز میں چاکلیٹ کھا رہا تھا۔

''اس کو اس کے پرانے حلیے میں واپس لے

کرآؤ جو چیزیں اس کو دی گئی ہیں سب واپس لے لو۔'' آدھے گھنٹے میں گنجا سورج مکھی لڑکا پرانے سے شلوار قمیص اور دوپٹی کی ٹوٹی ہوئی چپل پہنے جب منیجر کے ساتھ آیا تو سرفراز صاحب ہنس کر بولے۔

''اسے تو دروازے کا واچ مین بھی نہیں پہچان پائے گا کہ یہ شخص کون ہے اور آفس میں کیسے گھس... آیا۔''

''ہاں واجد جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے جاؤ اور یہ بات تم خواب میں بھی مت سوچنا کہ تم ہیرو جیسے لگتے تھے۔ دوبارہ کراچی آنے کی کوشش مت کرنا اور یہ سب باتیں کسی ڈروانے خواب کی طرح بھول جانا ورنہ..... آوارہ کتوں کو مروانے پر انعام بھی مل جایا کرتا ہے اور ہم نے بہت سے آوارہ کتے مروائے بھی ہیں۔ اس لیے تمہیں اب صرف یہی بات یاد رکھنی ہے کہ تم واجد ہو۔'' منیجر نے اسے تھوڑی سی رقم دیتے ہوئے کہا۔ واجد سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا اور اس تیزی سے باہر بھاگا جیسے کوئی اس کی جان نہ لے لے اور سرفراز صاحب کے قہقہے چھت کو پھاڑنے لگے۔

''بھاگ گیا سالا..... بے وقوف کہیں کا۔''

☆☆☆

ساجدہ بیگم کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی تھی۔ ظہیر حسن اور ریحان ان کے پاس ہی تھے مگر انہیں یوں لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ جی نہیں پائیں گی۔ انہوں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میرے پیارے بیٹے تم مجھے معاف کر دینا، میں نے مینا جیسی لڑکی سے تمہاری منگنی کر کے تمہاری زندگی میں کانٹے بھرے اور نہاں جیسی فرشتہ صفت لڑکی اپنی برادری میں ہوتے ہوئے بھی مجھے نظر نہیں آئی۔''

''امی کون نہاں؟'' وہ حیرت سے ماں سے پوچھ رہا تھا۔

''ایک ایسی ہیرا لڑکی جو شاید تمہاری قسمت میں ہی نہیں تھی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کی منگنی ہو چکی تھی اور تمہاری بھی اور پھر معلوم ہوا کہ کسی نے اس کی منگنی تڑوادی۔''

''کس نے؟'' ریحان نے پوچھا۔

''یقیناً اس کی کوئی پھپھو ہوگی یا کوئی چچی یا تائی کہ وہی لوگ اس کے پیچھے بلاوجہ لگے ہوئے ہیں کہ ان کی اپنی بیٹیاں بیٹھی ہوئی جو ہیں۔'' ساجدہ بیگم نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تو اب کیا ہوا؟'' ریحان نے الجھ کر کہا کہ اسے سوائے نہاں کے نام سے کوئی دوسری دلچسپی ہرگز نہیں تھی۔

''تمہاری منگنی کے بعد جب میں ان کے ہاں گئی تو اس کا رشتہ دوبارہ طے ہو چکا تھا کہ واقعی وہ تمہاری قسمت میں ہی نہیں تھی۔''

''امی، لڑکیوں کا ایسا قحط تو نہیں پڑا ہے کہ آپ خوامخواہ اس بیچاری لڑکی کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔'' ریحان نے مسکرا کر کہا۔

''آپ کا بلڈ پریشر اس قدر لو ہو رہا ہے، اس وقت بھی آپ کو ریحان کی شادی کی باتیں کرنی ہیں یا اسپتال جا کر ڈرپ لگوانی ہے۔'' ظہیر حسن نے بیوی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی، گھر میں ہی رہوں گی اپنے بچے کے پاس۔'' انہوں نے ریحان کے ہاتھ تھام لیے۔

''پتا نہیں کیوں میرے بچے کی شادی میں دیر ہوئی جا رہی ہے۔ طبیعت ذرا سنبھلے تو سلطانہ خالہ کے پاس جا کر کہتی ہوں کہ کوئی اچھی سی لڑکی مجھے دکھائیں، اب اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے کہ میں چل دوں اور میرا بیٹا اکیلا رہ جائے۔ کوئی تو ہو جو اس کا خیال رکھے۔

اب بہو جلدی سے گھر آجانی چاہیے۔"

"ابو آپ ڈاکٹر آرزو کو فون کر کے کہیں کہ اپنے اسپتال کی نرس جلدی سے گھر بھیج دیں تاکہ امی کے آپ گھر میں ہی لگ سکے۔" تب ظہیر حسن اپنے موبائل کے نمبر تیزی سے پش کرنے لگے۔

☆☆☆

"اماں دیکھیے، یہ لڑکی ہے نہاں بے شرم، بے حیا سی جس کے گھر والوں کے کہنے پر ریحان کی منگنی ٹوٹی تھی۔" سرفراز صاحب نے نہاں کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے خراب سی لڑکی لگ رہی ہے۔" اماں نے تصویر کو دیکھ کر کراہیت سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... بہت خراب لڑکی ہے یہ۔ اس سے کوئی منگنی یا شادی تو کیا کوئی بات کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ خاندان تو کیا دور دراز کے لوگ اگر اپنی لڑکیوں کے پاس اس کو آتا دیکھیں گے تو دھکے دے کر بھگا دیں گے۔" سرفراز نے ہنس کر اپنی اماں کو بتایا۔

"کوئی کچھ بھی کرے یا نہ کرے ہمارا اس سے کیا تعلق؟" انہوں نے کہا۔

"ہمارا تعلق تو اس لڑکی سے بہت گہرا ہے۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولے۔

"وہ کیسے؟" اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

"صرف اس لڑکی وجہ سے مری مینا نے یہ دنیا چھوڑی ہے۔ اسی نے تو بے پر کی باتیں اڑائی تھیں۔"

"بیٹا پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہ تک کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہماری مینا کی زندگی ہی بس اتنی سی تھی تو اس میں اس کا کیا دوش؟" ماں نے بیٹے کو سمجھانے کی کی۔

سنسان سڑک پر کھڑی خوبصورت دوشیزہ نے ایک کار والے سے لفٹ لی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد لڑکی نے اچانک اس لڑکے سے سوال کیا۔

"کیا تم ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر سکتے ہو؟"

لڑکے نے پُرجوش آواز میں کہا۔ "ہاں ہاں....."

اس نے پھر یہی سوال کیا۔ "کیا واقعی تم ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر سکتے ہو؟"

لڑکے نے پھر خوشی سے جواب دیا۔ "ہاں ہاں، کیوں نہیں۔"

"تو پھر مہربانی کر کے دوسرے ہاتھ سے اپنی ناک صاف کرلو۔" لڑکی نے کہا۔

مرسلہ: روحی، طیبہ..... سیالکوٹ

"نہیں اماں، ظالم کو سزا تو ضرور ملنی چاہیے ورنہ لوگوں کو کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ ان سے غلطی کب اور کہاں پر ہوئی ہے۔"

"بیٹا اللہ تو سب دیکھتا ہے تم کس جھمیلے میں پڑ گئے۔" اماں اکتا کر ان کے کمرے سے ہی باہر نکل گئیں۔ تو وہ یہ تصویریں لے کر اپنے بیٹوں کے پاس چلے آئے۔

"شاہد بیٹا دیکھو، بیٹا یہ تصویریں کیسی ہیں؟" انہوں نے تمسخر سے کہا۔

"پاپا کیا آپ اب بھی ایسی تصویریں دیکھا کرتے ہیں۔" ان کے بڑے بیٹے دانش نے ہنس کر پوچھا۔

"تم یہ بتاؤ کہ یہ تصویریں کیسی ہیں؟" انہوں نے نہاں کا البم ان کے سامنے رکھ دیا۔

"یقیناً کسی طوائف کی ہوں گی۔" شاہد کھل کر ہنسا۔

"نہیں بیٹا، یہ ایک شریف زادی کی تصویریں ہیں۔" وہ سنجیدہ سے ہو گئے۔

"شریف زادیاں اب اس انداز میں تصویریں

بنوانے لگی ہیں۔'' دانش نے البم اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''یہ ہمارے دشمن کی تصویریں ہیں۔'' وہ غصے سے بولے۔

''تو پھر آپ کے پاس کیا کر رہی ہیں یہ؟''

''ان کو کسی گٹر میں ڈال دیجیے ناں۔'' دونوں بیٹے یکجا آواز میں بولے۔

''ہاں بیٹا انہیں گٹر میں ڈالنے سے پہلے تمہیں دکھانا چاہتا تھا کہ زندگی میں کبھی یہ چہرہ نظر آجائے تو تھوک کر آگے بڑھ جانا، رکنا نہیں۔''

''پاپا رکنے کے لیے ہمارے پاس ٹارگٹ کم ہیں کیا جو دشمن کے پاس ہم کبھی جانے کا بھی سوچیں گے'' شاہد نے مسکرا کر دانش کی جانب دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دبائی مگر سرفراز احمد تو وہ البم ہاتھ میں لیے یوں روانہ ہوگئے جیسے کوئی خزانہ لے کر کہیں جا رہے ہوں۔

☆☆☆

''بھیا ہم نے جو آپ سے کہا تھا وہ غلط نہیں کہا تھا۔ آپ نے غیر کے خون کو لے کر پالا تو کر دیا ناں اپنا نقصان۔'' فون پر ان کے چھوٹے بھائی غصے سے باتیں سنا رہے تھے۔

''شہباز تم نے ہمیشہ ہی اُلٹی ہانکی ہے کبھی تو سیدھی بات کر لیا کرو۔'' ریاض صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''حیرت ہے بھیا، نہاں نے آپ کی ناک کاٹ دی ہے اور آپ کو پھر بھی کوئی افسوس نہیں ہے۔''

''میری بیٹی کیسی ہے اس کو مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا...... اس لیے آئندہ کوئی ایسی ویسی بات کرنے سے پہلے تم سوچ لیا کرنا، یہ نہ ہو کہ میں تمہیں کچھ کہہ دوں اور تم ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔ رشتے داری کو توڑنا اگر گناہ نہ ہوتا تو میں کب کا اپنے خاندان کو چھوڑ چکا ہوتا۔'' ریاض صاحب غصے میں اپنے بھائی کو ڈانٹنے لگے تو شہباز نے فون ہی کاٹ دیا۔

ریاض صاحب اسٹیشن جا رہے تھے، شہباز کا فون آجانے سے ان کا موڈ آف ہوگیا تھا۔ نسرین بیگم پھل کاٹ کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

''لیجیے کچھ کھا لیجیے اور گھر پر آرام کریں۔ ٹکٹ کل جا کر لے لیجیے گا فون پر بکنگ تو آپ نے کروا ہی دی ہے ناں۔'' انہیں شہباز کے فون کا علم نہیں تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''آج بینک جا کر کچھ پیسے نکال لاتا ہوں اگر تم نے اور نہاں نے کچھ شاپنگ کرنی ہوئی تو تم لوگوں کے کام آجائیں گے۔'' سیب کے ایک دو ٹکڑے کھا کر ریاض صاحب باہر نکل گئے اور نسرین بیگم بڑا بیگ لاؤنج میں رکھ کر سوچنے لگیں۔

''اس میں پہلے وہ تمام ضروری چیزیں رکھ لی جائیں جو سفر میں یا کسی بھی اجنبی شہر میں جا کر لازمی ضرورت بن سکتی ہیں۔'' دروازے پر بیل ہوئی تو وہ سمجھیں کہ ریاض صاحب یقیناً اپنی کوئی چیز گھر پر ہی بھول گئے ہیں جو دوبارہ لوٹ آئے ہیں۔ وہ دروازے پر آئیں تو ڈاکیا کھڑا تھا۔

''ریاض احمد کا گھر یہی ہے ناں؟'' اس نے تصدیق کی کہ پہلی مرتبہ ان کے ہاں ڈاک آئی تھی۔

''ان کے نام رجسٹری آئی ہے۔'' اس نے بھاری لفافہ انہیں دیتے ہوئے کہا۔

''کہاں سے آئی ہے؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''آئی تو کراچی سے ہی ہے مگر بھیجنے والے کا نام نہیں لکھا ہے۔'' نسرین بیگم نے دستخط کر کے لفافہ وصول کر لیا۔

''یہ لفافہ کہاں سے آیا ہے؟'' انہیں حیرت سی ہو رہی تھی کہ کبھی کسی کا خط تک نہیں آیا تھا۔ سارے رشتے دار اسی شہر میں تھے۔

''کہیں آفس سے نہ آیا ہو۔'' یکبارگی انہوں نے سوچا اور پھر غیر ارادی طور پر وہ لفافہ انہوں نے کھول لیا۔ اس میں کوئی خط، کوئی کاغذ کچھ بھی نہیں تھا بس ایک البم رکھی ہوئی تھی۔

''یقیناً ڈاکیا کسی دوسرے کی البم ہمارے گھر دے گیا ہے۔'' وہ یہ سوچ کر مسکرائیں۔ ''دیکھوں تو سہی یہ کس کی البم ہے۔ محلے میں کسی کی ہوئی تو جا کر دے تو دوں گی۔'' انہوں نے البم کھولی اور یوں لگا جیسے آسمان سر پر آگرا ہو...... یکبارگی وہ کانپ سی گئیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے نہاں کا چہرہ لگا کر عریاں تصویریں بنائی تھیں۔ ہر تصویر میں نہاں تھی مگر اس کے ساتھ مختلف لڑکا۔

''نہاں تو کہہ رہی تھی کہ نواز نے اس کے ساتھ دست درازی کی تھی مگر کسی بھی تصویر میں نواز تو نہیں تھا۔ تو کیا نہاں کو کسی پلان کے تحت ہوٹل لے جایا گیا۔'' انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

''تو کیا نواز بھی وہ نہیں جو نظر آرہا تھا۔ تو پھر ریاض کی نوکری بھی اسی سازش کا حصہ تھی۔ نہیں، نہیں...... یہ سب نہیں ہوسکتا۔ میری پھول سی بچی پر یہ ظلم کوئی نہیں کرسکتا، دشمن بھی نہیں۔ اولاد والے تو عزت اور ذلت کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ ایسی حرکت کوئی مسلمان تو ہرگز نہیں کرسکتا تھا۔'' انہوں نے البم کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی دہکتی ہوئی آگ ہو۔ کتنی دیر وہ یوں گم صم سی بیٹھی ہیں۔ ریاض صاحب بینک سے ہو کر کب آگئے انہیں پتا بھی نہیں چلا۔

''اتنا بڑا بینک ہے مگر کام صفر درجے کا...... منیجر کہہ رہا ہے کہ آپ کی اس ماہ کی سیلری تو کیا گزشتہ ماہ کی بھی نہیں آئی ہے۔ اب میں پہلے آفس جا کر معلوم کرتا ہوں کہ وہاں کسی سسٹم میں تو کوئی خرابی نہیں ہوگئی۔''

''آپ کو کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' نسرین بیگم نے بہ مشکل گلوگیر سے لہجے میں کہا۔

''کیا ہوا...... بات کیا ہے؟ یہ تم اتنی پیلی سی کیوں لگ رہی ہو۔ ارے تمہارے تو ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' ریاض احمد نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

''نسرین بتاؤ تو سہی کیا بات ہے۔''

''ہمارے دشمن نے بہت کاری وار کیا ہے۔''

''کیسا وار...... میں ابھی نواز کو فون کرتا ہوں۔'' وہ نسرین کو روتا چھوڑ کر نواز کو نمبر ملانے لگے۔

''پتا نہیں اس کا فون اس وقت بند کیوں ہے۔ خیر تھوڑی دیر بعد میں اسے پھر فون کروں گا کہ ہمارا دشمن کہیں گیا نہیں ہے موجود ہے...... مگر بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟ نواز پوچھے گا تو میں اسے کیا بتاؤں گا۔'' ریاض صاحب بیوی کو یوں سسکتا دیکھ کر پوچھ رہے تھے۔ نسرین بیگم نے اس سرخ البم کی طرف انگلی سے یوں اشارہ کیا جیسے وہ کسی بھوت پریت کو دیکھ رہی ہوں۔

''یہ کس کی البم ہے اور یہاں کس نے بھیجی ہے؟'' ریاض صاحب سرعت سے بڑھے اور پھر چکرا کر ایسے گرے کہ میز کا کونا ان کی پیشانی پر لگا اور ان کا خون پورے چہرے پر یوں پھیل گیا جیسے...... اس نے ان کی شکل چھپا دی ہو۔ کیسے وہ دونوں اٹھے اور اس البم کو لے جا کر اپنے کمرے میں چھپایا یہ وہ خود ہی جانتے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دے رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔

''نسرین تم فکر مت کرو، میں جب نواز کو بتاؤں گا تو وہ میری بات کا پورا یقین کر لے گا۔ وہ ان

تصویروں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ یہ بات جانتا ہے کہ عرصے سے ہمارا کوئی دشمن ہمیں تکلیفیں پہنچا رہا ہے مگر اس مرتبہ تو اس نے حد ہی کر دی ہے۔ ہماری جان ہی نکال کر رکھ دی ہے۔"

"یہ نواز بھی اسی دشمن کی ایک کڑی تھا۔" وہ بے حد مشکل سے ریاض صاحب کو بتا پائیں اور پھر وہ انہیں ہر بات بتاتی چلی گئیں اور ریاض صاحب کھڑے قد سے نیچے گر پڑے۔

☆☆☆

نہاں کالج سے آئی تو آتے ہی بولی۔

"امی ہمارے گھر میں کمپیوٹر نہیں ہے اور نہ ہی انٹرنیٹ کی سہولت۔ آپ ابو سے کہیے ناں کہ کوئی سستا سا لیپ ٹاپ ہی لے لیں۔"

"ہوں۔" نسرین بیگم بہ مشکل بولیں۔

"آج میرے کالج کی کئی لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ یوٹیوب پر کسی لڑکی کی تصویریں ہیں۔ اس کی نہ صرف مجھ سے شکل ملتی ہے بلکہ اس کا نام بھی نہاں احمد ہے۔ ہے ناں امی عجیب وغریب بات وہ لڑکی میری ہم شکل ہے بلکہ کئی لڑکیاں تو میرا کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہی تھیں اگر میں عبایا نہ پہنا کرتی تو ان کو یہ یقین آجاتا کہ وہ تصویریں میری ہی ہیں۔" اور نسرین بیگم کو یہ معلوم ہوگیا کہ تصاویر کا سلسلہ صرف گھر بھیجنے تک ہی نہیں بلکہ اسے انٹرنیٹ تک دے دیا گیا ہے۔

☆☆☆

پھر ایک طوفان سا آگیا۔ ہر رشتے دار کے گھر میں، ہر دوست کے گھر میں، محلے کے ہر مکان میں، قریبی فلیٹوں کے ہر فلیٹ میں حد تو یہ تھی کہ نہاں کے کالج میں اس کی پرنسپل کو نہاں کی عریاں تصاویر بھیج کر کہا گیا تھا۔

"آپ کے کالج میں ایسی لڑکی پڑھتی ہے اگر آپ نے اسے کالج سے نہیں نکالا تو والدین اپنی بچیاں گھر بٹھالیں گے۔" مطلوبہ کالج کی پرنسپل پریشان سی جب ریاض صاحب کے گھر پہنچیں تو ان کے ہاں خود ہی صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔

"نہاں تو بہت شریف لڑکی تھی اس کا ریکارڈ بہترین تھا مگر ہماری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔ پلیز ہم بے حد مجبور ہیں، آپ کی نہاں کو کالج میں آنے کی اجازت دے نہیں سکتے۔" پرنسپل نیچی نظریں کیے کہہ رہی تھیں مگر نسرین بیگم کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں تو بس اب یہ پتا تھا کہ ان کی نہاں اب عریاں کہلائی جارہی ہے اور اللہ نہ کرے یہ وقت کسی بھی بیٹی پر آئے...... مگر یہ سب ان ہی کے ساتھ ہوا تھا جنہوں نے کبھی بھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا ہر پل ایمانداری کے ساتھ بسر کیا تھا۔ حرام کی کمائی کا کبھی کوئی لقمہ بھی ان کے گھر میں نہیں آیا تھا۔ جنہوں نے حیا کو اپنا شعار بنایا تھا۔ نسرین بیگم خود بھی پردہ کرتی تھیں اور ان کی بیٹی بھی باپردہ تھی اور آج گھر گھر اس کی عریاں تصویریں لوگوں کو مل رہی تھیں اور دیکھنے والے کراہیت سے دیکھنے کے بعد بھی کہہ رہے تھے۔

"اُف اس قدر پردے داری میں یہ کرتوت ہیں اگر کہیں ماڈ ہوتیں تو پتا نہیں کیا قیامت ڈھاتیں۔" نسرین بیگم اور ریاض صاحب یہ ظلم سہہ کر بھی یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا دشمن کون ہے جس نے انہیں آسمان سے زمین پر پٹخ دیا ہے۔ جس نے منہ سے لقمہ تو چھینا ہی تھا مگر کپڑے بھی تار تار کر دیے تھے۔ تب ان دونوں نے وضو کر کے نماز پڑھی اور روتے ہوئے بددعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یا رب العالمین جس نے ہمیں ناحق بے عزت کیا ہے تو بھی اسے ایسی کڑی سزا دے کہ سب دیکھیں۔"

(آخری قسط آئندہ ماہ پڑھیں)

دوسرا آپشن

نوشین ناز اختر

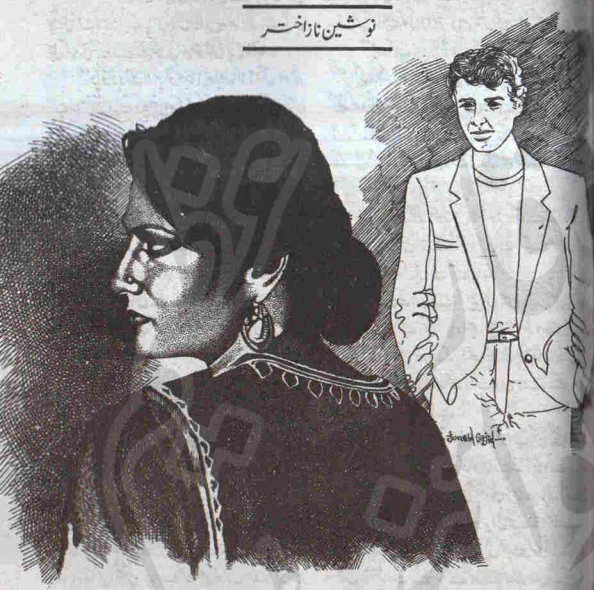

"ثروت یہ تم نے خبر کا فریم بنایا ہے یا پھر مقبرہ؟ اتنی سادگی سے لکھو گی تو تمہاری خبر کو کون پڑھے گا؟ یہ مری ہوئی خبر ہے......!" افتخار عرف افی نے ثروت کو سخت سست سنائی تھیں۔

"سر، میں اس خبر میں کیا مسالا ڈالوں؟ عام سی خبر ہے، لڑکا اپنی بے پروائی سے ایکسیڈنٹ میں مر گیا۔ اب میں اس میں کیا لکھوں کہ وہ ایکٹریس میرا کا دیوانہ پروانہ تھا؟ میرا کا وہاں سے گزر ہونا تھا

اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس نے اتنی تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلائی کہ وہ میرا کے پاس نہیں بلکہ سیدھا اللہ کے پاس چلا گیا۔'' ثروت نے طنزیہ انداز میں پوچھا تھا۔

''واہ ثروت! تم تو اتنا اچھا مسالا ڈالتی ہو خبر میں...... تو پھر بنتی کیوں ہو کہ تم کو خبر میں میر ینشن نہیں کرنی آتی ہے'' سرانی نے پورے زور سے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''سر پلیز یہ سراسر زیادتی ہے عوام کے ساتھ۔ ہم لوگوں نے خبروں میں مسالا ڈال ڈال کر اپنے ہی لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کو نفسیاتی ٹارچر دینے کو عادت بنالیا ہے۔ یہ سر ہمارے پروفیشن کے ساتھ بے ایمانی ہے۔'' ثروت نے نیا نیا یہ اخبار جوائن کیا تھا اس لیے تصویر کا یہ دوسرا رخ اس سے ہضم کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔

''ڈیئر جرنلسٹ......! ہمارا پروفیشن تو یہی ہے کہ خبر کو بیچا جائے تو پھر کیوں تم اتنی ہائپر ہو رہی ہو؟'' سرانی نے سکون سے اپنی ناک سے مکھی اڑائی تھی۔ دراصل انہوں نے مکھی نہیں بلکہ ثروت کی بات اڑائی تھی۔ ثروت کو غصہ ضبط کرتے کرتے رونا آ گیا لیکن وہ سرافتخار کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

''سر ہمارا پروفیشن یہ نہیں ہے کہ خبر کو بیچا جائے بلکہ ہمارا پروفیشن یہ ہے کہ ہم لوگوں تک سچی خبر پہنچائیں۔'' ثروت نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو ہم سچی خبریں ہی دیتے ہیں۔ ہم اور کیا کرتے ہیں۔'' سرافتخار کی بے نیازی انتہا پر تھی۔

''سر! آپ ایک سیدھی سادی بات کا اتنا بناؤ سنگھار کر ڈالتے ہیں کہ وہ اتنے زیادہ میک اپ میں اپنا اصل مطلب بدل چکی ہوتی ہے۔ تو ایسے میں کون سی سچی خبر؟ کیسی ایمانداری؟'' ثروت نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ شدتِ جذبات سے اس کی اپنی ہی زبان اور لفظ موٹے پڑتے جا رہے تھے۔

''مس ثروت آپ بہت جذباتی ہیں۔'' سرانی نے یوں کہا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض کی تشخیص کرتا ہے۔

''اور آپ......؟ آپ جذبات سے کھیلنے والے کسی بھی جذبے سے عاری انسان ہیں۔'' ثروت اتنا کہہ کر وہاں رکی نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔

جبکہ سرافتخار نے یوں کندھے اچکائے تھے جیسے ان کے لیے ثروت اور اس کی بات کی رتی بھر اہمیت نہ ہو۔

☆☆☆

''سرانی کتنے کٹھور ہیں نا؟ یوں لگتا ہے کہ وہ کسی سے بھی پیار نہیں کر سکتے۔'' مائرہ نے ایک دم کمپیوٹر سے نظریں اٹھا کر ثروت سے کہا۔

''خیریت آج اپنے آئیڈیل مین کے متعلق اتنی نیگیٹو باتیں کیسے کی جا رہی ہیں؟'' ثروت نے ٹرانسپرنسی اٹھا کر بورڈ کے ساتھ لگاتے پوچھا۔

''اپنی رجا کے ساتھ رات دن رہنے کے بعد اسے لال سگنل دکھا دیا ہے۔''

''جب لڑکی سرخ جوڑے کا خواب بُن لیتی ہے تو یہ بندہ فوراً سرخ سگنل دکھا دیتا ہے۔'' ثروت نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''میری اس مختصر سی ڈیڑھ سالہ نوکری میں یہ کوئی چوتھی لڑکی ہے جس کو سرانی نے چھوڑا ہے۔ اللہ جانے یہ شخص بھی کسی سے سچی محبت کر سکتا ہے یا نہیں۔'' ثروت نے سڑے ہوئے لہجے میں یہ آواز بلند کہا۔

''اللہ تو جانتا ہے آپ بھی جان لو کہ سرانی صرف اور صرف اپنی ماں سے پیار کرتا ہے۔ باقی دنیا میں لوگ جو رشتے بناتے ہیں وہ سب ٹائم پاس ہوتے ہیں۔ میرے لیے بھی سارے رشتے ٹائم پاس ہیں۔ آپ کو کوئی پرابلم؟'' سرافتخار جو کہ جانے کب دروازے میں آ کھڑے ہوئے تھے اور ان کی باتیں سن رہے تھے۔ بہت سکون سے ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ ایسے میں ثروت اور مائرہ ادھر اُدھر جانے کیا تلاش کرنے لگی تھیں۔ شاید چھپنے کے لیے کوئی جگہ۔

☆☆☆

''محترم اور عزیز سہیلی! کتنی بار کہا ہے آپ کھانا کھا لیا کرو میرے تو ڈیوٹی آور ہی ایسے ہیں، میں وقت پر گھر نہیں آ سکتا۔'' افتخار نے ماں کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''میں تیری ماں ہوں، بیوی نہیں جو تیرے بغیر کھانا کھا لوں۔ بیویوں کو چاؤ ہوتا ہے شروع کے سالوں میں انتظار کر کر کے کھانا کھانے کا۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ چاؤ کم پڑتے پڑتے ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ ماں کا پیار ڈھلتے داریوں میں بھی کبھی دھندلا نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ انتظار کرتی ہے اپنی اولاد کا۔'' امی نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''او کے مان لیا سہیلی، چلیں کھانا کھائیں۔'' افتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں نے بریانی بنا رکھی ہے پھر تو لیٹ تھا تو میں نے پائے بھی پریشر ککر میں چڑھا دیے۔ بس پانچ دس منٹ لگیں گے۔'' افتخار کی امی یہ کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

ابھی ان کو کچن میں گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کچن سے بہت زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ افتخار بدحواس ہو کر کچن کی طرف بھاگے تھے پریشر ککر پھٹ چکا تھا اور افتخار کی امی کچن میں بے ہوش پڑی تھیں۔

''امی......!'' افتخار کی چیخ بے اختیار تھی۔ وہ گھر کو لاک کیے بغیر ماں کو اسپتال لے کر بھاگے تھے۔

☆☆☆

''امی پلیز حوصلہ پکڑیں، اس واقعے کو چار ماہ ہونے کو آئے، آپ کو اللہ نے نئی زندگی دی ہے، صحت مل گئی ہے آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ آپ آخر کب تک اس خوف میں بیٹھی رہیں گی۔'' ارم نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ پریشر ککر پھٹنے سے ان کی کمر پر گرم گرم پانی پڑا تھا جس سے ان کی کمر بری طرح جھلس گئی تھی۔ مسلسل علاج کروانے سے ان کو آرام تو آ گیا لیکن ان کے اندر جو خوف بس گیا تھا ابھی اس کا علاج باقی تھا۔

ارم کینیڈا سے ماں کے پاس آئی تو ان کو کچن میں جاتے ڈرتے دیکھا۔ برنر کو جلاتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپتے تھے۔ وہ ہر وقت ایک خوف میں مبتلا رہتی تھیں۔ ارم سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماں کو سمجھایا کہ زندگی میں کوئی تکلیف آ جائے تو ہمیشہ اسی تکلیف کے زیرِ اثر زندگی گزارنے والا ناامید اور مایوس انسان ہوتا ہے اور مایوسی اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔ ارم کی بات بے شک والدہ کے دل کو لگی تھی لیکن ان کا دل اب بھی اس دھماکے کی آواز اور کھولتے ہوئے پانی اور تکلیف میں اٹکا ہوا تھا۔

''میں کوشش کروں گی ارم کہ میں یوں ہر وقت پریشان نہ رہوں۔'' بیٹی کے بار بار کہنے پر بالآخر انہوں نے بیٹی سے وعدہ کر لیا تھا۔

''اور ہاں امی آپ نے بہت اکیلے رہ کر زندگی گزار لی۔ اب اپنا کوئی اسسٹنٹ ہی لے آئیں اور افتخار کی شادی کر دیں۔ آخر کب تک انتظار کریں گی کہ افتخار کو کوئی لڑکی پسند آ جائے۔ آپ بس اپنی مرضی کریں۔'' ارم نے ماں کو دوسری راہ بھی دکھائی تھی۔

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ اب واقعی افتخار کی شادی ہو جانی چاہیے۔'' پہلی بار اُن کے لہجے میں اس معاملے کے بارے میں سنجیدگی آئی تھی۔

☆☆☆

افتخار کے اخبار نے مزید ترقی یہ کی تھی کہ انہوں نے ایک نیوز چینل بھی خرید لیا تھا۔ پرانا سارا عملہ الیکٹرنک میڈیا میں چلا گیا تھا۔ چونکہ مالک افتخار سے

بہت خوش تھے۔ اس لیے اس کے چیف ایڈیٹر نے نیوز چینل کی تقریباً پوری ذمے داری دے دی تھی اور افتخار بہت خوش تھے اور روز ہر قسم کی خبر کو خوب مسالے دار بنا کر بولٹن کے لیے پاس کرتے تھے۔

''یار کبھی روز سے کوئی بلاسٹ ہی نہیں ہوا؟ کب تک شعیب اور ثانیہ مرزا کی پٹی چلے گی؟ کچھ مزہ نہیں آرہا۔ اپنے چینل کی تو ریڈ پٹی ہی سوتی ہوگئی ہے۔'' افتخار کہہ رہے تھے اور ثروت نہایت دکھ سے اس خوب صورت انسان کا بدصورت دل محسوس کررہی تھی۔ روز کئی پھٹی اور مسخ شدہ لاشوں کی لائیو کوریج ہوتے دیکھنا کتنا اذیت ناک عمل تھا اور سرافتخار چسکے لے کر باتیں کررہے تھے۔

''سر آپ کا کیا خیال ہے بلاسٹ کیوں نہیں ہورہے؟ کیا حکومت نے اپنی ذمے داری کو محسوس کرلیا ہے؟'' اقبال نے افتخار سے پوچھا۔

''نہیں یار..... ایسا کے اس لیے نہیں ہورہے کہ کوئی اسپیشل سیکیورٹی سسٹم رائج کردیا گیا ہے بلکہ یہ اس لیے نہیں ہورہے کیونکہ دہشت گرد ابھی بلاسٹ کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ ابھی فوراً بلاسٹ ان کے منصوبے میں نہیں ہے۔ اس لیے ویٹ کہ کب ان کا موڈ بنتا ہے اور کب ہمارے نیوز چینل کی روٹی بنتی ہے۔'' سرانی نے مزے سے چائے کے سپ لیتے ہوئے کہا۔ جبکہ ثروت نے غصے سے سر جھکا لیا اگر اہم میٹنگ نہ ہوتی تو وہ کب کی وہاں سے بھاگ چکی ہوتی۔ اسے سرانی کی بے رحمی پر بہت زیادہ غصہ آتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کو اپنے دل سے بہت قریب دیکھتی تھی اور جب جب وہ اس کے تصور سے ہٹ کر کوئی بات کرتے تھے تو وہ بہت زیادہ دکھی ہوجاتی تھی۔

☆☆☆

''ابھی ابھی پنجاب میں دو گاڑیاں بارود سے بھری داخل ہوئی ہیں، یہ خبر فوراً ریڈ پٹی پر چلاؤ اور پھر بعد میں نیلی پٹی پر لے آنا۔'' سرافتخار نے خبر لاکر ثروت کو دی۔

''سر آپ کا سورس آف نیوز اتنا تیز ہے تو آپ کو پتا بھی ہوگا کہ گاڑیاں کہاں ہیں۔ آپ پولیس کو خبر کردیں تاکہ کوئی جانی نقصان نہ ہو۔'' ثروت نے بے حد دل سے مشورہ دیا۔

''اوئے ہیلو.....! یہ نیوز چینل ہے یہاں خبر بنائی جاتی ہے بگاڑی جاتی ہے لیکن سلوشن نہیں نکالے جاتے اگر ہم سلوشن نکالنے لگیں گے تو پھر تو سب اچھا ہوجائے گا اور سب اچھا ہوجائے گا تو پریشان قوم نیوز چینل کیسے دیکھے گی اور نہیں دیکھے گی تو ہمارا چینل کیسے چلے گا چینل نہیں چلے گا تو ہمارے گھر کا چولھا کیسے جلے گا۔ اس لیے تم ہر وقت سوشل سروس نہ کیا کرو۔'' سرافتخار نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سر پلیز! اس طرح کی خبریں لوگوں میں خوف ہراس پھیلاتی ہیں۔ اب پنجاب میں گاڑیاں داخل ہوگئی ہیں۔ جو بھی سنے گا خوف زدہ ہوجائے گا۔'' ثروت بھی بولنے سے باز نہیں آئی۔ ''مجھے کل ایک آنٹی ملیں ان کو ایسی نیوز سن کر ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہوگئی ہے۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوں گے سر..... ہمیں انسانیت کے ناتے ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' ثروت نے تحمل سے ان کو سمجھایا۔

''مس ثروت، آپ جا کر ایدھی فاؤنڈیشن میں کام شروع کریں، آپ کا بھلا نیوز چینل میں کیا کام؟'' سرانی نے میز پر پڑے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے کہا۔

جواباً نیوز روم میں مختلف کونوں سے ہنسی کی آوازیں برآمد ہوئی تھیں۔

''مس ثروت، نیوز ہو یا پھر مچھلی مرغی جب تک اسے مسالا نہ لگا ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا اور ہم سیلز اور بی گڈ سیلز..... ورنہ تو ٹلیا ضرور ڈوبے گی۔''

نہیں تھی پھر بھی اس کا یہ دل ایسے ہی شخص پر کیوں ہمکتا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

''اچھا تم دل نہ چھوٹا کرو۔ میں بھی تو اس انکوائری کی زد میں ہوں۔ یہ کون سی بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح کی روٹین وضاحتی انکوائریز تو ہر سسٹم کا حصہ ہوتی ہیں۔'' قاسم نے اپنی طرف سے اس کی خاصی ڈھارس بندھائی تھی جبکہ ثروت نے بے اختیار گہری ٹھنڈی سانس بھری تھی جس میں بے بسی کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔

☆☆☆

''سر، میں نے لکھ تو دیا ہے کہ وہ ایک کریکر تھا۔ بم نہیں تھا تو پھر میں کیسے..... یہ خبر بم دھماکا بنا کر چلوا دیتی۔ اس طرح لوگوں میں دہشت پھیلتی ہے سر۔''

''تو.....؟ دہشت پھیلتی ہے تو لوگ ٹی وی کھول کر نیوز چینل دیکھتے ہیں ناں! ورنہ تمہیں اگر یاد ہو کہ نیوز چینل کے اتنے اہم مقام کا تصور بھی نہیں تھا۔ لوگ نو بجے کی خبریں بھی لگے بندھے انداز میں دیکھتے تھے لیکن اب دور بدل گیا کیونکہ اب خبر میں وہ مسالا ہوتا ہے، وہ سنسنی ہوتی ہے جو دیور کو پیش کرتی ہے کہ نیوز چینل کو کھول کر دیکھیں، ایسے دیکھیں جیسے وہ کوئی فل آف تھرل فلم دیکھ رہے ہوں۔ کوئی کلیمرس ڈراما دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ ہم سنسنی پیدا کرتے ہیں اس لیے ویورز چینل کھول کر بیٹھتے ہیں۔''

''سر یہ سنسنی نہیں ہے، دہشت ہے جو ہم پھیلاتے ہیں اور میں فیک خبریں نہیں پھیلاؤں گی۔'' ثروت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ویری فنی، آپ یہاں ملازم ہیں۔ آپ کا جو کام ہے آپ نہ صرف اس کو کرنے سے انکار کررہی ہیں بلکہ باقاعدہ حکم دے رہی ہیں کہ یہ کروں گی وہ نہیں کروں گی۔ واہ.....'' سرانی نے تالی مار کر کہا۔

''آئی لائیک یور کانفیڈنس لیکن میڈم اچھا ہوتا افتخار کہہ کر اگلے کیبن میں داخل ہوگئے تھے۔

''کیا ہمارا سسٹم بدل سکتا ہے؟ کیا یہ شخص بدل سکتا ہے؟'' ثروت نے بے اختیار خود سے سوال کیے تھے لیکن اس کے اندر سے آواز گھوم پھر کر خالی ہاتھ لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

''سر بلاسٹ ہوا ہے۔'' قاسم تیزی سے کیبن میں داخل ہوا۔

''کب! کتنے بجے؟'' سرافتخار نے جلدی سے نیوز روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی ہوا ہے سر۔'' قاسم نے بے حد ذمے داری سے جواب دیا۔

''آنے سے پہلے تم نیوز روم میں خبر کو شفٹ کرائے تھے ناں؟'' سرافتخار نے پوچھا۔

''نو سر، پہلے آپ کو بتانا لازم تھا۔'' قاسم نے کہا۔

''ایڈیٹ..... تمہیں معلوم ہے کہ خبر جا ہے تھرتھلی سنسنی ہی کیوں نہ لیٹ ہو، کتنا بڑا نقصان ہے۔ اس سچویشن میں تو سب سے پہلے خبر لگانے پر ہی نمبر ملتے ہیں۔'' سرافتخار نے غصے سے قاسم کو گھورتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے نیوز روم میں داخل ہوگئے تھے۔ باتیں کرکے وہ مزید اس خبر کو ڈیلے نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے وہ ڈائٹ کو کسی اور موقع پر شفٹ کرکے کام میں مصروف ہوچکے تھے۔

☆☆☆

''مس ثروت آپ کی انکوائری ہے، کیا آپ نے وضاحتی پیپر سر کے روم میں بھیج دیے؟'' قاسم نے آکر ثروت کو چونکا دیا۔ جو نہ جانے کہاں گم تھی۔

''قاسم، سر افتخار آخر ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' ثروت نے نہایت دکھ سے کہا۔ جس شخص کو وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی اس کی کوئی ایک عادت بھی اسے پسند

کہ آپ یہ کانفیڈنس اپنے کام کے لیے استعمال کرتیں۔ وہ آپ نے کرنا نہیں ہے اور ہمیں اپنے چینل میں نصیحت کرنے کی سیٹ نہیں رکھنی ورنہ تو ہمارا بیڑا غرق ضرور ہوگا۔ سوری! مجھے یہ سوری کہتے بہت تکلیف ہو رہی ہے، آپ مزید ہمارے ساتھ نہیں چل سکیں گی۔'' سرافی نے ایک اور دھما کا کیا تھا۔ ثروت نے بے حد شاک سے سرافی کو دیکھا پھر ایک دم ہی گہری سانس بھر کر اپنے آنسو ضبط کیے تھے۔

غیر کا دیا دکھ ہو یا خوشی وہ عام سا لگتا ہے لیکن جن لوگوں کو جانے انجانے میں ہم اپنے دل کے قریب مقام دیتے ہیں ان کی کوئی عام سی بات بھی عام نہیں رہتی۔ اس لیے ایسے رشتوں سے ملا دکھ دل کی دھڑکنوں تک کو رُلا دیتا ہے۔ خون تک آنسوؤں میں بدل جاتا ہے۔ ثروت کے دکھ کا مقام تو یہ بھی تھا کہ وہ ظالم اپنے دوہرے ظلم سے بے خبر تھا۔

''اوکے سر!'' ثروت بے حد ضبط کر کے اٹھی تھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کی ناب گھمانے سے پہلے وہ واپس مڑی سر افتخار اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ثروت نے لب بے اختیار کاٹے تھے۔

''سر......! جانتی ہوں جو میں کہوں گی وہ آپ کے دل تک نہیں پہنچے گا لیکن کیا کروں آپ کو جلتی بھڑکتی آگ کی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مجبور ہوں ناں......'' ثروت کی بات پر افی نے بے اختیار اسے بغور دیکھا۔ وہ کیا کہنے جا رہی تھی؟

ثروت نے چہرے پر بننے والی آنسوؤں کی لکیریں بے رحمی سے صاف کیں۔ جب بولی تو آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔

''بہت سال پہلے میں نے سورۂ نحل کی تفسیر پڑھی تھی جس میں ایک آیت تھی کہ اگر ہم کچھ اچھا کرتے ہیں تو اس کے سائڈ افیکٹ میں کوئی اچھائی کرتا ہے تو اس کے اس عمل کا کچھ کنٹری بیوشن ہمارے اکاؤنٹ میں ڈپازٹ ہوتا ہے اور ہم اگر کچھ ایسا برا کرتے ہیں کہ کوئی ہم سے انسپائر ہوتا ہے یا پھر امفیکٹ ہوتا ہے تو اس کا بھی کچھ حصہ ہمارے ہی اکاؤنٹ میں ہمیشہ ڈپازٹ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یہاں نہیں رکتا ہے جو جو امفیکٹڈ ہوگا سب کا حصہ جائے گا اکاؤنٹ میں۔ دنیا میں پہلے قتل میں ہابیل قابیل کی کہانی میں پہلے قاتل کے اکاؤنٹ میں سب قاتلوں کے اعمال کا حصہ اس کے حصے میں جمع ہو رہا ہے۔''

ثروت جلدی جلدی بول رہی تھی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ سر افتخار کے ماتھے پر بل بہت واضح ہو گئے تھے۔

''آپ جانتی ہیں آپ کی یہ نصیحت کرنے کی عادت اور اس طرح کی نصیحت بھری تقاریر ہی آپ کی جاب چھٹنے کا سبب ہے۔'' ثروت نے بے اختیار گہری سانس بھری تھی۔

''بند دروازوں سے دستک واپس مڑ آتی ہے۔'' سر افتخار کے دل کے دروازے بھی بند تھے۔ ''کاش آپ کو میری بات سمجھ آ جاتی۔'' ثروت نے بے حد دکھ سے دل ہی دل میں کہا اور ایسی نظروں سے سر افتخار کو جاتے جاتے دیکھا کہ سر افتخار جیسے سخت دل انسان بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ثروت چلی گئی تھی۔

آئندہ کئی دنوں تک سر افتخار کام کی بے حد مصروفیت میں بھی وہ آنسوؤں بھری آنکھیں بھلا نہیں پائے تھے۔ ایسے میں وہ بے اختیار سر اور کندھے بار بار جھٹکتے تھے۔

☆☆☆

''ثروت جب سے تمہاری جاب ختم ہوئی ہے تمہاری نیند نہیں ختم ہو رہی ہے۔'' ممی نے ثروت کے منہ سے رضائی کھینچی۔

''ممی سونے دیں ناں......'' ثروت نے دوبارہ لحاف میں منہ چھپایا۔

''بس بہت ہو گئی...... اور کتنا ضائع کرو گی خود کو۔ تم نے جاب کی اجازت مانگی وہ دی اب اور کیا کرنا ہے؟ بس اب شادی کرو۔'' ممی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''شا...... شادی......'' وہ اپنے لمبے بال سمیٹ کر آزردہ ہو کر بیٹھ گئی۔ ممی نے بے حد پیار سے اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھا۔ وہ ان کی زندگی کی واحد خوشی تھی۔ اس کا دکھ اُن سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

''بھول جاؤ اسے......! وہ تمہاری یکطرفہ محبت تھی ناں پھر ایسی محبت کا کیا فائدہ۔'' ممی نے پیار سے اسے ساتھ لگایا تھا۔ وہ ان کی بہت پیاری بیٹی تھی۔ ثروت نے کبھی اپنی سہیلیوں جیسی ماں سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

''ممی! جن لوگوں نے زندگی میں رہنا نہیں ہوتا پھر وہ ہماری زندگی میں آتے کیوں ہیں؟ اور اگر آتے ہیں تو بھولتے کیوں نہیں؟'' ثروت بے حد دکھی ہو گئی تھی۔ ممی نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

''یہ سب اللہ کی مصلحتیں ہیں، شروع شروع میں انسان ان کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے بعد میں اسے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو اللہ کی مرضی تھی وہ بہترین چیز تھی اس کی زندگی کی۔''

''سب جانتی ہوں اور مانتی بھی ہوں ممی! آخر آپ کی بیٹی ہوں، کیسے اتنی اہم بات سے انکار کر سکتی ہوں۔'' ثروت نے بھیگے لہجے میں کہا۔

''آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔ ماؤں کی دعائیں تو بہت قبول ہوتی ہیں ناں...... اللہ تعالیٰ مجھے اس محبت کے آزار سے نکال دے۔ میرا دل میری بے بسی بننے سے رک جائے۔'' ثروت نے اپنی بے بسی کی حد تک ماں کو دکھا دی تھی۔

''میرا بچہ......'' ممی نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔ ''تمہاری ماں تو ہر ہر پل .... ہر ہر سانس تمہارے لیے دعا گو ہے میری جان! اللہ سوہنا کرم کرے گا۔''

☆☆☆

''تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ شادی کر لو، امی کو کوئی ساتھی چاہیے۔ ان فیکٹ تمہیں بھی ساتھی چاہیے۔'' ارم باجی فون پر کہہ رہی تھیں۔

''کیوں آپ میری آزادی کی دشمن بن رہی ہیں۔'' افتخار نے بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔

''افتخار میں بہت سنجیدہ ہوں، تم کو کوئی پسند ہے تو بتاؤ ورنہ میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ بس وہ فائنل کر دینی ہے۔'' ارم باجی نے باقاعدہ دھمکی دی تھی۔

''باجی، افتخار کی زندگی میں اتنی بھیڑ ہے کہ ہجوم میں کوئی فرد نہ ملا۔'' افتخار کہہ کر ہنسے تھے اسی پل دماغ کے پردے پر دو آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں لہرائی تھیں۔ افتخار کا قہقہہ ایک دم رک گیا تھا۔ خود افتخار کو اس احساس پر حیرت سے جھٹکا لگا تھا۔

''ہجوم میں...... اس زندگی کی بھیڑ میں...... کوئی' کوئی ''فرد'' تھا۔

''کیا ہوا افی......؟'' ارم باجی پوچھ رہی تھیں۔

''ک...... کچھ نہیں باجی۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' سر افتخار نے گم صم انداز میں فون رکھ دیا اور بے اختیار آنکھیں موندھ کر کرسی سے سر لگا لیا۔ اب ذہن کے پردے پر دو ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس چہرے کے نقش بھی ابھر رہے تھے۔ وہاں ایک مکمل چہرہ اب موجود تھا۔ عکس موجود تھا۔ وہ عکس ثروت کا تھا۔

☆☆☆

''امی کیوں آپ کا بی پی ہائی رہتا ہے؟'' افی کو امی کے روز بڑھتے ہوئے بی پی پر پریشانی ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں بیٹا۔" امی نے معصومیت سے کہا۔

"اوکے..... آپ آرام کریں ڈاکٹر نے ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے آپ کو آرام کرنے کو کہا تھا۔" افی نے ماں کے چہرے پر ہاتھ رکھا پھر جھک کر ماتھے پر بوسا دیا۔

"امی میں کوشش کروں گا جلدی آنے کی لیکن پلیز آپ وقت پر کھانا کھا لیجیے گا۔ میرے انتظار میں آپ کا کھانا اور دوا دونوں ہی لیٹ ہو جاتے ہیں۔" افتخار نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"مجھے تمہارے بنا کہاں بھوک لگتی ہے؟" امی نے پیار بھری نظروں سے افتخار کو دیکھا۔

"امی پلیز..... میری پیاری امی۔ آپ کی فکر میں میرا دھیان بار بار کام سے ہٹتا ہے۔ آج مجھے ایک جلسے کی کوریج کے لیے جانا ہے۔ پلیز آپ کھانا وقت پر کھا لیجیے گا۔" افتخار نے کہا۔

"اچھا وہ باجی زبیدہ جو سامنے رہتی ہیں ان کو اپنی نواسی کی سالگرہ کے لیے تحفہ لانا ہے بازار سے۔ میری طرح وہ بھی اکیلی جان ہے۔ اکیلے جانے سے گھبراتی ہے۔ آج میں ان کے ساتھ مون مارکیٹ تک ہو آؤں؟" امی نے افتخار کو اطلاع کے ساتھ اجازت مانگی تھی۔

"امی آپ تو پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں۔" افتخار امی کی صحت کو لے کر ہچکچائے۔

"میں ٹھیک ہوں افی پھر میرا ابھی دل بہل جائے گا کون سا ہم نے زیادہ دیر کو جانا ہے۔ صرف ایک تحفہ ہی تو لینا ہے۔" امی نے افی کے وسوسے ختم کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے! پھر آپ پلیز سیل ساتھ لے کر جائیں گی تاکہ میں ان ٹچ رہ سکوں۔" افی نے نیم رضامندی سے ماں کو اجازت دی تھی۔

"ٹھیک ہے لے جاؤں گی۔ مجھ سے ٹھیک سے چلتا تو ہے نہیں۔" امی نے منہ بنایا تھا۔

"آپ نے کون سا کچھ کرنا ہے، بس یہ ہرا بٹن دبا کر کال سننی ہے۔" افی نے اپنی سادہ سی ماں کو بے حد پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" امی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "افتخار میری بہت شدید خواہش ہے کہ تم اب شادی کر لو۔" امی نے بیٹے کا اچھا موڈ دیکھ کر بات کی تھی۔

"امی ابھی تو میں جلدی میں ہوں پھر بات کریں گے۔" افی نے ہمیشہ کی طرح اس موضوع سے جان چھڑائی تھی۔۔ اور اپنا سیل فون اور لیپ ٹاپ اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔

"ہمیشہ اس موضوع سے بچتا رہتا ہے۔ آخر کب تک بچے گا شادی تو کرنی ہی ہے۔ اپنی ہی پسند بتا دے لیکن یوں کیوں بھاگتا ہے۔" امی نے کچھ زچ ہو کر بہ آواز بلند کہا تھا۔

☆☆☆

"سر، مون مارکیٹ میں بم بلاسٹ کی اطلاع ملی ہے۔" نواز بھاگتا آیا تھا۔ افتخار اپنی ریکارڈنگ ٹیم کو لے کر ایک جلسے کی کوریج کے لیے نکل رہے تھے۔

"واٹ......!" سر افتخار کے ہاتھ سے فائل چھٹ کر نیچے جا گری تھی جو وہ نکلنے سے پہلے کھڑے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ افتخار اپنی گاڑی کی طرف دوڑے تھے۔ کون سی کوریج...... کون سی نیوز...... افتخار کو کوئی خبر نہیں تھی۔

"امی......!" افتخار کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت نکل رہے تھے۔

"سر......سر۔" انہیں پیچھے سے بہت سارے لوگوں نے آوازیں دیں لیکن افتخار کو تو کوئی چیز نہ دکھائی دے رہی تھی نہ کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"امی...... امی......" افتخار کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر

کانپ رہے تھے۔ آنسوؤں سے بار بار منظر دھندلے ہو رہے تھے۔

"پیاری امی جان فون اٹھائیں۔" افتخار سارے رستے پاگلوں کی طرح فون ملاتے رہے لیکن امی فون نہیں اٹھا رہی تھیں۔ ٹریفک نیو کیمپس کے پاس آ کر دور تک جام تھی۔ افتخار نے اسٹیئرنگ پر بے اختیار مکا مارا تھا۔

"امی......!" افتخار کو لگ رہا تھا کہ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ اپنی سانس لینے میں وقت ہو رہی تھی۔

"سر آپ بہت مضبوط ہیں، بہت اسٹرونگ ہوتے ہیں جب تک کسی اپنے کی مجبوری اور دکھ نہیں آتا۔" کوئی سر افتخار کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔

"کسی اپنے کی تھوڑی سی چوٹ کسی کاری ضرب سے کم نہیں ہوتی ہے۔" ان کے دماغ میں کسی کی آواز گونجی تھی۔ آج ان کو احساس ہوا تھا کہ کسی اپنے کی گمشدگی ہو یا اس کی خیریت کی گمشدگی کیسے انسان کی خود کی سانسیں گمشدہ کر دیتی۔

"امی۔ اے اللہ! میری ماں کو سلامت رکھنا۔" افتخار کو اللہ یاد آ ہی گیا تھا۔ دور تک ٹریفک جام ان کے اوسان خطا کر رہا تھا۔ سر افتخار نے گاڑی وہیں چھوڑی اور یہ سوچے بنا کہ ان کی گاڑی ان لاک تھی۔ یہ وہ ہی گاڑی تھی ناں جو انہوں نے بڑے ارمانوں سے خریدی تھی لیکن اس وقت انہیں ہوش تھا ہی کہاں۔ جب وہ سخت سردی میں پسینے پسینے بھاگتے مون مارکیٹ تک پہنچے تو ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ وہاں بلاسٹ نہیں ہوا تھا۔ بلاسٹ کی افواہ تھی لیکن بازار میں موجود بچے اور خواتین خوف و ہراس کی وجہ سے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے تھے اور اس بھگدڑ میں بہت سارے لوگ پاؤں تلے روندے گئے تھے، خواتین زخمی ہو گئی تھیں۔ انتظار میں باہر کھڑے لوگ بھی اس اطلاع کو سن کر اندر بھاگے تھے۔ افتخار

میرے مسافر

تم گزرتے جو میری راہ سے
تو میں راہ کے ہر قدم پر
اپنے آنچل کے ستارے ٹانک دیتی
اپنی مانگ کے سارے ارماں راستے میں سجا دیتی
تمہارے ہر قدم سے اپنے دل کی دھڑکن باندھ دیتی
اپنے جنون کی ہر ننھی خوشی تمہیں دے کر
تمہارے غم سارے دامن میں بھر لیتی اپنے
لیکن اس کا کیا کریں کہ میرے اس دل میرے اس مسافر کا
سفر دوسرا تھا
رہ گزر دوسرا تھا
ہم سفر دوسرا تھا

مرسلہ: رابعہ انجم، پتوکی

سہمے سہمے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ہر خاتون کا رویا اور چیختا وجود ان کی ماں میں ڈھل رہا تھا۔ ہر عورت پر ان کو اپنی ماں کا گمان ہو رہا تھا۔

"امی......" ہر جگہ ماں کو تلاش کرتے کرتے افتخار ہانپ رہے تھے۔

"امی...... امی...... کہاں ہیں۔" وہ امی کو فون ڈائل کر رہے تھے۔

"پلیز امی فون اٹھائیں۔ اے اللہ...... میری ماں سلامت رہیں۔" اسی پل جب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تو ایک بچہ جو تقریباً پانچ چھ سال کا تھا ایک بوٹ پہنے ان کو روتا نظر آیا تھا۔ وہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ افتخار نے اسے بغور دیکھا تو انہیں لگا کہ ان کے آنسو بالکل اس بچے سے مشابہت رکھتے تھے۔ دونوں کی ماں بچھڑ گئی تھی۔

"ماما...... ماما......!" بچہ روتے روتے چلا رہا تھا۔ افتخار کا پتھر دل اس کی کرب سے بھری آواز سے

موم کی طرح پگھلے جا رہا تھا۔ وہ بے اختیار بچے کی طرف بڑھے اور بچے کو گود میں اٹھالیا۔ دونوں کا غم مشترکہ تھا۔ ایک کریکر پھٹنے سے اتنا شر پھیلا تھا۔ بم نہیں تھا لیکن صرف کریکر کی آواز نے لوگوں کو اس قدر کیوں بدحواس کیا تھا۔

آخر لوگوں نے کیوں نہ اسے فیس کیا تھا۔ صاف وجہ تھی۔ ہمارے نیوز چینل اور اخبار لوگوں کو اتنا ڈرا چکے ہیں کہ ایک عام کریکر ہو یا ایک بم کی جھوٹی اطلاع تو بھی سب کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے جتنی کہ سچ میں ہوسکتی تھی۔ ہماری قوم اتنی ڈر چکی ہے کہ خالی شیر آیا کی اطلاع پر لوگ اپنے حواس کھودیتے ہے۔ سر افتخار کے ذہن کے پردوں پر ایک بار پھر کوئی چلایا تھا۔

''اور سر یہ حواس کون چھین رہا ہے؟ یہ حواس ہمارے خبروں کو دیے مسالے چھین رہے ہیں۔'' ثروت کی آواز نے ایک بار پھر ان کا پیچھا کیا تھا۔ افتخار بچے کو باہر لے کر آئے تھے اسے پیار کیا تھا۔ وہ اب چپ تھا ان کی گود میں تھا۔ اچانک کوئی عورت ان پر جھپٹی تھی۔

''میرا بچہ......'' افتخار نے بچہ اسے دے دیا۔ ماں دیوانہ وار اسے چوم رہی تھی۔ افتخار کا سر اور نگاہ شرم سے جھکتی جا رہی تھی۔ جانے وہ کب سے ایسے مناظر کا باعث بن رہے تھے اور ان کو اس کا احساس تک نہیں تھا۔

''آہ......میں کیا کیے جا رہا تھا۔ واقعی میں بھول گیا تھا کہ خبر کو مسالا لگا کر بار بار چینل پر چلانے سے وہ لوگوں کے حواس چھین کر بہت بڑے مجرم بن چکے تھے۔

''اے اللہ...... میں زندگی میں اب کبھی دوبارہ ایسا کام نہیں کروں گا۔ میں کبھی لوگوں میں خوف و ہراس نہیں پھیلاؤں گا، ہمیشہ درست خبر کا باعث بنوں گا۔ میری ماں کو سلامت رکھنا۔ مجھے معاف کردے مالک!''۔ افتخار نے دل ہی دل میں دعا کی تھی اور وہ تو رب کریم ہے وہ پکارنے والوں کی سنتا ہے۔

''افتخار......'' ان کے پیچھے کسی نے آواز دی تھی۔ یہ امی کی آواز تھی۔ وہ تڑپ کر ماں کی آواز پر پلٹے تھے۔ اس آواز کی سلامتی پر وہ کس قدر تڑپے تھے یہ کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ تڑپ کر ماں سے جا لپٹے تھے۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' امی نے نقاہت بھری آواز میں کہا تھا۔'' اس بچی کا اللہ بھلا کرے۔ مجھے کیسے ہجوم میں سے بچا کر باہر لائی...... ورنہ تو میں نے ہجوم میں کچلے جانا تھا۔'' امی نے ساتھ کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ افتخار پہلی بار اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ وہ ثروت ہی تھی جس کی آوازیں، باتیں ان کا مسلسل پیچھا کرتی رہی تھیں آج تک۔ وہ ایک چھوٹے سے اسکارف کو سر پر لپیٹے ہوئے تھی، اس کے سوٹ کی چادر امی نے اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے پیر بھی ننگے تھے۔ اس کی جوتی بھی امی کے پیروں میں تھی اور وہ اتنی سردی میں ننگے پیر بہت سکون سے اس کی ماں کو تھامے کھڑی ان کو شرمندہ کر رہی تھی۔

''ثروت......!'' ان کے لب کپکپائے تھے۔ وہ اس سے سوری کریں یا شکریہ کہیں...... وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

''جی سر......!'' ثروت نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''آئی ......ایم......آئی ایم سوری۔'' انہوں نے ثروت کے قریب آ کر کہا تھا۔

امی نے غور سے دونوں کو دیکھا تھا۔ وہ یہ تو نہ جان سکی تھیں کہ افتخار اسے شکریہ کہنے کے بجائے سوری کیوں کہہ رہا تھا لیکن وہ یہ ضرور جان گئی تھیں کہ وہ اس پیاری سی لڑکی کو پہلے سے جانتا ہے۔ ثروت نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے تھے۔ وہ اپنی بدزبانی اور برے رویے کی معافی کہاں اور کس جگہ مانگ رہے تھے۔

لیکن کیا واقعی سر بدل گئے ہیں جو معافی مانگ رہے ہیں۔ دل نے سوال کرتے ہی اِک خوشی سی محسوس کی تھی۔ یہ دل کے سودے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنا پارٹنر تھوڑی سی بھی درستگی دکھاتا ہے تو اسے گزشتہ سو خون معاف کر دیتا ہے۔ ثروت پر بھی یہی کیفیت طاری تھی۔ اسی لیے تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

''اٹس او کے سر۔'' سر افتخار کی نظروں میں پل بھر میں جو احساس ابھر کر ثروت کے وجود کو چکا چوند کر گیا تھا اس پر ثروت نے بے اختیار نگاہ جھکالی تھی۔

''میں یہاں بک شاپ سے کچھ بکس لینے آئی تھی۔'' ثروت نے جیسے خود پر طاری کیفیت سے نکلنے کو کہا تھا۔

''اس بچی کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے اس نے آج میری جان بچائی ہے۔'' امی نے ثروت کو پیار سے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''آنٹی پلیز، آپ ایسی بات کر کے شرمندہ نہ کریں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ کاش میرے بس میں ہوتا تو میں کسی کو بھی ایسی سچویشن سے نہ گزرنے دیتی۔'' ثروت نے بہت معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ افتخار نے بے اختیار اسے دیکھا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ثروت نے کس پس منظر میں یہ بات کہی تھی۔ وہ تینوں بھیڑ سے نکل آئے تھے۔

''آپ میرے جوتے پہن لیں۔'' افتخار کو اس کا ننگے پاؤں سڑک پر چلنا تکلیف دے رہا تھا۔

''سر آپ کے بڑے جوتے پہن کر تو میں گر جاؤں گی۔'' ثروت نے مسکرا کر کہا تھا۔ افتخار نے جھک کر اپنے جوتے اتارے پھر سوکس اتارے۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس کے نرم و نازک چھوٹے سے پاؤں کہاں اس کے جوتوں میں آنے تھے۔

''آپ فی الحال ان سے اپنے پیروں کو کور کرلیں۔'' افتخار نے سوکس اس کو دیے جو ثروت نے فوراً پہن لیے۔ سردی سے ٹھنڈے فرش پر مزید کھڑے ہونا اسے بے حد دشوار لگ رہا تھا۔

''میری گاڑی دور ٹریفک میں پھنسی ہے۔ آپ کو کس طرف جانا ہے؟'' سر افتخار نے ایک رکشے والے کو روکتے ہوئے ثروت سے پوچھا۔

''گلشنِ راوی سر۔''

''ٹھیک ہے آپ گھر جا کر مجھے پہنچنے کی اطلاع کریں۔'' سر افتخار نے رکشے والے کو پیسے والٹ نکال کر پہلے ادا کر دیے تھے اور رکشے کا نمبر بھی اپنے سیل میں محفوظ کرلیا تھا۔ ثروت رکشے میں بیٹھ گئی تو سر افتخار نے تھوڑا سا جھک کر ثروت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثروت میرے آفس میں نیوز رپورٹر کی جگہ خالی ہے۔ تم چاہو تو آ سکتی ہو اگر تم مجھے دل سے معاف کرسکو تو اور دوسرے آپشن میں میری زندگی میں ایک نصیحت کرنے والی لڑکی کی بے حد کمی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس پوسٹ کی آفر کرنے اپنی امی کے ساتھ تمہاری امی سے ملاقات کرنے آجاؤں ؟'' ثروت نے چونک کر سر افتخار کو دیکھا تھا۔ سر افتخار کی بے چینی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ ثروت کے جواب کے لیے اسی کو دیکھ رہے تھے۔

''سر!'' ثروت نے گلا کھنکھارا۔'' آپ کوئی کام تو سیدھا کرلیا کریں۔ کوئی رکشے میں بھی پرپوز کرتا ہے؟''

سر افتخار کے چہرے پر مایوسی کی لہر آئی تھی۔

''ویسے سر مجھے دوسرا آپشن منظور ہے۔'' ثروت کی بات پر افتخار بے اختیار کھلکھلائے تھے اور پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رکشا ان کی نظروں سے دور چلا گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے اپنی گاڑی تک پہنچے اور امی کو سیٹ پر لٹا دیا۔ ٹریفک ابھی تک بلاک تھا۔

لیکن ان کی زندگی میں ''خیر'' کا راستہ کھل چکا تھا۔

مکمل ناول

حسابِ زیانِ جاں

عنیزہ سید

وہ اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی کے پٹ وا کیے اس کے پار کا منظر دیکھ رہی تھی۔ صحن میں اماں چارپائی بچھائے دھوپ سینک رہی تھیں اور ان کے ساتھ بیٹھا حمزہ گنا چوس رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے دانتوں سے گنے کا چھلکا اتارتا اور مزے سے اس کا رس چوس کر اس کی باقیات اپنے پاؤں کے قریب چھلکوں کے ڈھیر پر اچھال دیتا۔ ساتھ ساتھ وہ اماں سے تبادلۂ خیالات میں بھی مصروف تھا۔ منٹوں میں گنے کا آخری ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے آنکھوں کے سامنے کیے نظروں سے ٹٹول رہا تھا شاید

اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے چوسا جائے یا نہیں۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے وہ ٹکڑا اپنی ہتھیلی کے ڈھیر میں اچھال دیا۔ گنے کا آخری حصہ عموماً سخت اور کم رس والا ہوتا ہے۔ مائرہ کو پتا تھا حمزہ یہ ٹکڑا نہیں چوسے گا اور اس کے ایسا کرنے پر وہ سخت بیزاری کے موڈ میں بھی بے اختیار مسکرا دی۔

گنے سے فارغ ہونے کے بعد حمزہ نے اماں سے کچھ کہا اور ان کے جواب پر ہولے سے سر ہلایا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر صحن میں لگے نلکے کا دستہ چلانے لگا۔ لمحوں میں نلکا شفاف پانی اگلنے لگا۔ حمزہ نے ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بعد گیلے ہاتھ اپنے بالوں میں پھیرے اور بال سنوارتے ہوئے اس کمرے کی سمت دیکھا جہاں مائرہ بیٹھی تھی۔

"اب اس کا اگلا قدم ادھر کو بڑھے گا اور جو کچھ اس نے اب تک اماں سے سنا ہے اس کی روشنی میں یہ میرے سامنے ایک عدد تقریر جھاڑے گا جو انتہائی نصیحت آموز اور سبق آموز ہوگی۔" مائرہ نے سوچا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کمرے کے باہر قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مائرہ نے بازو گھٹنوں کے گرد باندھ کر گردن کھڑکی کی طرف موڑ لی۔ حمزہ کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر اسے دلچسپی سے دیکھتا رہا۔

"میں سمجھا تم سو رہی ہو؟ جب ہی جواب نہیں دیا دستک کا۔" اس نے کہا۔

"تم پھر بھی اندر آ گئے۔" مائرہ نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں۔" وہ ہنسا اور کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اس لیے کہ تمہاری بے مروتی اور بے اعتنائی پر مجھے کوئی خاص خوش فہمی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں دوسری سوچ یہ تھی کہ ہو سکتا ہے تم اپنی ان دنوں خوبیوں کی وجہ سے جواب نہ دے رہی ہو۔" حمزہ کے اس بیان پر مائرہ نے جزبز ہوتے ہوئے کھڑکی کا ایک پٹ زور سے بند کیا۔

"دھیان سے۔" حمزہ نے اس کی اس حرکت سے یقیناً خط اٹھایا تھا۔ "ٹوٹ بھی سکتا ہے۔"

"تم سے مطلب....." اب کے مائرہ اس کی طرف دیکھ کر جیسے باقاعدہ میدانِ جنگ میں کودی۔ "فکر نہ کرو، ٹوٹ بھی گیا تو تم سے نہیں کہیں گے ٹھیک کروا دو۔"

"میں تو خیر کیوں بنوا کے دوں گا اگر کہو بھی تو۔" وہ مزید محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تو بچی جان کی پریشانی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔"

"تم اماں کی فکر بھی مت کرو، تمہیں وہ بھی نہیں کہیں گی کہ کچھ غلط جو ہمارے گھر میں ہوا ہے، اسے ٹھیک کر دو۔" مائرہ جیسے چبھیں ہو کر بولی۔

"اوہ اچھا۔" وہ مائرہ کے لہجے کو محسوس کر کے سنجیدہ ہو گیا۔

"اب وہ بھی کہہ دو جو اماں نے تمہیں کہنے کے لیے بھیجا ہے۔" مائرہ نے اسی جلے بھنے انداز میں کہا۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں کہنا تم سے۔" وہ اب بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"کیوں.....؟" مائرہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اماں کا پڑھایا سبق بھول گئے ہو؟"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم سے اس لیے کچھ نہیں کہنا کہ تم سے کچھ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

مائرہ زیرِ لب مسکرائی، بالآخر اس نے حمزہ کو بھی زچ کر دیا تھا۔

"ویسے میں تمہارے اس رویّے سے خاصا مایوس ہوا ہوں۔" حمزہ نے یہ بات بھی بہت سنجیدگی سے کہی تھی۔

"اچھا ہوا تم کو جلدی پتا چل گیا کہ مجھ سے بات کرنے یا بڑے بڑے الفاظ سے بھرپور تقریر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" مائرہ اپنی ٹانگیں سیدھی

کرتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوئی۔

"بدنامی اور بدتمیزی کے خول کے اندر چھپ کر، بے اعتنائی اور گستاخی کو ڈھال بنا کر اگر تاریخ میں بھی کسی نے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو یا کوئی معرکہ جیت لیا ہو تو مجھے ضرور بتانا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"اور اپنی مرضی کے خلاف خود پر مسلط کیے ہوئے کام کو اگر کبھی کسی نے تاریخ میں ڈھنگ سے سر انجام دے لیا ہو تو تم مجھے ضرور بتانا۔" مائرہ نے کہا۔

"ہاں ضرور۔" حمزہ نے اس کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اونہہ۔" مائرہ نے اسے جاتے دیکھتے ہوئے سر جھٹکا۔ "چلا تھا مجھے سمجھانے۔"

☆☆☆

"جو بات مجھ جیسی کم عقل، ان پڑھ کی سمجھ میں آ گئی، اللہ جانے اس بچی کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔" اسی شام مٹی کے چولھے پر بڑا سا دیگچہ چڑھائے مسالا بھونتے ہوئے ماسی ہاجرہ نے خیال آرائی کی۔

"تمہیں کیا سمجھ آیا ماسی؟" حمزہ نے چولھے کی آگ سینکتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔" ماسی ہاجرہ نے پھونکنی میں پھونک مارتے ہوئے آگ کی لو بڑھانے کی کوشش کی اور پھر دھوئیں سے آنکھوں میں بھر آئے پانی کو چادر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی پیڑ کی شاخ کو چادر کی طرح لپک کھاتی ہی اچھی رہتی ہے، تتے کی طرح بے لچک، سیدھی کھڑی بیٹی کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"واہ ماسی۔" حمزہ کے منہ سے بے اختیار الفاظ نکلے۔ "تو تم بڑی اعلیٰ حکم کی فلسفی ہے، مجھے تو دانشور ہونا چاہیے تھا تو کدھر بیٹھی ہانڈیاں بھون رہی ہے۔"

"میں کوئی بھی نہیں۔" ماسی نے بھنتے سالن میں پانی کا چھینٹا مارتے ہوئے کہا۔ "ذات کی نائن ہوں، ہانڈیاں پکانے اور روٹیاں لگانے کا کام ہے میرا۔ میں اپنے حصے کا کام کر رہی ہوں، مجھے اپنے کام کی الف ب، ضرب، جمع، تقسیم ساری آتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔"

"لے ماسی! ابھی تو، تو نے اتنا بھاری فلسفہ سنایا ہے، لڑکیوں کے بارے میں، حمزہ نے چولھے میں رکھی سب سے بڑی لکڑی چولھے کے اندر مزید دھکیلتے ہوئے کہا۔

"ہائے، ہائے نہ گھسا لکڑی کو اندر، آگ خراب ہوتی ہے۔" ماسی نے اس کا ہاتھ روکا۔

"لو بتاؤ، آپا جی۔" پھر وہ صحن کے اس کونے میں آتی چچی جان سے مخاطب ہوئی۔ "کڑیوں چڑیوں کی کہانی کون سی نئی ہے جو میں نے اس کو سنا دی۔ کڑیاں چڑیاں پیڑ کی شاخ کی طرح لچک کھاتی ہی بھلی لگتی ہیں۔ کیوں؟" اس نے تائید طلب نظروں سے چچی جان کی طرف دیکھا جو پاس دھری پیڑھی پر بیٹھ رہی تھیں۔

"ویسے مجھے یہ بھی خیال آتا ہے۔" پھر ماسی ہاجرہ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"کیا.....؟" حمزہ نے دیکھا چچی جان کے چہرے پر ابھی تک صبح والا دکھ کا احساس چھایا ہوا تھا۔

"فاطمہ بی بی کا جن اِدھر مائرہ پر بھی تو قبضہ جمانے کی کوشش نہیں کرنے لگا۔"

"کیا حماقت کی بات ہے ہاجرہ۔" چچی جان نے اسے ڈپٹا۔ "کسی اور کے سامنے نہیں کر دینا یہ بات۔"

"لو میری غلط فہمی ماسی نے فوراً ختم کر دی۔" حمزہ نے ہنس کر چچی جان کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ دیر پہلے ماسی کو اعلیٰ پائے کی فلسفی قرار دے رہا تھا۔ جن والی بات کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ یہ تو واقعی نائن ہے، ہانڈیاں بھوننے اور روٹیاں لگانے والی نائن۔"

"تو میں نے اور کیا کہا ہے بچہ؟" ماسی نے بھنتے مسالے میں کھنے ہوئے آلو ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں

اپنا کام جانتی ہوں، کتنے بندوں کے لیے کتنا کھانا، اس کھانے کے لیے کتنا سالن چاہیے، نمک، مرچ، ہلدی، گھی، مسالا، پیاز، تھوم، ادرک، ٹماٹر۔ میری زندگی تو اس کے گرد چکتی ہے۔ میں نائن اس سے آگے کی باتیں کیا جانوں۔'' حمزہ نے بے دھیانی سے ماسی کی گفتگو سنتے ہوئے چچی جان کی نظروں کا تعاقب کیا جو بار بار مائرہ کے کمرے کی کھڑکی سے ٹکراتی تھیں اور ہر بار اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار پہلے سے زیادہ ہوتے تھے۔

''مسائل اور پریشانیاں، تارِ عنکبوت کی طرح میری زندگی کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ عنکبوت مستقل ادھر ہی ٹھکانا کر بیٹھا ہے، نہ ہٹائے ہٹتا ہے، نہ گرائے گرتا ہے۔'' انہوں نے حمزہ سے کہا۔

''ہٹ جائے گا آپ فکر نہیں کریں۔'' حمزہ نے انہیں کمزور سی تسلی دینے کی کوشش کی، اسے اپنی بات کا قطعی یقین نہیں تھا۔

''کاش میں ایک بچی ہوتی، ایسی ہر تسلی کو سچ مان لیتی۔'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اللہ پر بھروسا رکھیں اور سب اس پر چھوڑ دیں۔'' حمزہ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا، سورج مکمل تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ صحن کے ایک طرف بنی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آگیا۔ لوگ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر مخصوص راستوں پر چلتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے ایک اور دن کا اختتام ہو رہا تھا۔ ارد گرد کے گھروں کے صحنوں سے چولھوں میں جلتی آگ کی لو نظر آرہی تھی۔ وہ بچپن سے اس موسم اور اس منظر سے مانوس تھا۔ اسے اس وقت بھی یہ منظر اچھا لگتا تھا جب وہ اپنے والدین اور بہن، بھائیوں کے ساتھ اسی گھر میں رہتا تھا۔ اس وقت بھی جب وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد چھٹیوں میں یہاں آتا تھا اور اب بھی جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے کام سے لگنے کی تگ و دو میں تھا اور اسے کبھی کبھار ہی یہاں آنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھتا اور اس میں ایک نادیدہ مانوسیت پاتا تھا۔ یہاں آکر اسے ہمیشہ لگتا جیسے وہ اپنے فریم سے بچھڑا دوبارہ فریم میں جڑ گیا ہو، وہ خود کو اس ماحول سے متعلق اور اس فسوں میں مقید محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس اس مانوس فضا میں لی اور اسی وقت اسے اسی گھر کے ایک کمرے میں موجود مسئلے کا خیال آیا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سے دکھ کی چبھن اٹھنے لگی۔

''کیسی عجیب ضد باندھ لی ہے تم نے۔'' اس نے تصور میں آئے مائرہ کے چہرے کو مخاطب کیا۔ ''ایک نارمل انسان جتنا غور کیے بغیر اپنی ضد کے نتائج و عواقب پر۔''

اسے محسوس ہوا جیسے اور بہت سی وجوہات کے علاوہ وہ مائرہ کے لیے بھی یہاں آتا تھا۔ اسے چچی جان کے نرم، دھیمے، پُرسکون مزاج کی چھاؤں میں پرورش پائی ہوئی بے دھڑک، ضدی، من موجی، بے پروا، سرکش سی وہ لڑکی بہت عزیز تھی۔ وہ اس کے مزاج کی تیزی کے ہر مظاہرے کی دانستہ کاٹ کرتا اور اسی لیے بظاہر ان دونوں کی آپس میں بنتی نہیں تھی مگر یہ صرف وہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اسے کتنی عزیز تھی اور اس بات کا قلق کل سے اسے کھائے جا رہا تھا کہ اس کے دل کی یہ خوش فہمی کہ بظاہر وہ اس سے کتنا ہی لڑتی اور خار کھاتی تھی دل میں وہ بھی اسے اتنا ہی عزیز جانتی تھی خاک ہوئی۔

''وہ کہتی ہے کہ اس نے نادر سے ہی شادی کرنی ہے، دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ اپنی بات سے نہیں ہٹے گی۔'' یہ خبر کل صبح ہی چچی جان نے اسے فون پر دی تھی تو وہ خوش فہمی کے زعم میں مسکرا دیا تھا۔

''تم ہی آؤ، اس کو کچھ سمجھاؤ۔'' چچی جان کہہ رہی تھیں۔ ''تم جانتے ہو اس کی ضد کیسی ہوتی ہے؟''

''ہاں جی، میں جانتا ہوں۔'' وہ رسان سے

بولا۔ ''مٹھائی کی دکان پر سجی رنگ برنگی مٹھائی دیکھ کر للچا جانے والے بچے کی سی ضد۔'' وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ ''ایسے بچے کو اس سے زیادہ للچانے والی چیز دیکھا دو، وہ پہلی کو بھول کر اس کے لیے مچلنے لگے گا، ارے چچی جان آپ اسے جانتی ہیں...... پھر بھی اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔''

''تم سمجھ نہیں رہے ہو، اس لیے اتنا آسان لے رہے ہو۔'' چچی جان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ''اس کے تیور خطرناک ہیں اور اس کی یہ ضد میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔''

''اچھا آپ پریشان نہ ہوں، میں آتا ہوں۔'' حمزہ کو اس وقت بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مائرہ اس ضد کے پیچھے بھوک ہڑتال تک کیے بیٹھی ہو گی کیونکہ وہ جتنی بھی ضدی تھی، بھوک کی بہت کچی تھی۔ چچی جان کبھی کبھار اس کی بے جا ضد سے زچ ہو کر اسے کھانا دینا بند کر دیتی تھیں اور محاذ پر وہ فوراً ہتھیار ڈال دیتی تھی مگر یہ ضد ایسی سخت تھی جسے منوانے کے لیے وہ پیٹ کی دوہائی تک کی بھی پروا نہیں کر رہی تھی۔ حمزہ نے یہاں آکر گھر کی فضا پر چھائی سوگواری کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ چچی جان کی آنکھیں سرخ اور بھاری ہو رہی تھیں۔ اسے صورتِ حال کے کچھ سنجیدہ ہونے کا احساس تو ہوا تھا مگر مائرہ کا گستاخانہ اور باغیانہ لہجہ جب تک اس نے خود محسوس نہیں کر لیا تھا، اسے صورتِ حال کی سنگینی کا یقین نہیں آیا تھا۔

''سب کچھ دیکھ کر بھی مجھے علم ہے، تم جلد ہی اپنی یہ احمقانہ ضد چھوڑ دو گی۔'' اس نے ایک بار پھر تصور میں مائرہ کو مخاطب کیا اور سردی کی شدت زیادہ محسوس ہونے پر نیچے آگیا۔

☆☆☆

''تم نادر کے متعلق شاید کچھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتیں۔'' اگلے دن جب وہ مائرہ سے ملا تو اس نے اسے احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے، میں اسے اتنا جانتی

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

ہوں، جتنا شاید خود کو بھی نہیں جانتی۔''
اس کے لہجے میں اپنی بات پر یقین بول رہا تھا۔

''اوہ..... اچھا۔'' حمزہ مسکرایا۔ ''پھر یہ بات یوں کرلیتے ہیں کہ تم شاید خود کو اتنا ٹھیک سے نہیں جانتیں اس لیے اپنے فیصلے کے نتائج پر غور نہیں کر پا رہی ہو۔''

''اونہہ!'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''میں نادر کو جتنا جانتی ہوں، اس سے بھی زیادہ جان لینا چاہتی ہوں، وہ بھی اس طرح کہ خود کو بھول جاؤں۔''
حمزہ نے اس کی بات سنی اور اس کے کانوں نے جو سنا اس پر یقین کرنے کے لیے دھیان کسی اور طرف مبذول کرنا چاہا۔ اس کے سامنے صحن میں لگے موسمی پھولوں کے پودے تھے جن پر اڑتی ایک تتلی اپنے خوشنما پر پھیلائے اِدھر سے اُدھر حرکت کر رہی تھی۔

''نہ وہ تمہاری قوم کا نہ تمہاری برادری کا، ذات اس کی ان جانی، تم کس حساب میں اسے اتنا جان لینا چاہتی ہو کہ خود کو بھول جاؤ۔'' چچی جان جو صبح سے خاموش بیٹھی تھیں بالآخر خاموش نہ رہتے ہوئے بولیں۔

''آپ کو تو ذات کا قوم کا مان لے ڈوبے گا۔'' مائرہ نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ''کیا دیا آپ کو آج تک ان اونچی ذات والوں نے۔'' وہ کھا جانے والی نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ناکردہ گناہ کی سزا عمر قید۔'' اس کی آواز مزید بلند ہوئی۔ ''اس کے بجائے آپ بھی اگر ارد گرد نظر ڈالتیں تو کوئی نہ کوئی مہربان شخص آپ کو بھی مل جاتا اس قید تنہائی سے نجات دلانے کے لیے۔''

''میرے بارے میں خیال آرائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔'' چچی جان اس کی بات پر غصے سے بولیں۔

''میں آپ کے قاعدے اور قانون نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ زندگی مجھے صرف ایک بار

نہیں ملی ہے اور اس زندگی میں مجھے وہی کرنا چاہیے جو میرا دل چاہتا ہے۔''

''لیکن میں تمہیں اس من مانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' چچی جان نے اب کے ذرا مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ حرکت میری برسوں کی ریاضت کو خاک میں ملا دے گی، میں نے جس طرح کانٹوں پر چل کر عزت کی چادر سر پر تانی ہے اسے تم سمجھ سکتی ہو نہ اس کا تصور کرسکتی ہو مگر میں اس کا احترام بھی تم سے نہیں مانگتی اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اپنے لیے جو فیصلہ کر رہی ہو وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

''آپ کو کیا پتا کہ میرے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا۔'' مائرہ درشت لہجے میں بولی۔ ''آپ یہ فیصلہ کیسے کرسکتی ہیں جبکہ آپ کو عمر بھر یہ پتا نہیں چلا کہ خود آپ کے حق میں کیا اچھا ہے۔''

حمزہ نے حیرت سے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔

''مجھے زندگی نے وہ بھی سکھا دیا جو سیکھنے کی خواہش میں نے کبھی نہیں کی تھی۔ میں کبھی یہ نہیں چاہوں گی کہ تم بھی حالات کی مار کھا کر وہ سب سیکھو جو سیکھنے کی خواہش تمہیں نہیں ہے۔'' چچی جان نے اب کے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''آپ کی کسی بات سے بھی میں متاثر نہیں ہوتی۔'' مائرہ بدستور اسی لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''آپ کے لفظ، آپ کا لہجہ، آپ کی نصیحتیں سب پرانی ہوچکیں بار بار دُہرائی جانے والی اور یہ ساری باتیں اگر ہماری زندگی بدلنے یا بہتر کرنے کے لیے بددعا ہوتیں تو بھی ان کو سنا جاسکتا تھا، دھیان دیا جاسکتا تھا مگر یہ محض باتیں ہیں، بے معنی لفظ، بے تاثر جملے، ناقابلِ عمل نصیحتیں جو کتابیں لکھنے والے اپنی کتابوں میں بس لکھ دیتے ہیں۔ اسکرین پر نظر آنے والے بس بول دیتے ہیں، ان سے کتنوں کی زندگیاں بہتر ہوتی ہیں، کون کتنا پُرسکون رہتا ہے ان پر عمل کرکے کبھی نظر نہیں آیا۔'' وہ تضحیک اڑانے کے سے انداز میں بول رہی تھی۔

حمزہ نے اس کے ملگجے لباس، بکھرے بالوں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف پر کب تک مزید ڈٹی رہ سکتی ہے۔

''تم جو بھی کہہ لو، طنز کے جتنے تیر برسانا چاہتی ہو برسالو، میں تمہاری شادی نادر سے ہرگز نہیں کروں گی۔'' چچی جان نے حتمی انداز میں کہا۔

''تو آپ نہ کریں، میں خود کرلوں گی۔'' مائرہ پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

''میں تمہیں یہاں سے باہر نکلنے دوں گی تو کرو گی نا؟'' چچی جان شاید اس کی یہ دھمکی پہلے بھی سن چکی تھیں۔

''میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی، دیکھ لیجیے گا۔'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔

''آپ کی گیدڑ بھبکیاں میرا راستہ نہیں روک سکتیں۔'' مائرہ کی اس بات نے حمزہ کو بالکل ہی ششدر کردیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اس شخص کے لیے یہ گھر سے بھی بھاگ سکتی ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''جو اتنے تردد پر اتر آئے کیا اسے روکا جاسکتا ہے۔'' اس کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا۔

''یہ خاندانی عزت اور وقار، یہ اعلیٰ اخلاقیات اور روایات کے ڈھونگ، یہ ذات برادری، حسب نسب، میرے اور نادر کے درمیان جو بھی چیز آئے گی میں اس پر تھوک دوں گی، کان کھول کر سن لیں، آپ مجھے ایسا کرنے سے اب کسی طور نہیں روک سکتیں۔''

حمزہ کو لگا اتنی درشت باتیں کان میں پڑنے پر جیسے اس کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اسے بے حد عزیز تھی۔ اس کا چہرہ حمزہ کی آنکھوں کی نمی کے سامنے جھلملا رہا تھا۔

''لو آج میں تم سے دست بردار ہوا۔'' اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔ ''پتا نہیں کب اور کیوں تمہیں دل میں بسا بیٹھا تھا۔ شاید اس غلط فہمی میں کہ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں یا پھر شاید اس لیے کہ زندگی کی ہر چیز سے مختلف ہم اپنے نظریات پر کھلے دل سے تبادلۂ خیال کرلیا کرتے تھے اور اس وقت آپس میں لڑ لینے کے بعد غور کرنے پر پتا چلتا تھا کہ ہمارے نظریات تو خاصے ملتے جلتے ہیں۔ تم کس سائنسدان کے بارے میں کیا سوچتی ہو، کس ادیب کی کون سی کہانی، کس گلوکار کا کون سا گانا، کون سی خوشبو، کون سا پھول، کون سی فلم، کون سا شاعر، کون سا فلسفہ، کون سی تھیوری..... ڈھیر ساری بحث کے بعد ہم اپنے اپنے تئیں پوائنٹس اسکور کرکے خود کو فاتح قرار دیتے تھے اور بعد میں پتا چلتا تھا کہ نظریات تو ایک سے ہیں۔ اسی باہمی ہم آہنگی نے تو میرے دل کو خوش فہم بنا رکھا تھا کہ تم بھی میرے بارے میں یونہی سوچتی ہو۔'' اس نے نظر اٹھا کر ایک بار پھر مائرہ کو دیکھا۔

''واہ بھئی نادر میاں۔'' پھر اس نے کسی اور کو دل میں مخاطب کیا۔ ''نہ جانے تم کون ہو اور کیسے ہو مگر جو بھی ہو خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی کے دل میں بسے بیٹھے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ بحث ختم کی جائے۔'' اس نے چچی جان کو مزید بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''تم جیسا چاہتی ہو، ویسا ہی ہوگا۔'' پھر اس نے مائرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی اس بات کے ردِعمل میں مائرہ کا چہرہ ایک دم روشن سا ہوگیا، اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے مگر کہے بغیر بند ہوگئے۔

چچی جان نے چونکہ کر اس کی طرف دیکھا، جس کو انہوں نے اپنا دلیل بنایا تھا اسی نے ساری بحث سمیٹ دی تھی۔ اس کے پاس دلائل ختم ہوگئے تھے یا اس نے بغیر جرح کے ہی ہار مان لی تھی۔

''تم اس سے کہو، وہ آکر چچی جان سے مل لے۔'' حمزہ نے مائرہ سے کہا۔ ''تمہارا نکاح چچی جان

ہی کریں گی، تمہیں کہیں بھاگ کر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس کی آواز ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی اور ان کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

☆☆☆

''میرا دل نہیں چاہ رہا کہ جس عزت و ناموس کی خاطر آپ نے اتنے سال اتنی محتاط ہو کر گزار دیے وہ پل کے پل میں خاک ہو جاتے۔'' اسی رات حمزہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''جو کام ایک بڑا نقصان ہونے کے بعد بھی ہونا ہی ہے، اسے اس بڑے نقصان کے بغیر کیوں نہ ہونے دیا جائے۔''

''میرا خیال تھا کہ تمہیں اس سرکش گھوڑے کو لگام دینا آتی ہوگی۔'' وہ دکھ سے بوجھل ہوتی آواز میں بولی تھیں۔ ''تم تو اس کے مزاج سے آشنا ہو، تم سے میں نے بہت امید وابستہ کر رکھی تھی۔''

''یہ مزاج آشنائی کا ہی تو نتیجہ ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ صرف کہہ ہی نہیں رہی تھی، اس بار اس نے کر دکھانا تھا، آپ نے اس کا لہجہ اور عزم محسوس نہیں کیا شاید... کچھ تجربوں سے گزرے بغیر شاید ان کے نتائج وعواقب کا اندازہ ٹھیک سے نہیں ہو پاتا۔ لفظ سمجھانے کے لیے ناکافی ہوتے ہیں اور گزشتہ تجربوں کا نچوڑ نظر نہیں آتا۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ پُریقین ہے کہ اس نے اپنے لیے بہترین انتخاب کیا ہے اور اس جیسے لوگ جب پُریقین ہوں تو پھر انہیں سمجھانا فضول ثابت ہوتا ہے۔''

''مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ بے چین ہو کر بولی تھیں۔ ''یہ کوئی من مرضی کا کھانا، لباس، مضمون، کالج، اسکول کا معاملہ نہیں ہے، جو اس کی ضد پر اس کی مان لی جائے۔ وہ ذات اور قوم کے نیچ، ان کا پس منظر سرے سے غیر موجود، خیرات کھانے والے لوگ......'' انہوں نے رک کر حمزہ کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

''میں کوئی بڑا بول نہیں بول رہی۔'' حمزہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔ ''مگر یہ چیزیں معنی رکھتی ہیں۔'' انہوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر یہ کیسی محبت ہے کہ جن کے ساتھ ایک عمر گزاری، جنہوں نے نوالہ توڑنے، انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلانے، ایک ایک حرف سے لے کر لفظوں تک پڑھنا سکھانے کی مشقت سہی، جو تنگی ترشی، پریشانی مصیبت میں سائبان بنے رہے، جنہوں نے گود کی گرمی اور محبت کی نرمی سے آشنا کیا، ان کی محبت پر ایک دم اجنبی شخص کی محبت حاوی ہو گئی۔ بے غرض، بے ریا، مرنجان مرنج، چھوٹے بڑے کی محبت میں جان لٹا دینے والے وفا پرست باپ کی بیٹی اتنی بے مروت، خود غرض اور سرکش۔'' وہ سانس لینے کو رکیں۔ ''مجھے علم ہوتا تو اس کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ کر مار دیتی۔'' انہوں نے حمزہ کی طرف دیکھا جو لب بھینچے بات سن رہا تھا۔

''میرا کہنا اب بھی یہی ہے کہ ان سب باتوں کا کچھ فائدہ نہیں، وہ گھر سے بھاگ جائے یا اپنی جان لے لے، دونوں صورتوں میں ہی ایک بڑا نقصان ہمارا ہوگا۔ اس بڑے نقصان سے بچنے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ اسے من مانی کر لینے دیں۔''

''کیسے بھاگ جائے گی۔'' وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ''ٹانگیں کاٹ دوں گی اس کی، صبح ہی بلاؤ قاضی کو، میں اس کا نکاح تم سے کرواتی ہوں... پھر کیسے بھاگے گی۔''

''نہیں۔'' حمزہ نے تیزی سے کہا۔ ''میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔''

''تم......!'' وہ ششدر رہ گئیں۔ ''جب کہ میرا خیال تھا......'' وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''خیال کا کیا ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ ان سے آنکھیں چرا کر بولا۔ ''اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں تو یقین جانیں وہ یہی ہے

کہ مائرہ کا نکاح اس لڑکے سے کر کے خود اپنے ہاتھوں اس کو رخصت کر دیا جائے۔''

''کیا ایسا کرنے سے ہمارے خاندان کی عزت بچ جائے گی، برادری اور خاندان والے ہمیں بخش دیں گے، کیا کیا باتیں نہ بنائی جائیں گی، میری تربیت کو غلط اور میری ذات کو نشانہ بنانے والی کون سی زبان ہوگی جو خاموش رہے گی؟''

''اس کی آپ فکر نہ کریں، میں سنبھال لوں گا۔'' حمزہ کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے اپنی اس بات کا یقین تھا یا وہ محض چچی جان کی تسلی کو یہ بات کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

چچی جان اس گفتگو کے بعد بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ مائرہ نے اپنی سہیلی مریم کے ذریعے نادر کو پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ آ کر گھر والوں سے مل لے۔ چچی جان نے نادر سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حمزہ نے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں سب کچھ وہی کرے گا۔ ان کے اسی سخت رویّے کا نتیجہ تھا کہ جس سہ پہر نادر اس ملاقات کو اِدھر آیا اس روز صبح سے گھر میں صفائی ہوئی نہ آنے والے کے لیے کسی چائے پانی کا اہتمام کیا گیا، چچی جان سارا دن منہ پر چادر ڈالے صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹی رہیں۔ اُن کا مزاجِ ایسا ہو رہا تھا کہ کسی کو اُن کے ساتھ بات کرنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ حمزہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال اور ذمّے داری سے کیسے نمٹے گا۔

نادر کے آنے کی اطلاع ملنے پر جب وہ بیٹھک کی طرف آتا مائرہ کے کمرے کے آگے سے گزرا تو بلو گراس کے لوشن اور ایوننگ ان پیرس کی ملی جلی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ اس کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے آگے ذرا کی ذرا رکا، اندر سے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ کی آواز کے ساتھ ساتھ مائرہ کے گنگنانے کی ہلکی سی آواز بھی آ رہی تھی۔

''انکھیوں کے جھروکوں سے میں نے دیکھا جو سامنے ......'' وہ گنگنا رہی تھی۔ اس کمرے کے سارے ماحول سے جیسے خوشی کی لہر اٹھ رہی تھی۔ حمزہ مزید رکے بغیر لمبے ڈگ بھرتا آگے نکل گیا۔ اسے لگا اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ اسی ماؤف ذہن سے اس نے بیٹھک کا باہر کھلنے والا دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے چھبیس، ستائیس سالہ دراز قد شخص کھڑا تھا۔

''اچھا تو تم ہو، رقیبِ روسیاہ!'' اسے اندر بٹھانے کے بعد اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس ماؤف ذہن میں جو بات آئی اس پر حمزہ کا دل ہنسا تھا یا اس میں عجیب سی چبھن محسوس ہوئی تھی یہ اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

''میں کپڑا ایکسپورٹ کرتا ہوں۔'' رقیبِ روسیاہ اسے بتا رہا تھا۔ ''ہم ساتھ کے گاؤں کے رہنے والے ہیں، میرے والد شریف الدین صاحب چوہدری مجید کے ڈیرے پر کام کرتے تھے، اب نہیں کرتے کیونکہ اب ہم سب بھائی اچھا کما رہے ہیں۔'' نادر بتا رہا تھا۔

''میرے کپڑے کی بڑی ملوں والوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں، میں اسٹاک میں بھی خاصا مال رکھتا ہوں، سیزن آنے پر اچھی خاصی چاندی ہو جاتی ہے۔'' حمزہ کا ماؤف ذہن بس سن رہا تھا۔

''میری چھوٹی بہن عاصمہ، مائرہ کی کلاس فیلو ہے، میں عاصمہ کو کالج چھوڑنے اور لینے جاتا ہوں، مائرہ سے وہیں ملاقات ہوئی۔'' حمزہ کو نہ جانے کیوں لگا جیسے یہ بات سناتے ہوئے نادر کے چہرے پر ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''اس کو میری ہائیٹ اور میری مسکراہٹ نے بہت متاثر کیا۔'' اب کے وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

''اور تمہیں مائرہ کی کس چیز نے متاثر کیا؟'' حمزہ نے پوچھنا چاہا مگر اس کا کوئی بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''مائرہ کی پسندیدگی کا جب مجھے پتا چلا تو میں گڑ

بڑا کر رہ گیا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''کیوں......؟'' حمزہ کو یہ سوال کرتی اپنی آواز بھی کسی پاتال سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''اس خاندان کا علاقے میں بڑا نام ہے جی اس لیے۔'' اب کے نادر کا لہجہ عجیب مسکین سا ہوگیا...... ''بی بی جی کے اسکول کے آگے سے گزرتے ہوئے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی تھی ہماری اور جب تک چوہدری وارث صاحب حیات تھے ہم ان کے مکانوں کو نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔'' حمزہ نے اپنا سر جھکالیا۔

''میں نے مائرہ کو یہ بتایا تو وہ ہنس دی۔'' وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔ ''میں نے کہا مائرہ بی بی..... میں شریف دیندار کا بیٹا ہوں جی آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے شاید تو وہ ہنس کر بولی۔ ''اس میں غلط فہمی کی کیا بات ہے، دل تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔'' حمزہ کا دل ڈوبنے لگا۔

''ویسے بھی پرانی شان وشوکت کے تو تذکرے ہی باقی ہیں نا...... اب دور اور آگیا ہے، چوہدری وارث صاحب کی زمینیں بکیں تو میرے چاچے نے قیمت لگائی تھی سب سے پہلے اور جو خریدیں ان کے دام کھرے دیے تھے یکمشت... اور اب تو یہ اونچے مکان ڈھاڈ بھیری ہونے کو ہیں۔ پر ادھر ہمارا کاروبار بڑا پھیل گیا ہے، ہم نے اپنی کوٹھی شروع کرائی ہوئی ہے، اِدھر لین سے پار جو کھلی جگہ تھی وہ ہماری ہی ہے، میں یو کے کا ویزا لے رہا ہوں، جلد ہی ہمارا کاروبار انٹرنیشنل ہو جائے گا۔'' حمزہ خاموش بیٹھا ترقی اور تنزلی کے پڑاؤ سن رہا تھا۔

''مجھے تو خوف تھا اور بے یقینی بھی، پر مائرہ کا حوصلہ بلند تھا۔ کہتی تھی تم میں کیا کمی ہے نادر، پڑھے لکھے تم ہو، اپنا کام کرتے ہو، خوب کماتے ہو اور سب سے بڑھ کر اتنے وجیہہ ہو کہ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھنچتا ہے۔'' حمزہ نے بے چینی کے عالم میں پہلو بدلا۔

''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم مائرہ سے نکاح کے لیے تیار ہو؟'' اس نے بہ مشکل اپنی آواز میں اٹھنے والے دل کے ابال پر قابو پاتے ہوئے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔

''بالکل......'' اس کے مخاطب نے شانے اچکاتے ہوئے یوں جواب دیا جیسے یہ انتہائی معمولی کام تھا جسے اس کا بایاں ہاتھ بھی سرانجام دے سکتا تھا۔

''اس کا کیا قصور ہے، جب تم خود اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کام بن گئی ہو۔'' اس نے نادر کے اس انداز پر دل میں اٹھتے ہوئے ردِعمل کو دباتے ہوئے سوچا۔

''کیا یہ کام تم ایک دو دن میں ہی کر سکتے ہو؟'' اس نے دوسرا سوال نادر سے کیا۔

''ہاں، چاہیں تو آج ہی۔'' بائیں ہاتھ کا کام دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔

''تم ایسا کرو پرسوں، رات آٹھ بجے گواہوں کے ساتھ یہاں آجانا، نکاح ہو جائے گا۔'' حمزہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنے کے بعد کہا۔ نادر نے خوشی کے عالم میں پہلو بدلا۔

''مائرہ یہاں سے ایک جوڑے میں رخصت ہوگی، تم یہاں کسی سامان، روپے یا جائداد کے کسی کاغذ کی امید رکھے بغیر آنا۔'' حمزہ نے اپنی اس بات کا ردِعمل جاننے کے لیے نادر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمحے کو ساکت ہوا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس نے نارمل انداز میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے مگر اس طرح ایک بار یہاں سے رخصت ہونے کے بعد مائرہ دوبارہ پھر یہاں قدم نہیں رکھے گی۔'' اس نے اپنے تئیں اپنی شرط پیش کی تھی۔

''میں یہ بات پہلے ہی تم سے کہنے والا تھا۔'' حمزہ نے اتنے ہی نارمل انداز میں اسے جواب دیا تھا۔

''تم......!'' نادر نے انگلی اٹھا کر حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم کون ہو یہ سب طے کرنے والے... بی بی جی کہاں ہیں؟''

''کیا تم سوچ سکتے ہو کہ وہ تم سے ملیں گی یا کوئی بات کریں گی؟'' حمزہ نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اس سے سوال کیا۔ ''تم اور مائرہ جو چاہتے ہو وہ ہونے جا رہا ہے، تم دونوں کی کوئی خواہش اس کے سوا نہیں ہے۔'' اس نے اپنی بات کی تائید حاصل کرنے والی نظروں سے اسے دیکھا، جواب میں نادر خاموش رہا تھا۔ ''تو جو تم دونوں چاہتے ہو وہ بغیر کسی تردد کے آسانی سے ہونے جا رہا ہے کیا یہ کافی نہیں؟''

''اوہ......!'' وہ ہنسا۔ ''بڑی کرم نوازی ہے تمہاری۔'' اس نے اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سلام کرنے کے سے انداز میں رکھا۔ ''ویسے یہ کام تم نہ کرتے تو بھی ہو جانا تھا۔''

''زحمت سے بچ گئے تم شکر کرو۔'' حمزہ کا لہجہ پہلی بار درشت ہوا ''کسی بھی دوسری صورت میں پولیس، تھانے، مقدموں، اور خواری کا سامنا کرتے عمر گزر جاتی، شادی کا مزہ بھگتتے رہتے ایک عرصے تک۔''

''مائرہ نابالغ اور فاتر العقل نہیں ہے، جو عدالت اسے اور مجھے کسی لمبے مقدمے میں گھسیٹتی نہ ہی تم۔'' نادر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اور تمہارے خاندان کے باقی مردوں میں اب وہ دم خم کہاں رہا ہے کہ بندوق اٹھا ہی لو، چلانا تو دور کی بات ہے، اس لیے مجھ پر احسان لادنے کی کوئی گنجائش نہیں۔'' باہر نکلنے سے پہلے وہ رکا اور مڑ کر حمزہ سے ایک بار پھر مخاطب ہوا۔ ''ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہاری بزعم خود اونچی شان کے جنازے کی بے عزتی کا گراف ذرا کم ہو جائے گا۔'' حمزہ نے نادر کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔

دراز قد اور ظاہری وجاہت، دو چیزیں سب

کچھ داؤ پر لگا دینے کا باعث بن گئی تھیں۔ اسے لگا اس کمرے کے در و دیوار سے اس کے خاندان کی بزرگ عورتوں کی روحیں چمٹ کر بین کر رہی تھیں۔

☆☆☆

''ہار پھول، عرقِ گلاب اور مشک کافور منگوا لینا۔'' چچی جان نے اس سے اس گفتگو کی تفصیل سننے کے بعد جو اس کے اور نادر کے درمیان ہوئی تھی کہا۔ وہ رک کر اُن کے چہرے کو دیکھنے لگا، وہ اسے کسی طرح بھی نارمل نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''چلیں آپ آرام کریں، ہم پھر بات کریں گے۔'' اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

''پھر تو آنا بھی نہیں۔'' وہ بڑبڑائی تھیں اور پھر ان پر وہی خاموشی چھا گئی جو صبح سے چھائی ہوئی تھی۔

''آپ لیٹ جائیں، میں ماسی ہاجرہ کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔'' وہ گھبرا کر اٹھا۔ انہوں نے کسی معمول کی طرح اس کی بات کی تقلید کی اور چہرے پر چادر ڈال کر لیٹ گئیں۔ ماسی ہاجرہ کو ان کے پاس بھیج کر صحن میں کھڑے اس کی نظر مائرہ کے کمرے کی کھڑکی پر پڑی جس سے روشنی چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ ذرا آگے بڑھا اور کمرے کے اندر کی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں کیسٹ پلیئر آن تھا اور چیزوں کی اٹھا پٹخ کی آوازوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اہم کام سرانجام دیا جا رہا ہو، وہ بنا دستک دیے پہلی بار اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا مائرہ کے کمرے کا سامان بکھرا پڑا تھا اور اس کے بیڈ پر تین ٹریول بیگز رکھے تھے۔ وہ بکھری چیزوں کو ترتیب دے کر بیگز میں رکھنے میں مصروف تھی۔ اس کا کیسٹ پلیئر آہستہ آواز میں گیت بجا رہا تھا۔

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے

مائرہ خود بھی زیرِ لب یہ گیت گنگنا رہی تھی۔ اس نے ایک شوخ رنگ لباس پہن رکھا تھا اور اس کے

ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی سجی تھی۔ حمزہ کا دل ایک لمحے کو دھڑکنا جیسے چھوڑ گیا۔ وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی اور وہ اتنی خوش نظر آرہی تھی جیسے اسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو، وہ اپنی جگہ پر دم بخود کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

مائرہ کو کمرے میں کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس کچھ دیر بعد ہوا تھا۔ حمزہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ اتنے دونوں میں پہلی بار خوشدلی سے مسکرائی تھی۔

"بیٹھو....." اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ حمزہ کو لگا وہ یہاں بیٹھنا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا، شاید جو وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

"تم یہ سب کیا کر رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں....." مائرہ نے چند بکھری چیزیں اٹھانے کے بعد کیسٹ پلیئر بند کیا۔ "جو بہت ضروری چیزیں ہیں وہ سمیٹ رہی ہوں، ان کو میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"تمہیں پتا ہے نادر کے ساتھ کیا بات طے ہوئی؟" حمزہ نے سوال کیا۔

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیسے پتا ہے؟" حمزہ حیران ہوا۔

"جاتے ہوئے نادر مجھ سے مل کر گیا تھا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کہاں.....؟" حمزہ کی حیرت بڑھ گئی۔

"یہ کھڑکی۔" اس نے اپنے کمرے کی اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو باہر کی بندگلی میں کھلتی تھی۔ "یہ میری سہیلی ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ "میرے بہت سے رازوں کی خاموش امین۔" وہ ہاتھ میں پکڑا دوپٹا پیڈ پر اچھال کر گہری سانس لیتے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "نادر نے اسی کھڑکی پر دستک دے کر مجھے بتایا کہ تمہارے ساتھ اس کی کیا بات طے ہوئی۔ ویسے....." اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ "اسے شاید یقین نہیں آرہا تھا کہ امی کے بجائے تم یہ معاملات طے کرو گے۔" وہ ہنسی۔ "میں نے اسے بتایا کہ یقین کرو، حمزہ امی کا مشیر خاص ہے، آیا تو وہ مجھے سمجھانے تھا مگر اسے میرے نکاح کے معاملات طے کرنے پڑ گئے۔"

"تمہیں ذرا سا بھی ملال نہیں ہے کہ تم یہ سب کس طرح کر رہی ہو۔" حمزہ کو اس کی بات بے بات ہنسی سے چڑ ہونے لگی تھی۔

"ملال والی اس میں کوئی بات ہے ہی نہیں، ایک جائز بات ہے، اس میں ملال کیسا؟" وہ بے نیازی سے بولی۔ "ہاں تم نے اور امی نے اسے الیٹو بنا دیا خوامخواہ اور یہ جو....." وہ ایک بار پھر ہنسی۔ "تم لوگوں کا خیال ہے کہ مجھے اس بچی کھچی چاندی، روپے، پیسے اور سامان سے محروم کرنے کی دھمکی دے کر میرا اور نادر کا راستہ روک لوگے تو یہ وہم ہے تمہارا۔" اس نے ایک بار پھر حمزہ کی طرف دیکھا۔ "مجھے تو خیر نام نہاد سہولتوں کی پروا بھی نہیں، نادر بھی اپنے قول کا کیسا پکا ہے، وہ مجھے بتا کر گیا ہے کہ تم سے اس کا کیا معاملہ طے ہوا اور اس نے بالکل ٹھیک کہا تم جیسے مادیت پرستوں سے تعلق رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے مجھیں۔ میں شکر کرتی ہوں مجھے اخلاقیات، روایات، خاندان پرستی کی ان زنجیروں سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔"

"مجھے ان لفظوں کے تمہارے ہونے پر حیرت ہو رہی ہے مائرہ۔" حمزہ نے درشتی سے کہا۔

"ہونی بھی چاہیے۔" وہ مسکرائی۔ "میں تمہاری طرح چیزوں سے، لوگوں اور جگہوں سے وابستگی کی فیٹیشس کا شکار جو نہیں..... تم۔" اس نے انگلی سے حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ "تم جو گورنمنٹ ہائی اسکول فار بوائز نمبر 2 کی عمارت کے باہر چھٹی کے ٹائم موجود ریڑھیوں سے چیزیں لے کر کھانے کی فیٹیشس میں ابھی تک گرفتار ہو اور جس کا نظارہ کرنے اب بھی باقاعدگی سے اُدھر جاتے ہو، تمہارے لیے خاندانی پس منظر، روایتی اقدار قسم کی چیزیں تو بہت بڑی فیٹیشس

ہوں گی، اس لیے کہ تمہارا آئی کیو لیول یہاں ختم ہو جاتا ہے، تمہارا وژن اِدھر تک ہی محدود ہے۔ اس سے آگے تم سوچ ہی نہیں سکتے۔"

"اس سے آگے کیا ہے، تم بتاؤ؟" حمزہ نے بے وجہ سوال کیا۔

"اس سے آگے بہت کچھ ہے، انسان کی اپنی زندگی جو صرف ایک بار ملتی ہے اور ہر چیز سے اہم ہے، جو نہیں ہے تو یہ بڑے بڑے لفظ اور اونچی سوچ، سب بیکار ہے۔"

"ہوں....." حمزہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تو پھر تو تمہیں تمہاری انسانی زندگی بہت مبارک ہو، جو ہے اور تمہارے فیصلے کے پورا ہونے کے بعد مزید ہوگی۔"

"ہاں۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "امی نے انہی روایات اور خاندان پرستی کی وجہ سے کم عمری کی بیوگی تا حیات قبول کی تھی نا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔ "اب کیا ہے اُن کے پاس، تھوڑی سی زمین، سر چھپانے کو یہ مخدوش حالت والی چھت اور ایک سرکش بیٹی۔" وہ زور زور کو رکی۔ "وہ ایک زندگی جو انہیں حاصل ہوئی تھی جسے انہوں نے اس آن بان پر وار دیا۔ اس کی جمع تفریق کرو تو سارے کھاتے نقصان کے نکلیں گے۔ نہ بھی برادری نے حسین کے ڈوگمرے برسائے نہ ضرورت پڑنے پر خاندان والے مدد کو آئے، اب باقی کی عمر اسی آن بان کا ڈھول پیٹنے کے سوا ان کے پاس کوئی آپشن نہیں۔"

"ڈھول تو خیر تم نے اُن کا پھاڑ دیا، اب کیا پیٹیں گی وہ۔" حمزہ نے آہستہ آواز میں کہا۔ جواب میں وہ یوں بے نیاز ہوئی جیسے سنا ہی نہیں۔

"اور ہاں۔" اس نے کچھ یاد آجانے پر کہا۔ "میں یہاں سے کچھ نہیں لے جارہی مگر یہ....." اس نے بکھری ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب میں نے اپنے لیے خود لیا۔ اس پاکٹ منی سے جو

مجھے تم سے محبت ہے

یہ کیسی بات ہوگئی
کہ دن میں رات ہوگئی
یہ میرے خواب تو دیکھو
چمکتے ہیں ایسے جیسے
کسی تنہائی کی شب میں
کوئی مہتاب سا چمکا
میری یادوں کے صحرا میں
کوئی گلاب سا مہکے
میرے اس دل کے شہر میں
یہ کیسی ہلچل ہے مچی
مجھے لگتا ہے یہ ہر پل
میری سانسوں کی تاروں پر
ان آنکھوں کے کناروں پر
تیرے لفظوں اور باتوں کی
تیرے لہجے اور سانسوں کی
عجب سی خوشبو نے عجب جادو کر ڈالا
تمہارے ساتھ بھی جاناں
کسی شب کے کسی معصوم سے پل میں
کبھی گر ایسا ہوتا ہو
تو پریشاں نہ ہونا
بس اتنا جان لینا
کہ
مجھے تم سے محبت ہے
تمہیں ہم سے محبت ہے

شاعرہ: مہک خان، کراچی

مجھے ملا کرتی تھی۔ ویسے بھی۔‘‘ اس نے شانے اچکائے۔ ’’یہ یہاں کسی کے کیا کام آئیں گی۔‘‘

’’تمہیں پتا ہے مائرہ کہ چچی جان کی حالت کیسی ہے اس وقت؟‘‘ حمزہ کو اس کے اس خود غرضانہ اور بے حس رویے پر اب شدید غصہ آنے لگا تھا۔

’’وہ اپنی اس حالت کی خود ذمے دار ہیں۔‘‘ اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا۔ ’’ہم دوسروں سے ان کی استطاعت سے بڑی توقعات کیوں لگائیں؟‘‘ اس نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کو دیکھا۔ ’’مجھے دیکھو، مجھے پتا تھا کہ امی میری بات کبھی نہیں مانیں گی اسی لیے میں نے ان سے ایسی کوئی توقع نہیں لگائی تھی۔‘‘

’’شاباش مائرہ، تم ہم سب کی توقعات سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئیں۔‘‘ حمزہ کی برداشت ختم ہونے لگی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ’’واقعی ہمیں دوسروں سے اُن کے قد سے بڑی توقعات نہیں لگانی چاہئیں۔‘‘ وہ تیز قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی کمرے سے دوبارہ کیسٹ پلیئر کی آواز آنے لگی۔

☆☆☆

وہ دھوپ چڑھے سے لے کر اس وقت دوپہر تک چھت پر بچھی کھری چارپائی پر لیٹا تھا۔ فضا میں عجیب سا سکوت تھا، آسمان صاف اور گہرے نیلے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اس نے دیر تک اونچے افق پر قطار در قطار سفر کرتے پرندوں کا نظارہ کیا اور پھر آنکھیں تھک جانے پر موندھ لی تھیں۔ اس کا ذہن خالی تھا اور دل میں بے چینی تھی۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اس کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی تھیں اسی لیے اسے انہیں بند کرنا پڑا تھا ورنہ وہ انہیں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آنکھیں بند کرنے پر کئی دن سے اس کے سامنے ایک ہی منظر فلم کی طرح چلنے لگتا تھا۔ نکاح خواں، گواہ، نکاح کے بول، نکاح نامے پر دولھا کے کالم میں نادر کا نام اور دلہن کے دستخطوں میں مائرہ کے ہاتھ سے لکھا وہ مانوس ایم... پھر دلہن کے وکیل کی حیثیت سے کیے گئے اس کے اپنے دستخط، نارنجی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس وہ ان سجی دلہن، اس کا اعتماد جس کے ساتھ وہ بغیر کسی کی دعا لیے نادر کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے غلطی سے بھی ایک نگاہ اس گھر کے آنگن پر نہیں ڈالی تھی جس میں کھیلتے کودتے اس کا بچپن گزرا، اٹھتے بیٹھتے لڑکپن اور جوانی کے سال بیتے تھے، اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ اس کی ماں اس کے رخصت ہوتے وقت منہ پر کپڑا ڈالے خاموش پڑی تھی۔ انہوں نے اس کے چلے جانے تک ایک لفظ بھی اس سے نہیں بولا تھا۔

’’کیا بے حسی اور خود غرضی کی ایک اسٹیج یہ بھی ہوتی ہے؟‘‘ بے چینی سے کروٹ بدل کر حمزہ نے سوچا پھر اس نے آنکھیں کھول کر سورج کی شعاعوں کو براہِ راست دیکھنے کی کوشش کی۔ ’’کیا میں بزدل ہوں یا مصلحت پسند جو اس کو روک نہ سکا؟‘‘ اس نے خود سے سوال کیا۔ ’’بندوق کے زور پر یا دلائل دے کر کیا اس کو روکا جا سکتا تھا؟‘‘ اسے لگا اس کے پاس اس کے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں تھا یا شاید وہ ایسے کسی سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

’’جو ہونا تھا وہ تو گیا، اب ایک دوجے سے منہ چھپانے کا کیا فائدہ۔‘‘ اسے اس کی سوچوں سے ماسی ہاجرہ نے چونکا دیا تھا۔

’’منہ سے نکلی بات واپس نہیں آ سکتی دوسرا کمانوں نکلا تیر۔‘‘ وہ حمزہ والی چارپائی کی ادوائن پر بیٹھ کر بولی۔ ’’دھی رانی کو خیال نئیں نہ آیا کہ پیچھے رہ جانے والے کون سے حال جیویں گے تو تسی بھی اس کی فکر دل سے نکال دیو۔‘‘ وہ اپنے تئیں حمزہ کو دلاسا دے رہی تھی۔

حمزہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنی چپلوں میں پاؤں ڈالنے لگا۔

’’پورا پنڈ دانتوں میں انگلیاں دے کر بیٹھا ہے۔‘‘ ماسی ہاجرہ نے خبر سنائی۔ ’’چوہدری سلطان کے مکانوں میں پہلے کبھی ایسی برات آئی نہ ایسا تماشا ہوا۔‘‘ حمزہ نے سر جھکا لیا۔

’’پر انگلیاں کب تک دانتوں میں رہیں گی، ایک آدھ دن میں سب اپنے کام میں لگ جائیں گے، بھول جائیں گے تو پھر تم دونوں کیوں ایک دوجے سے چھپتے پھرتے ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں ماسی، میرا جسم بخار سے ٹوٹ رہا تھا، میں اس لیے اِدھر آ کر لیٹ گیا۔‘‘ حمزہ نے کہا۔

’’اس بخار کو اب پنڈے سے باہر نکلنے دے۔‘‘ ماسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ’’مجھے پتا ہے یہ پھوک کے چڑھنے والا بخار ہے، پنڈ الوس جاتا ہے، پر جب یہ باہر نکل جاتا ہے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ کبھی چڑھا بھی تھا۔‘‘ ماسی اپنا فلسفہ سنا رہی تھی۔

’’چچی جان کیا کر رہی ہیں؟‘‘ حمزہ نے ماسی کی گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔

’’میری ٹھنڈی مٹھی آپا کے دل کو بھی ضد کے بھانبھڑ نے لوس دیا ہے وہ تو چپ کی چپ ہی ہو گئی۔‘‘ ماسی نے کہا۔

’’ماسی مجھے سخت پیاس لگ رہی ہے۔‘‘ حمزہ نے حلق کو تھوک سے تر کرتے ہوئے کہا۔

’’نیچے آجا، کوئی روٹی پانی کر و تسی لوگ، مرنے والے کے ساتھ بھی بھلا کوئی مرتا ہے۔‘‘ ماسی نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’میں آج شام کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا، ماسی تم چچی جان کا بہت خیال رکھنا۔‘‘ باورچی خانے کی پیڑھی پر بیٹھ کر ایک جگ پانی پینے کے بعد اس نے کہا تھا۔

’’اس کو اس حال میں اکیلا چھوڑ جائے گا۔‘‘ ماسی نے اس کی بات پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرنا شروع کیا جو خاصا طویل تھا وہ بے دھیانی سے سنتا رہا۔ اسے اسی کچن میں وہ چلتے پھرتے، کھانا کھاتے ہوئے، لڑتے، جھگڑتے، مذاق کرتے نظر آ رہی تھی، اس نے سر کو جھٹک کر اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے منظروں کو ذہن سے جھٹکنا چاہا اور پھر اپنی بے بسی پر سر جھکا لیا۔

☆☆☆

ٹرین کی کھڑکی سے باہر منظر بھاگ رہے تھے۔ وہ ان پر دانستہ نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ یہ وہی منظر تھے جن کو اِدھر کے اور واپسی کے سفر کے دوران وہ کئی سالوں سے دیکھ رہا تھا، اس سے پہلے یہاں آتے ہوئے بس پر سر خوشی کا عالم سوار ہوتا تھا اور واپسی پر چھوٹی چھوٹی ہنستی مسکراتی یادوں کا ایک خزانہ ساتھ ہوتا تھا۔

’’سنو، یہ فون اکثر ڈیڈ رہتا ہے، تم سے بات یا تو ہو نہیں پاتی ہوتی ہے تو کٹ جاتی ہے، اس بار آؤ تو شیزان سے کیک لے کر آنا اور ہاں فیض کی کوئی کتاب بھی...... ارے گھامڑ تم سائنس کی بورنگ کتابیں پڑھنے والوں کو کیا پتا فیض کو پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے، کتابوں کی دکان پر جا کر فیض احمد فیض کی کتاب مانگنا، پچھلی بار کی طرح فیض محمد کی کتابیں نہ پوچھنے بیٹھ جانا۔‘‘ کچھ عرصے پہلے کی ایک فون کال پر سنی باتیں اسے یاد آئیں۔

’’تم صبیحہ بھابی کے ساتھ جا کر فاروق والوں کے پرنٹ لانا میرے لیے لان کے، ستارہ کی لان اس دفعہ اچھی نہیں آئی...... ہاں، ہاں مہنگی ہے۔ مجھے پتا ہے، فکر مت کرو پورے پیسے دوں گی تمہیں مفت میں نہیں لیتی۔‘‘ ایک اور فرمائش بھری گفتگو۔

’’پتا نہیں تم کیسے پڑھتے ہو فزکس...... اتنا بورنگ سبجیکٹ اور پھر اس کو پڑھ کر تم زیادہ سے زیادہ کرو گے کیا، لیکچرر شپ، اس کے علاوہ اس کا کیا اسکوپ ہے۔ زندگی کو گزارو تم...... زندگی تمہیں گزارنے جا رہی ہے خبردار ہوشیار۔‘‘ وہ لفظوں کی بازگشت سنتا سامنے نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ سن کر کے ایک سنگریزہ پٹری سے اچھل کر اس کی آنکھ سے آ ٹکرایا

اور اسے اپنی آنکھ میں چبھن محسوس ہونے لگی۔

''انگریزی تمہیں آتی نہیں، کلاس ٹیسٹوں میں پٹا پٹ فیل ہوتی ہو، کیا فائدہ اتنے سارے ٹیسٹ پیپرز اور پچھلے سالوں کے پیپرز منگوانے کا، پیسے ضائع ہو رہے ہیں بس۔''

''تم اتنے خبیث ہو حمزہ، تمہاری کالی زبان کے لفظ مجھے ضرور فیل کروائیں گے۔ یا اللہ میں دنیا کے کس کونے میں چلی جاؤں جو تم سے جان چھوٹ جائے۔'' ایک روہانسی، زچ ہوتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے اپنی دکھتی آنکھ پر ہاتھ ملا، وہ نم ہو رہی تھی۔

''تم دنیا کے جس کونے میں بھی اس وقت موجود ہو یقیناً خوش ہو گی کہ مجھ سے تمہاری جان چھوٹ گئی۔'' اس نے کھڑکی کا شیشہ بند کر دیا۔

☆☆☆

''وہ جب سے گاؤں سے واپس آیا ہے، چپ چپ ہے، کھویا کھویا، ویسا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔'' انہوں نے کئی بار خود کو بتایا تھا۔ حمزہ سے پوچھتیں تو وہ ٹال جاتا تھا۔ اس چپ کا عقدہ امین مزارع کے آنے پر کھلا تھا جو ساگ اور کینو کے تحفے دینے خاص طور سے ان کے پاس آیا تھا۔

''شی......'' انہوں نے امین کی بات سن کر اسے خبردار کیا تھا۔ ''فیصل اور اس کی بیوی سے نہ کرنا یہ بات، نہ ہی فضول چرچا کرنا اِدھر اُدھر۔''

''چرچا ہم نے کیا کرنا ہے بی بی جی۔'' امین مزارع ہنس کر بولا تھا۔ ''سات پنڈوں تک آواز گئی ہے اس انہونی کی۔ آپا جی نے اسکول آنا بند کر دیا ہے، مس نگہت کو چارج دے دیا ہے اسکول والوں نے۔ لوگ باتیں کرنے سے نہیں مڑتے، آپا جی نے لوگوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور جی سارا کام تو یہ باؤ حمزہ نمٹا کر آیا تھا اس نے نہیں ذکر کیا آپ سے؟''

امین نے مزید انکشاف کیا تھا۔

''ہوں۔'' انہیں بغیر پوچھے ہی صورتِ حال کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ''امین تو اس خاندان کا وفادار ہے، میٹھی آپا کی عزت کا محافظ ہے، خیال کرنا اذیت میں ہے وہ۔'' انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ فوری طور پر کیا کریں۔ امین کے چلے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں دیر تک ڈوبی رہیں۔

''بڑی عقلوں والا کام کیا تم نے؟'' اس روز وہ عرصے بعد حمزہ سے ناراض لہجے میں بولی تھیں۔

''وہ تو، بے عقل، ناسمجھ تھی۔ تیری عقل کو کیا ہوا جو تو نے میٹھی آپا کی بھی نہ سنی اور بزرگ بن کر نکاح کے بول پڑھانے بیٹھ گیا۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ذہن میں آنے والی ساری بری بری باتیں اسے سناتی چلی جائیں۔

''میں آپ کو سمجھا نہیں پاؤں گا۔'' جواب میں اس نے مختصراً کہا تھا۔

''اتنا ہی منہ کو آئی ہوئی تھی تو اس کلموہے کو ایک دفعہ تو کھڑکانا تھا۔'' انہوں نے اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''پنڈ کوئی سمندر پار تو نہیں تھا جو میں نہ پہنچ پاتی۔''

''آپ کے وہاں پہنچ جانے سے کیا فرق پڑتا؟'' وہ نیچی آواز میں بولا۔

''پتا ہے، مجھے سارا پتا ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولیں۔ ''اپنا غصہ اسے کھوہ میں دھکا دے کر نکالا تو نے۔'' حمزہ نے چونک کر اپنی اماں کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو اور کیا۔'' انہوں نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ جان کر کہ اس نے تجھ پر دینداروں کے لڑکے کو ترجیح دے دی، تو نے اسے کچھ کہا نہ سمجھایا، بس ہاتھ سے پکڑ کر آگے کیا، لے حمزہ چکھ اس کو چکھنے کا، دھوپ کا رخ دیکھ کر کسی کو پتا نہیں چلتا سایہ کدھر کو چلے گا، تو بھی اتنا کا کا نہیں کہ تجھے پتا نہیں اس نکاح کے بعد اس نے کیا جھیلنا ہے۔ نمی نمی لو پہ ساری حیاتی جلنا ہے، کچے کوئلے کی طرح سلگنا اور سیاہ

ہو جانا ہے کہ تخت چڑھی ملکہ بننا ہے۔''

''ماں جی آپ نہیں سمجھتیں، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ صورتِ حال کیا تھی۔'' وہ ان کی باتوں سے گھبرا کر بول اٹھا تھا۔

''اندازہ ہے مجھے، میں تجھے بھی جانتی ہوں اور اس نمانی کی ضدوں کو بھی، تو اس سے وقت لیتا، اسے بہلا پھسلا کر اِدھر لے آتا چار دن، دینداروں کے لڑکے سے مرد بن کر بات کرتا، پر تو نے تو میٹھی آپا کو بھی اپنے ساتھ چپ کرا دیا۔'' وہ مسلسل اسے ملامت کیے جا رہی تھیں۔ ''اوپر سے اس غریب کو اکیلا چھوڑ آیا ہے، تیری اِدھر کون سی ملیں بند ہو گئی تھیں تیرے نہ ہونے سے۔'' انہوں نے اسے مزید گھرکا۔ ''صبح کاغذوں کی فائل لے کر نکلنا اور شام تک دفتر دفتر پھر کر نوکری ڈھونڈھنے کے سوا کون سا ضروری کام تھا تیرا جو رک گیا تھا۔''

حمزہ خاموش بیٹھا سنتا رہا۔

''اس بے چاری کو لوگوں کی زبانوں کے فائر کے آگے اکیلا چھوڑ آیا ہے۔'' وہ بولے جا رہی تھیں۔

''ٹکٹ کرا صبح ہی دو اور چل میرے ساتھ میٹھی آپا کے پاس، نہیں معلوم کیا حال ہو رہا ہو گا اس کا۔'' انہوں نے اس کا شانہ جھنجوڑ کر حکم دیا تھا۔

☆☆☆

اس بار گاؤں آ کر چچی جان کی جو حالت اس نے دیکھی، اس کا دل بیٹھ گیا۔

''جیسے اماں کہتی ہیں اس کے حساب سے کیا میں ان کی اس حالت کا ذمے دار ہوں۔'' وہ ایک نئی کشمکش میں پڑ گیا۔

''اماں جو حل بتاتی ہیں کیا وہ ممکن تھا؟'' اس نے سوچا اور اس کے دل نے نفی میں جواب دیا۔

اماں، چچی جان کی خاموشی کا قفل توڑنے کی کوشش کرتی رہیں مگر ناکام لوٹیں۔ لیکن جتنے دن وہ وہاں رہیں انہوں نے گاؤں کی عورتوں سے ملاقات بھی کی اور ان کے سوالوں کے جواب بھی دیے۔ خود اس سے اور چچی جان سے زیادہ اماں بہادر تھیں۔

''مکمل صفائی کرو گھر کی۔ موت ہو جائے تو بھی اتنے دن کا سوگ نہیں مناتا ہو گا کوئی، غضب ہے اللہ کا من من گرد پڑی ہے ہر چیز پر۔'' اماں نے ماسی ہاجرہ کو حکم سناتے ہوئے کہا تھا۔ اماں کے قیام کے دوران ویران گھر میں آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ چچی جان نے چہرے سے کپڑا ہٹا کر سب کو دیکھنا اور کمرے سے باہر نکل کر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔

''اتنے غم کے ساتھ یہ اپنی عمر تنہا کیسے گزاریں گی؟'' حمزہ سوچتا رہا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' اس نے گھبرا کر ان سے کہا۔ جواب میں انہوں نے سختی سے سر ہلایا تھا اور یہ نہ ہمیشہ کی طرح نہ ہی رہی تھی اس کی اور اماں کی منتوں پر بھی ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ حمزہ جانتا تھا کہ مائرہ جس ضد پر اڑ گئی تھی اماں کی بتائی ہوئی تدبیروں سے بھی وہ اپنی ضد سے دست بردار ہونے والی نہیں تھی۔ پھر بھی اماں کی باتوں نے اسے ایک عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ گاؤں سے اس دن واپس آتے ہوئے اس نے اپنے لیے وہ فیصلہ کیا تھا جس کا پہلے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

جس روز اس کی اس گورنمنٹ ہائی اسکول میں بطور سائنس ٹیچر تعیناتی ہوئی جہاں سے اس نے خود میٹرک کیا تھا اس دن اس جیسا خوش اور اس جیسا افسردہ شاید کوئی نہ تھا۔ اس سے دو روز پہلے ہی اسے اٹامک انرجی کمیشن سے بھی اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ اس پر اسکول ماسٹری کو ترجیح دینے کا پہلے اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا مگر وہ دل کی خلش تھی کہ کیا تھا جس نے اسے گورنمنٹ ہائی اسکول کی ماسٹری کو ترجیح دینے پر اکسایا تھا۔ اس کے اس فیصلے نے اس کے گھر میں سب کو ہی چونکایا تھا سوائے اس کی اماں کے۔ فیصل بھائی نے اسے احمق اور جذباتی قرار دیا تھا اور بہنوں نے سخت مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ مگر اماں نے سنجیدگی سے سر ہلایا

تھا۔

"ٹھیک کیا ہے، بچے پڑھانے سے بڑا نیکی کا کام کوئی نہیں، تیری عاقبت بھی سنور جائے گی۔" اماں نے خود کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی مگر اتنی حکمت کی باتیں نہ جانے کیسے کر لیتی تھیں۔

☆☆☆

وہ اپنا مختصر سامان لیے اس ٹرین پر سفر کرتا گاؤں پہنچا تھا۔ اور یہاں پہنچ کر اس نے دیکھا تھا کہ چچی جان کے چہرے پر اس کی آمد کی نوعیت جان کر زندگی کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔

"بیٹھک کے ساتھ والا کمرا حمزہ کے لیے تیار کرو۔" انہوں نے اشارے سے ماسی ہاجرہ کو کہا تھا۔

"آپ بول سکتی ہیں تو بولتی کیوں نہیں، نہیں بولا جاتا تو پھر میں آپ کو کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔" حمزہ نے ان کو ابھی تک اشاروں کی زبان میں گفتگو کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

"نہ۔" انہوں نے انگلی کے اشارے سے جواب دیا تھا اور یہ اسی طرح کی نہ تھی جس کے آگے شاید کوئی دلیل نہیں چلتی تھی۔ اس نے فی الحال اس موضوع پر بات کرنے سے گریز کرنا بہتر خیال کیا۔

☆☆☆

گورنمنٹ ہائی اسکول کی ماسٹری کچھ زیادہ مشکل کام ثابت نہ ہوا۔ وہ اپنے ہی استادوں کے درمیان استاد بنا بیٹھا تھا اور اپنے شاگردوں میں جلد ہی ہر دلعزیز ثابت ہونے لگا تھا کیونکہ وہ پڑھانے کے نت نئے طریقے متعارف کروا رہا تھا۔ ڈنڈے کے زور پر چلنے والے لڑکے جدید ایکٹیویٹیز کے ذریعے پڑھ رہے تھے اور انہیں اس کی کلاس کا انتظار رہتا تھا۔ اس کے استاد اس کو بچوں سے سختی برتنے کو کہتے اور وہ مسکرا دیتا۔

"دیکھ لینا یہ بچے سائنس میں رزلٹ نہیں دیں گے، تم ان کو مست رکھتے ہو۔" وہ کہتے۔

"ہم بہتیری ہڈیاں تڑوائیں لیکن ہم میں سے کتنے میٹرک پاس کر گئے سرجی یاد ہے آپ کو؟" وہ کہتا اور اپنے طریقے سے کام کرنے میں مگن رہتا۔ وہ قصبے کا اسکول تھا صبح کا گیا شام کو وہ واپس گاؤں جاتا۔ گاؤں جانے کے لیے اسے لائن پار کرنا پڑتی اور اس گاؤں کے آگے سے گزرنا ہوتا جہاں مائرہ گئی تھی۔ اس گاؤں کو جانے والے راستے سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھاری ہو جاتا اور وہ اپنی ویسپا وہاں سے بھگانے کی کوشش کرتا تھا۔

"میں سن گن لیتی رہتی ہوں۔" ماسی ہاجرہ کبھی کبھار اس کے کان میں سرگوشی کرتی۔ "وہ تو کب کی اپنے بندے سمیت وہاں سے چلی گئی، کوئی کہتا ہے کراچی گئی کوئی کہتا ہے ولایت چلی گئی۔"

"اس کے سسرالی اس کی کوئی قدر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں سات پنڈ ہمیں بددعائیں دیتے ہیں چوہدریوں کی لڑکی لانے پر۔" وہ بتاتی۔

"ان سات پنڈوں کی بھی عجیب تھیوری ہے۔ یہ دانتوں میں انگلیاں دبائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ملامتیں کرتے ہیں، دوسروں کے معاملوں پر سرگوشیاں کرتے ہیں اور سن گن لینے میں مصروف رہتے ہیں، ان کو کوئی اور کام نہیں اپنا ذاتی۔" کبھی کبھی وہ ماسی ہاجرہ کو جواب دیتا۔

"سات پنڈ مطلب ہے کہ اِدھر اُدھر کے لوگ۔" وہ وضاحت کرتی تو وہ ہنس دیتا۔ یہاں آنے کے ایک دو ماہ بعد اس نے لاشعوری طور پر کوشش کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ اس گھر میں ہر وہ سامان کرے گا جو چچی جان کو زندگی کی طرف واپس لا سکے۔ اس نے اپنی پہلی تنخواہ پر گھر کی چند ضروری مرمتیں کروائیں اور اس کے بعد رنگ روغن نیا کروایا۔ مرغیوں کے ڈربے اور پرندوں کے پنجرے لا کر رکھے، صحن کی کیاریوں میں موسمی پھولوں اور پھلوں کے نئے بیج ڈلوائے۔ گھر میں رونق کی آمد آمد ہونے لگی۔ گاؤں کے لوگوں سے اس کی میل ملاقات بڑھی تو دروازے پر دستک بھی ہونے لگی۔ گھر زندہ اور

موجود انسانوں کا مسکن بننے لگا۔ اس نے دیکھا تھا کہ ان تبدیلیوں کا اثر چچی جان کے مزاج اور طبیعت پر پڑنے لگا تھا۔ وہ ہر وہ کوشش کرنا چاہتا تھا جس سے ان کے دکھ اور عمر بھر کی ریاضت ضائع جانے کا احساس کم ہو سکے۔

"کسی دن وہ کمرا بھی کھول کے دیکھ لے باؤ، جس میں مائرہ رہتی تھی۔ اس کا چونا تو اس وقت بھی جھڑ رہا تھا اور باہر گلی کا پانی اندر دیوار میں سیل دے رہا تھا۔" ایک دن ماسی ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے اسے کہا تھا۔

"اچھا دیکھتے ہیں۔" اس روز وہ اسے ٹال گیا تھا مگر اس بات کے دو ماہ بعد بند گلی میں کھڑے گاؤں کے ایک دوست سے بات کرتے اس کی نظر اس کمرے کی بیرونی دیوار میں پڑتی دراڑ پر پڑی تھی۔

"ارے یہ کمرا تو زیادہ خراب ہو رہا ہے۔" اس نے سوچا اور اسی رات چچی جان کے سو جانے کے بعد وہ دروازہ اتنے عرصے کے بعد کھولا تھا۔

کمرے میں موجود ہر چیز پر دیواروں سے جھڑی قلعی کے ذرات بکھرے تھے اور سیلن کی بو تھی۔ اس نے سوئچ پنچ کر کے ٹیوب لائٹ بھی جلا دی۔ ہر چیز جوں کی توں رکھی تھی۔ کرسی اور میز جس پر بیٹھ کر وہ پڑھتی لکھتی تھی۔ سنگار میز جس کے آئینے کے ایک طرف اس کے پراندے اسی طرح لٹکے تھے، سنگار میز پر بلو گراس اور ایوننگ ان پیرس کی خالی شیشیاں رکھی تھیں، کتابوں کی شیلف جس میں موجود کافی کتابیں شاید وہ ساتھ لے گئی تھی، کچھ کتابیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ حمزہ کچھ دیر ساکت کھڑا ان مانوس چیزوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر سنگار میز کی دراز کھولی، ٹوٹی چوڑیوں کے کانچ، لپ اسٹکس کے خالی رول، چند رومال، کاجل کی پرانی ڈبیا اور کریم کی خالی شیشی کے درمیان تین چیزیں ایسی بھی پڑی تھیں جنہیں وہ حرزِ جاں بنائے رکھتی تھی۔ وہ ان چیزوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئی تھی؟ حمزہ حیران ہوا۔

نظم

عدم سے بشر آئے گا ایک دن
زمانہ کہے گا اسے نیک دن
لڑکپن کے دن ہوں گے شاہی کے دن
محبت کے دن بے گناہی کے دن
خوشی ان دنوں نور برسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی
پھر آئے گا مدہوش کرنے شباب
رہے گا خیالِ شراب و کباب
کبھی جوشِ مستی کبھی نوشِ خواب
نہ فکرِ ثواب نہ خوفِ عذاب
گھٹا دل پہ پندار کی چھائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی
زمانہ کرے گا جواں کو ادھیڑ
توانائی کا ہو گا پژمردہ پیڑ
لگائے گا اسپِ جوانی کو ایڑ
نقاہت کرے گی قواؤں سے چھیڑ
طبیعت اس آفت سے گھبرائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی
بڑھاپے سے ہو گا بڑا انقلاب
نہ ہو گی دلیری نہ ہو گا شباب
ضعیفی کرے گی کل اعضا خراب
یہاں تک کہ جینا بھی ہو گا عذاب
اجل چیل سی سر پہ منڈلائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی
مرض موت کا جب اٹھائے گا سر
دوا کر کے ہاریں گے کل چارہ گر
بگڑ جائے گا کھیل سب سربسر
بن آئے گی بیمار کی جان پر
بڑی سختی نیزہ دکھلائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

مرسلہ: سیدہ رفیعہ ابدالی، نارتھ کراچی

اس نے دراز میں سے ان تینوں کو اٹھا لیا۔ شفاف پلاسٹک کے ڈبے میں رکھا سرخ مزاری کا چھوٹا سا ماڈل، پارکر کے ڈبے میں پیک پین اور بال پوائنٹ اور ایک چھوٹے سے ٹائز میں جڑا ٹیبل کلاک جو ابھی تک اپنی اصلی پیکنگ میں بند تھا۔ یہ تینوں چیزیں اس نے اپنے مرحوم ماموں سے فرمائش کر کے منگوائی تھیں اور اسے بے حد عزیز تھیں۔

''نہ جانے وہ انہیں یہاں کیوں چھوڑ گئی ہے؟'' حمزہ نے بلا ارادہ ان تینوں کی پیکنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ ''یا پھر شاید وہ انہیں بھول گئی۔'' اسے خیال آیا۔

''وہ ان چیزوں سے کہیں زیادہ قیمتی انسانوں کو اِدھر ہی بھول گئی تو یہ تو بے جان چیزیں ہیں۔'' اس کے دل نے کہا۔

''ان تین ٹریول بیگز میں عزیز نہیں ضروری چیزیں ہوں گی۔'' اس نے سوچا اور سنگار میز کی دراز بند کر کے اس کے تالے میں لٹکتی چابی گھما کر اسے بند کرنے کے بعد وہ چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔

وہ کمرا اس نے بہت خیال سے ٹھیک کرنے کے بعد دوبارہ بند کر دیا تھا۔ چچی جان اس کی یہ ساری مصروفیت خاموشی سے دیکھتی رہیں مگر انہوں نے اسے منع کیا نہ خوشی کا اظہار۔

☆☆☆

اسے گاؤں آئے اور چچی جان کے ساتھ رہتے سات مہینے گزر گئے، وہ گاؤں کے ماحول میں رچ بس گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ استاد ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے اور اس کے یہاں رہنے کی وجہ سے مائرہ کے سلسلے میں ہونے والی چہ میگوئیاں بھی بند ہوگئی تھیں۔ اس نے امین مزارع سے چچی جان کی بچ رہنے والی زمین کا ٹھیکا طے کر دیا تھا، گھر میں چچی جان کے گزارے کے لیے آمدنی کا بندوبست ہو گیا تھا۔ باقی اخراجات خود اس نے اٹھا رکھے تھے۔ شام کو گاؤں کے کچھ دوستوں کے اصرار پر میٹرک کے لڑکوں کو ٹیوشن بھی پڑھا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی خلش مٹنے لگی تھی اور ذہن سکون پذیر ہونے لگا تھا۔

مگر وہ ایک مختلف دن تھا جب چچی جان کے نہ سمجھ میں آنے والے اشاروں کی زبان کی مترجم ماسی ہاجرہ نے اس سے کہا تھا کہ چچی جان چاہتی تھیں وہ شادی کر لے۔

''نہیں ماسی، شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا تھا۔

''یہ میری خواہش ہے۔'' جواب میں چچی جان نے اشارہ کیا تھا۔ ان کے اشارے میں ایسا اعتماد تھا جیسے انہیں یقین ہو حمزہ اُن کی بات ٹال نہیں سکتا۔

''تمہاری ماں جی سے بات ہوئی تھی میٹھی آپا کی میرے ذریعے ٹیلی فون پر۔'' ماسی ہاجرہ نے بتایا۔ ''وہ کہتی تھیں بسم اللہ کرو، جہاں دل چاہتا ہے بات پکی کردو۔''

''مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' وہ بدکا تھا۔

''کیوں، اس میں کون سی غلط بات ہے؟'' ماسی ہاجرہ نے پوچھا۔

''میرا ذہن، میرا دل نہیں مانتا۔'' بے اختیار یہ لفظ اس کے منہ سے نکلے۔ اس نے گھبرا کر چچی جان کی طرف دیکھا جو اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ''میرا مطلب ہے میں نے اس کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں۔'' وہ ہکلایا۔

''میں جانتی ہوں کیوں نہیں سوچا۔'' چچی جان کی آنکھیں اسے کہتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''مگر اس طرح اکیلے زندگی نہیں گزرتی۔'' ان کے اشارے کو ماسی ہاجرہ نے ترجمہ کیا۔ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

''مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی شادی کر سکتا ہوں۔'' چند دن بعد اماں کے فون پر اُن کے بھی اسی اصرار کے جواب میں اس نے کہا تھا۔

''اللہ کے فرمان کی نافرمانی ہے یہ تو۔'' انہوں نے ایک اور نکتہ سوجھا دیا۔ ''اکیلی ذات صرف اللہ پاک کی ہے، بندوں کے اس نے جوڑے پیدا کیے ہیں..... اکیلا بندہ نہیں جچتا۔'' وہ بولیں۔

''ٹھیک ہے...مگر میرا ذہن ابھی اس طرف سوچنے کو مائل نہیں ہوتا۔'' اس نے لاجواب ہو کر کہا۔

''ذہن کو اس طرف لا، میٹھی آپا کے گھر میں رونق ہو جائے گی، وہ رونق کو ترسی ہے، اس کے دل لگانے کا سامان کر۔'' اماں دھیمے لہجے میں اس پر جذباتی وار کر رہی تھیں۔

''کس سے کروں شادی؟'' اس نے پوچھا۔

''بتائیں کوئی ہے آپ کی نظر میں۔''

''انسان نیت کرلے تو سبب ہزار بن جاتے ہیں، تو نیت تو کر۔'' انہوں نے رسان سے جواب دیا، وہ خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

''میٹھی آپا نے چوہدری ذوالفقار کی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا آج۔'' اس کے چند ہی دن بعد ماسی ہاجرہ نے خوشی سے لڑکھڑاتی آواز میں اسے بتایا۔

''وہ کون ہے چوہدری ذوالفقار؟'' حمزہ نے نظر اٹھا کر ماسی کی طرف دیکھا۔

''وہ ہی نویں پنڈ والا چوہدری، کلثوم کا ماما۔'' ماسی نے جو تعارف کروایا وہ حمزہ کے لیے اجنبی تھا۔

''اسی کی بیٹی ہے آمنہ، بڑی سوہنی اور بڑی عقلوں والی۔'' ماسی نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

''اچھا پھر......؟'' اس نے پوچھا۔

''او بچی میٹھی آپا کو بہت پسند آئی ہے، اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی اِدھر ملنے۔'' ماسی ہاجرہ نے اس کو تھوڑا سا بھی تجسس ظاہر نہ کرتے دیکھ کر ذرا تھم کے بتایا۔

''سوہنے اور عقلوں والے لوگوں کو اپنے جیسے ساتھ ہی بجتے ہیں، ماسی مجھ میں تو یہ دونوں ہی خوبیاں نہیں ہیں۔'' حمزہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تجھ میں کیا کمی ہے باؤ، وہ تو بسم اللہ کر کے رشتہ دیں گے۔'' ماسی نے جھٹ جواب دیا۔ ''جب دینداروں کے لڑکے کے ساتھ چوہدریوں کی لڑکی بس سکتی ہے تو سب راضی خوشی رہ سکتے ہیں۔'' ماسی نے اپنا فلسفہ پیش کیا۔

''بس بھی گئی، رچ بھی گئی۔'' حمزہ کا دل چاہا کہے۔ ''ایسے کہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔'' اس کے دل میں عجیب سا بوجھل پن اتر آیا۔

''ماسی تو چچی جان سے کہہ دینا، میں ہمیشہ کی طرح ان کی خوشی کے آگے سرنڈر کرتا ہوں۔'' نہ جانے کس احساس سے مغلوب ہو کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''کیا کرتا ہوں؟'' ماسی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''مطلب میں ان کی خوشی میں راضی ہوں۔'' اس نے وضاحت کی اور ماسی چشم زدن میں وہاں سے بگٹٹ ہوئی، ماسی کے دل کی خوشی کا عالم وہ اس کے چہرے پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے نظریں گلاب کی اس باڑھ پر ٹکالیں جو صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ کھڑی تھی۔

''کیا تم کبھی جان پاؤ گی کہ تمہارے چلے جانے کے احساس نے میری زندگی اور میرے دل میں کیا کیا وارداتیں کی ہیں، کیسا کیسا رخ بدلا ہے میرے مزاج کا؟'' اس نے مائرہ کے کمرے کی صحن میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کچھ ایسا کروں جو تمہارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دے مگر تمہارے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھنا میرے نصیب میں نہ تھا، یہ کسی اور کا مقسوم تھا مگر یہ جواب میں کر رہا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے۔'' پھر اس نے

سوچا۔ ''دل بہلائے رکھنے کا بہانہ، چچی جان کی محبت یا پھر......'' وہ سوچتے سوچتے رک گیا اور اپنا دھیان آسمان پر اڑتی پتنگوں کی طرف کرلیا۔

☆☆☆

پھر وہ آبائی مکان رنگ برنگ برقی قمقموں سے منور ہوا، ہار پھول خوشبوؤں سے بھی سجا، گاتی بجاتی برات لے کر وہ چوہدری ذوالفقار کی بیٹی رخصت کروانے پہنچا اور اسی آبائی مکان میں اس کے کمرے میں خوشبوؤں سے مہکتی، رنگوں میں بسی دلہن کا اضافہ ہوگیا۔ ایک قطعی اجنبی انسان سے عمر بھر کا تعلق بن گیا۔ اس رات اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اسے لگا جیسے اس کے قدم اُدھر کو اٹھتے ہی نہ ہوں۔

''یہ کیسی خیانت والی بات ہے کہ دل میں کوئی اور بسا ہو اور جسم کسی اور سے تعلق باندھ لے۔'' وہ اپنے کمرے سے باہر برآمدے کے ستون سے لگا کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے سامنے در و دیوار سے لپٹے برقی قمقمے روشنیاں بکھیر رہے تھے۔ برقی بورڈ پر بنی چرخہ کاتتی عورت پر جڑے ننھے ننھے قمقمے جل بجھ رہے تھے۔ پل میں وہ روشن ہوتی، پل میں غائب، وہ غائب دماغی کی کیفیت میں اس روشنی کی بڑھیا کو دیکھتا رہا۔ آسمان پر بادلوں کی اوٹ میں چھپا چاند بیمار، کمزور اور مضمحل نظر آرہا تھا۔ فضا میں دھند کے پھوئے اِدھر سے اُدھر اڑتے پھرتے تھے۔

''یہ شادمانی کی رات ہے مگر میرا دل کیوں اتنا ویران ہے، خالی اور بے احساس۔'' اس نے سوچا اور پھر ستون کا سہارا چھوڑ کر اس سے دور ہٹا۔ گھر کے مکینوں پر نیند غلبہ کیے بیٹھی تھی مگر وہ ایک جی جو آنکھوں میں خواب بسائے اس کا منتظر تھا۔ اسے خیال آیا اور وہ بوجھل دل اور من بھر ہوتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا جو پھولوں اور ائرفریشنر کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

☆☆☆

آمنہ، چچی جان اور اماں کی آئیڈیل بہو ثابت ہوئی تھی۔ وہ کم گو، لیے دیے رہنے والی، نظریں جھکائے اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ اتنی کم گو تھی کہ اگر کبھی وہ کوئی طویل جملہ بولتی تو حمزہ کو اس کی آواز اجنبی لگتی۔ اس نے انٹر کا امتحان دیا ہی تھا کہ اس کی شادی ہوگئی۔ حمزہ کو اندازہ تھا کہ وہ اس کی ذہنی سطح کو کبھی نہیں پاسکے گی، وہ اس سے بس ضرورت کے تحت ہی بات کرتا تھا مگر آمنہ بنا اس کے کہے اس کا ہر کام وقت پر انجام دیتی۔ وہ شاید کم عرصے میں ہی حمزہ کی پسند ناپسند کو جان گئی تھی۔ حمزہ کو اپنا ہر کام وقت پر ہوا مل جاتا تھا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ اماں اِدھر رہیں اور جاتے ہوئے وہ آمنہ کے کلمے پڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد چچی جان کو اس نے جب کبھی غور سے دیکھا...... اسے لگا ان میں زندگی کی حرارت اور خوش رہنے کی صلاحیت بڑھنے لگی تھی۔

''میں خود اپنے لیے نہ سہی چلو کسی کے لیے تو کچھ کرنے کے قابل رہا۔ زندگی یوں ہی ضائع نہ گئی۔'' وہ کبھی کبھار سوچتا۔ چچی جان کے سارے کام آمنہ کرتی تھی۔

شادی کے بہت عرصے بعد حمزہ کو پتا چلا کہ وہ حافظہ قرآن بھی تھی۔ چچی جان آنکھیں بند کیے بیٹھی رہتیں اور آمنہ نیچی آواز میں ان کے قریب بیٹھی تلاوت کررہی ہوتی۔ پھر اس نے دیکھا چچی جان کے علاوہ بھی گاؤں کی کچھ خواتین اِدھر آنے لگی تھیں۔ وہ سب آمنہ کی تلاوت سننے آتی تھیں۔ حمزہ یہ سب گھر میں ہوتا دیکھتا اور بے نیاز نظر آنے کی کوشش کرتا۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے، نرم، گرم، آسان، کٹھن دن۔ کئی جاڑے رخصت ہوئے اور بہاریں آئیں، گرمیاں آکر بہاروں کو رخصت کرتی رہیں اور پھر خزائیں ڈیرا ڈال لیتیں۔ زندگی اپنے ڈھب پر گزرتی جارہی تھی۔ وقت کے ساتھ حمزہ پہلے کی نسبت کم گو اور مزید سنجیدہ ہوگیا۔ آمنہ کو کبھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس

کے شوہر کے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے کیسا تھا، یہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ جو اس نے دیکھا تھا وہ ایسا ہی تھا، سنجیدہ، بے نیاز، کم گو، سوچوں میں گم......وہ کبھی اس کو بہت غور سے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتی تھی۔ بہت پہلے ایک بار اس نے اسے غور سے دیکھا تھا، وہ درمیانے قد اور متناسب جسم کا مالک تھا۔ گندمی رنگت اور سیاہی مائل بھورے بال اس کی شخصیت کو اچھا خاصا جاذب نظر بناتے تھے۔ وہ اسے غور سے دیکھنے پر بہت خوش ہوئی تھی مگر پھر اس کی نظر اس کی گہری بھوری آنکھوں میں کروٹیں لیتی اداسی پر پڑ گئی، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اداسی غیر معمولی تھی اور جیسے مستقل ڈیرا ڈالے ہوئے تھی۔ اس نے اس کے بعد دوبارہ اسے غور سے دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی نہ ہی کبھی وہ یہ ہمت کرسکی کہ اس سے اس اداسی کا سبب پوچھے، وہ انتہائی ذاتی سطح پر اپنے دروازے اس مضبوطی سے بند کرلیتا تھا کہ دستک دینے والے ہاتھ تھک جائیں دروازہ کھل کر نہیں دیتا تھا۔ آمنہ بہت جلد اس بات کو بھانپ گئی تھی اس نے کبھی اس بند دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

شادی کے ایک سال کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کم گو، سنجیدہ، لیے دیے رہنے والے شوہر کی محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس کے شوہر کے بارے میں لوگ کہتے تھے کہ بڑا لائق فائق تھا۔ اس کے شاگرد قابل اور ذہین تھے اور اپنے استاد کو اپنا رول ماڈل قرار دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں میں اس کی نیک نامی تھی، وہ اپنی بیوہ چچی کی خاطر شہر کی کامیاب زندگی ٹھکرا کر اِدھر محدود زندگی گزارنے کو آگیا تھا۔ اس کی ذات سے متعلق سارے نکات مثبت تھے، اس سب پر قربان آمنہ اپنی زندگی پر صابر شاکر خوشی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ اس کو صرف ایک بات کا قلق ہر دم رہتا تھا۔ چار سال گزرنے کے بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ اس کا بے نیاز شوہر اس محرومی سے بھی بے نیاز تھا۔ اس نے اس سلسلے میں اسے کبھی خواہش کرتے یا محرومی کا شکوہ کرتے نہیں سنا تھا۔

''میرا ہی کچھ قصور ہوگا۔'' اس نے یہ کمی بھی اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی اور اس کے زیرِ اثر وہ پہلے سے زیادہ تندہی سے اس کی اور چچی کی خدمت میں مشغول ہوجاتی۔ ماسی ہاجرہ چپکے چپکے اسے کئی قسم کے ٹونے ٹوٹکے آزمانے کی ترکیبیں بتاتی اور وہ چپکے چپکے ان پر عمل کرتی رہتی۔

''تیرے سینے میں تو قرآن محفوظ ہے بی بی، تجھے اللہ کبھی نامراد نہیں رہنے دے گا۔'' ماسی ہاجرہ اسے یقین دلاتی۔ وہ سر جھکا دیتی۔

☆☆☆

دن یونہی خاموشی سے گزر رہے تھے۔ وہ سب اپنی روٹین کے عادی ہوچکے تھے مگر وہ ایک مختلف دن تھا جب آمنہ صحن میں مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی اور ماسی ہاجرہ پسوانے سے پہلے سوکھی مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ رہی تھی۔ چچی جان اپنے کمرے میں لیٹی تھیں، جب گھر کا داخلی دروازہ بنا دستک زور سے ایسے کھلا کہ اس کے کواڑ دیوار سے جا لگے۔ دروازے کے قریب رکھے رنگ برنگ پرندوں کے پنجرے میں بند پرندے بری طرح پھڑ پھڑا کر پنجرے کی جالیوں سے جا لگے۔ صحن میں پھرتی مرغیاں اچھل کر اِدھر اُدھر جا گریں۔ آمنہ نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آنے والی بے حد اعتماد کے ساتھ صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ آمنہ نے استعجاب بھری نظروں سے ماسی ہاجرہ کی طرف دیکھا جس کے مرچیں توڑتے ہاتھ اپنی جگہ جیسے تھم گئے تھے۔

''کیسی ہو ماسی؟'' آنے والی نے خود ہی ماسی کو مخاطب کیا تھا۔

''تو...... کیسے آگئی؟'' لفظ ماسی کے منہ سے اٹک اٹک کر نکلے۔

''کیا نہ آتی؟'' اُدھر سے جواب میں سوال آیا۔

ماسی کے پاس شاید اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے سر جھکا کر جلدی جلدی مرچیں سمیٹنا شروع کر

دیں۔ آنے والی مالکانہ استحقاق کے ساتھ قدم بڑھاتی اندر کو چلی گئی۔

''مائرہ ہے۔'' اس کے اندر جانے کے بعد ماسی نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے دیکھا ماسی کے دوپٹے کا کونا اس کے دانتوں تلے دبا تھا۔

چچی جان کی وہ بیٹی جو دینداروں کے لڑکے کے ساتھ نکاح کر کے چلی گئی تھی واپس آ گئی تھی۔ آمنہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی شاید۔

☆☆☆

ماسی ہاجرہ حیران تھی کہ مائرہ کے آنے پر جس ہنگامے کی وہ توقع کر رہی تھی۔ وہ نہیں ہوا تھا۔ میٹھی آپا نے مائرہ کی آمد کی خبر سن کر کچھ بھی ردِعمل ظاہر کیے بغیر سالوں بعد ایک بار پھر منہ پر کپڑا ڈال لیا تھا۔ حمزہ کو اس شام گھر لوٹنے پر جب مائرہ کی آمد کا پتا چلا تو وہ بھی ماسی کو اتنا نارمل لگا تھا جیسے یہ کوئی متوقع بات ہو۔ مائرہ نے آ کر کسی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی، ماسی سے صرف اپنے کمرے کی چابی مانگی تھی۔ چابی حمزہ کے پاس تھی اسی لیے حمزہ کی آمد تک وہ پچھلے برآمدے میں بچھے تخت پر یوں لیٹی رہی تھی جیسے یہاں سے کبھی گئی ہی نہ ہو۔ حمزہ کی آمد پر ماسی کے ذریعے چابی لے کر وہ اپنے کمرے میں جا گھسی تھی۔ ماسی کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا اسے مائرہ کے کمرے کی صفائی کرنی چاہیے یا نہیں۔ مالکوں سے پوچھے بغیر وہ یہ کام کیسے سرانجام دے سکتی تھی۔

''مگر مالک کون ہے بھلا؟'' یہ سوال پہلی بار اس کے ذہن میں آیا تھا۔

''ہر چیز سے ریٹائرڈ میٹھی آپا، حمزہ یا آمنہ؟'' ماسی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس بات پر غور ملتوی کر دیا اور اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ جب باقی سب اتنے نارمل تھے تو اسے کیا ضرورت تھی سوچ سوچ کر ہلکان ہونے کی۔

''وہ اس گھر کی بیٹی ہے، جو عرصے کے بعد میکے آئی ہے اس کی مدارات میں کوئی کمی نہ کرنا۔'' اس شام آمنہ کے کم گو، سنجیدہ مزاج شوہر نے اسے ہدایت کی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اس فرمان کو قبول کیا اور گھر کے باورچی خانے سے پلاؤ اور قورمہ پکنے کی مہک اٹھنے لگی تھی۔

☆☆☆

مائرہ کسی سے زیادہ بات کیے بغیر اپنی مرضی سے دن، رات گزار رہی تھی۔ نہ اس سے کسی نے اس طرح آمد کی وجہ پوچھی نہ اس نے خود کچھ بتایا۔ وہ اپنی مرضی سے اٹھتی اور مرضی سے سوتی۔ جاگنے پر اسے آمنہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا، سو جانے پر اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالتا تھا۔

ماسی ہاجرہ یہ سب دیکھتی اور سوچتی ''یہ پڑھے لکھے لوگوں کے رویے ہیں، ہم جاہل کیا جانیں مصلحت اندیشی، خاموش طبعی اور سکون پذیری کو، ہم تو اس طرح کی صورتِ حال میں آنے والی لڑکی کو بغیر اس کی بات سنے، طعنے کوسنے دے دے کر ہی اس کا سینہ چھلنی کر دیں، اور پھر دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ ہونا تو ایسا ہی چاہیے، دل کی جلن اور برسوں کی دُھن کو نکل جانے کا موقع تو ملنا چاہیے۔'' وہ اپنے کام میں مگن مسلسل اسی صورتِ حال پر غور کرتی سوچتی رہتی۔

''وہ جس ڈھٹائی سے گئی اسی ڈھٹائی سے واپس آ گئی اور نخرہ یہ ہے کہ کسی سے بات تک نہیں کرتی اور پورا حق بھی جتاتی ہے، در فتے منہ۔'' ماسی کی سوچوں پر جو فیصلے وہ دیتی وہ بھی دل ہی میں رہتے۔

☆☆☆

''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں میں کیوں آ گئی جبکہ مجھے یہاں دوبارہ آنے سے سختی سے منع کیا گیا تھا؟'' پھر ایک شام مائرہ کی چپ ٹوٹی اور اس نے حمزہ سے پوچھا۔

''وقت گزرنے کے بعد ایسے کئی اسٹیٹ منٹس لمحوں کی گرد تلے چھپ جاتے ہیں، کون ان کو جھاڑ پونچھ کے باہر نکالے۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا۔

''گویا تم لوگوں نے دل سے وہ بات نکال دی۔'' مائرہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''لوگوں کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا، میں اپنی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے بھی میں نے شاید اس وقت بھی اس بات کو دل میں نہیں بٹھایا تھا۔''

''اچھا۔'' وہ جیسے بری طرح چونکی تھی۔ ''خیر۔'' پھر اس نے سر کو جھٹکا تھا۔ ''میں امی کی بات کر رہی ہوں۔''

''ان کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' حمزہ نے نرمی سے کہا۔

''تم ہمیشہ سے ان کے نمائندے ہو، تم کو کیا نہیں پتا ہوتا ان کے بارے میں۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''اور مجھے تو تمہارے رنگ ڈھنگ پر بھی حیرت ہو رہی ہے۔'' پھر حمزہ کا جواب سنے بغیر ہی اس نے کہا۔ ''جتنے تم جینئس تھے، میرا خیال تھا کہ کسی دن میں تمہارا نام فزکس کے نوبل پرائز ونر کے طور پر سنوں گی مگر تم تو بن گئے اسکول ماسٹر' وہ بھی گورنمنٹ ہائی اسکول کے۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں حمزہ کی طرف دیکھا۔ ''لڑکوں کو ڈنڈے مارنے اور مرغے بنانے والے ماسٹر صاحب، کچی پنسلوں کو کان میں پھیر کر کان کی صفائی کرنے والے ماسٹر جی، اسکول کے لڑکوں سے کندھے اور ٹانگیں دبوانے والے سر جی۔'' وہ ہنسی اور اس کی ہنسی میں چھلکتا تمسخر کسی کو بھی محسوس ہو سکتا تھا۔

''یا پھر شاید تمہیں تفریح اور چھٹی کے وقت اسکول گیٹ کے باہر بکنے والی چاٹ، سموسے، نان حلیم، چنے چاول، مرونڈے، گول گپے اور کراری دال کی فیکلٹیسی نے اِدھر لا پھینکا، ہاہا۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔

''مجھے یقین نہیں آتا حمزہ، یہ تم ہو، یہ تمہاری زندگی ہے۔'' اس نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''مسلسل شلوار قمیص پہننے والے، پاؤں میں کھیڑیاں پہن کر پھرنے والے، مرغیوں، بطخوں، پرندوں کے دانے دنکے کا حساب کتاب رکھنے والے، بھینسوں، گائیوں اور بکریوں کی لک آفٹری کرنے والے، کس کا جھال گر گیا، کس کو منہ کھر کی بیماری لگ گئی، فصلوں پر امریکن اور گلابی سنڈی سے بچاؤ کے اسپرے کروانے والے، پانی کی باری کے انتظار میں راتیں جاگنے والے۔ اور تم نے شادی بھی کی تو کس سے......'' اس نے باہر صحن کی طرف اشارہ کیا۔

''اناج پھٹکتی، کوٹھوں اور صحنوں کی لپائیاں کرتی، کمروں میں جھاڑو پونچھا کرتی، یخنی دار پلاؤ پکاتی اور گڑ والے چاول پکانے کی ماہر روتی صورت لڑکی سے...... جسے کچھ پتا نہیں گھر کے باہر، اس گاؤں سے باہر، ملک سے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جو بس اپنی بکھری لٹیں سنوارتی ساس اور شوہر کی خدمت میں مگن اس فکر میں مبتلا رہتی ہے کہ کہیں اس سے کوئی ناخوش نہ ہو جائے۔'' اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا تھا۔

''واہ حمزہ۔ تو تمہاری زندگی کا ڈھب یہ ہونا تھا۔'' اس نے تمسخر اڑاتی نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔ جواب میں حمزہ نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''تمہیں یہاں کوئی بے آرامی تو محسوس نہیں ہوتی ہے؟'' اس کا جواب بالکل ہی اور نوعیت کا تھا۔

''کوئی چیز چاہیے ہو تو بتاؤ؟'' مائرہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو مجھے پتا تھا تمہارے پاس میری کسی بات کا جواب نہیں ہوگا۔

☆☆☆

پھر مائرہ نے بات بے بات آمنہ پر حکم چلانا اور اس کا تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔ ماسی ہاجرہ کو آمنہ سے اس کا یہ رویہ چبھتا تھا اور اس بات کو وہ میٹھی آپا کے پاس بیٹھ کر اُن کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہلکی آواز میں جتاتی رہتی تھی، جواب میں اگر کبھی وہ چہرے سے کپڑا ہٹاتیں تو لگتا اُن کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے ہیں، اُن کے چہرے کی واپس آتی شادابی زردیوں

میں بدلنے لگی تھی۔ وہ کمزور اور دکھی نظر آتی تھیں۔ ان دنوں میں تو وہ اشاروں سے کچھ کہنا بھی چھوڑ گئی تھیں۔ وقت کے وقت آمنہ ان کے سامنے ناشتا، کھانا لا کر رکھ دیتی تو وہ تھوڑا بہت کھا لیتیں، نماز کے وقت کبھی ہاجرہ اور کبھی آمنہ انہیں وضو کراتیں تو وہ کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھ لیتیں۔

''ایسا بے حس، پتھر دل بھی کوئی نہ ہوگا۔'' ماسی سوچتی۔ ''مہینہ ہونے کو آیا ہے آئے ہوئے، ماں کی شکل دیکھی نہ دیکھنے کی آرزو کی ہے کبھی۔ سانپ کینچلی بدلتا ہے، فطرت نہیں۔'' پھر وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی فیصلہ صادر کرتی۔ ''اور لوگوں کی زبانیں سنا ہے پھر سے کھلنے لگی ہیں، آمنہ سے قرآن پاک کی تلاوت سننے کے لیے آنے والی عورتوں نے اِدھر آنا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی اپنا بچہ بھی نہیں بھیجتا اب اِدھر سبق لینے کے لیے، پر اس نے واپس کب جانا ہے۔'' وہ سوچتی۔

''اللہ جانے وہ کدھر ہے صنم اس کا جس کی خاطر سب کو چھوڑ گئی تھی۔ ہم نے تو لینوں پار کے جگرانوں والا راستہ ہی بدل لیا، لمبے راستے سے ہو کر شہر جانے کی عادت ڈال لی، ڈاکوؤں، چوروں کے پنڈ کا راستہ کون دیکھے۔'' وہ اپنے ہی دھیان میں باتیں کرتی اور جواب دیتی رہتی۔

''تم نے مجھ سے پوچھا نہیں، میں کس حال میں جیتی ہوں؟'' پھر ایک روز جب حمزہ اتوار کی چھٹی پر گھر میں تھا مائرہ نے اس سے کہا۔

''یقیناً اچھے حال میں جیتی ہو گی، اس لیے نہیں پوچھا۔'' وہ رسان سے بولا۔ ''دراصل میں سدا کا خوش گمان ہوں۔''

''تمہیں تجسس نہیں ہوتا کہ میں نے جو سرکشی کی، اس کا نتیجہ میرے حق میں نکلا یا میرے خلاف؟'' اس نے حمزہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''چیزیں خود بخود unfold ہو جاتی ہیں، میں اتنا ست الوجود ہوں کہ تجسس کرنا بھی مجھے ایک طرح کی ایکسرسائز لگتی ہے۔''

''تم واقعی اتنے بے نیاز ہو یا بس نظر آنے کی کوشش کرتے ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''میں نے بتایا نا کہ میں اتنا کاہل ہوں کہ کچھ نظر آنے کی کوشش کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''ہیل وِد۔'' مائرہ نے غصے سے پاؤں مار کر سامنے رکھی تپائی کھسکائی۔ ''تم سب مینٹل ہو چکے ہو، ایک دم پاگل۔''

''ہاں یہ compliment بالکل ٹھیک ہے۔ کم از کم میرے لیے۔''

''تم جیسے دیوانوں کی طرح میری ہر بات سے متفق رہتے تھے، میرا خیال تھا آج بھی ویسے ہی ہو گے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''میں تین سال بعد انگلینڈ سے واپس آئی ہوں۔'' اس نے پہلی بار اپنے بارے میں بات کی۔ ''اور میں اس گھر کا رخ کبھی نہ کرتی اگر میں یہ نہ سنتی کہ اب تم اس گھر کے کرتا دھرتا ہو...... تم جانتے ہو کہ میں یہاں صرف تمہارے لیے آئی ہوں۔'' اس نے انکشاف کیا۔ ''مگر تم۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''تم فاتر العقل ہو چکے ہو، میری سمجھ سے بالکل باہر۔''

''اوہ آئی ایم سوری۔'' حمزہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''پھر تو مجھے تمہیں بالکل اور طرح سے ٹریٹ کرنا چاہیے، تم جانتی ہو کہ مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا مجھے کب، کیسا رویّہ اپنانا چاہیے۔''

''تمہیں سب پتا ہے کہ کیا صحیح ہے، کیا نہیں، کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''صرف تم بے حس ہو گئے ہو اور بے نیاز نظر آنے کی ایکٹنگ کرتے ہو، اور ایسا۔'' اس نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمہاری اس کم عقل، بے شعور، ان پڑھ بیوی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم اپنی ذاتی زندگی سے مایوس ہو، اسی لیے تم نے خود کو ذات کے سرد خانے میں چھپا کر بے نیازی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ اور یہ تھی وہ چیز جس سے بچاؤ کی خواہش نے مجھے نادر کا انتخاب کرنے کا موقع دیا۔''

''ٹپ۔'' حمزہ نے صبح سے چھائے بادلوں سے برسنے والے پہلے قطرے پر نظر جمالی۔

''میں وہ نہ کرتی تو آج تمہاری طرح کسی جاہل، پینڈو، بے شعور چوہدری کے پلے بندھی کولھو کے بیل اور کنوئیں کے مینڈک جیسی زندگی گزار رہی ہوتی۔''

''ٹپ، ٹپا، ٹپ، ٹپ۔'' موٹی موٹی بوندیں قطار باندھے برسنے لگی تھیں اور فضا میں خشک مٹی پر پڑنے والے پانی کے بعد اٹھنے والی خوشبو پھیل گئی تھی۔

''مجھے کوئی regret نہیں ہے اپنے اس فیصلے پر۔'' کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے جتانے والے انداز میں کہا۔ ''نہ تم لوگوں کے عاق نامے نے میری زندگی پر کوئی اثر ڈالا، نہ چوہدریوں کی بیٹی کے دینداروں کے بیٹے سے نکاح کرنے نے۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' حمزہ نے مسلسل برستی بارش کی بوندوں پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

''مگر شاید میری زندگی میں کچھ کم ہے۔'' حمزہ کے انہماک کو مائرہ کے اس جملے نے توڑ دیا تھا۔ اس نے گردن پھیر کر مائرہ کی طرف دیکھا۔

''اتنے سالوں کے بعد بھی مجھے لگتا ہے کہ میں نادر کو بہت سارا جان لینے کے بعد بھی اس کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی۔'' حمزہ نے نظریں جھکا کر مائرہ کی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔

''جیسے ایک خلا ہے۔'' مائرہ نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔ ''ایک void نہ نظر آنے والا۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''وہ خلا اتنا تاریک ہے کہ اس میں انسان محض ٹامک ٹوئیاں ہی مارتا رہ جاتا ہے اس کے پار نہیں جا سکتا۔ اس کو عبور نہیں کر سکتا — تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟'' اس نے حمزہ کی طرف دیکھا۔

''اسے کیا پسند ہے، مجھے کیا ناپسند ہے۔ وہ کیا اوڑھنا پہننا پسند کرتا ہے، میں کیسے کھانا پینا چاہتی ہوں۔ زندگی میں کیا چیز اہم ہے کیا غیر اہم، پہلی ترجیح کیا ہے، دوسری کیا، آخری کیا ہے۔ سب کچھ اس خلا کے مہیب سناٹوں اور اندھیروں میں گڈمڈ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی چیز کا کوئی سرا ہی نہیں ملتا۔'' اس نے ایک بار پھر حمزہ کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھینچے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔

''ایسا ہی void تمہاری اور آمنہ کی زندگیوں میں بھی ہے نا؟'' اچانک مائرہ نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

''تم اپنی بات سناؤ۔'' حمزہ نے کہا۔

''ہاں۔'' وہ واپس اپنے ٹریک پر آ گئی۔ ''اور اس مہیب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے مارتے اب ایسا لگتا ہے جیسے ہم ہر بات میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں...... میں اسی صورتِ حال سے بریک لینے یہاں آئی ہوں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تمہارے بچے بھی تو ہوں گے؟'' حمزہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے ہاتھ سمیٹ کر گود میں رکھ لیے۔ ''ایک بیٹی ہے مگر وہ پیدائشی طور پر گونگی اور بہری ہے۔''

بادل ایک دم زور سے گرجا تھا اور بجلی کا ایک کوندا سا چمک کر صحن کے منظر کو روشن کر گیا تھا۔ باورچی خانے سے آمنہ نکل کر بھیگتی بھیگتی برآمدے سے آگے دالان میں گھس گئی تھی۔ اسے چچی جان کو ان کے کمرے سے لا کر دالان میں لٹانا تھا۔ عصر کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس وقت نماز کے بعد وہ انہیں مختلف سورتیں اور ان کا ترجمہ سناتی تھی۔

''میں ایک معذور بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔'' مائرہ نے یوں کہا جیسے اسے کسی اور کی بچی کی دیکھ بھال کرنی پڑ گئی ہو۔ ''میں اس کو معذور بچوں کے ادارے میں چھوڑ آئی، اس بات پر نادر کو مجھ سے

شدید اختلاف ہے۔ وہ مجھے خودغرض کہتا ہے اور پتھر دل بھی۔'' حمزہ نے سامنے دیکھا، دالان میں کرسی پر قبلہ رو ہو کر بیٹھی چچی جان رکوع و سجود میں مصروف تھیں۔

''اس نے مجھے کہا کہ اگر گھر میں وہ بچی نہیں رہے گی تو میں بھی نہیں رہوں گی۔'' مائرہ بتارہی تھی۔

''اس نے تمہیں گھر بدر کر دیا؟'' حمزہ نے یوں کہا جیسے اس کہانی کے منطقی انجام کا آخری جملہ سنا رہا ہو۔

''نہیں۔'' اس نے سخت لہجے میں تردید کی۔ ''تمہیں شاید پتا نہیں کہ دیندار اپنی بات کے بہت پکے ہوتے ہیں، چوہدریوں کی طرح وقت کے ساتھ اپنی بات سے پھرنے والے نہیں ہوتے۔''

''اوہ گریٹ۔'' حمزہ نے مسکرا کر کہا۔

''میں شاید زندگی یونہی گزار لیتی، اگر یہ بچی والا معاملہ نہ ہوتا۔'' مائرہ نے حمزہ کے طنز کو نظر انداز کر دیا۔

''وہ پیدائشی معذور ہونے کے ساتھ ساتھ عجیب سی حرکتیں بھی کرتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے عجیب سے شرارے نکلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اول تو وہ ہنستی ہی نہیں، ہنسے تو اس کی شکل اتنی بھیانک ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والا برداشت نہیں کر پاتا۔ تین سال کی ہونے کو آئی ہے مگر چلتی نہیں۔ وہ crawl بھی نہیں کرتی فرش پر چت لیٹ کر سینے، ٹانگوں اور بازوؤں کے بل پر آگے سرکتی ہے جیسے سانپ چل رہا ہو۔''

''استغفار...... توبہ استغفار!'' حمزہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا تمہیں ان کی خبر نہ آئی جنہوں نے تم سے پہلے سرکشی کی۔'' دالان سے آمنہ کی تلاوت و ترجمہ کی آواز ابھرنے لگی۔

''اس کے رنگ ڈھنگ انسانوں والے نہیں ہیں، وہ ایک مافوق الفطرت مخلوق ہے۔''

''اور اپنے کام کا وبال چکھا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' آمنہ سنا رہی تھی۔

''اسے دیکھ کر مجھے اتنی اذیت ہوتی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے جہاں وہ موجود ہو، وہاں سے کہیں دور چلی جاؤں۔'' مائرہ کی آنکھ سے آنسو کا پہلا قطرہ پھسلا۔

''تم نے ممتا کا دل دکھانے کا جو گناہ کیا، اس کو گناہ سمجھا کبھی تم نے۔'' حمزہ کا دل چاہا کہے۔

''یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لاتے تو بولتے کیا آدمی ہمیں راہ بتائیں گے۔'' آمنہ بے حد خوش الحان تھی، حمزہ نے اس روز پہلی بار دھیان سے اس کی آواز سنی تھی۔

''میں سمجھتی ہوں یہ سب نیچرل ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بچے بھی نیچرل ہوتے ہیں، مگر وہ بچی جیسے بلا صورت ہے، میڈیکل سائنس اس کے سلسلے میں اپنی توجیہات پیش کرتی ہے، مگر میں سوچتی ہوں کہ ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔''

''تو کافر ہوئے اور پھر گئے اور اللہ نے بے نیازی کو کام فرمایا، اور اللہ بے نیاز ہے، سب خوبیوں سراہا۔'' آمنہ کی آواز آئی۔ حمزہ نے دیکھا چچی جان کی آنکھوں سے جھڑی کی صورت آنسو رواں تھے۔

''تجھے اللہ اور اس کے رسولؐ کا واسطہ۔'' برسوں پہلے چچی جان کا جڑے ہاتھوں کے ساتھ مائرہ سے فریاد کرنے کا منظر اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

''اللہ اور اس کے رسولؐ نے اپنی جائز خواہشوں کو پاؤں تلے روندنے کا کوئی حکم نہیں دیا۔'' مائرہ کی رعونت بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''ماں باپ کے حقوق، ماں کا درجہ، اس کا احترام۔'' چچی جان اسے بتارہی تھیں۔

''اونہہ۔'' اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا تھا۔

''کافروں نے کہا کہ وہ ہرگز نہ اٹھائے جائیں گے، تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور

اٹھائے جاؤ گے، پھر تمہارے کوتک تمہیں جتائے جائیں گے، اور یہ اللہ کو آسان ہے۔'' آمنہ کی آواز آئی۔

''میں اس بچی کی موجودگی میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔'' اب مائرہ کے آنسو بھی قطار باندھ گئے تھے۔ حمزہ نے اپنا پورا دھیان دالان سے آتی آواز کی طرف مبذول کر لیا۔

''کوئی مصیبت نہیں پہنچتی، مگر اللہ کے حکم سے۔''

''اے ایمان والو تمہاری کچھ بی بیاں اور بچے تمہارے دشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو۔'' حمزہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

''اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تمہارے مال اور تمہارے بچے جانچ ہی ہیں، اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔''

حمزہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے چچی جان کی طرف دیکھا، وہ دونوں ہاتھ جوڑے اوپر دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''بڑی اذیت ہے یہ میرے لیے بڑی اذیت ہے۔'' مائرہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے بدقت بول رہی تھی۔ حمزہ نے برآمدے سے باہر دیکھا، صحن میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ نئی بوندیں گرنے پر کھڑے پانی میں بھنور بنتے اور ختم ہو جاتے۔ یکلخت اس نے اٹھ کر مائرہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لیے دالان میں چلا آیا۔

''جس دل کو توڑنے، اذیت دینے، بے آواز رُلاتے رہنے، جن ہونٹوں پر قفل ڈال دینے کے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو، اس دل سے جب تک معافی نہیں مانگ لوگی تب تک تمہاری اذیت ختم نہیں ہوگی۔'' اس نے مائرہ کو چچی جان کے روبرو کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

چچی جان نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

اپریل 2012ء

کارپربہار شمارہ

دشت تنہائی

آخری صفحات پر آپ کی محبوب قلم کار **نجمہ مودی** ایک خوبصورت شاہکار لیے حاضر ہیں۔ دل گرفتگی کے عالم میں ویران راہوں پر ایک تنہا مسافر اور نامکمل خواہشوں کا رقص...... دلفریب منظر اور تلاطم برپا کرتے جذبات کی سحر انگیزی۔

مسافر

سلسلے وار صفحات پر **ناصر ملک** کا چونکا دینے والا طویل سلسلہ۔ گل و گلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی رودادِ حیات

گھر کے چراغ سے

''جو تلوار سے قتل کرتا ہے وہ تلوار سے ہی قتل ہوتا ہے'' جلال الدین خلجی کے بارے میں ایک درویش کی پیش گوئی جو اس انداز سے پوری ہوئی کہ وہم و گماں میں بھی نہ تھا۔ **ڈاکٹر ساجد امجد** کی عرق ریزی۔

حضرت داؤد علیہ السلام

پرندوں کی زبان سمجھنے والے اور پتھروں کی پکار سننے والے نبی کی سوانح...... انہیں نبوت اور بادشاہت بیک وقت ملی

اس کے علاوہ کشکول، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید مزید: کاشف زبیر، مختار آزاد، مریم کے خان، تنویر ریاض اور سلیم انور کی بہترین کہانیاں

اپنے دھیان میں تلاوت و ترجمہ کرتی آمنہ کی محویت ٹوٹی اور وہ چونک گئی۔

مائرہ ساکت کھڑی تھی۔

''وہ گناہ نہیں تھا، ایک جائز خواہش۔''

''بکواس بند کرو۔'' حمزہ کے ہاتھ نے مائرہ کے گال پر نشان چھوڑ دیا۔

مائرہ ہاتھ گال پر رکھے ششدر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کاش یہ تھپڑ میں نے تمہیں اس وقت مارا ہوتا۔'' حمزہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''ایک نہیں کئی تھپڑ۔'' اس نے سختی سے کہا۔ ''کاش میں نے چچی جان کے کہنے پر تمہاری ٹانگیں کاٹ کر پھینک دی ہوتیں یا تمہارے اس عاشقِ نامدار کے غیرت دلانے پر واقعی بندوق اٹھالی ہوتی۔'' اس کی آواز اشتعال کی وجہ سے کانپنے لگی تھی۔

''مگر اس وقت میرا نادان دل تمہاری محبت کا مغلوب تھا۔ تمہاری ہر خواہش کا احترام کرتے ہوئے تمہارے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھنے کا متمنی۔ میرا خیال تھا تم ناز اٹھوانے، بات منوانے اور اس کے لیے ہر حد سے گزر جانے کا حق رکھتی ہو، سو میں ہر اس ردِعمل سے دست بردار ہو گیا جو تمہاری اس خواہش کے جواب میں ہونا چاہیے تھا یا جس کی مجھے ترغیب دی گئی۔ میں تمہاری اس خواہش اور ضد کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور انہونی کو ہونی میں بدلنے کا وسیلہ بن گیا صرف اس لیے کہ میں نادان یہ سمجھتا تھا تمہارے دل کو دکھ دینا گناہ ہے۔'' مائرہ نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں اتنا ہی احمق تھا۔'' حمزہ نے اس کے اس طرح دیکھنے پر کہا۔ ''اتنا احمق کہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہیں پوجتا رہا۔ تمہاری محبت سے مغلوب میں نے ایک ممکنہ شاندار کیریئر کو لات مار کر اِدھر آبسیرا کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں بہت خوش گمان ہوں، یہاں آ کر رہنا بھی میری خوش گمانی کا نتیجہ تھا، چچی جان کی خدمت کر کے، ان کے لیے اپنی زندگی کے اچھے دن قربان کر کے میں یہ گمان کرتا رہا کہ کبھی جب تم کو اپنی ماں کا خیال آئے گا اور تم ان کے پاس لوٹو گی تو کتنی خوش ہو گی کہ میں نے تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں کا کس قدر خیال رکھا۔ میرے جیسا بھی کوئی احمق الذی ہو گا۔'' سانس لینے کو ٹھہرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو اپنی ماں کی برسوں کی ریاضت کی ناقدری کرتے ہوئے ایک اجنبی کی خاطر اسے ٹھکرا سکتی ہے، وہ میری محبت یا میرے دل کے جذبوں کی کیا قدر کرے گی۔ جس کی آنکھ، دل اور زبان پر شر کا پردہ پڑ گیا، جس نے اپنی غرض میں اس دل کو پاؤں تلے روند ڈالا جس میں رب بستا ہے، جو ناشکری کی انتہا پر پہنچ کر کہتی رہی ''میری ماں اب آن بان کا ڈھول پیٹتی رہے گی عمر بھر''۔ وہ میری شکر گزار کیا ہو گی...... مگر میں نے بتایا نا کہ میں نے ایک عمر خوش گمانی میں گزاری۔'' وہ ایسے ہنسا جیسے اپنا تمسخر اڑا رہا ہو۔

''میں ابھی بھی خوش گمان تھا۔'' پھر اس نے انکشاف کیا۔ ''تمہاری واپسی پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، تمہارا مان بڑھانے کو تمہاری خاطروں، خدمتوں میں مصروف ہوا، کچھ تو اپنی محبت سے مغلوب ہو کر کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی تمہارا خیال میرے دل میں سینٹرل پوزیشن سنبھالے بیٹھا تھا۔'' کہتے کہتے اس کی نظر آمنہ پر پڑی جس کا سر یہ بات سن کر مزید جھک گیا تھا۔

''اب بھی میں تمہارے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کا متمنی تھا، اسی لیے میں نے تم سے کوئی سوال جواب کیا نہ تمہارے کسی سوال کا جواب دیا۔ مگر افسوس ہے مائرہ! تم نے آج کی گفتگو کے دوران میرے عمر بھر کے التباس پل بھر میں ملیامیٹ کر دیے۔ میں نے تم سے سوال کیا کہ تمہارے بچے بھی تو ہوں گے، اس سوال کے پیچھے یہ توقع تھی کہ جب تم خود ماں

بنی ہو گی تو تمہیں اپنی ماں کی بھی قدر آئی ہو گی۔ ماتا کی فطرت کو صرف ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ مگر تم......'' اس نے مائرہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''تم گمراہی کی اس شاہراہ پر جا نکلی ہو جہاں تمہیں اپنے بطن سے جنی بچی کے لیے بھی ماتا کا احساس نہیں ہوتا، تم اس سے بھی پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہو...... نہیں۔'' حمزہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی خاندانی روایات، لاشعور میں بسے تعصبات نہیں جن سے ایک قدم غلط اٹھا کر پیچھا چھڑایا جا سکے...... خود غرضی کی جتنی بھی دبیز پٹی آنکھوں پر باندھ کر تم اس مافوق الفطرت بچی کے نظارے سے بچنا چاہو گی اتنا ہی تمہارے دل کی اذیت بڑھتی جائے گی۔ سرکشی اور بغاوت کا یہ وہ پڑاؤ ہے جہاں سے آگے نہ ختم ہونے والی اذیت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ تم غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو کہ تمہاری بچی کی شکل میں اللہ کی بے نیازی کے رنگ تمہارے سامنے آنے لگے ہیں، یہ تمہارے کوتک ہیں جو تمہیں اس شکل میں جتائے جا رہے ہیں۔ تمہاری ماں جس نے تمہاری خاطر لمبی جوانی بیوگی میں کاٹ دی اور عزت کی چادر سر پر تانے رکھنے کی خاطر جو آبلہ پا ہوئی، اس کی کسی نصیحت پر تم نے کان دھرے نہ اس کی منت سماجت تمہارے سامنے کوئی حیثیت پا سکی۔'' وہ ایک بار پھر سانس لینے کو رکا۔

''اپنے اور نادر کے درمیان جس خلا کا تم نے ذکر کیا جس میں ایک مہیب سناٹا اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا ہے، جہاں تم دونوں ٹامک ٹوئیاں مارتے ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہو، یاد کرو یہ وہی خاندانی فرق ہے، تربیت و ماحول کا فرق جس کو چچی جان تمہارے گوش گزار کر کے تمہیں کسی بڑی مصیبت سے بچانا چاہتی تھیں، وہ تجربہ کار تھیں، جانتی تھیں ذات، منات خاندان سے کچھ فرق نہیں بھی پڑتا ہو تو ماحول و تربیت کا فرق ضرور آڑے آ جاتا ہے، تم نے کہا تمہاری پسند، ناپسند، ترجیحات، طرزِ زندگی سب اس خلا میں گڈمڈ ہو جاتا ہے، یہ وہ تلخ تجربہ تھا جس سے یہ تمہیں بچانا چاہتی تھیں، مگر تم کو اس تجربے سے گزرنے کی بے قراری تھی...... شاید یہ تجربہ تلخ نہ ہوتا جو تم اُن کی دعا لے کر اس میں سے گزرنے کو جاتیں...... مگر تمہاری بدقسمتی تمہارا شعور، عقل و فہم اور بینائی سب سرکشی اور ضد کی آگ میں بھسم ہوئی...... اور اس سے بھی بڑی بدقسمتی تمہاری یہ ہے کہ تمہیں اب بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہارا دل اذیت میں مبتلا کیوں ہے۔'' اس نے دم بھر کو مائرہ کی طرف دیکھا جو ستا چہرہ لیے چچی جان کو دیکھے جا رہی تھی۔

وہ دسمبر کی شام

یاد ہے تم کو
وہ سرد، بھیگی، دسمبر کی شام
میرے یخ بستہ ہاتھوں میں اپنی زندگی
سے بھرپور لمس سمو رہے تھے
ہم، تم مدہوشیوں میں
کہیں دور سپنوں میں کھو رہے تھے
دھند میں لپٹی سرد، کہر آلود ہوا نے جب
پکارا ہمیں......
کھلی آنکھ تو سپنے سراب، سراب تھے
دسمبر کے دھند آمیز لمحے عذاب ہی
عذاب تھے
چاروں جانب سوالیہ نظریں تھیں
خالی، خالی جواب تھے
کرچیاں تھیں
ٹوٹے بکھرے خواب تھے
ملن کے سارے موسموں کے لمحے
سراب ہی سراب تھے

فصیحہ آصف خان، ملتان

”میں سمجھتا رہا کہ یہ تمہارے ضمیر کی خلش ہے جو تمہیں اب تک ان کا سامنا کرنے نہیں دے رہی۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر اب سمجھ میں آیا کہ سرکشی کی یہ وہ اسٹیج ہے جہاں اب بھی تم اُن کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔“ مائرہ نے آنکھیں زور سے بند کرلیں۔

”اور میں......“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”مجھے دیکھو ایک خودغرض کی محبت میں اتنا غرض مند ہوا کہ سب رشتوں کا احترام بھول گیا۔ تمہیں یاد ہے تم مجھے ایک نظم سنایا کرتی تھیں فیض احمد فیض کی جسے میں ہمیشہ فیض محمد کہا کرتا تھا۔“ اس نے مائرہ کی طرف دیکھا۔

”مجھے آج اپنا اور تمہارا تجزیہ کرتے ہوئے بے اختیار اس کے کچھ الفاظ یاد آگئے۔ شاید تمہیں بھی یاد آجائے۔

چلو آج کچھ حسابِ زیانِ جاں کرلیں
الم شمار کریں درد آشکار کریں
حسابِ زیانِ جاں“

اس نے دُہرایا۔ ”تمہاری محبت میں مغلوب میں سوچتا رہا کہ تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچنا بے وفائی ہے اور اس احمقانہ سوچ کے زیرِاثر میں اس فرشتوں جیسی لڑکی سے یوں غافل رہا جیسے اس کا وجود میرے اردگرد ہے ہی نہیں۔“ اس نے آمنہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نے کبھی اسے ڈھنگ سے مخاطب ہی نہیں کیا۔ میں نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس میں کون کون سی خوبیاں ہیں۔ لیکن آج تمہاری خودغرضانہ اسٹیٹ مینٹس نے مجھ پر یہ آشکار کیا کہ بے غرضی کیسی ہوتی ہے، اس لڑکی جیسی جو میری بیوی ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور کرسی جیسے آمنہ کے وجود کے نیچے ڈگمگا گئی تھی۔

”یہ مجھے کو آج تک نہیں ”پا“ سکی مگر میں نے اس کی زبان پر کبھی کوئی گلہ آتے نہیں دیکھا، میرے دن اپنے کام میں اور راتیں تمہارے کمرے میں، تمہارے بستر، تمہاری چیزوں سے تمہارے لمس کو محسوس کرتے دل بہلاتے گزرتی رہیں، مگر اس نے سب جانتے ہوئے بھی کبھی نہ مجھے نہ کبھی چچی جان کو جھنجوڑا کہ اگر میرے دل پر کسی اور کا قبضہ ہے تو وہ کس جرم کی پاداش میں یہاں لائی گئی ہے، یہ چچی جان کی سگی بیٹی نہیں مگر چچی جان کی یوں خدمت کرتی ہے جیسی سگی بیٹی بھی نہ کرسکے...... کیوں؟“ اس نے مائرہ کی طرف دیکھ کر جیسے اس سے سوال کیا۔

”یہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں مگر ڈگریاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس لیے کہ اس کو اللہ نے مضبوط ایمان کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے، اس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے، اس کے دل میں سکون بسیرا کرتا ہے۔ یہ ناامید ہوتی ہے نہ نامرادی کی خلش میں مبتلا، یہ ہماری تمہاری طرح اللہ سے گلہ نہیں کرتی اور ہر حال میں شکرگزاری کا قرینہ جانتی ہے۔ اس کی حقیقت اور تمہاری خودغرضی سے آشکار ہونے کے بعد آج مجھ پر انکشاف ہوا کہ زیانِ جاں اس قدر کیوں ہے۔ میرا دل اس قدر ویران کیوں ہے۔ اس لیے مائرہ......“ اس نے مائرہ کو دیکھا۔ ”کہ ہماری، تمہاری نیتوں میں فتور ہے۔ تم اپنے دل کو اور میں تم کو خوش رکھنے کے چکر میں دوسروں کی محبتوں سے بے نیاز رہے۔ میں اپنے تئیں چچی جان کی جو خدمت کرتا رہا اس میں بھی تم کو خوش رکھنے کی غرض شامل تھی۔ جب ہی تو اللہ نے ہماری نیتوں کا وبال چکھایا...... تمہیں مافوق الفطرت اولاد عطا کرکے، مجھے اولاد سے محروم رکھ کر...... بے شک کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر اللہ کے حکم سے۔“ حمزہ کی آواز کپکپانے لگی تھی۔

”اب بھی موقع ہے مائرہ...... چلو آج حسابِ زیانِ جاں کرلیں۔ جن لوگوں کے دل دکھانے کا باعث بنتے رہے...... ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیں۔“ اس نے نم آنکھوں سے آمنہ کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے مائرہ چچی جان کے قدموں میں گھٹنوں کے بل گری ہوئی تھی۔

”امی مجھے معاف کردیں۔“ وہ چلا رہی تھی۔

”اور اگر معاف کرو، اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ حمزہ نے کچھ دیر پہلے سنے ہوئے الفاظ دُہرائے تھے۔ چچی جان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مائرہ کو دیکھا تھا اور پھر اسے سینے سے لگالیا۔

”ممتا خودغرض نہیں ہوتی، مجھ سے نہیں اس سوچ کے شر سے پناہ مانگ جو تجھے اپنی بچی سے دور جانے پر اکساتی ہے۔“ برسوں بعد چچی جان کی آواز گھر کی فضا میں ابھری تھی۔ ان سب نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

”تیرے جانے کے بعد میں نے خاموشی کی چادر اس لیے اوڑھی کہ کہیں غم و غصے میں میری زبان سے کوئی بددعا تیرے لیے نہ نکل جائے، میں اپنے دل میں تیرے لیے شر سے پناہ کی درخواست کرتی رہی۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اللہ نے تجھے شر سے توبہ کا موقع دیا ہے۔ بندے سے بغاوت اللہ سے بغاوت کی طرف لے جاتی ہے۔ برسوں پہلے تو نے نہ جانا کہ ماں اولاد کی دشمن نہیں ہوسکتی۔ میں نے تجھے کہا تھا اگر تیرے لیے وہ فیصلہ بہتر ہوتا تو میں کسی چیز کو آڑے نہ آنے دیتی۔ تو نے میری بات نہیں سمجھی اور تو نے دیکھا میں غلط نہیں کہتی تھی، خاندانوں کا رہن سہن برسوں کے عمل سے گزر کر بنتا ہے۔ ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جا کر گزر بسر کرنا آسان نہیں ہوتا، وہ بھی یوں کہ پیچھے دعائیں اور اپنوں کا سایہ نہ ہو مگر تو نہ سمجھی، اپنے من کی مراد پانے کے لیے سب کے دلوں کو کچل گئی۔“ وہ روئے چلی جارہی تھیں۔

”ماں کا دل جس میں رب بستا ہے۔“ ”پر اب تجھے اللہ نے شر سے موقع دیا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے، وہ دنیا میں بھی انسان کو اس کے کو تک جتلا دیتا ہے، اسے معافی مانگنے اور توبہ کرنے کا پتھر دلی سے نرم دلی کی طرف لوٹنے کا موقع دیتا ہے، وہ مہربان بھی ہے اور غفور الرحیم بھی۔“ انہوں نے مائرہ کے ہاتھ پکڑ کر اسے جھنجوڑا۔

”وہ اللہ کی بھیجی مخلوق ہے، تیرے پیٹ کی جنی ہے، ماں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر دیکھی تو نے، ماممتا سے فرار حاصل نہ کر، اسے اپنے سینے سے لگا، اللہ تیری باقی سختیاں بھی معاف کردے گا...... اس کے اور اس کے باپ کی طرف لوٹ جا، جا میں نے تجھے دل سے معاف کیا، جا اس بار تجھے میں اپنی رضا سے رخصت کروں گی...... اللہ بھی تجھے آسانیاں عطا فرمائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور مائرہ روتے ہوئے زور زور سے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ چچی جان نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا تھا۔

حمزہ نے کن انکھیوں سے آمنہ کی طرف دیکھا، جو دنگ کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ حمزہ نے اپنے ہاتھ آمنہ کے سامنے جوڑ دیے۔ ایمان کی دولت سے مالا مال اور شکرگزاری کے وصف سے سرشار آمنہ نم آنکھیں پونچھتے ہوئے مسکرادی تھی۔ اس کا خاموش طبع، سرد مزاج اور لیے دیے رہنے والا شوہر اس روز خوب بولا تھا اور اس نے اس کے اوصاف کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کیا تھا۔ لاحاصل، حاصل ہوگیا تھا۔

تمہارا میرا تعلق بس ایک لفظ کا ہے
لغت کے انت میں سمٹا ہوا
فقط ایک لفظ......
اس ایک لفظ میں سچائی ہے زمانوں کی
چلو کہ آج یہی لفظ اختیار کریں
اس ایک لفظ کا دامن نہ داغدار کریں

برسوں بعد حمزہ کا دل مائرہ کی محبت کے گمان سے نکل کر ایک ناقابلِ تردید حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعتراف کر رہا تھا اور آمنہ کے دل کا غبار جیسے باہر چھاجوں برستی بارش کے ساتھ بہہ کر چھٹ رہا تھا۔

ڈائری سے انتخاب

جسمانی صحت اور اس کی مناسب دیکھ بھال کے لیے پاکیزہ بہنیں اکثر فکر مند رہتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر بازاری نسخوں اور میک اپ کے ساز و سامان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں تاکہ شخصیت کی دلکشی دیر تک برقرار رہے لیکن عام طور پر ایسے تجربات کا نتیجہ وقت اور پیسے کے زیاں کے ساتھ افسردگی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کبھی کبھی فائدے کے بجائے بگاڑ بھی ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں کچھ کاغذات کی تلاش میں ایک پرانی ڈائری میرے ہاتھ لگی جس میں، میں نے 1985ء سے بہت سے گھریلو نسخے اور ٹوٹکے نوٹ کیے ہوئے تھے۔ میری سہیلیاں اور ملنے جلنے والیاں اکثر مجھ سے پوچھتی رہتی ہیں کہ میں خود کو Maintain کرنے کے لیے کیا کرتی ہوں۔ میرے لیے فرداً فرداً بتانا مشکل رہا ہے۔ اب میں نے سوچا کہ سالگرہ نمبر کے ان صفحات کے ذریعے اپنے تجربات پاکیزہ بہنوں تک پہنچا دوں۔ یہ سب میرے آزمودہ ہیں۔ ایک جوان اور گبرو بیٹے کی ماں ہونے کے باوجود میں میک اپ قطعی نہیں کرتی۔ ان ہی آزمودہ ترکیبوں پر گاہے گاہے عمل کرتی رہتی ہوں۔ جیسی اور جو کچھ ہوں، سب پاکیزہ بہنوں کے سامنے ہوں۔ ان سب کے فائدے کے لیے میں اپنی ڈائری کے کچھ چیدہ چیدہ نوٹ پیش کر رہی ہوں...... گر قبول افتد۔

عذرا رسول

- ......اگر سر میں خشکی ہو تو ہفتے میں دو بار لیموں کا عرق پانی میں ملا کر سر دھوئیں خشکی صاف ہو جائے گی۔
- ......تیل میں لیموں کا رس ڈال کر بالوں میں لگانے سے بال چمک اٹھیں گے۔
- ......لیموں کا عرق نکال کر اس کا چھلکا دھیرے دھیرے ہونٹوں پر ملیں، کالا پن دور ہو جائے گا پھٹیں گے بھی نہیں۔
- ......بالوں میں گاجر کا رس تیل کی طرح لگائیں بال جھڑنا بند ہو جائیں گے۔ گاجر کا رس پینے سے خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔
- ......ایک چمچ ٹماٹر کا رس اور چند قطرے لیموں کا عرق اچھی طرح ملا لیں۔ اس لوشن کو دھیرے دھیرے ملیں، چہرہ ملائم اور چکنا ہو جائے گا۔ تازہ پانی سے منہ دھو لیں۔
- ...... پودینے کی پتیوں کو باریک پیس کر رس نکال لیں، رات کو سونے سے پہلے عرق کو چہرے پر لگائیں پھر تازہ پانی سے منہ دھو لیں، چہرہ بے داغ اور پر کشش ہو جائے گا۔
- ...... چہرے کی جھائیاں دور کرنے کے لیے سیم کی تازہ پتیوں کو پیس کر رس لگائیں۔ مالٹے کے رس کو مسلسل لگانے سے بھی چہرے کی جھائیاں دور ہو جاتی ہیں۔
- ......لوکی کے چھلکے پیس کر دھیرے دھیرے چہرے پر ملیں، چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔
- ......ہرا دھنیا پیس کر جلد کے دانوں پر ملیں دانے غائب ہو جائیں گے۔
- ......کھیرے کا رس دودھ میں ملا کر چہرے پر لگانے سے رنگ صاف ہو جاتا ہے۔
- ......پھل انسان کے چہرے پر وہ قدرتی نکھار پیدا کرتے ہیں جو کوئی میک اپ پیدا نہیں کر سکتا۔ روز مرہ خوراک میں گوشت، پھل اور سبزیاں ضرور لیں۔

- ......شہد، عرق گلاب اور oatmeal کو ملا کر ماسک تیار کریں اور 15 منٹ کے لیے چہرے پر پھیلا لیں پھر خوب ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیں۔ ہفتہ میں ایک بار کافی ہے۔
- ......کھیرے کو کدوکش کر کے چہرے پر پھیلا لیں اور 10 منٹ بعد منہ دھو لیں، تھکن دور ہو جائے گی۔
- ......بادام کا تیل ہلکا گرم اس طرح کریں کہ بوتل کو گرم پانی میں رکھ کر گرم کر لیں، ہلکے ہلکے چہرے پر مساج کر لیں جذب ہو جائے گا۔ ہفتہ میں ایک بار بھی کافی ہے۔
- ......خشک بالوں کے لیے اگر مہندی لگائیں تو اس میں تیل اور انڈے کی زردی ضرور ڈالیں۔ 20 منٹ بعد دھو لیں کنڈیشنگ ہو جائے گی۔
- ......خشک جلد کے لیے کیلوں کا ماسک اچھا ہے۔ کیلوں کو میش کر کے 15 منٹ لگائیں کہ اس کا تیل جلد میں اچھی طرح جذب ہو جائے۔ ماسک اتار کر موئسچرائزر لگا لیں۔ اس کے علاوہ پکے ہوئے ٹماٹر لے کر اس کے ٹکڑے چہرے پر لگائیں۔ 15 منٹ بعد ہلکے ہلکے رگڑ کر اتار لیں۔ ایک کھانے کا چمچ گرم شہد ایک چمچ لیموں یا انناس کا رس چہرے پر پھیلا لیں اور 10 منٹ بعد صاف کر لیں۔ خشک جلد کو ماسک مہینے میں ایک بار، چکنی جلد کو ہفتے میں ایک بار۔ ملی جلی جلد کو دو ہفتے میں لگانا چاہیے۔
- ......ہونٹ پتلے اور خوب صورت بنانے کے لیے گلاب کا عرق، پھٹکری، لیموں کا عرق ملا کر رات کو سوتے وقت لگائیں۔
- ......نمک اور سوڈا بائی کاربونیٹ برابر مقدار میں لے کر دانتوں کو برش کریں تو دانت سفید اور چمکدار ہو جائیں گے۔
- ......اگر دانت پیلے ہو جائیں اور دانتوں کی چمک ختم ہو جائے تو لیموں کے چھلکے پر کھانے کا سوڈا معمولی سا لگا کر دانتوں پر ملیں۔ دانت سفید اور چمکدار ہو جائیں گے۔
- ......آنکھوں کے حلقے دور کرنے کے لیے آلو باریک پیس لیں اور اس کے پانی کو آنکھوں کے حلقوں پر دن میں پانچ چھ دفعہ لگائیں۔
- ...... چہرے کے دانوں کو ختم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پھٹکری باریک پیس کر پانی میں ملا کر فریج میں رکھ دیں۔ دن میں سات دفعہ لگائیں، دانے ایک ہفتے میں ختم ہو جائیں گے۔
- ......دہی میں تھوڑا سا میٹھا تیل ڈال کر بال دھونے سے آدھا گھنٹے پہلے خوب ملیں اور نیم گرم پانی سے سر دھو لیں، خشکی ختم ہو جائے گی۔
- ......جلد کی تر و تازگی کو برقرار رکھنے کے یوں تو بہت سے طریقے ہیں مگر ماہرین کہتی ہیں کہ اہم نسخہ انڈے اور شہد کا ماسک ہے۔ ایک انڈے کی زردی میں ایک چمچ شہد، تھوڑا سا دودھ اور عرق گلاب ملا کر یکجان کر لیں اور شیشی میں بند کر کے رکھ دیں۔ روزانہ ایک بار اس کو جلد پر لگائیں 15 منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ ماسک کو رگڑ کر نہ اتاریں۔ یہ ماسک جلد کو تر و تازہ بھی رکھتا ہے اور جلد کے کھنچاؤ اور لچک میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ ماسک لگاتے ہوئے آنکھوں کے حلقے اور پپوٹے بچائیں۔
- ......لیموں کا رس 5 گنا گرم پانی میں ڈال کر سر دھونے سے بال گرنا بند ہو جاتے ہیں اور ملائم بھی ہو جاتے ہیں۔

بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو آپ سب کو ماہنامہ پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو' پاکیزہ اپنے چالیسویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔ چالیس کا ہندسہ بڑا مبارک سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ یقین ہے کہ بفضلِ خدا ہمارا یہ سال بہت اچھا گزرے گا (انشاء اللہ)

ادب میں معاشرے کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہی ادب معاشرے میں مقبول ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کی عکاسی عمدگی سے کرے۔ اس لیے ہمارے ادیب معاشرے کے نباض ہی نہیں محتسب بھی ہیں۔ وہ معاشرے میں موجود اچھائیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور برائیوں کی نشان دہی کرتے ہیں، گویا آنکھیں جو دیکھیں گی، دل پر جو گزرے گی، احساس پر جو بیتے گا اور ذہن جو محسوس کرے گا وہی لکھا جائے گا اس حوالے سے اگر ادب کو ماحولیاتی نظام کی معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی حرف گری کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

☆ اچھی تحریریں لذتِ زبان اور لذتِ ذہن دونوں کا کام کرتی ہیں اور ہماری تمام مصنفات کا اس میں سو فی صد ہاتھ ہے۔ ہم اپنی تمام مصنفات سینئرز اور جونیئرز سب ہی کے بے حد ممنون ہیں جو بطورِ خاص پاکیزہ کے لیے لکھتی ہیں۔ ہم اپنی تبصرہ نگار بہنوں کے ساتھ ساتھ اپنی قارئین بہنوں کے بھی شکر گزار ہیں جن کا تعاون، مشورے، تجاویز ہمارے لیے بے حد اہم ہوتے ہیں۔

اس نئے سال ہم یقیناً کچھ نئے سلسلے شروع کرنا چاہیں گے...... اگر آپ کے ذہن میں کوئی منفرد، خوب صورت رائے ہو...... تو ہمیں ضرور بتائیں۔

اس سال عمیرہ احمد جیسی مایہ ناز مصنفہ نے پاکیزہ کے لیے اپنا ناول عکس شروع کر کے جہاں پاکیزہ کو چار چاند لگائے...... وہاں عنیقہ محمد بیگ، نمرہ احمد، نادیہ جہانگیر، شمع سید، کرن احمد، ثمینہ عظمت علی، ریما علی سید، رفاقت جاوید، نظارت نصر، عاشفہ مسعود، عظمیٰ سید افتخار نے بھی اپنی خوب صورت تحریروں سے پاکیزہ کی خوب صورتی میں اضافہ کیا۔ ہماری بے حد پیاری مصنفہ عنیزہ سید، ناہید سلطانہ اختر اور رخ چوہدری نے بھی ایک لمبے بریک کے بعد پاکیزہ میں اپنی شاندار حاضری دی۔

ہماری اکثر مصنفات کو مجھ سے یہ شکایت رہتی ہے کہ میں ان کی تحریریں خاصی تاخیر کے بعد لگاتی ہوں...... اس ضمن میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہماری یہ خواہش ہوتی ہے کہ پاکیزہ کا ہر شمارہ پہلے سے بڑھ کر آئے...... تو افسانوں میں تبدیلیاں آخر وقت تک ہوتی رہتی ہیں۔ کسی کی کوئی بھی تحریر جو ہمیں اچھی لگتی ہے، اسے ہم ضرور شامل کرتے ہیں، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اوسط درجے کی تحریروں کو انتظار کرنا پڑتا ہے...... اس کے باوجود بھی...... کبھی ٹائٹل اچھا نہیں ہوتا اور کبھی کوئی افسانہ بھی ہلکا لگ جاتا ہے مگر یہ بات میں آپ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ آپ کا ہر خط اور ہر افسانہ میں خود پڑھتی ہوں اور حتی الامکان اپنی نئی مصنفات کی حوصلہ افزائی بھی کرتی ہوں...... ان کو ٹھیک بھی کرتی ہوں مگر پورا افسانہ ری رائٹ کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہاں بہنوں کی محفل میں آپ کا خط ٹوٹی پھوٹی زبان میں لکھا ہو، انگریزی میں ہو، پنجابی میں یا سرائیکی میں یا سندھی میں آپ مجھے ضرور بھیجیں...... میں اسے ضرور لگادوں گی کہ افسانے میں تو اے بی اور سی کے درجات ہوتے ہیں مگر خطوط سب درجۂ اول میں شمار ہوتے ہیں اور جگہ پاتے ہیں، یقین نہ آئے تو خط لکھ کر دیکھ لیں، اس ماہ ایک بہن نے خط لکھ کر پوچھا ہے کہ اس

سال کون سا رنگ فیشن میں ہے تو اخباری رپورٹ کے مطابق سرخ رنگ ہے، ویسے آپ جو دل چاہے رنگ پہنیں وہی رنگ خوب صورت کہلائے گا۔

پاکیزہ کی مصنفات، پاکیزہ کی مقبولیت، کامیابی اور کامرانی کا جس طرح ایک اہم ستون ہیں اسی طرح پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، مراسلہ نگار، مستقل سلسلوں میں حصہ لینے والی ہماری بہنیں پاکیزہ کا دوسرا بڑا ستون ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان ہی بہنوں کی وجہ سے ہم رائٹرز کو شہرت نصیب ہوتی ہے کہ پاکیزہ میں شائع ہونے والے کسی بھی افسانے پر تین ماہ تک تبصرہ شائع ہوتا ہے۔ ہمیں حقیقتاً نامور بنانے والی یہی بہنیں ہیں جن کی تعریف کسی بھی رائٹر کے لیے آکسیجن کا کام دیتی ہے اور ان کی تنقید ہماری تحریروں میں مزید بہتری کی گنجائش پیدا کرتی ہے۔ جو ہم سب کے لیے بہت ضروری ہے۔ اسی لیے آج سالگرہ کی اس خصوصی اشاعت میں، میں اپنی ان تمام بہنوں کے ہاتھوں کو چوم رہی ہوں اور انہیں اپنے گلے سے لگاتے ہوئے صدقِ دل سے یہ دعا کررہی ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشیوں اور صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔ آپ کے ذوقِ مطالعہ کو پروان چڑھائے...... آپ کا اور ہمارا ساتھ ہمیشہ یونہی جڑا رہے، آمین! میں اپنی ان تمام بہنوں کو بھی سلام کرتی ہوں جو بے شک ہمیں خط نہیں لکھ پاتیں مگر فون پر اپنی آرا سے ہمیں آگاہ کرتی رہتی ہیں۔

میں اپنی ان مایۂ ناز بہنوں کو دعاؤں کے گلدستے دیتے ہوئے ان کے نام لکھ رہی ہوں...... جو میرے دل کے بے حد قریب ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں گی اگر کسی بہن کا نام میرے قلم کے ذہن سے نکل جائے تو...... (اور ایسا یقیناً ضرور ہوگا، اسی لیے تو پیشگی معافی مانگ رہی ہوں)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی۔ پروفیسر عابدہ خان، ایبٹ آباد۔ پروفیسر قمر جہاں خلیل، کراچی۔ عروج ذکی، کراچی۔ مسز شمع حسین، ٹورنٹو۔ مسز قیصر قدیر، ٹورنٹو۔ راشدہ صمد، ٹورنٹو۔ بختاور بلوچ، بلوچستان۔ خاک مدینہ، پنجاب۔ عارفہ کنول، پنجاب۔ عائشہ خالد، میرپور خاص۔ انیلا ناہید، لیہ۔ صبا نور، لیہ۔ سیدہ شفق عامر زیدی، کراچی۔ حمیرا کلیم، ملتان کینٹ۔ تانی چوہدری، آکسفورڈ۔ زرین زبیر کوٹھاری، کراچی۔ فصیحہ آصف خان، ملتان۔ ریحانہ شہزاد، کراچی۔ جبیں ہاشمی، بھیرہ۔ گیتی آرا، کراچی۔ ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی۔ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد۔ نسیم نیازی، لاہور۔ فریدہ فری، لاہور۔ شگفتہ شفیق، کراچی۔ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ، کرن صابر، جنڈ والا۔ شبانہ حیات، لاہور۔ فریدہ افتخار، پشاور۔ یاسمین رشید، کراچی۔ نویدہ تبسم، پشاور۔ مہناز کرن، پشاور۔ رفعت مبین رفی، کراچی۔ رفیعہ ابدالی، کراچی۔ مسز نزہت اشفاق، کراچی۔ زاہدہ عالم، کراچی۔ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ۔ زاہدہ اشرف، راول پنڈی۔ مسز وقار، راول پنڈی۔ زم زم، ویہاڑی۔ شکیلہ قمر، سندھ۔ شکیلہ، رقیہ، اوچ شریف۔ امینہ عندلیب، سلانوالی۔ ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس۔ ثمینہ وحید، پنجاب۔ صدف جاوید قریشی، ہزارہ۔ شائستہ اعجاز، کراچی۔ مسز سمیرا حمید فاروق، کراچی۔ ذکیہ ایوب، کراچی۔ انجم گلزار، کراچی۔ زہرہ جنید، کراچی۔ فاطمہ حمید، کراچی۔ شہلا نواز، لاہور۔ فریدہ خانم مختلف، لاہور۔ بتول فاطمہ، منچن آباد۔ عائشہ سلیم، لاہور۔ شمسہ الماس، ناروے۔ فریدہ فرح لاکھانی، سڈنی۔ سعدیہ سلیم، سڈنی۔ فرزانہ سلیم، میاں چنوں۔ روشانے عبدالقیوم، بونیری۔ یاسمین کنول، سیالکوٹ۔ عائشہ مظہر علی، میلسی۔ سامعہ تبسم، ملتان۔ عالیہ ملک، ساہیوال۔ رانا عالم، کراچی۔ مسز فرح امجد، لاہور۔ شائلہ سہیل جاوید، کراچی۔ سدرۃ المنتہٰی، ٹنڈو آدم۔ آصفہ شفیق، اسلام آباد۔ مسرت خلیل، کراچی۔ فیروزہ بیگم، کراچی۔ فہمی فردوس احمد، گوجرانوالہ۔ منور شہزادی، گوجرانوالہ۔ مسز عظمیٰ خورشید، لاہور۔ مریم، لاہور۔ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور۔ پروفیسر نوشابہ رئیس، لاہور۔ مسز عظمیٰ افتخار لاہور۔ پروفیسر نسرین، لاہور۔ یاسمین نشاط اختر، لاہور۔ عقیلہ حق، کراچی۔ فرحت جمال، کراچی۔ نزہت جبیں ضیا، کراچی۔ نگہت غفار، کراچی۔ نیررانی شفق، ڈیرا غازی خان۔ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ۔ ظل شاہین، رحیم یار خان۔ پروین افضل شاہین بہاول نگر۔ زینب ظفر زریں، قلعہ دیدار سنگھ۔ اقرا مظاہر، حیدر آباد۔ قمر شمس الحق، جھنگ۔ صاعقہ ریاض، حیدر آبا۔ بشریٰ آصف، لاہور۔ شبنم میر، سیالکوٹ۔ آمنہ ثنا، فیصل آباد۔ رخسانہ، لیہ۔ شہزادی، فیصل آباد۔ میمونہ عزیز، کراچی۔ منزہ نعیم، راول پنڈی۔ صائمہ شاہ راول پنڈی۔ رخسانہ امجد، ملکوال۔ روبینہ سید، کراچی۔ دھنک علی، اسلام آباد۔ ہما اصغر علی، اوکاڑہ۔ زینت عبدالصمد، میرپور ساکرو۔ عمارہ قریشی، حجرہ شاہ مقیم۔ رفعت خادم حسین، بلوچستان۔ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ۔ نوشی اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان۔ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی۔ عروج ذکی، کراچی۔ عذرا آفتاب، کراچی۔ نادیہ خاں وسیر، کرم پور۔ عظمیٰ

عنبرین، ڈی جی خان۔ ماہم، مظفر گڑھ۔ مصباح رضا سعید، فیصل آباد۔ درخشاں ضیا، حیدر آباد۔ سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم۔ فرخندہ انجم، لاہور کینٹ۔ صفیہ مغل، لیہ۔ رضوانہ بدر، بہاول پور۔ نورافشاں شیخ، شکار پور۔ ہما شاہ، ہارون آباد۔ خالدہ نسیم، لندن۔ ہما بیگ، کراچی۔ پروین عذرا تشنہ، کراچی۔ سائرہ لنگڑیال، سیال موڑ۔ معصومہ شیرازی، کراچی۔ صائمہ مشتاق، سرگودھا۔ میمونہ گل، سکھر۔ فائزہ ریاض، سیالکوٹ۔ ارم ملک، ہلکوال۔ سدرہ یاسین، سرگودھا۔ غزالہ یاسین، سرگودھا۔ مریم زبیر، کراچی۔ رافعہ، چکوال۔ مہتاب خان، کراچی۔ ماریہ فاروق، ریتی روڈ اباڑو۔ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا۔ نورین طلعت عروبہ، راول پنڈی۔ شگفتہ ناصر، فیصل آباد۔ انیلا شاہین، لاہور۔ نادیہ خان، ضلع وہاڑی۔ بشریٰ سہیل، یواے ای۔ بمیرا مشتاق، دوہا قطر۔ رفاقت جاوید، اسلام آباد۔ طلعت رانا، چیچہ وطنی۔ رابعہ فیاض قادری، کراچی۔ روبینہ گل، ہری پور۔ یزمان سیدہ رقیہ، اسماعیل شاہ۔ عارفہ مسعود، لاہور کینٹ۔ ثروت، سوات۔ نیر فہیم خان، کراچی۔ آمنہ مشیر، نیویارک۔ انجم افشاں، گجرات۔ اصفا فیصل، کراچی۔ شگفتہ ناہید قاضی، رسال پور کینٹ۔ عظمٰی آفاق سعید، کراچی۔ ہماری بہت سی مصنفات شاعرات بھی گاہے بہ گاہے بہنوں کی محفل میں شرکت کیا کرتی ہیں۔ ان کی اس شرکت سے پوری محفل میں ایک خوشی کا احساس رچ جاتا ہے۔ یوں تو ہماری تبصرہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد مصنفات کا چولا بھی پہن چکی ہے۔ بہنوں کی محفل میں شرکت کرنے والی مصنفات کے نام یہ ہیں۔ تو آئیں پہلے آپ میرے گلے لگ جائیں اور اپنی روشن اور ذہین پیشانی سامنے کریں تاکہ میں اسے بوسہ دوں اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی۔ اقبال بانو، وہاڑی۔ شیریں حیدر اسلام آباد۔ صائمہ اکرم، اسلام آباد۔ ساجدہ حبیب، راول پنڈی۔ عائشہ خان، لاہور۔ عطیہ عمر، کراچی۔ عالیہ حرا، کراچی۔ سلمٰی یونس، کراچی۔ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی۔ شگفتہ بھٹی، ملتان۔ عالیہ بخاری، کراچی۔ ثمرہ بخاری، چنیوٹ۔ رضوانہ پرنس، لندن۔ شائستہ زریں، کراچی۔ قیصرہ حیات، سیالکوٹ۔ تانیہ رحمٰن، لندن۔ نگہت نسیم، سڈنی۔ فریدہ فرح لاکھانی، سڈنی۔ سیمار رضاردا، کراچی۔ سیما بنتِ عاصم، کراچی۔ پروفیسر سیما سراج، کراچی۔ ثریا انجم، کراچی۔ تسنیم منیر علوی، دبئی۔ نیلوفر عباسی، امریکا۔ عائشہ خان، کراچی۔ شائستہ عزیز، کراچی۔ نوشین ناز اختر، لاہور۔ سعدیہ رئیس، کراچی۔ نزہت اصغر، کراچی اور عمیرہ احمد سیالکوٹ...... جی ہاں پاکیزہ میں عمیرہ احمد کا خط شائع ہوا ہے۔

ماہنامہ پاکیزہ کی روایت برسوں سے قائم ہے کہ اپنی اس خصوصی اشاعت میں جدا ہوتے والی مصنفات، شاعرات کو نہ صرف خراج تحسین پیش کرتا ہے بلکہ ان کے لیے دعاؤں کے تحفے بھی بھیجتا ہے۔ تمام قارئین پاکیزہ سے استدعا ہے کہ ہم سے جدا ہونے والی ان مایۂ ناز مصنفات اور شاعرات اور تبصرہ نگار بہنوں کے لیے کم از کم تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے ضرور دعا کریں کہ یہ سب بے شک اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی تحریریں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

☆ خالدہ اسد ☆ فاطمہ شہناز مرتضٰی ☆ نسرین قریشی ☆ عظمت عزمی ☆ ایم سلطانہ فخر ☆ شازیہ چوہدری ☆ پروین شاکر ☆ وحیدہ نسیم ☆ ریحانہ امجد ☆ تحسین فاطمہ ترمذی ☆ گوہر سلطانہ عظمٰی ☆ اطروبہ نایاب ☆ عطیہ بانو ☆ بلقیس ظفر ☆ ایم کے صوفیہ ☆ مسز طلعت حسین ☆ چاندنی عمران ☆ ظفرانہ عباس ☆ ناظمہ طالب ☆ شگفتہ کنول۔

میں تہ دل سے اپنے ادارے کے لوگوں کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہوں گی جن کا ساتھ میری ہمت اور توانائی کو ہمیشہ بحال رکھتا ہے۔ میری معاون آمنہ حماد بڑی پیاری لڑکی ہے اور میری بے حد مدد کرتی ہے۔ جناب کلب عباس بھی انتہائی مستعد اور مدد گار ہیں۔ محمد شہزاد خان، بدرالدین صاحب اور حمید صاحب کا بھی بے حد شکریہ جو ہر ممکن میری مدد کرتے ہیں۔

☆☆☆

.... آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لاالٰہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین○

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ محترمہ عذرا رسول کے فرزند ذیشان رسول تعلیمی سرگرمیوں میں ماشاءاللہ خوب آگے ہیں، اپنی یونیورسٹی کے کیش ایوارڈ مقابلے میں ذیشان رسول کے ریسرچ پیپر کو سرٹیفکیٹ دیا گیا اور کیش ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ (ماشاءاللہ)

☆ نامور مصنفہ ساجدہ حبیب کے بھتیجے عمر فاروق کی شادی ماہم سہیل کے ساتھ ہوئی۔ اس میں شرکت کرنے کے لیے ماہم کی پھپو نائلہ اعجاز نیویارک سے آئیں۔ نائلہ نہ صرف پاکیزہ کی مستقل قاری ہیں بلکہ ہماری فین بھی نکل آئیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ معروف مصنف کے اشرف، امریکا کا نام افسانوں، ناول اور کالم کے میدان میں بہت بڑا ہے کہ وہ جس موضوع اور صنف میں لکھیں اپنی تحریروں کو منوالیا کرتے ہیں۔ تاریکی میں جلتے لوگ ان کے ایسے افسانوں کا مجموعہ ہیں جو سچ کی بھٹی میں تپ کر کندن ہوتے ہیں۔ حسبِ معمول ان کی یہ ساتویں کتاب بھی بہت اچھے کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ صفحات 154 ہیں، قیمت صرف 250 روپے یا دس ڈالر ہے۔ جے سی ڈبلیو پرنٹرز 1375 یونیورسٹی ایونیو برکلے، کیلفورنیا 94702 یو ایس اے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

☆ وشال امیر سندھی زبان کے معروف مصنف ہیں، ان کے سندھی کالموں کا مجموعہ یادوں کا عکس کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ جس میں ان کی سچی اور کھری باتیں ہیں۔ انور سومرو نے اس کتاب کا خوب صورت تجزیہ کیا ہے۔ صفحات 144 اور قیمت صرف 100 روپے ہے جو انتہائی کم رکھی گئی ہے۔ تبصرہ کے لیے ہمیں یہ کتاب ہماری قاری بہن نورافشاں شیخ نے شکار پور سے بھیجی ہے۔ ہمارے قارئین اس خوب صورت کتاب کو اس ایڈریس سے منگوا سکتے ہیں۔ واکا پبلیکیشن فلیٹ نمبر 60 بی سیکنڈ فلور ای ون کو مپلیکس فیز II بلاک سی ابوالحسن اصفہانی روڈ کراچی۔

☆ آپ کی باجی انجم انصار کی نئی کتاب کھری کھری شائع ہو گئی ہے۔ جس کا انتساب محسنِ قوم ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نام ہے۔ اس کے صفحات 367 ہیں۔ اس میں قمر علی عباسی، امریکا۔ مسز فریدہ لاکھانی، آسٹریلیا۔ مسز شمع حسین ٹورنٹو اور علامہ عبدالستار عاصم چیئرمین قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل لاہور وغیرہ کی آرا شامل ہیں۔ کتاب کی قیمت 500 روپے ہے اور کتاب منگوانے کا پتا یہ ہے۔ مقبول اکیڈمی 199 سرکلر روڈ اردو بازار چوک لاہور۔ فون نمبر 042.37324164.7233165 پاکیزہ میں 26 ماہ چلنے والا ہمارا ناول محبت ہم سفر میری کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔ اس ضخیم ناول کے صفحات 576 ہیں قیمت صرف 500 روپے کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ القریش پبلیکیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور تبصرہ نگار شمسہ الماس، ناروے اور شاعرہ سائرہ احمد، جرمنی دوبارہ بھرپور انداز میں انٹری دینے والی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ میرے بیٹے عمیر کے ولیمے میں آنے والے تمام مہمان واپس چلے گئے ہیں۔ دولہا، دلہن بھی آسٹریلیا جا چکے ہیں۔ میں اپنے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کرنے والے تمام مہمانوں بشمول اپنی تمام رائٹرز، تبصرہ نگار بہنوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ انہوں نے اپنی شرکت سے میری محفل میں چار چاند لگا دیے۔ (نوازش)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عارفہ خاں کی اسی ماہ رخصتی ہو رہی ہے۔ (دلی مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ستارہ شیخ اور ان کی فیملی گزشتہ ہفتہ سعودی عرب روانہ ہو گئی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار زبیدہ حبیب، لاہور کے بیٹے ڈاکٹر سہیل عطا الرسول کا پی ایچ ڈی میں داخلہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ (ماشاءاللہ)

☆ فیصل آباد کے مشہور کپل شگفتہ ناصر اور ناصر صاحب کو اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے، ناصر صاحب دل کے عارضے میں مبتلا ہیں اور شگفتہ ان کے لیے بے حد پریشان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ (آمین)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور ہماری بہت اچھی دوست رفعت مبین رفی، کراچی ان دنوں اسپتال میں ایڈمٹ

ہیں۔ان کی کُلّی صحت کے لیے دعا کریں۔

☆میرے بہنوئی شاہد عالم، کراچی کا گزشتہ دنوں دل کا آپریشن ہوا ہے۔ بفضلِ خدا ان کا آپریشن کامیاب رہا۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی ان دنوں پھر بیمار ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ ملک، علی پور کے بیٹے مصطفیٰ کمال نے اپنی کلاس میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔(مبارک باد)

انتقالِ پُر ملال

☆ہماری نامور مصنفہ عطیہ عمر کی ساس انتقال فرماگئیں۔

☆معروف فنکارہ طاہرہ واسطی چل بسیں۔

☆پاکیزہ کی مستقل قاری مسز نشاط تسنیم صدیقی، انچولی سوسائٹی کراچی انتقال فرماگئیں۔

نوٹ: مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ ”مارچ کا شمارہ پڑھ لیا اور انتظار شروع اپریل کے شمارے کا۔ حسبِ معمول زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنے کے لیے بہت اچھا پیغام دیا ہے۔ بہنیں عمل کریں اور مایوسیوں میں مسکرانا سیکھ لیں۔ دین کی باتیں اور اسما رسول ایمان افروز ہیں۔ عکس ایک ہی نشست میں ختم کیا۔ یہ قسط پچھلی قسطوں کی نسبت ذرا کمزور رہی مگر پھر بھی اس کا اپنا ہی نشہ ہے اور خوب ہے۔ زندگی، زندگی کی گھما گھمیوں سے بھرپور ہے۔ حجاب بیچاری لگتا ہے کسی مشکل میں گرفتار ہونے والی ہے اور تسنیم تو مشکل میں پڑ ہی گئی ہے۔ پھولوں کے سوداگر اور سراغِ زندگی گوارا تحریریں ہیں۔ شیشوں کا مسیحا تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اس قسط میں تو کئی کرداروں کے ساتھ بہت برا ہوا...... اگلی قسط کا انتظار ہے۔ تحفہ میں ایک اچھا پیغام ہے۔ کانچ سی لڑکی کا اپنا ہی منفرد دلچسپ اور سبق آموز انداز ہے مگر ہر دفعہ لگتا ہے بہت مختصر لکھی گئی ہے۔ بے وطن مسافر اور ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں گوارا تحریریں تھیں۔ چلیں ایک تھی نیناں تو تھی ..... سے ہے میں تبدیل ہو کر منزل پا گئیں بلکہ نیناں تو کیا سب ہی لوگ بامراد ہو گئے بہرحال راحت وفا صاحبہ کے قلم کی بیبا کیوں کو صرفِ نظر کیا جائے تو گوارا تحریر تھی۔ بھرم ایک اچھی تحریر ہے۔ اور اب باری ہے اپنی محفل کی جو ہمیشہ کی طرح خوب خوب سجی ہے جس میں شرکت ہمیشہ خوشی کا باعث بنتی ہے۔ سالگرہ نمبرز کا شدت سے انتظار ہے اور ہاں ہماری بھی سالگرہ ہے اپریل میں، دعاؤں میں یاد رکھیں بہنیں۔ عمیرہ اور انجم آپ دونوں کا پاکستان کی چالیس نامور خواتین میں شامل ہونا مبارک ہو۔ بے حد خوشی ہوئی اور خوشی تو عمیر اور ثمینہ کے ریسپشن میں شامل ہو کر بھی ہوئی جو بہت سی رائٹر بہنوں سے ملاقات کا باعث بنی اور عذرا سے بھی ملاقات رہی (آپ تو مصروف تھیں) ماشاء اللہ دونوں بہت پیارے لگ رہے تھے مگر عمیر زیادہ نمبر لے گئے۔ ثمینہ ڈیئر ناراض نہ ہونا آخر تو عمیر تمہاری پسند ہیں لہٰذا تمہیں اپنی پسند پر فخر ہونا چاہیے۔ بلاشبہ بہت پیاری جوڑی ہے اللہ تعالیٰ نظرِ بد سے بچائے اور خوشیاں دکھائے، آمین۔ مصنف بہنوں کے ڈرامے ٹی وی پر دیکھ کر اچھا لگتا ہے۔ رابعہ کو تقریب آمین مبارک۔ لبنیٰ بہن اپنے بیٹے کو میری طرف سے کہیں کہ خط کا ایک الگ اور منفرد اپنا ہی مزہ ہے جس سے نئی نسل نا آشنا ہے۔ جن بہنوں نے انگلش الفاظ کے استعمال پر اعتراض کیا ہے وہ اعتراض برائے اعتراض نہیں ہے بلکہ درحقیقت ابھی تعلیم اتنی عام اور معیاری نہیں ہوئی کہ اکثریت ان الفاظ کو سمجھ لے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو طبقہ دکھایا جا رہا ہے تو ان کی بول چال کا یہی طریقہ لہٰذا مصنفہ بھی مجبور ہے۔ عکس کی ڈرامائی تشکیل کا ابھی سے انتظار ہے......اور کانچ سی لڑکی کا بھی...... خدا کرے جلد یہ ڈرامے ٹی وی پر آئیں۔ فرحت پیاری تمہارا بے حد شکریہ تم خود بھی بہت اچھی ہو (محبت کرنے والی) انٹرویو آن ائر جانے کی مبارک باد لو۔ عظمیٰ نے پاکیزہ ڈائری خوب ترتیب دی۔ عظمیٰ کی شاعری بھی اچھی لگی۔ آمنہ حماد کا انتخاب اور دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں جلترنگ میں کہانی گھر گھر کی دلچسپ تھا۔“ (تبصرے کا شکریہ بہنیں آسان اور مزے دار کشمیری چائے

پاکیزہ سے پاکیزہ کا رشتہ

نزہت اصغر

فقط لفظ ”رشتہ“ ہی اپنے اندر معانی کا پورا سمندر رکھتا ہے۔ لفظ رشتہ زبان پر آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بندھی لامحدود ڈوریں دور تک کسی نہ کسی نے بڑے پیار سے تھامی ہوئی ہوتی ہیں۔

اب ”رشتہ“ کی تشریح کرنے بیٹھ جاؤں تو صفحات پر صفحات ختم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں مجھے خصوصیت سے دوستی کے رشتے کے حوالے سے بات کرنی ہے اور پاکیزہ ڈائجسٹ سے بڑھ کر کون دوست ہوگا۔

یہ وہی پاکیزہ ہے جس سے میں نے اپنا رشتہ شعور کی سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھتے ہی جوڑا تھا مگر اس دور میں جبکہ رسالے نو عمروں کے لیے شجرِ ممنوعہ سمجھے جاتے تھے۔ صرف بڑی بہنوں کے ڈر سے رسالے کو چاہنے کے باوجود ہاتھ نہ لگا پاتے تو والدین کی اجازت تو دور کی بات...... بہنوں سے طے یہ ہوا کہ صرف چھٹی والے دن تھوڑی دیر رسالہ دیکھ لیا کرو وہ بھی صرف پاکیزہ...... یوں پاکیزہ سے پاکیزہ سی دوستی کا آغاز ہوا اور وہ دوستی مہینوں سے سالوں پر چلی گئی۔ انسان صدیاں نہیں جیتا ورنہ صدیاں لکھتی۔

بہرحال اس سالگرہ پر تحریر لکھنے کی وجہ دو ماہ پہلے آنے والی وہ فون کال بنی جو میری سہیلی نے بے حد تگ و دو کے بعد میرا فون نمبر حاصل کر کے مجھے پچیس سال بعد کی۔ ہوا اس طرح کہ میری سہیلی نفیسہ جو گزشتہ بیس سال سے یو اے ای میں قیام پذیر ہے اسے ہماری ایک مشترکہ دوست کوثر خورشید نے lakedistrict یوکے سے فون کر کے بتایا کہ میں نے نزہت رضوی جواب نزہت اصغر ہے، اس کی تصویریں پاکیزہ رسالے میں دیکھی ہیں، اس کا نمبر تم معلوم کرو۔“ سو نفیسہ نے کئی مرتبہ کوشش کی مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ حال ہی میں ذیشان رسول کے حج ولیمے کی دعوت کی تقریب کا احوال پاکیزہ میں چھپا اس طرح پھر یہ تحریک شروع ہوئی۔ میرے میکے کے نمبرز تو تبدیل ہو گئے تھے سو نفیسہ نے رسالے پر درج نمبرز پر رابطہ کر کے ہمیں ڈھونڈ نکالا اور عزیز قارئین یقین کریں کہ...... گراہم بیل کی اس جادوئی ایجاد کے باعث ایسا محسوس ہوا کہ پچیس سال کہیں ہوا ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ ہم آج بھی اسی کالج کے کوریڈور میں پھر رہے ہیں اور تفریحی ٹرپس کے پروگرام بنا رہے ہیں۔ اور یہ صرف پاکیزہ سے رشتے کی بدولت ہی ممکن ہوا۔

پاکیزہ ادارے کے تمام منتظمین کو سلام اور شکریہ بھی کہ انہوں نے دوستی کی روایات کو بھرپور طریقے سے سینچا اور پروان چڑھایا۔

پاکیزہ سے مستقل تعلق ہمارے لیے کسی نعمت سے کم ثابت نہ ہوا۔ خوب باتیں ہوئیں، دلکش کا بھی ذکرِ خیر آیا اور بہت سے قارئین کے نیک جذبات اور دعائیں دلکش کے دوبارہ اجراء کے لیے ملیں۔ یو کے میں مقیم ہماری دوست کوثر خورشید نے بتایا کہ میں پندرہ سال اسکاٹ لینڈ میں رہی اور پاکیزہ لینے چند مہینوں بعد ہم لوگ یو کے آتے تھے اور اکٹھا رسالے لے جاتے تھے۔ کوثر کا شوہر خورشید محمود وہاں مصروف اسکن اسپشلسٹ ہے۔ اسی طرح یو۔ اے۔ ای والی سہیلی نفیسہ نے بتایا کہ خرفیقان سے میرے شوہر خاص طور پر دبئی ہر ماہ رسالہ لینے آتے ہیں جبکہ وہ بھی ایک مصروف ڈاکٹر ہیں۔

یہ تو ایک دو مثالیں ہیں اسی طرح سے پاکیزہ سے دوستی کا سفر نہ جانے کتنے مسافر ہر ماہ طے کرتے ہیں اور ہزار دقتوں کے باوجود اپنی پسندیدہ تحریروں کو پڑھنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

اس سالگرہ پر پاکیزہ نے مجھے تجدیدِ دوستی کا بہت خوب صورت تحفہ خود دیا ہے اور میں بھی پاکیزہ کو اپنی تحریر کا یہ مختصر سا تحفہ ان دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ دے رہی ہوں کہ اے ربِ العزت، اس ادارے کے ناظمِ اعلیٰ محترم معراج رسول کو صحت کلی عطا ہو۔ عذرا رسول صاحبہ کو تندرستی، توانائی اور وہ ہمتیں عطا ہوں کہ دوستی کے یہ رشتے سدا قائم رہیں اور جذبِ جواں وطاقتِ نو ذیشان رسول کی صورت ان کے ہم قدم رہے۔ پاکیزہ کے بلاشبہ لاکھوں قارئین اس خلوص کی ڈوری میں مضبوطی سے بندھے رہیں۔

ایک مرتبہ پھر شکریہ پاکیزہ کہ مجھے تجدید دوستی کی چاشنی کی لذت نصیب ہوئی۔ پروردگار سے یہی دعا ہے کہ اس خلوص کی ڈور سے بندھے تمام قارئین، مصنفات و دیگر سدا شاد و آباد رہیں اور رسالے کی ترقی و ترویج میں اپنا اپنا کردار نبھاتے رہیں۔

بنانے کی ترکیب لکھ کر بھیجیں)

ذونیرہ طاہر، بہاول نگر سے۔ ''انجم آنٹی میری دوستی غزالہ جلیل، فریدہ جاوید فری سے بہت ہے۔ پاکیزہ پڑھ کر میرا بھی دل چاہا ہے کہ میں بھی اس میں شریک ہوں۔ میں نے سوچا کہ پہلے پوچھ لوں۔'' (گڑیا جم جم آؤ)

نزہت اصغر، کراچی سے۔ ''تمام رائٹرز، قارئین اور سب سے بڑھ کر مدیرہ پاکیزہ انجم باجی کو پاکیزہ کی سالگرہ بہت مبارک ہو۔ آپ کی بہترین کاوشوں سے ترقی کا سفر ممکن ہوا ساتھ میں قارئین کا ہمت افزا ساتھ نہ ہو تو کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل کی بدولت سب سے دوستی کے رشتے استوار رہتے ہیں اور رسالے کے مطالب پر بھی کافی تنقید و تعریف پڑھنے کو ملتی ہے جو اس کے حق میں بہتر ہے۔ بہر حال مائیہ ناز رائٹرز کی تحریریں تو رسالے کا حسن نکھارتی ہی ہیں مگر دیگر سلسلے اور قارئین کی ہر اعتبار سے شمولیت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں مدیرہ کی محنت و جانفشانی کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ماہ جنوری کے شمارے سے بات کروں تو نئے سال کا آغاز اچھا ہوا۔ ذیشان رسول کے حج کے ولیمے کی تقریب کا احوال بہت خوب صورت تھا، وہ موقع ہی اتنا بابرکت تھا۔ جو بہنیں پاکیزہ کی خاموش قاری ہیں وہ وقتاً فوقتاً ہمارے ذریعے سے تبصرے اور تجاویز پہنچاتی رہی ہیں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ ہر ماہ تحریری تبصرے سے رہ جاتی ہوں بہر حال آج کے دور میں بھی رسالے کے قارئین بہت ہیں جو اس میں مثبت تبدیلیاں اور خوشگوار سلسلے دیکھنا چاہتے ہیں اور اپنی آرا کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ بے شک کمپیوٹر کا دور ہے مگر رسالے کی اہمیت ختم نہیں ہوئی۔ مقبول لکھاریوں کو شامل کر کے آپ نے سنجیدہ قارئین کی دلی آرزو پوری کی ہے۔ میری گزارش ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر ناول ہی طویل ترین ہو دو طویل تو دو کم اقساط کے رکھیں۔ ایک تھی نیناں کا نجام کب تک ہے۔ شیریں حیدر تو اپنے کالموں کے ذریعے کافی دکھتی رگوں کو ٹٹول رہی ہیں۔ مجھے ان کے افسانے زیادہ پسند ہیں ناول میں طوالت بہت ہو جاتی ہے۔ ساجدہ حبیب کی کوئی پرانی تحریر کبھی لگا دیا کریں۔ رفعت سراج کی تحریر کے بھی ہم منتظر ہیں۔ عنیزہ سید سے دلکش والا ناول مکمل کروائیں۔ ڈائری کے صفحات میں کئی تحریریں مکرر لگیں۔ سندیسے والا سلسلہ بالکل پسند نہیں آیا۔ جلترنگ کی مختصر تحریریں زیادہ پُر اثر لگتی ہیں ورنہ پورا مضمون لگتا ہے۔ انٹرویو کے لیے عرض ہے کہ کوئی نامور شخصیات خصوصاً خواتین جو اپنے اپنے شعبے میں نمایاں ہیں ان سے بات چیت کی جائے۔ بچوں اور لڑکیوں کی تربیت کے حوالے سے بھی کچھ شامل رکھیں۔ امید ہے تبصرہ مکمل شائع ہوگا۔ تمام قارئین کو سلام اور دعائیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

شائستہ عامر، کراچی سے۔ ''میں اور میری ساس پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ اداریے سے لے کر ہر تحریر پڑھتے ہیں۔ جلترنگ بہت پسند ہے۔ کسی بھی تقریب کی روداد پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ خصوصی طور پر اس وقت اسے جب آپ لکھیں خوشبو بھری تقریب کو بار بار پڑھا ہے۔ عکس اور کانچ سی لڑکی اور ناہید سلطانہ اختر کا ناول بہت پسند آرہا ہے۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، امید ہے آئندہ بھی اپنی آرا سے باخبر رکھیں گی)

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''مارچ کا ٹائٹل جنوری میں لگنا چاہیے تھا۔ عکس میں چڑیا کالج میں پہنچ گئی۔ کہانی میں تجسس برقرار ہے کیونکہ ماضی اور حال ساتھ چل رہے ہیں۔ یسمایا کیمن کا بوجھ واقعی دل کا بوجھ بڑھا گیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی زندگی میں کردار بہت ہیں مگر کہانی سمجھ میں آرہی ہے اللہ لڑکے اور لڑکیوں کو نیک راستے پر چلائے۔ پھولوں کے سوداگر اچھی کہانی تھی۔ شیریں حیدر کی قسط میں کچھ باتیں عجیب سی لگیں۔ انجم تم جو بہنوں کی محفل میں لکھتی ہو کہ مرحومین کے لیے تین مرتبہ سورۂ اخلاص ضرور پڑھیں اسی سے متاثر ہو کر زاہدہ پروین نے افسانہ تحفہ لکھا اور پسند آیا۔ کانچ سی لڑکی کی کہانی بہت اچھی جارہی ہے۔ سرفراز صاحب پتا نہیں کیا کچھ کریں گے۔ اللہ نہاں کو بھی ناگہانی آفت سے بچائے۔ ایک تھی نیناں کا اختتام ہوا چاروں جوڑوں کی کشتی پار لگادی گئی۔ بہت خوب کرن احمد نے اچھا لکھا۔ عائشہ خان اور نزہت جبیں ضیا کے افسانے سو سو لگے۔ عظمیٰ آفاق کی ڈائری زبردست لگی۔ عمیر کے ولیمے میں عظمیٰ آفاق سے میں ملی وہ بہت زبردست لگیں۔'' (شکریہ)

امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''میری پیاری بہنو! کیسی ہیں آپ سب؟ اللہ تعالیٰ آپ سب کو سدا خوش سلامت رکھے، آمین۔ بہنوں کی محفل سے غیر حاضری بوجہ بیماری ہے۔ باجی سے آپ سب کی خیریت فون پر پوچھتی ہوں۔ باجی عذرا رسول، بھائی جان معراج رسول صاحب، ذیشان رسول بہت دعائیں کرتی ہوں۔ میری محترم بہنو بذریعہ قلم کسی بہن کو اگر میری بات کبھی بری لگی تو پلیز دل سے مجھے معاف کر دو اور دعا کرنا کہ میں زندگی اور خوشیوں کی طرف لوٹ آؤں جلد آپ کے

ساتھ اس محفل میں شامل رہوں۔'' (گڑیا تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی، انشاء اللہ)

اریبہ شاہ، یو کے سے۔ ''میں بہت زیادہ اردو لکھنا نہیں جانتی مگر پھر بھی لکھ رہی ہوں پتا نہیں آپ پڑھ پائیں گی یا نہیں۔ مجھے پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں پر 5 پونڈ کا ملتا ہے ہم تین بندیاں لے لیتی ہیں۔ مجھے اپنے ایک مسئلے کا حل پوچھنا تھا۔ ایک شمارے میں میں نے پڑھا تھا کہ بچہ پڑھنے میں کمزور ہو تو قرآن پاک کی کسی سورہ کی آیت پڑھنے سے بچے کا دماغ تیز ہوتا ہے پلیز آپ جواب ضرور بتانا کیونکہ میرا بیٹا پڑھنے میں کمزور ہے۔ میں آپ کو بہت دعائیں دوں گی۔ یہ میں نے پاکیزہ کے سلسلے روحانی مشورے میں پڑھا تھا۔ اگر یہ خط شائع ہوا تو میں آپ سے رابطہ رکھوں گی۔ پلیز پلیز یہ میرا مسئلہ ضرور شائع کرنا خط اگر لیٹ بھی ملتا ہے تو بھی باجی اللہ آپ کو صحت و زندگی دے، آمین۔'' (رب الشرح لی صدری ٥ ویسر لی امری ٥ وخلل عقدہ من لسانی ٥ یفقھو قولی ٥ یہ بہت اچھی دعا ہے۔ سورۂ طٰہٰ کی 25,26,27,28 ویں آیات اپنے بچوں کو یاد کروادیں اور بھی بہت سی دعائیں۔ جو آپ دیگر کتابوں میں دیکھ سکتی ہیں، میری روحانی مشورے اور انمول خزانے والی کتاب میں بھی دیکھ سکتی ہیں)

حمیرا شریف، گلگت سے۔ ''میں پہلی مرتبہ آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ بہت بہترین انجم انصار صاحبہ، نمرہ احمد اور عمیرہ احمد یہ سب پاکیزہ محفل کی رونقیں ہیں اگر یہ نہ ہوں تو محفل اداس...... جلترنگ ہمیشہ کی طرح فنٹاسٹک باقی روحانی مشورے، میں اکثر گنگناتی ہوں، سندیسے بھی اچھے لگے۔ میں آپ لوگوں کی محفل کا حصہ بننا چاہتی ہوں اس لیے ایک کہانی ارسال کر دی ہے۔ ویسے اتنے عظیم اور نامور رائٹرز کے ہوتے ہوئے میری یہ ننھی جسارت کہاں...... ویسے امید پہ دنیا قائم ہے امید کا دھاگا پکڑا دیجیے ہمیں۔ آپ سمیت سب بہنوں کو موسم بہار کی ڈھیروں خوشیاں ملیں، آمین۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، آپ ہر ماہ اس محفل میں شریک ہوں، مجھے دلی خوشی ہوگی۔ ابھی آپ کا افسانہ پڑھ نہیں پائی ہوں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد شکریہ کہتی ہیں)

سدرہ سحر، وہاڑی سے۔ ''آنٹی آپ کا نہیں...... نہیں بلکہ ہمارا بھی پاکیزہ بہت ہی اچھا ہے اور مجھے تو پاکیزہ بہت ہی اچھا لگتا ہے اور شاید آنٹی میں پاکیزہ کی بہت کم عمر قاری ہوں اور اب آتی ہوں پاکیزہ کی طرف جی سب سے پہلے تو سرورق کو دیکھ کر بہت ہی خوشی ہوئی۔ سلسلے وار ناول عکس، زندگی اور ایک تھی نیناں بہت ہی اچھے جارہے ہیں۔ ناولٹ بھی بہت ہی اچھے ہیں۔ افسانوں کی تو بات ہی کیا ہے بھی افسانے زبردست تھے مگر بنو حاکم ایسے، تمہیں خوشیاں مبارک اور خاص کر بھابی اور سوگ تو بہت ہی اچھے تھے اور انجم آنٹی آپ کے جلترنگ کی تو ماشاء اللہ کیا بات ہے۔ مجھے تو ہر ماہ ہی رسالے کا شدت سے انتظار رہتا ہے مگر مجبوری کہ ہمیں رسالہ جلد نہیں ملتا تقریباً آٹھ یا نو کو ملتا ہے۔ آپ ہی کوئی حل بتایئے میں تو آپ سے رشتہ جوڑ ہی چکی ہوں اب دیکھیں آپ کی طرف سے کیا رسپانس ملتا ہے۔ امید تو چالیس، پینتالیس نہیں بلکہ سو فیصد ہے کہ آپ ہمیں بھی اپنوں میں شامل کر لیں گی۔'' (گڑیا خوش آمدید، آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی اور ہاں یہ کیا لکھ دیا کہ تم پاکیزہ کی سب سے کم عمر لکھاری ہو۔ اس بات پر بہت سی بہنیں احتجاج کر سکتی ہیں کہ قلم کار تو سدا جوان رہتی ہیں۔ قلم تھوڑی بوڑھا ہوتا ہے)

شیریں ظفر، ملتان۔ بیٹا میں نے تمہارا پورا خط پڑھ لیا ہے۔ تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے۔ عمیرہ احمد بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ تم اپنی تحریریں مجھے ضرور ارسال کرو۔ ہاں میں اقبال بانو کو بتا رہی ہوں کہ وہ تمہارے گھر آئی تھیں۔ اس وقت تم فرسٹ ایئر کی طالبہ تھیں۔ ہاں خوش رہو پریشانی کی ہر بات ذہن سے جھٹک کر درود پاک پڑھ لیا کرو۔ ہمیشہ خوش رہو گی، انشاء اللہ۔

طلعت رانا، چیچہ وطنی سے۔ ''خدا تعالیٰ نے کچھ بندے مخصوص کاموں کے لیے چن رکھے ہوئے ہیں تبھی انہیں ایسی راہ پر چلاتا ہے جو کامیابی کی طرف جاتی ہے اور یہ مقدر والوں کو نصیب ہوا کرتی ہے، آپ بھی ان لوگوں میں شمار ہیں۔ کہانیاں، شاعری اور بھی بہت سے رسالوں میں پڑھی جاسکتی ہیں مگر پاکیزہ کی مقبولیت کی وجہ آپ کی حد درجہ انوالومنٹ، سادگی، سپردگی، اپنائیت، نرمی اور شفقت ہے جبھی بہنیں آپ پر اعتماد کرتی ہیں۔ ہر ماں کو یہ خوبیاں اپنانی چاہئیں اپنی نسلوں کی بقا کے لیے مجھ سمیت۔ اپنی خوب صورت یادداشتوں میں یاد رکھنے کا ٹوکرے بھر بھر کر شکریہ، عنایت، کرم، مہربانی۔ شادی سے پہلے جتنی ان تھی پاکیزہ میں شادی کے بعد اتنی ہی آؤٹ ہو کر رہ گئی ہوں، لگتا ہے شادی نہیں کی گوبر میں پاؤں گھب گئے ہیں نکالے نہیں نکل

رہے حالانکہ من چاہتا ہے گزشتہ لائف میں جو پاگل سے تجربات بھولے بھالے خیالات واحساسات کے بعد جوتیاں کھائیں، تڑختی باتیں، نندوں کی صلواتیں، ساس کی پھٹکاریں، دیورانیوں کی جیلس فیلنگز، شوہر نامدار کی لگی بندھی روٹین، دوغلا رویہ اور عمرے کی سعادت حاصل جو کمل گھونٹے وہ بہنوں سے شیئر کروں کیا کسی نے کیے ہوں گے سوائے جلترنگ کے۔ ویسے کیا خیال ہے جو لکھوں گوش گزار کر دیں گی بہنوں کے کیا واقعی عمرہ کر کے آتے ہیں یا تجربہ ہی ہوتا ہے کتنی غلطیاں تجربے ہوتے ہیں، ذاتی احساسات رائے جو وہاں نہیں ہونی چاہیے لکھ بھیجوں......؟'' (گڑیا میں اکیلی کچھ نہیں کر سکتی آپ بہنوں کا ساتھ اور یہ ساتھ محبت اور اعتماد بھرا ہے، اس لیے آپ کو پاکیزہ میں اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ رہی بات غلطی کرنے کی تو انسان ہونے کے ناتے ہم سب سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ عمرہ کرتے ہوئے بھی، حج کے موقع پر بھی مگر ہم سب کے دل میں یہ یقین کامل ہونا چاہیے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی معاف کرنے والا ہے کہ وہ رحیم ہے، کریم ہے اور ہر شے پر قادر ہے)

٭ سعدیہ کاظمی، کراچی سے۔ ''عمیرہ احمد کا ناول عکس بہت ہی خوب صورتی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے عکس بلاشبہ ایک بھرپور ناول ہے جس میں سسپنس، تھرل، رومانس سب کچھ موجود ہے۔ عمیرہ احمد کو میری طرف سے مبارک باد کہ انہوں نے اتنا اچھا ناول ہمارے لیے لکھا۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ ارجمند عقیل، کراچی کینٹ سے۔ ''سب سے پہلے تو بہت بہت شکریہ بدھ کے دن عمیر میاں کے ولیمے کی دعوت میں بہت لطف آیا اور کتنی ہی لکھاری بہنوں سے ملاقات ہوئی اور پھر آپ کی محبت اور گرم جوشی نے بہت متاثر کیا۔ امید ہے کہ آئندہ شمارے میں تصاویر وغیرہ تو لگیں گی۔ عذرا رسول، رفعت سراج، سیما مناف اور نگہت عبداللہ ان سب سے اور بہنوں سے مل کر آپ کے لیے دل سے بہت دعائیں نکلیں۔ یہ سب آپ کی محبت اور محنت کا ہی نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ دولھا دلہن کو بہت خوشیاں دے اور پاکیزہ کو بمعہ آپ کے سلامت رکھے، آمین۔'' (آپ کی دعاؤں کے لیے شکریہ)

٭ ممتاز خانم، کراچی سے۔ ''نہ آپ کو کوئی گلہ ہم سے اور نہ ہی ہمیں کوئی شکایت آپ سے۔ بس ہمیشہ خوش رہیں، یہ پیاری پیاری سی محفل سجاتی رہیں اور ان تمام کاموں کو سنبھالنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو صحت اور تندرستی عطا کرے اور آپ کی زندگی میں خوشیوں اور محبتوں کے پھول مہکتے رہیں، آمین۔ ہر ماہ کی طرح اس ماہ کا پاکیزہ بھی پڑھ لیا ہے یعنی مارچ کا۔ پاکیزہ میں کچھ اپنی کمی سی لگی سو حاضر خدمت ہیں۔ آپ پر ہمیشہ کی طرح اعتماد جو آپ ہم سب کو بہت وافر مقدار میں دیتی ہیں۔'' (بہت عرصے بعد خط ملا ہے اپنے مراسلات باقاعدگی سے بھیجو)

٭ مصباح رضا سعید، فیصل آباد سے۔ ''مارچ کا ٹائٹل بہت زبردست ہے۔ آپی جی 15 اپریل کو ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ وش کریں (بے حد مبارک باد) کانچ سی لڑکی زبردست جا رہا ہے۔ سب سے پہلے پڑھتی ہوں کہ دیکھوں انجم آپی کتنا ہنسائی اور کتنا رلاتی ہیں۔ جلترنگ تو بار بار پڑھتی ہوں اور پڑھ کر میاں جی کو سنانے کا تو اپنا مزہ ہے۔ وہ کہیں گے کہ میں خود پڑھ لوں گا میں کہتی ہوں میں تو اس لیے سنا رہی ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ہنس لوں۔'' (شکریہ)

٭ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ''خوب صورت ٹائٹل سے سجا پاکیزہ بے حد اچھی تحریروں سے مزین ہے جس میں ہمارے انتہائی پسندیدہ دو سلسلے عکس اور کانچ سی لڑکی بھی شامل ہیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے پر سکینہ فرخ کا افسانہ دوام زندگی بے حد پسند آیا اور جناب اداریے کی تعریف کے لیے الفاظ کی کمی پڑ جاتی ہے۔ بہت خوب صورت بات آپ نے بتائی ہے۔ بہنوں کو میری تو ساری زندگی اسی طرح ہی گزری ہے مسکراتے مسکراتے۔ ماشاءاللہ اللہ پاک نے وِل پاور اچھی دی ہے اور اللہ کا بڑا فضل ہے، الحمدللہ۔ اس بار پاکیزہ میں ایک اور صفحے نے ہماری توجہ اپنی طرف مرکوز کروالی ہے، وہ ہے عشقِ ناکام نمبر یہ کب آئے گا؟ یہ خاص شمارہ تو ہم ضرور ہی پڑھیں گے سرگزشت کا۔ بہت ہی دلچسپ ہوگا۔ انہوں نے مہینہ نہیں لکھا کہ کون سے مہینے میں آئے گا۔ (بہت جلد آئے گا اس کی اطلاع آپ کو پاکیزہ سے ہو جائے گی) جلترنگ میں بیچاری گنجی بیگم کے دکھڑے سن سن کے مسکراہٹ بکھرتی رہی۔ باقی سلسلے بھی خوب رہے۔'' (شکریہ)

٭ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے سلسلے وار ناولز کی بات ہو جائے۔ عمیرہ کا عکس ہو یا ناہید صاحبہ کی زندگی...... دونوں ہی زبردست جا رہے ہیں۔ شیریں حیدر بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں ہیں مگر ان کے ناول میں کردار بے شمار ہیں تو تھوڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ ناولٹ میں سکینہ فرخ صاحبہ بازی لے گئیں۔ نگہت جیسی نندیں نعمتِ خداوندی ہوتی ہیں۔ کانچ کی

لڑکی بھی آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا رہا ہے اور سرفراز صاحب کی انتہا پسندی نہ جانے کتنی آزمائشوں کا موجب بنے گی۔ زاہدہ پروین کا تحفہ سب سے انمول تھا ایسی تحریریں صدقۂ جاریہ ہوتی ہیں۔ کوئی بہن نزلہ زکام سے بچاؤ کا گھریلو نسخہ بتا دیں۔ باقی سلسلے بھی شاندار رہے۔ بہنوں کی محفل میں سب سے ملاقات اور ان کے حالات وخیالات سے آگہی ہو جاتی ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں فصیحہ صاحبہ کی غزل بہت پسند آئی۔ روحانی مشورے تو ایک خزانہ ہیں بشرطیکہ ان پر دل سے عمل کیا جائے۔'' (شکریہ)

٭ مہناز کرن، پشاور سے۔ ''آنٹی مجھے آپ سے ایک نئی نئی شکایت ہے اور وہ یہ کہ کچھ عرصہ قبل میں نے آپ کو اپنی 8,10 غزلیں بھیجی تھیں جن میں سے ایک دو شائع ہوگئیں اور باقی غائب تقریباً ایک سال پہلے میں بہنوں کی محفل میں بھی شریک ہوا کرتی تھی۔ انجم آنٹی کیا آپ کو میری شاعری پسند نہیں آتی میری ٹیچرز کو تو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ میری شاعری ہے۔ آنٹی ایک اور گلہ بھی ہے اور وہ یہ کہ میں نے آپ کے ناول محبت ہم سفر میری کے لیے بطور خاص ایک قطعہ بھیجا تھا مگر آپ نے اس کے ساتھ میرا نام نہیں لکھا۔'' (پیاری گڑیا! آپ اپنی غزلیں ایک ساتھ بھجوا دیں اور قطعہ بھی میں اسے آپ کے نام کے ساتھ شائع کر دوں گی۔ آپ کا نام غلطی سے لگنے سے رہ گیا ہوگا)

٭ عروج ذکی آفندی، کراچی سے۔ ''دو ماہ سے پاکیزہ سے غائب ہوں، پتا نہیں آپ نے مس کیا یا نہیں، عذرا آنٹی کو بیٹے کی حج کی مبارک باد۔ اس ماہ کا پاکیزہ بڑا انوکھا سا تھا ٹائٹل پاکیزگی کا پیکر لگا۔ اس ماہ تو بلاشبہ نئی مصنفات نے بھی کمال کر دیا بلکہ میدان مار لیا۔ عکس ہمیشہ کی طرح سے دلچسپی لیے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ چڑیا کا ماضی ہی عکس کا مستقبل تو نہیں۔ خیر دین کے ساتھ ہونے والے سلوک نے تقریباً رلا ہی دیا لیکن ایک قدرت کا قانون ہے کہ سچ کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔ شیریں حیدر کے شیشوں کا مسیحا میں اس قسط میں ایک نئے کردار کا اضافہ ہو گیا ہے۔ شیریں بہترین لکھاری ہیں۔ کانچ سی لڑکی زمانے کے اتار چڑھاؤ پر مبنی بہترین ناولٹ ہے۔ اونچے گھرانے کا اوسط درجے کے گھرانے سے ٹکراؤ نے ایک مقابلے کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا خمیازہ نہاں کو بھگتنا ہوگا۔ کہانی جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے اس میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ بنو حاکم ایسے زبردست رہی، ویل ڈن نادیہ جہانگیر کہانی میں آج کل کی لڑکیوں کے لیے بڑا سبق تھا۔ شمیم فضل خالق کی بھابی بھی بڑی انوکھی سی کہانی لگی ویسے آج کل کچھ ماحول اسی طرح ہوتا بھی جا رہا ہے کہ لڑکے لڑکیوں کی طرح بالوں کی پونی ٹیل بنائے بالکل لڑکی بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ جس طرح ہر کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی طلب ہوتی ہے اسی طرح پورا پاکیزہ کھانے کی طرح جلترنگ میٹھے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے آپی دولھا کے بارے میں جو خاکہ لکھا وہ یقیناً اتنے مزے کا تھا کہ میں نے سہ بار پڑھا۔ مزاحیہ لکھنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔'' (ایسی بات نہیں ہے یہ صرف اللہ کا کرم ہے کہ آپ بہنوں کو اچھا لگتا ہے)

٭ زاہدہ نسیم، مانسہرہ سے۔ ''جنوری فروری کے شمارے میں دو بہنوں کے خطوط پڑھ کر بے حد خوشی (1) زرقا محسود جنوبی وزیرستان محسود قبائل (جنوری) (2) گلفام مالاکنڈ ایجنسی (فروری) اس کے علاوہ (3) بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان کا خط بھی اچھا لگا کہ ہمیں اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں خطوط کی شکل میں ہی سہی۔ خط کافی تفصیل سے لکھا گیا تھا اور بہت پیار وخلوص کا اظہار بھی کیا گیا تھا۔ خوشی ہوئی کہ بلوچستان والے پاکستان کے باسیوں کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ ان علاقوں کے باسیوں سے گزارش ہے کہ اپنی تحریریں بھی سامنے لائیں اور اپنے علاقے کے لوگوں کو آگہی دیں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عمیرہ احمد ایلیٹ کلاس کا چہرہ عام قاری کے سامنے بے نقاب کرنے میں بے حد کامیاب رہیں۔ ناہید سلطانہ اختر کا ناول ابھی دو اقساط تک پڑھا اچھا لگا۔ اوہ! کانچ سی لڑکی کے لیے لفظ اچھا ٹھیک کافی نہیں بلکہ اس ناولٹ میں واقعات کا تسلسل، رشتوں کی منافقتیں اور انسانوں کا بھیانک روپ، محبت کی معصوم خواہش، سبھی کچھ ہے۔ حیرت انگیز حد تک یہ تحریر کراچی کے حالات سے بھی متاثر ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ ایک متاثر کن بہترین تحریر ہے۔ نمرہ احمد سے ایک سوال ہے حد ناولٹ سے متعلق۔ مہر ماہ کو کیسے پتا چلا کہ منال نے جھوٹ بولا یا بول رہی ہے؟ آپ کا ناولٹ حد اور افسانہ احمق تماشائی دونوں ہی تجسس سے بھرپور ہیں۔ ایک بھرپور ذہنی اختراع کی علامت! گڈ۔ فرنچائز نوشین ناز اختر کی بہترین تحریر لگی۔ شجرِ وفا عطیہ عمر کی اچھی تحریر تھی۔ ایک سوال کہ شجرِ وفا امیر گھرانوں میں یا وسائل سے بھرپور گھرانوں میں کیوں؟ کسی غریب کی کٹیا میں کیوں نہیں؟ رفاقت جاوید کا سفر تو ایک سوال ہے ان لوگوں کے لیے جو ماڈرن بننے کی دوڑ میں اپنی اسلامی روایات بھول جاتے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کے سامنے بھی حاضر ہونا ہے۔ دل کو چھوتی ہوئی ایک تحریر۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے ”خداوند کریم نے مجھے ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ دعا کریں کہ میں اس پر پوری اتروں اور خداوند کریم مجھے صبر و حوصلہ عطا کرے، آمین میری صحت مند و توانا بیٹی حریم فاطمہ بھاگتی دوڑتی، ہنستی کھیلتی اچانک ہی اپنی ٹانگوں کی طاقت کھو بیٹھی۔ پہلے تو ہم لوگ پولیو کے اثرات سمجھے مگر ڈاکٹر کی تشخیص کے بعد پتا چلا کہ یہ GBS کا وائرس ہے۔ جس نے پٹھوں پر اٹیک کیا ہے اور پٹھے بالکل کمزور ہو چکے ہیں اور بازوؤں میں بھی اس کے اثرات نظر آ رہے تھے۔ میں اسی وجہ سے کافی ڈپریسڈ تھی۔ بچی بالکل میری محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ لاہور میں پروفیسر ڈاکٹر قاضی سے علاج معالجہ کروا رہے ہیں اور اب وہ فزیوتھراپی سے کچھ بہتر نظر آ رہی ہے مگر چلنا پھر بھی شروع نہیں کیا۔ میں دن رات روغن زیتون سے اس کے جسم کی مالش کرتی ہوں اور خود ایکسر سائز کرواتی ہوں۔ بہر حال اتنا ہو گیا ہے وہ کرالنگ کرنے لگی ہے اور سہارے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ سے اور تمام بہنوں سے دعا کی اپیل ہے۔ نہ جانے خداوند کریم کس کی سن لے۔“ (عنبر تم بالکل پریشان نہ ہو۔ ہمارے قارئین حریم فاطمہ کی کلی صحت کے لیے ضرور دعا کریں گے)

فرحانہ ناز ملک، ڈیرہ غازی خان سے۔ ”یہ میں ہوں فرحانہ ناز ملک، پلیز سینے سے لگ جائیں ٹھا کر کے۔ بڑی مدتوں بعد مخاطب ہو رہی ہوں، شوق ملن بھی اتنا ہی بڑھا ہوا ہے۔ یقیناً نئے لوگ مل گئے آپ کو مگر فرحانہ ایک ہی رہی ہے۔ پوری امید ہے مجھے میری سیٹ ضرور ملے گی۔ ری انٹری ایک ہلکے پھلکے افسانے کی صورت میں کر رہی ہوں۔ پھر ہر مہینے اعلیٰ سے اعلیٰ آئیڈیا لے کر آؤں گی۔ بیچ میں بہت بار دل نے اکسایا کہ اب شرکت کرنی چاہیے جیسے آپ کے بیٹے کی شادی اور پیاری پیاری بھابی کی معصومیت کی تعریفوں کے لیے لیکن زندگی پہلے جیسی نہیں رہی تھی ادھر سوچا ادھر عمل بھی کر ڈالا۔ گردشِ حالات نے میری شوخی ہی نہیں وہ بے ساختگی بھی چھین لی۔ جو طبیعت کا خاصہ تھی اور ہماری شخصیت کا مثبت عکس بھی۔ خیر بھی قسم کے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کر چکنے کے بعد میں بھی پھر سے آ گئی۔ مجھے بہت اچھا لگا عمیرہ اور نمرہ کو پاکیزہ کا حصہ بنے دیکھ کر۔ یہ میرے پاکیزہ کی بہت بڑی کامیابی ہے اور عمیرہ کو تو میں خود ہر ماہ بتا دیتی ہوں ان کے ناول کی قسط کے متعلق کہ کیسی قسط رہی۔ لیکن انشاء اللہ اب پاکیزہ میں تبصرہ دیا کروں گی۔“ (بہت عرصے بعد آئی ہو۔ خوشی ہوئی۔ ہاں افسانہ جلد شائع ہوگا)

سندس جبیں، گوجرانوالہ سے۔ ”پاکیزہ ہمارے ہاں کافی عرصے سے آ رہا ہے۔ سو جب میں نے آپ کا دیگر مصنفین سے اتنا پیارا رشتہ دیکھا تو دل مچل اٹھا کہ پاکیزہ کے صفحات پر میرا نام بھی چمکے۔ یہ میرے لیے اعزاز ہوگا۔ اپنے بارے میں کچھ بتاتی چلوں۔ میں انگریزی ادب میں ماسٹر کر رہی ہوں۔ جولائی میں میرے فائنل ایگزامز ہیں۔ اب تک میری ایک کتاب اس کارِ جنوں میں منظر عام پر آ چکی ہے اور دو مزید کتابیں چند دنوں تک آنے والی ہیں۔ آپی! میں پاکیزہ کے لیے بہت سا اور بہت اچھا سا لکھنا چاہتی ہوں، آپ کی رہنمائی چاہیے۔“ (پیاری سندس، خوش آمدید۔ پاکیزہ کو اپنا پرچا سمجھو۔ اور اپنے اچھے اچھے افسانے ہمیں باقاعدگی سے بھیجو۔ مجھے خوشی ہوگی)

فردوس سحر، حیدر آباد سے۔ ”میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا ہے تو صرف عمیرہ احمد کی وجہ سے۔ اتنا پیارا اور سحر انگیز لکھنے پر میری جانب سے مبارک باد۔ معلوم ہوا کہ ٹی وی پر آنے والے سیریل میں چاندی اور پل صراط آپ کے ڈائجسٹ میں شائع ہو چکے ہیں تو افسوس کیے بنا نہیں رہ سکی۔ کاش اس سے پہلے ہی میں پڑھتی ہوتی۔ آپ کا ناول کانچ جیسی بھی بہت پیارا اور سادہ سا ہے، اس کے علاوہ نیا ناول بھی دلچسپ لگ رہا ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

فرخ وسیم فری، ملتان کینٹ سے۔ ”سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے“ پڑھ کر بہت اچھا لگا پھر بہنوں کی محفل میں بہنوں سے ملاقات کر کے فریش ہو گئے۔ مگر بہن گلفام بی بی کا حال پڑھ کر دل بھر آیا۔ اس دفعہ تو زیادہ ناولز اور افسانے بہت دکھی کر گئے۔ جیسے تمہیں خوشیاں مبارک ہوں، سوگ، شجر وفا، فرنچائز وغیرہ خاص کر محبت کا پھیلاؤ اور کانچ سی لڑکی کی قسط پڑھ کر دل درد سے بھر گیا۔ خیر یہ تو اچھا ہوا جو ریحان کی جان چھوٹی مینا جیسی لڑکی سے۔ احساس اچھا افسانہ تھا۔ ایسے تمام آفیسر جو تحائف کے نام پر رشوت لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی ہدایت دے۔ بنو حاکم ایسے اچھی تحریر تھی۔ کاش جو بہوئیں زیادہ اچھی نہیں بن سکتیں۔ وہ بشریٰ جیسا ہی سوچ لیں تو کسی گھر میں لڑائی جھگڑا نہیں ہو۔ سلسلے وار ناولز زبردست جا رہے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری، میرا انتخاب، روحانی مشورے، ہومیو کلینک اور خوش ذائقہ سب زبردست رہے۔“ (نوازش۔ ہاں غزل کچی سی لگی

......آئندہ پکا کر بھیجنا)

رُبیعہ، ساہیوال سے ”میرے نزدیک پاکیزہ کا معیار اچھا ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے اس کی معیاری لکھاری۔ پاکیزہ میں ہر وہ رائٹر لکھتی ہیں جنہیں میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے تو میں تعریف کروں گی عمیرہ احمد کی۔ وہ جب بھی لکھتی ہیں کمال کا لکھتی ہیں۔ آپ یقین کریں عکس کو پڑھنے کے لیے میں مہینے کے سارے دن گن گن کر گزارتی ہوں۔ عکس میں مجھے خیر دین کا کردار بہت پسند ہے جو اپنے ساتھ اتنا برا ہونے کے باوجود حالات کے ساتھ لڑ رہا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر بھی ایک بہت اچھا ناول لکھ رہی ہیں۔ ایک تھی نیناں مجھے کوئی خاص پسند نہیں آیا۔ میں بلاوجہ کی تنقید پسند نہیں کرتی لیکن یہ ایک بہت ہی ٹیپیکل کہانی تھی۔ اب آتی ہوں ناولٹ کی طرف انجم جی آپ کا ناولٹ اچھا جا رہا ہے، محبت کا پھیلاؤ ایک بہت اچھا ناولٹ تھا۔ اب آتی ہوں افسانوں کی طرف مجھے کسی بھی ڈائجسٹ میں افسانے جیسے لگتے ہیں جو کہ ڈائجسٹ کی عمارت کو لیے ہوئے کھڑے ہیں۔ نمرہ احمد میری فیورٹ رائٹر ہیں ان کا افسانہ مجھے بہت پسند آیا پلیز نمرہ احمد سے مسلسل ناول لکھوائیں ویسے افسانے بہت اچھے تھے لیکن فرنچائز میں رائٹر نے جیسے ان بوس اور میڈم لوگوں کے تکبر کی عکاسی کی اور پھر ان کا راہِ راست پر آنا مجھے بہت اچھا لگا۔ سوگ میں ثمینہ عظمت جی آپ نے معاشرے کے ایک منفی پہلو کی عکاسی کی۔ کرن احمد کی تمہیں خوشیاں مبارک ہوں مجھے بے حد پسند آئیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ اور اس محفل میں خوش آمدید)

جویریہ سلیم، راولپنڈی سے۔ ”میں جویریہ سلیم ہوں فاطمہ جناح یونیورسٹی میں بی سی ایس کر رہی ہوں۔ پاکیزہ کی محفل میں پہلی بار حاضری دے رہی ہوں۔ آپ مجھے اپنی دوسری بھتیجی سمجھ لیں یعنی رابعہ سلیم اور جویریہ سلیم۔ کیا آئندہ میں آپ کو پھپھو کہہ کر مخاطب کر سکتی ہوں (ضرور) پاکیزہ اور دیگر پرچے ہمارے گھر آتے رہتے ہیں۔ جب بھی موڈ ہو پڑھ لیتی ہوں۔ کالج میں پڑھتی تھی تو بہت شوق تھا پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا بھی۔ کالج کے میگزین میں کچھ نہ کچھ بے ڈھنگا سا لکھتی رہتی تھی۔ اردو کی میڈم بہت حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ ان کی حوصلہ افزائی نے کچھ تحریریں لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اب تک صرف تین تحریریں ہی شائع ہوئی ہیں۔ کچھ عرصے سے پاکیزہ مسلسل خرید کر پڑھ رہی ہوں۔ اس کی تحریریں خاص کر آپ کی، عمیرہ احمد اور ناہید سلطانہ اختر کی تحریریں پرچے کی جان ہوتی ہیں۔ پاکیزہ کو پڑھ کر رقم کے زیاں کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے تمام کالمز کا اپنا مزہ اور مقام ہے۔ ان سب کو پڑھ کر کچھ سیکھنے اور سدھرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کا سارا کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے۔ آپ بلاشبہ ایک بہترین لکھاری ہی نہیں بلکہ ایک بہترین دوست اور رہبر بھی ہیں۔ مجھے بھی آپ کی بے لوث دعاؤں اور رہبری کی ضرورت ہے۔ مجھے محفل میں ضرور جگہ دیں اور حوصلہ افزائی بھی کریں۔ میں نے گزشتہ برس سی بی کالج سے ایف ایس سی کیا تھا اور اسکالرشپ حاصل کیا اور وزیر اعلیٰ پنجاب کی طرف سے لیپ ٹاپ بھی وصول کرنا ہے۔“ (پیاری بھتیجی جویریہ اس محفل میں خوش آمدید۔ آپ جیسی ٹیلنٹڈ لڑکیوں کو ہمارے تمام سلسلوں میں حصہ لینا چاہیے۔ ہاں حوصلہ افزائی بھی ضرور ہوگی)

نور افشاں شیخ، شکارپور سے۔ ”آپی عذرا کو ذیشان کے حج کی مبارک، باجی انجم کو عمیر کی شادی کی مبارک اور مونا کو ایک کروڑ درود پڑھنے کی بہت بہت مبارک۔ مارچ کا پاکیزہ بہت اچھا لگا ماڈل بھی بہت پیاری لگی۔ حمد باری تعالیٰ، نعت اور دعا پڑھنے کے بعد روحانی مشورے پڑھے۔ مجھے میری بہنوں کو یہ سلسلہ بہت بہت پسند ہے۔ باجی اس سلسلے کے صفحات پلیز بڑھا دیں اس کے بعد سندیسے پاکیزہ بہنیں میں اپنا ایس ایم ایس پڑھ کے بہت خوشی ہوئی، شکریہ باجی۔ سب سے پہلے کہانیوں میں کانچ سی لڑکی پڑھا جو بہت اچھا اور وی آئی پی لگتا ہے اور بالکل سمجھ میں آنے والا آسان بھی میں اور میری بڑی بہنیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں کانچ سی لڑکی اور مینا کی خودکشی پر بہت دکھ ہوا اور نہاں کے گھر والوں کی مشکلات پڑھ کے بھی اور آخر میں نواز کی اصلیت جان کر بھی حیرانی ہوئی۔ عکس میں مجھے چاچا خیر دین، چڑیا اور باربی ڈول کے کیریکٹرز بہت اچھے لگتے ہیں اور ان کی باتیں بھی۔ باجی جی چڑیا ہی عکس ہے نا......؟ کہانیوں کے علاوہ سب سے پہلے روحانی مشورے، مجھے کچھ کہنا ہے، پاکیزہ ڈائری، بہنوں کی محفل اسپیشلی بہت پسند ہیں۔ اس کے علاوہ جلترنگ میں کہانی گھر گھر کی نے تو بہت ہنسایا اور کوڑا جمال شاہی نے تو بہت ہنسایا۔ باجی آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے، ایسا ہی ہوتا ہے۔“ (کم بالوں والی بہنیں پریشان نہ ہوں۔ باہر گنجے مرد پسند کیے جاتے ہیں۔ بس کچھ ہی دیر باقی ہے جب گنجی عورتیں فیشن ایبل خواتین کہلائیں گی اور ان کی حرم میں سب

لمبے بالوں والیاں اپنی چوٹیاں کاٹ پھینکیں گی۔ تب بہت ساری خواتین سکون کی سانس لیں گی)

رفیعہ ابدالی، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے اداریے میں آپ کی پُر بہار باتیں پڑھیں واقعی زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ دین کی باتیں پڑھ کر دینی علم میں اضافہ ہوا۔ سلسلے وار ناول سب ہی اچھے ہیں لیکن زندگی سب پر بازی لے گیا۔ راحت وفا کے ناول کی آخری قسط پسند آئی۔ ناولٹ میں کانچ سی لڑکی پڑھ کر دل دھک دھک کرنے لگا، یہ قسط بہت ہی خوفناک تھی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ سکینہ فرخ کا ناولٹ دوامِ زندگی پڑھ کر مزہ آ گیا ان کی نصیحت آموز تحریر بہت خوب صورت تھی۔ سیما یاسمین مجتبیٰ کی بوجھ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ پھولوں کے سوداگر بہت زبردست تحریر تھی۔ اس ماہ کی یہ سب سے بہترین تحریر ہے۔ سراغِ زندگی میں زندگی کے سراغ سے آگاہ ہوئے۔ زاہدہ پروین کا تحفہ ہمارے لیے ایک حسین تحفہ ہے۔ بشریٰ گوندل نے اپنے افسانے بے وطن مسافر میں افغانی مہاجروں کا درست نقشہ کھینچا ہے، اسے پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ کرن احمد نے بھی اچھا لکھا۔ عائشہ خان کے افسانے ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں تاخیر کی وجہ سے اچھی لڑکی بابر کی قسمت سے نکل گئی۔ کفارہ میں شہلا حیات نے اپنی غلطی کا کفارا ادا کر دیا۔ بہت ہی اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ بھرم میں نزہت جبیں ضیا نے نور جہاں کا بھرم خوب رکھا۔ زبردست تحریر تھی۔ بہنوں کی محفل بہت شاندار سجی تھی۔ جس میں بہنیں اپنے دکھ سکھ بیان کر رہی تھیں۔ جلترنگ پڑھ کر بے حد محظوظ ہوئے، خوش ذائقے میں مزے مزے کی ڈشز تھیں آپی میں نے گوشت کے حلوے کی ترکیب ارسال کی تھی مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئی کیا آپ کو پسند نہیں آئی ویسے یہ حلوہ بہت لذیز بنتا ہے۔'' (گڑیا گوشت کے حلوے کی ترکیب شائع کر دیتی تو شاید کچھ لوگ حلوہ بنانا تو کیا کھانا بھی چھوڑ دیتے۔ آج مجھے کریلے کی برفی کی ترکیب بھی موصول ہوئی۔ ابھی تو ہماری بہت سی بہنوں کو سوجی کا حلوہ صحیح طرح سے بنانا نہیں آتا ایسا کچا سا بناتی ہیں کہ سوجی بھونتی تک نہیں ہیں۔ سوجی کا ٹکریوں کا جما ہوا حلوہ بنانے کی ترکیب آپ بھیج دیں کہ یہ مجھ سے بھی ہر دفعہ صحیح نہیں بنتا۔ بعض دفعہ فریزر میں رکھ کر جمایا کرتی ہوں)

سیدہ حما شاہ، ہارون آباد سے۔ ''پاکیزہ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اس ماہنامے نے خواتین کی جس طرح نمائندگی کی ہے یہ بات قابلِ داد ہے محبتوں سے گندھا ہوا ہر ہر لفظ عکس الفت ہے۔ آپی جی میرا پہلا شعری مجموعہ مارچ میں آ رہا ہے آپ کی قیمتی رائے کے لیے آپ کو بھیجوں گی۔'' (بہت بہت مبارک ہو)

سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ سے۔ ''پاکیزہ، پاکیزہ بہنوں کے لیے ایک مکمل تفریحی کتاب ہے جس میں تمام بہنوں کی پسند کا تمام مواد شامل ہوتا ہے لیکن پھر بھی میری شکایت ان پر واجب رہتی ہے کہ میں ہر ماہ پابندی سے متفرق صفحوں کے لیے کوئی نہ کوئی فریش سی تحریریں بھیجتی ہوں مگر آپ اتنی پابندی سے شامل نہیں کرتیں۔ عمیرہ احمد عکس میں پھر سے محبت کو کشید کر رہی ہیں اور ان کی ہر تحریر میں محبت کا ایک نیا زاویہ ہوتا ہے محبت پھر محبت کبھی دل سے نہیں جاتی محبت کے ہزاروں رنگ ہیں اس کے عجب سے ڈھنگ ہیں محبت کبھی صحرا، کبھی دریا، کبھی جگنو کبھی آنسو اور محبت کبھی دعا بنتی ہے یہی عمیرہ احمد کا اپنی لازوال تحریروں میں پیغام ہوتا ہے۔ سلسلے وار ناول اپنی روایت کے مطابق سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خاص کر ... ناہید سلطانہ اختر کا زندگی خنک راتوں میں پڑھنے میں مزہ دیتا ہے۔ ایک تھی نیناں سائیکو اسٹوری نہیں تھی بلکہ ہلکی پھلکی رومانوی انداز میں لکھی تھی۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں بھی قابلِ ذکر ہے۔ ناولٹ میں کانچ سی لڑکی ناولٹ کے فارمیٹ پر لکھی گئی ہے۔ افسانے مجھے بہت پسند آئے جو کم صفحوں پر اپنا خوشگوار دی اینڈ دے جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں کفارہ، سراغ زندگی، بوجھ اور بے وطن مسافر بہت پسند آئے۔ اداریے کے ساتھ ساتھ مستقل صفحات پڑھنے کے قابل ہیں جن میں زندگی ہوتی ہے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ۔ بعض اچھے مراسلات بھی تاخیر سے ملنے کے سبب شائع ہو جانے سے رہ جاتے ہیں۔ بہار نمبر کے لیے ہمیں بہترین تحریریں بہار نمبر شائع ہونے کے بعد ملیں۔ ڈاک کا نظام خاصا خراب ہے اور اس نظام کی وجہ سے بہنوں کے دل میں ہمارے لیے بدگمانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں)

غزالہ اعظم پاٹولی، حیدرآباد سے۔ ''میں آپ کی ایک خاموش قاری ہوں لیکن قلم اٹھانے کی جرأت پہلی دفعہ کر رہی ہوں۔ لکھنے لکھانے کا شوق بھی تھا اور لکھا بھی لیکن اس بات کو بھی بہت عرصہ گزر گیا۔ کچھ مجبوریوں اور مصروفیتوں کی بدولت یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اب پھر قلم اٹھایا ہے۔ رہی بات پاکیزہ کی تو یقین کریں پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاکیزہ ہی ہے کہ

اس کا جو معیار پہلے سے چلا آ رہا ہے آپ نے اس میں اضافہ تو کیا ہے لیکن کہیں سے کسی جگہ بھی کمپرومائز نہیں کیا جو صاف ستھرا ادب ہمیں یہاں پڑھنے کو مل رہا ہے اس کے لیے آپ لائقِ تحسین ہیں اور عذرا رسول صاحبہ کو بھی ڈھیروں دعائیں اور پیار کہ اللہ ان کے جیون ساتھی کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور بیٹے کی خوشیاں دکھائے، آمین۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ ''مارچ کا پاکیزہ اچھا لگا۔ زندگی کے دکھوں پر مسکرا کر مقابلہ کرنا ہی زندہ دلی ہے۔ آپ کی پُراثر باتیں گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ پھر عکس کی دلفریبیوں میں الجھ گئے۔ شیر دل کا کردار بھرپور تجسس لیے ہوئے ہے۔ چڑیا اور نانا کی جدوجہد قابلِ ستائش ہے۔ بوجھ نے آنکھیں کھول ڈالیں۔ کاش کوئی سمجھ جائے۔ زندگی میں تسنیم کے عمل سے دکھ اور صدمہ ہوا حجاب کا لگتا ہے آزمائشوں سے واسطہ پڑے گا۔ پھولوں کے سوداگر سبق آموز تحریر لگی۔ تحفہ دین داری کا درس دے گئی۔ کانچ سی لڑکی دلچسپی سے بھرپور کردار نگاری کا مرقع لگتی ہے۔ آپ کا برجستہ انداز اور بعض جملے ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بشریٰ گوندل کی بے وطن مسافر جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق رہی۔ ایک تھی نیناں تعریف و تنقید برداشت کرتی اختتام پذیر ہوئی۔ محبت وطن سے ہو تو ہمارا مان ہو تم کہانیاں تخلیق پاتی ہیں۔ سکینہ فرخ کی دوام زندگی اپنی ہمت و برداشت سے بڑھ کر ردا نے خود کو سمیٹا۔ شادی تو ہے ہی برداشت و سمجھوتے کا نام۔ ایک دوسرے کی عادات کو برداشت کرنا نہ چاہتے ہوئے بھی۔ سکینہ فرخ کے سمجھانے کا انداز دلکش رہا جو آج کل کی نازک اندام لڑکیوں کے لیے کسی اہم سبق سے کم نہیں جو ذرا ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتی ہیں۔ عائشہ خان نے افسردہ کر دیا۔ کفارہ تابندہ جی نے خوب لکھا درد بھی کوئی کوئی محسوس کرتا ہے۔ سید حارا ستہ دکھا کر فریال سرخرو ہوئی۔ بھرم نزہت جبیں نے زبردست لکھا کچھ بھی ہوا نیلم اجڑنے سے بچ گئی۔ بہت مبارک ہو آپ کا اور عمیرہ احمد کا نام جگمگا گیا۔ بہنوں کی محفل میں محترمہ عظمیٰ خورشید کی آمد بہت بھلی لگی پلیز اب ناغہ نہ کیجیے گا ورنہ جرمانہ لگا دیں گے ہم۔ اللہ پاک آپ کو بہت سارا سکون دے، آمین۔ سبھی بہنوں نے اچھے تبصرے پیش کیے۔'' (شکریہ)

جبیں ہاشمی، بھیرہ سے۔ ''رسالے میں روز افزوں ترقی اور نکھار عذرا رسول اور انجم انصار کی وجہ سے ہے۔ اس میں ہر فرد کی طبیعت، مزاج اور دلچسپی پر مبنی ناول، افسانے اور تحریر ہوتی ہے۔ میں نے اس ڈائجسٹ کے ذریعے بہت کچھ سیکھا ہے کہتے ہے ناں ہر کوئی کسی نہ کسی سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی ہے اور یہ بالکل سچ ہے میں نے آپی انجم سے بہت سی ایسی باتیں سیکھی ہیں جو میں نہیں جانتی تھی۔ خاص کر جلترنگ اداس دل کو خوشگوار موڈ میں بدل دیتا ہے۔ ویل ڈن ایک فرمائش ہے میری دل سے جتنی بہنیں اس محفل میں شامل ہوتی ہیں تبصرے کے ساتھ ان کی تصویر بھی لگنی چاہیے اور میں پہلے ابتدا کر رہی ہوں۔ چلو آواز نہ سہی شکل تو دیکھ سکتے ہیں ناں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ محفل میں بیٹھے ہیں اور نظر بھی نہ آئیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ صرف جو رائٹرز لکھیں اسی پر تبصرہ نہ کریں بلکہ اس محفل میں ہر دوست جو خیالات کا اظہار کرتی ہیں ان کے پوائنٹ کو نوٹ کر کے ان پر بھی تنقید یا تبصرہ کریں، کیا خیال ہے؟'' (پھر تو افسانوں کی جگہ نہیں رہے گی)

حمیرا ہاشمی، بھکر سے۔ ''آپ نے ہمیں پاکیزہ ڈائری اور اپنے پاکیزہ دل میں جگہ دی۔ مابدولت حمیرا ہاشمی کو پورے پاکستان سے متعارف کروایا۔ ہمارے دل میں آپ کی عزت اور ہماری رگوں میں اتنی عزت افزائی سے پونے دو کلو خون بڑھ گیا۔ آپ کی اس حوصلہ افزائی پر بہت زیادہ محبت کے ساتھ خواتین کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ (بالکل نہیں) انجم آپی پاکیزہ کی جتنی تعریف کریں کم ہیں کیونکہ اس جیسا کوئی ڈائجسٹ نہیں یہ ایک ایسا چراغ ہے جو ہر طرف اپنی روشنی پھیلا رہا ہے اور پھولوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کی خوشبو دنیا کے ہر کونے تک پھیل چکی ہے۔ اے رب العزت ہمارے پاکیزہ سے وابستہ ہر بندے کو سلامت رکھنا، آمین۔'' (آپ کی دعاؤں کے لیے احسان مند ہوں)

☆ بہنوں کی محفل کا کوٹا ختم ہوا اس لیے اب اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم، صحت مند، کامیاب و کامران رکھے اور دشمنوں اور حاسدوں کے شر سے محفوظ رکھے، آمین ثم آمین۔

دعا گو
آپ کی باجی
انجم انصار

انجم انصار، رفاقت جاوید، عذرا رسول، شائستہ اعجاز

شادی میرے شہزادے کی

عظمیٰ آفاق سعید

پیاری بہنو! آج میں آپ کو ایسی تقریب کا حال سنانے جا رہی ہوں جو میرے شہزادے جیسے بھائی عمیر کے ولیمے کی تقریب تھی۔ میرا سب سے چھوٹا بھائی میرے لیے کسی شہزادے سے کم نہیں ہے۔ جب وہ چھوٹا تھا تو کوئی اسے انگریز کہتا تھا کوئی پٹھان۔ سرخ و سفید رنگت، گہری براؤن آنکھوں والا عمیر عادتوں کا بھی بہت پیارا ہے۔ جو بھی اس سے مل لے اس کا گرویدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لہجے کا دھیما پن، عاجزی، تمیز اور خوش خلقی اس کی شخصیت کا خاصہ

ہیں۔ ایک بہن ہونے کے ناتے مجھے اس پر فخر ہے اور یہ میری تربیت ہماری امی اور آپ کی باجی انجم انصار کی مرہونِ منت ہے۔ یہ ان کی تربیت کا ہی اثر ہے کہ آج ہم چاروں بہن بھائی زندگی میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ بفضلِ خدا مطمئن بھی ہیں (ماشاءاللہ)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ عمیر کی شادی آسٹریلیا میں ہوئی تھی جس کی روداد ہماری سعدیہ مامی نے پاکیزہ میں لکھی تھی۔ شادی میں چونکہ ہم گھر والے شریک نہیں ہو پائے تھے اس لیے سب کے دلوں میں ایک تشنگی سی تھی کہ اپنے لاڈلے بھائی کی شادی کے ارمان ہم نکال نہیں سکے تھے مگر اللہ کا شکر اور احسان کہ وہ وقت بھی آ گیا۔ عمیر نے جیسے ہی شادی کے فوراً بعد پاکستان آنے کے لیے اپنی اور ثمینہ کی سیٹ بک کروائی، میں نے اور امی نے ولیمے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ طے یہ پایا کہ ولیمے سے ایک دن پہلے ڈھولکی ہو گی اور دوسرے دن ولیمہ کیونکہ ہمارے ابو مہندی مایوں کی تقریبات کے سخت خلاف ہیں کیونکہ یہ سب خرافات ہیں تو ہم نے ڈھولکی ہی غنیمت جانی۔ جن کے بچے بیرونِ ملک سے گھر آتے ہیں ان گھروں میں یقیناً جشن کا سا سماں ہوتا ہوگا۔ ایسا ہی ہمارے گھر میں ہو رہا تھا۔ گھر میں رنگ و روغن کراکری، چادریں، پردے حتیٰ کہ عمیر اور ثمینہ کے آنے کی خوشی میں امی نے پورے گھر کا فرنیچر تک چینج کر دیا تھا۔ عمیر اپنی بیوی ثمینہ، ساس، سسر (مسٹر اینڈ مسز شجاع) کے ساتھ دس فروری کو کراچی پہنچا تو ہمارے گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ عمیر سے بڑا بھائی ضیا الرب جو چھ ماہ قبل سڈنی گیا تھا اس کو بھی بطورِ خاص بلوایا گیا تھا۔ وہ عمیر کے آنے سے چار دن پہلے آ گیا تھا اور انتظامی سرگرمیوں کا سربراہ تھا۔ ائرپورٹ پر عمیر کے دوستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ ثمینہ، عمیر، نہار باجی، شجاع بھائی کو سب نے اتنے بوکے دیے جو ان سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے اور جب گھر آئے تو امی نے پھولوں کی پتیوں سے روش بنوائی تھی جس پر دلہن پیر رکھتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کا کمرا پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اپنے اس استقبال پر سب ہی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

14 فروری کو ڈھولکی کی تقریب ڈرتے ڈرتے گھر کی چھت پر ہی ارینج کی گئی تھی کہ کہیں ابو ناراض نہ ہو جائیں۔ عمیر اور ثمینہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ کوئی کام ہو تو ہمیں بتائیں۔

میں نے کہا "بھیا کوئی کام بھی نہیں ہے۔ سارا کام ایونٹ آرگنائزر کریں گے۔"

اس پر عمیر بولا۔ "آپی ہم نے اپنی شادی میں سارے کام خود کیے حتیٰ کہ ہوٹل کے جس ہال میں شادی ہوئی تھی دوپہر کو جا کر میں اور ثمینہ اس کو ڈیکوریٹ کر کے آئے تھے۔ خوب صورت لائٹس کی جھالریں تک ہم نے خود لگائی تھیں۔"

اس پر میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "دیکھا ہمارا پاکستان کتنا اچھا ہے۔ جو چاہیے وہ حاضر ہو جاتا ہے۔" تب عمیر کے ساتھ ساتھ ثمینہ نے بھی تائید کی۔

رات نو بجے کے بعد سے مہمان آنے شروع ہو گئے جو... صرف عمیر کے دوست تھے۔ محلے کی بچیاں یا گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان۔ فیملی سے کوئی انوائٹ نہیں تھا اس کے باوجود 75 کے قریب مہمان موجود تھے۔ ندیم ماموں اور سہیل ماموں اسلام آباد سے آئے تھے۔ دلہن ثمینہ کی غیر ملکی سہیلی "جی" کینیڈا سے آئی تھی۔ آنٹی شمع حسین، ان کی بیٹی نازیہ حسین کینیڈا سے آئی تھیں۔ میری پیاری دوست شازیہ جمال جو امی کی بیٹی بھی بنی ہوئی ہے اپنی پوری فیملی کے ساتھ موجود تھی۔ پوری چھت پیلے اور گرین شامیانے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اسٹیج پر خوب صورت لکڑی کا جھولا

تھا جو گیندے اور گلاب سے سجایا گیا تھا۔ دلہن نے گرین شرارہ اور پیلی شرٹ اور ٹائی اینڈ ڈائی کا سبز اور پیلا شیفون کے گوٹے کے کام والا دوپٹا اوڑھا تھا۔ آج دلہن کا پورا زیور پھولوں کا تھا۔ عمیر بھی گرین کرتے، سفید شلوار میں بہت جچ رہا تھا۔ پہلے میں اور بڑی بھابی ڈاکٹر آرزو عظیم ڈھولک بجا کر خوب گانے گاتے رہے۔ بھابی کی آواز بہت اچھی ہے مگر ان کے ساتھ ہماری آوازیں بھی بہت اچھی طرح مکس اپ ہو گئی تھیں۔ دلہا، دلہن دونوں کو ایک ساتھ لایا گیا۔ کرن، رامین، کسوئی، اجیہ اور دیگر بچیاں ہاتھوں میں مہندی کے تھال اور شمعیں جلا کر ان کے آگے آگے تھیں۔ آج ہم سب نے شرارے پہنے تھے اور ماشاءاللہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے (آہم) ہمارے بیٹے ایمان نے ماموں کی شادی کی خوشی میں بڑا اچھا ڈانس کیا، اس کا ساتھ ہماری ننھی منی سی بیٹی کسوئی نے بھی دیا۔ آج وہ سرخ رنگ کے شرارے، کرتی کے ساتھ پراندہ ڈال کر چوٹی میں بھی تھیں اور پراندہ ہاتھ میں پکڑ کر خوب گھما بھی رہی تھیں۔ کسوئی کے ساتھ میری پیاری سی بھتیجیاں کرن اور رامین بھی برابر کی شریک تھیں اور بار بار ثمینہ چاچی پر پھولوں کی پتیاں پھینک رہی تھیں۔ ننھی منی سی ہانیہ کے ڈانس کو بھی سب نے پسند کیا۔ عمیر کے ڈھیر سارے دوست ڈھولکی کی اس تقریب میں نمایاں تھے۔ بچوں کے ڈانس کے بعد جب ان کی باری آئی تو انہوں نے ایسے بھنگڑے ڈالے کہ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا آخر میں انہوں نے عمیر بھائی کو بھی اٹھا لیا اور جب عمیر نے ڈانس شروع کیا تو ہمارے میاں جی آفاق بھی اس میں شامل ہو گئے اور بڑے بھائی عظیم کے ساتھ ضیا بھی شامل ہو گئے۔ یہ خیر دوسری بات ہے کہ ہمارے ابو کسی کام کا بہانہ کر کے تھوڑی دیر کے لیے دوسرے فلور پر چلے گئے۔ عمیر اور ثمینہ کو جھولے پر بٹھا کر سب نے صدقہ اتارا اور رسمیں کی گئیں۔ اس میں ہماری پھپھو نزہت آنٹی، عینی باجی، نیلوفر بھابی، نہار آنٹی، شازیہ، شمع آنٹی، نازیہ، مینا بھابی، آرزو بھابی، امی اور دیگر مہمانوں نے حصہ لیا۔ رات گہری ہو رہی تھی اور بھوک چمک رہی تھی۔ بیروں نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی اور سب نے گرما گرم کباب، پراٹھا، پوری، آلو کی ترکاری، حلیم، بروسٹ، ملائی تکہ، کھیر خوب مزے لے لے کر کھایا اور یوں یہ ایک چھوٹی سی تقریب خیر و عافیت اور اللہ کے کرم کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ اس تقریب میں دلہن کی سہیلی "جی" ساڑی پہن کر شریک ہوئی۔ آج کی یہ ساڑی ہماری امی نے اسے گفٹ کی تھی۔ سارا وقت وہ اپنے کیمرے سے تصویریں بناتی رہی۔ نئے لوگ، نیا کلچر اسے بہت بھا رہا تھا۔

دوسرے دن ولیمے کی تقریب تھی۔ صبح سے ہی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں تقریب سے تین دن پہلے ہی امی کے گھر آ گئی تھی۔ صبح جب میں نے ساڑی نکالی تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کا پیٹی کوٹ گھر پر ہی رہ گیا ہے اور گھر پر کہاں سنبھال کر رکھا ہے۔ وہ دماغ میں نہیں آ رہا تھا۔ جلدی سے فون کر کے اپنے میاں جی یعنی آفاق کو پیٹی کوٹ کی گمشدگی کی اطلاع دی گئی اور ان سے کہا کہ ڈھونڈ کر لانے پر آپ کو انعام الگ دیا جائے گا اور انعام بھی صیغۂ راز میں رکھا جائے گا۔ خیر جناب گھبراہٹ اور ٹینشن میں ایک کے بعد ایک چیز ہوتی جا رہی تھی۔ تین بجے دلہن، نہار باجی اور دلہن کی سہیلی جی پارلر گئیں تو امی کو بھی زبردستی ساتھ لے گئیں۔ ہماری امی کو لپ اسٹک لگانے کا شوق ہے اور وہ اس کو لگا کر سمجھتی ہیں کہ پورا میک اپ کر لیا ہے مگر نہار باجی نے کہا دولہا کی اماں مہمان خصوصی ہوا کرتی ہے اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ ضرور جانا ہے۔ دلہن کا میک اپ امی کی دوست اور روز بیوٹی پارلر کی

روحِ رواں فرحت احسان کی خصوصی توجہ کی وجہ سے ان کی بہترین میک اپ آرٹسٹ ثنا نے کیا تھا۔ جو دلہن کو دیکھ رہا تھا اس کے میک اپ کی تعریف کر رہا تھا (فرحت آنٹی بے حد شکریہ) گھر کے تمام مرد سوٹ میں تھے آج میرے دونوں بیٹے ایمان اور علی نے بھی سوٹ پہنے تھے۔ بڑی بیٹی اجیہ نے فیروزی شرٹ اور ٹراؤزر پہنا تھا جبکہ چھوٹی شہزادی کسوئی آج فیروزی لہنگے میں تھی۔ امی، ندرت بھابی، عذرا پھپھو، شمع آنٹی، میں، نہار باجی اور چی سب ساڑیوں میں تھے۔ چی کی آج کی بے حد کامدار ساڑی نہار باجی آسٹریلیا... سے لے کر آئی تھیں۔ دلہن ثمینہ نے بہت پیارا فیروزی، سی گرین اور گولڈن کلر کے امتزاج کا فرشی شرارہ پہنا تھا جو کہ خاص طور پر ڈیزائن کروایا گیا تھا۔ ثمینہ چونکہ نازک سی ہے تو کوئی اسے باربی ڈول کہہ رہا تھا تو کوئی گڑیا۔ عمیر بھائی بھی سیاہ سوٹ میں مردانہ وجاہت کا نمونہ دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے میاں آفاق ساری تقریب میں پیش پیش تھے کیونکہ امی کے اکلوتے داماد ہیں اس لیے بھی امی اور ابو کے ہر دل عزیز ہیں اور آفاق بھی اپنی طرف سے کوشش کرتے ہیں کہ سب ان سے خوش رہیں۔ ابھی سب تصویروں کے سیشن میں ہی مصروف تھے۔ امی، ابو اور دونوں ماموں میرج گارڈن چلے گئے جو علاقے کا سب سے خوب صورت گارڈن تھا۔ امی کو معلوم تھا کہ عمیر اور ثمینہ پولیس بینڈ کے ساتھ جائیں گے مگر انہیں اپنے مہمانوں کا خیال تھا اور وہ ان سے پہلے ہال میں موجود تھیں اور ہر مہمان کو انہوں نے خود ریسیو کیا تھا۔

بینڈ باجے برات کی رونق بڑھاتے ہیں مگر ہم تو اپنے بھائی کی برات لے کر گئے ہی نہیں تھے تو آج ولیمے کی تقریب میں پولیس بینڈ کو بلوایا گیا تھا جو دروازے پر کھڑا ایسی دھنیں بکھیر رہا تھا جس سے ہماری خوشی کی تانیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ ثمینہ چونکہ آسٹریلیا میں ہی پیدا ہوئی ہے اور پہلی مرتبہ پاکستان آئی ہے اس کے لیے یہ سب نیا، دلچسپ اور بے حد پُرمسرت تھا۔ آفاق، عظیم بھائی اور ضیا نے سب مہمانوں کو جلدی جلدی گاڑیوں میں بٹھایا۔ آگے آگے بینڈ باجے والوں کی گاڑی اور پیچھے پیچھے ہم روانہ ہوئے۔ میں دولھا، دلہن کی گاڑی میں تھی۔ ایک بہن کے لیے اس سے بڑا دن ہوتا ہی نہیں ہے جب وہ بھائی کی برات لے کر جاتی ہے۔ آج ہمیں اپنے سارے ارمان نکالنے تھے۔ شادی ہال سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ساری گاڑیاں رک گئیں۔ ابھی تو ہمارا والا میرج ہال نہیں آیا ہے یہ گاڑیاں کیوں رک گئیں۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اور یہ بات عمیر اور ثمینہ کو بھی نہیں بتائی گئی تھی اور اس سرپرائز کے انچارج ہمارے میاں جی تھے۔ اب دلہن، دولھا کو پھولوں سے بجی چار گھوڑے والی بگھی میں سوار کرایا گیا۔ بڑی بھابی ندرت، میں، دلہن کی امی، نہار باجی، کسوئی، رامین اور کرن اس میں سوار ہو گئے۔ ہمارے آگے اب بینڈ دھنیں بکھیرتا ہوا چل رہا تھا۔ بگھی خراماں خراماں چل رہی تھی۔ باقی گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں۔ اس سڑک پر میرج ہالز قطار سے بنے ہوئے ہیں۔

اس شان سے ہماری سواری جا رہی تھی کہ ثمینہ نے مجھ سے کہا۔ ”عظمیٰ باجی، میں تو اپنے آپ کو پرنسس محسوس کر رہی ہوں۔“

ہم نے دل میں سوچا۔ ”تم کیا ہم خود اپنے آپ کو مہارانی سمجھ رہے ہیں۔“

اب تمام راہ گیر، رکشا، ٹیکسی والے، بائیک والے جو جا تو آگے کی جانب رہے تھے مگر سب کے چہرے ہماری جانب تھے۔ چھوٹی بچیاں سب دیکھنے والوں کو ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھے کہ شاید یہ

کسی ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ کسی ہال میں آتش بازی ہو رہی تھی مگر دیکھنے والے تو کیا ہم سب لوگ بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ آتش بازی بھی ہماری جانب سے ہی ہو رہی ہے۔ اسی شب عمیر کے قریبی دوست عدیل کا ولیمہ بھی اسی قطار کے ایک ہال میں تھا۔ اس نے جب بگھی میں عمیر کو جاتا دیکھا تو وہ اپنے مہمانوں کے استقبال کو چھوڑ کر ہاتھ ہلاتا ہوا باہر آ پہنچا۔ نہار باجی اپنی شہزادی جیسی بیٹی کو دیکھ کر بے حد خوش ہو رہی تھیں۔ ندرت بھابی اور میں بھی خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ہال کے دروازے پر امی، ابو، اجیہ، ندیم، ماموں، سہیل ماموں، شازیہ سب انتظار میں کھڑے تھے۔ پورا ہال مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آٹھ سو مہمان مدعو کیے تھے اور ہزار کے قریب مہمان موجود تھے۔ فوٹوگرافرز اور مووی میکر بگھی کے مزید شاٹس لینا چاہ رہے تھے۔

امی نے کہا ”بہت دیر ہو چکی ہے عمیر بیٹا اب کود کر اتر آؤ، سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“ خیر جب ہم سب اندر آئے تو لوگوں کا جمِ غفیر تھا جو بڑی محبت سے شرکت کرنے آیا تھا اور دولھا، دلہن کو دعائیں اور نیک خواہشات کا پیغام ساتھ لایا تھا۔ اس تقریب کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ آسمانِ ادب کے بے شمار ستارے اس میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

اس تقریب کی خاص بات یہ بھی تھی کہ آنٹی عذرا رسول اپنے بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ شریک ہوئی تھیں بلکہ ان کی حیثیت میزبان کی سی تھی۔ وہ تمام رائٹرز کے پاس جا کر نہ صرف ان کی خیریت دریافت کر رہی تھیں بلکہ ان سے کھانے پینے کا بھی پوچھ رہی تھیں۔ آج انہوں نے بہت پیارا فیروزی سوٹ پہنا ہوا تھا۔ افسانہ نگار اور شاعرہ رفاقت جاوید اپنے شوہر قاضی جاوید کے ہمراہ اسلام آباد سے بطور خاص آئی تھیں اور وہ ساڑی میں تھیں۔ آنٹی عذرا رسول انہیں کمپنی دے رہی تھیں۔ شاعرہ، افسانہ نگار خالدہ نسیم اپنی بھانجی کے ساتھ آئی تھیں اور عذرا آنٹی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ عقیلہ حق بے حد اسمارٹ سی لگیں عذرا آنٹی نے امی سے کہا۔ ”انجم، عقیلہ حق تو خاصی موٹی تھیں یہ تو بہت سلم ہو گئیں۔“

تب امی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ نے انہیں پریگننسی میں دیکھا ہوگا۔“

سیما مناف کا کچھ عرصے پہلے ٹی وی کا سوپ ”ٹوٹے ہوئے پر“ ختم ہوا ہے۔ ان کو دیکھنے کے لیے لڑکیاں بڑی بے چین تھیں۔ خاص طور پر ہماری بیٹی اجیہ کہ اس کے نام پر ہی انہوں نے اپنی ہیروئن کا نام اجیہ رکھا تھا۔ رفعت سراج بھی تقریب میں بے حد اِن تھیں۔ مہمان خواتین ان کے پاس جا کر ہاتھ ملا رہی تھیں۔

عذرا آنٹی کے پاس جا کر جب کوئی لڑکی یہ کہتی کہ میں آپ کی فین ہوں تو وہ مسکرا کر کہتیں۔ ”کون سی فین ہو، ملت فین یا پاک فین؟“ اور یوں بھی عذرا آنٹی کے جملے پُرمزاح ہوا کرتے ہیں۔

ڈراما نگار شائستہ عزیز بھی بہت پیاری لگ رہی تھیں اور بڑی محبت سے شریک ہوئیں۔ آج کل ان کا سوپ ماں اور گلناز آن ایئر جا رہا ہے۔ نگہت عبداللہ کی کمر میں چک آئی ہوئی تھی مگر وہ اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ تقریب میں شریک ہوئیں۔ آف وائٹ سوٹ میں بے حد سوبر لگ رہی تھیں۔ اختر شجاعت امی کی بے حد پرانی سہیلی ہیں۔ ایسی سہیلی جو امی بیمار ہوں تو اسپتال میں موجود، امی کی سالگرہ کا دن انہیں یاد، شادی کی سالگرہ کا دن انہیں ازبر۔ اب وہ افسانے لکھنے کے بجائے دینی مضامین لکھتی ہیں۔ سیاہ برقع میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ شمع زیدی معروف صحافی اور لکھاری ہیں ان کے آنے پر امی کو دلی مسرت ہو رہی تھی۔ نزہت اصغر تو میری فیورٹ ہیں ان کو دیکھ

کر دلی خوشی ہوئی۔ رضوانہ منظر، انیلہ عباس اور مسز ثمر کو دیکھ کر امی کے ساتھ ساتھ میری خوشی بھی بڑھ گئی۔ شاعرہ شائلہ سہیل جاوید تو امی کی تنویر چچی کی رشتے دار نکل آئیں۔ وہ اس بات پر ناراض ہوئیں کہ آپ نے عمیر کے ولیمے کے بارے میں تو مجھے بتایا ہی نہیں، میں تو سمجھ رہی تھی شاید رائٹرز کی کوئی تقریب ہے۔

تب امی نے ہنس کر کہا۔ ''ہاں رائٹرز کی تو تقریب ہے، ادب کے ڈھیر سارے چاند آج اس محفل میں اتر آئے ہیں۔''

بہت عرصے بعد بہت ساری رائٹرز ایک ساتھ جمع تھیں۔ سو برسی سکینہ فرخ اپنے کرنل شوہر کے ساتھ موجود تھیں۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا اپنی بھانجی کے ساتھ آئی تھیں۔ رخ چوہدری اپنی بہنوں کے ساتھ آئیں تو مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ امی سے بہت محبت کرتی ہیں اور امی کو بھی رخ چوہدری کی عادات بے حد اچھی لگتی ہیں۔ امی تو انہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہیں۔ تبصرہ نگار اور شاعرہ رفعت مبین رفی اپنی طبیعت خرابی کے باوجود آئیں۔ تبصرہ نگار اور میری پڑوسن مسرت پرویز کی ٹانگ کا پلاسٹر چند دن پہلے ہی کھلا تھا اور وہ اسٹک کے سہارے موجود تھیں۔ مسرت جی، آپ کی بہت ساری اسٹوڈنٹ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ شاعرہ پروین عذرا تشنہ اپنی بے حد پیاری ہیروئن جیسی بہو افشین اور ہیرو جیسے بیٹے علی کے ساتھ آئی تھیں۔ ان کا بیٹا اور بہو جیو چینل پر جاب کرتے ہیں۔ افسانہ نگار صدف آصف، سماع چینل پر جاب کرتی ہیں اور امی کے گھر کے قریب ہی رہتی ہیں۔ ان کی خوب صورت آنکھوں کی عذرا آنٹی نے بہت تعریف کی جس سے وہ بہت خوش ہوئیں۔ تبصرہ نگار نسرین زبیر کوٹھاری اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں اور تقریب کی سب سے پہلے تصویر انہوں نے امی کی فیس بک وال پر ڈالی۔ (شکریہ) سلمیٰ غزل اور ثریا انجم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور بہت اچھی لگیں۔ شاعرہ اور افسانہ نگار طلعت جبیں مہناز تو امی کے اسلام آباد کے اسکول کی ہیں، افسانہ نگار سعدیہ رئیس اپنی بہن در شہوار کی تقریب چھوڑ کر ہمارے ہاں آئیں۔ تبصرہ نگار، افسانہ نگارہ حنا رضوان کے فرسٹ کزن کی اس شب شادی کی تقریب تھی، وہ پہلے ہمارے ہاں آئیں مگر کھانے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ شاعرہ فرحت جمال کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا جو بڑی اچھی لگیں۔ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق آئیں تو ہر رائٹرز سے گلے ملیں۔ ان کے نام کا اثر ان کی پوری شخصیت پر ہے۔ یہ شگفتہ بھی ہیں شفیق سی بھی۔ تبصرہ نگار انجم گلزار بہت دور سے آئی تھیں اس لیے زیادہ دیر نہیں رک پائیں۔ امی کے گھر کی میڈ انیسہ باجی نہ صرف اپنی پوری فیملی کے ساتھ آئی تھیں بلکہ اپنی دو سہیلیوں کو بھی لے کر آئی تھیں۔ انیسہ باجی، آپ نے سب مہمانوں کا بے حد خیال رکھا۔ شادی میں بھی اور بعد میں بھی، بے حد شکریہ۔ چینل ہم سے منسلک سیمار ضا آئیں تو محفل پر چھا سی گئیں۔ وہ مجھے سلم ہونے کے ساتھ ساتھ شگفتہ شگفتہ سی لگیں۔ بے حد پیاری عادتوں والی سیمار ضا سے ہماری فیملی کے دیرینہ تعلقات ہیں۔ آنٹی شمع حسین، مسعود انکل، نازیہ اپنی بہو مینا اور ان کے والدین کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ رائٹرز سے جا کر وہ خود ملیں۔ شوگر ہونے کے سبب آنٹی خاصی کمزور سی ہو گئی ہیں مگر ان کا حافظہ اتنا شاندار ہے کہ جو تحریر، انٹرویو وہ پڑھ لیں وہ انہیں سطر سطر یاد رہتی ہے اور بعض دفعہ ایسی باتیں کر جاتی ہیں کہ لکھنے والا بھی ان کا منہ تکتا رہ جاتا ہے کہ یہ میں نے کب لکھا تھا۔ آنٹی ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ لاہور گئی ہوئی ہیں۔ یاسمین رشید امی سے بہت چھوٹی ہیں مگر امی کی بہت اچھی دوست ہیں۔ یہ کراچی کی معروف فیشن ڈیزائنر

ہیں۔ اس تقریب میں اپنے بھانجوں کے ساتھ آئی تھیں۔ شائستہ اعجاز یہ عذرا آنٹی کی بچپن کی سہیلی ہیں (یاسمین رشید کی طرح) شائستہ آنٹی ان دنوں اپنی پیاری سی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں مگر دولہا، دلہن کو دعا دینے کے لیے موجود تھیں۔ آنٹی رضوانہ پرنس تو ہمارے گھر اس وقت سے آ رہی ہیں جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ بے حد ہنسنے ہنسانے والی بلکہ جہاں چلی جائیں قہقہوں کے پھول بکھیرنے والی شخصیت ہیں۔ امی کو اپنا گرو کہا کرتی ہیں۔ آج کی تقریب میں وہ بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔

سیما مناف امی سے کہہ رہی تھیں۔ ''انجم، بہنوں کی محفل میں تمہارے طویل جوابات پڑھ کر بے حد لطف آتا ہے۔ تم بڑے جواب ہی دیا کرو۔''

امی نے کہا۔ ''پھر خط کم شائع ہوں گے۔''

اس پر سیما مناف نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں مگر ہمیں تمہارے طویل جوابات میں مزہ آتا ہے۔''

ڈاکٹر شہلا عامر، گورنر کراچی عشرت العباد کی بھاوج ہیں۔ وہ اپنی نند کے ساتھ اس تقریب میں شریک ہوئیں۔ شہلا عامر پاکیزہ کی تبصرہ نگار بعد میں بنیں پہلے امی کی فین تھیں اور انہوں نے ہی بہنوں کی محفل کو پاکیزہ کی فیس بک کا نام دیا جسے تمام بہنوں نے پسند کیا۔ پروفیسر قمر جہاں خلیل بہت دور سے آئی تھیں۔ امی سے ان کی دوستی جب ہوئی تھی جب میرا کالج میں ایڈمیشن ہوا تھا اور وہ دوستی آج تک برقرار ہے۔ ان کے پوتے، میرے بچوں کے کلاس فیلوز ہیں اور ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں خلیل پاکیزہ کی اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی کالم نگار بھی ہیں۔ ثریا انجم اچھی افسانہ نگار ہیں۔ امی سے ان کی ملاقات اس تقریب میں پہلی مرتبہ ہوئی۔ اس تقریب کو سعادت بخشنے کے لیے جہاں بہجت آنٹی آئیں، وہ امی سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ امی کو ہمہ وقت دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں وہاں صاحبزادہ ابوالسرور محمد مسرور احمد بھی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ ان کو بیرونِ ملک سے لوگ اپنے ہاں بلانا سعادت سمجھا کرتے ہیں مگر یہ ہمارے ابو کے قریبی دوست سید مظفر علی کے داماد ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے ہاں آئے تھے۔ معروف شاعرہ اور معلمہ کشور سلطانہ نے بھی شرکت کرنی تھی مگر وہ آ نہ سکیں۔ ارجمند عقیل بھی پاکیزہ کی نئی افسانہ نگار ہیں مگر بہت اچھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر بہت اچھا لگا۔ میری بڑی بھابی جنہیں ہم گھر میں ندرت کے نام سے پکارتے ہیں سب مہمانوں سے مل رہی تھیں کہ ہم نے دیکھ لیا تھا امی اپنی رائٹرز کے حلقے سے باہر نہیں نکل رہی تھیں اس لیے میں اور ندرت ہر مہمان سے جا جا کر مل رہے تھے۔ آج کی اس تقریب میں میری پوری سسرال کا بچہ بچہ بوٹا بوٹا شریک تھا (ماشاءُاللہ) دبئی والی نند امبر کو چھوڑ کر میری ساری نندیں دیور، جیٹھ اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ موجود تھے۔ پاکیزہ کی تبصرہ نگار اور اس سے پہلے کی امی کی دوست اور منہ بولی بہن اور میری خلیا ساس مسز نزہت اشفاق اپنی طبیعت خرابی کے باوجود عینی باجی اور اشفاق انکل کے ساتھ موجود تھیں۔ نزہت خالہ، عذرا آنٹی کی زبردست فین ہیں۔ ان کے ہاں میلاد میں بھی امی کے ساتھ جا چکی ہیں اور آج بھی انہوں نے عذرا آنٹی سے خوب باتیں کیں۔ امی کی چچی مسز تنویر استقبال جو چچی سے زیادہ امی کی سہیلی ہیں، وہ بھی تمام رائٹرز سے ملیں۔ عذرا آنٹی، رفعت سراج، سیما مناف، رخ چوہدری اور نگہت عبداللہ سے مل کر بے حد سرشار سی ہو گئیں۔ ان کے بیٹے سید فرحان بخاری جو جامعہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ ان کی اسٹوڈنٹس نے انہیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔

ہمارے رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد ثمینہ کے پاس جا کر اسٹیج پر مل رہی تھی۔ اکثر اس سے انگریزی میں باتیں کر رہے تھے مگر وہ سب کی باتوں کا جواب اردو میں دے رہی تھی۔ ہاں انگریزی صرف ثمینہ کی سہیلی چی سے بولنی پڑی۔ وہ تقریب کے بعد 15 دن امی کے ہاں رہ کر گئی، گھر میں کام کرنے والیاں بھی اس سے انگریزی میں بات کرنے لگی تھیں۔ ثمینہ کے ابو ڈاکٹر شجاع چونکہ کراچی اور اسلام آباد میں رہ چکے ہیں تو ان کی اردو تو بہت صاف ہے۔ نہار باجی (مسز شجاع) انگریزی تو فراٹے سے بولتی ہی ہیں مگر اردو بھی اچھی خاصی بول لیتی ہیں مگر ثمینہ کی اُردو ان سے زیادہ اچھی ہے۔ اس تقریب میں امی کو ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا انتظار آخری وقت تک رہا مگر وہ اپنی طبیعت خرابی کے باعث نہیں آسکیں۔ تبصرہ نگار ذکیہ ایوب بے حد محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ ان کی حال ہی میں عدت ختم ہوئی تھی اور انہیں اپنے دوسرے بیٹے کے پاس لاہور بھی جانا تھا مگر عمیر کے ولیمے کی وجہ سے لاہور بعد میں گئیں ۔ ذکیہ آنٹی بے حد شکریہ اس محبت کا......! رمضان انکل سب سے آخر میں آئے اور آخر میں گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ بہت ساری بہنوں کو امی بلا نہیں پائیں جس کا امی کے ساتھ مجھے بھی افسوس رہا۔ جن میں پی ٹی وی کی پروڈیوسر تسنیم اسلم، شاعرہ زہرہ جنید، افسانہ نگار مہناز عرفان۔ افسانہ نگار ناہید فاطمہ حسنین کا تو موبائل ہی بند تھا۔ چینل ہم سے وابستہ سائرہ غلام نبی اپنی ذاتی مصروفیات کے باعث آ نہیں سکیں۔ اسی طرح امی کی بے حد پیاری دوست افسانہ نگار غزالہ رشید اپنی طبیعت خرابی کے باعث شرکت نہیں کر سکیں۔ شادی ہال بہت خوب صورتی سے سجوایا گیا تھا۔ دو بڑی اسکرین لگائی گئی تھیں جن میں عمیر اور ثمینہ کی منگنی شادی اور ایک دن پہلے ہونے والی ڈھولکی کی تصویریں چل رہی تھیں۔ آسٹریلیا سے جو مہمان نہیں آسکے تھے وہ بھی اس تقریب کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ خصوصاً جگنو ماموں، سعدیہ مامی اور پیاری سی رابعہ۔ میری فرسٹ کزن ندا نوید ان دنوں زچگی میں تھی اس کے ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے وہ نہیں آسکی تھی اور ناہید ممانی بھی نہیں آئی تھیں۔ نادرہ ممانی ان دنوں امریکا میں ہیں ان کی کمی بھی سب نے محسوس کی تھی۔ چمنا ماموں، زیبا ممانی، آمنہ پھپو کی کمی بھی سب نے محسوس کی تھی مگر امریکا سے آنا کوئی اتنا آسان کہاں ہوا کرتا ہے۔ ہماری امی، ابو کی نشاط مامی ان دنوں بیمار ہیں اور اسپتال میں ایڈمیٹ ہیں۔ اس لیے وہ نہیں آسکی تھیں۔

میری کالج فرینڈ ناز جب اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو میری خوشیاں جیسے بڑھ گئیں اور اس وقت میں اپنے آپ کو کالج گرل محسوس کرنے لگی۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی اپنی پیاری دوست شازیہ جمال کا جو امی کی بیٹی بھی ہیں، امی کی پڑوسن بھی اور ہم ان کو گھر میں ڈاکٹر شازیہ کے نام سے پکارتے ہیں کہ دواؤں کے نام انہیں ازبر ہوتے ہیں۔ یہ پاکستان کے بے حد مصروف سرجن ڈاکٹر جمال الدین کی بیگم ہیں۔ شازیہ پوری تقریب میں ایسے ہی شامل تھیں جیسے میں اور ندرت۔ ان کی پیاری سی بیٹی ماہ نور اپنے عمیر ماموں کی شادی میں اتنی خوش تھی جیسے کہ اجیہ کی سہیلیاں اس تقریب میں انوائٹ تھیں، اسی طرح ماہ نور نے بھی اپنی خاص تین سہیلیوں کو بلایا تھا کہ شازیہ کے بچے ہمارے بھائیوں کو ماموں ہی کہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈنر شروع ہو گیا جس میں چکن بریانی، مٹن بادامی، قورمہ، چکن بروسٹ، مینگی سموسے، سیخ کباب، گاجر کا حلوہ، کشمیری چائے اور کولڈ ڈرنک وغیرہ شامل تھیں۔ امی اور ابو

دونوں کا ہی حلقہ کافی وسیع ہے اس لیے جس کو بھی بلایا گیا وہ سب ہی آئے۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ تو شادی پلس ولیمہ ہو رہا ہے۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا کہ صرف ولیمے میں آئے ہیں۔ یہ تو برات بھی لگ رہی ہے۔

عذرا آنٹی، آپ کی میزبانی نے میرے دل میں آپ کی محبت کی ایک قندیل سی روشن کر دی ہے اور انشاء اللہ میں بھی ذیشان کی شادی میں میزبان کی حیثیت سے شریک ہوں گی۔ ذیشان ہمارے عمیر سے دو ڈھائی سال ہی تو چھوٹا ہے۔ اس لیے آپ بھی اس کی برات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں (اللہ وہ وقت جلد لائے) اس تقریب کی اداس بات یہ تھی کہ اس میں ہماری نانی امی اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث شریک نہیں ہوسکی تھیں اور سب کو ان کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اللہ ان کو صحت اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔ عمیر اور ثمینہ پر اللہ اپنا کرم رکھے اور انہیں شاد و آباد رکھے۔ بفضلِ خدا بہت پیاری جوڑی ہے اور بہت محبت کرنے والی بھی۔ میرے بھائی ضیا کے لیے بھی ایک پیاری سی دلہن جلدی سے مل جائے تو میں ان صفحات پر آپ کے لیے اس کی شادی کا احوال قلم بند کروں ۔ خیر اتنا بھرپور، پُر محبت اور پُر رونق ولیمہ لوگوں کو اتنی جلدی نہیں بھولے گا۔ جس کا ہر مہمان ہم سب کے لیے مہمان خصوصی کا درجہ رکھتا تھا۔

اس تقریب کی تصاویر جس میں سرورق کی تصویر بھی شامل ہے۔ حنا فوٹو اسٹوڈیو کی جانب سے کھینچی گئیں۔ سیل نمبر ارشد جمال 0300.2248374

ایک ستاروں بھری تقریب

شمائلہ سہیل جاوید

ہال اگر چہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشبوؤں کا سیلاب اور رنگ برنگ ملبوسات کی بہار تھی اور سب سے زیادہ مرکزِ نگاہ وہ ٹیبل تھی جس پر آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے جگمگا رہے تھے۔ سب سے چمکتا چاند تو عذرا آپی تھیں۔ وہ تو ہیں ہی سدا بہار، پُرنور چہرہ۔ ان سے مل کر معراج صاحب کی طبیعت کے بارے میں جان کر دلی تسلی ہوئی۔ اللہ انہیں سدا سہاگن رکھے۔

سعدیہ رئیس بھی بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ سیما مناف، شائستہ اور رفعت سراج سب بے حد گرم جوشی سے ملیں۔ میری بیٹی بھی میرے ہمراہ تھی جب رفعت سراج سے ملایا تو اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ سادی سی خوش اخلاق خاتون رفعت سراج ہیں اور دل، دیا دہلیز کے باری کی خالق۔ کافی دیر تک تو حیران ہی رہی۔ نگہت عبداللہ، رضوانہ پرنس، رخ چوہدری صاحبہ، شگفتہ شفیق، ناہید چوہدری، نزہت اصغر اور بھی دیگر نامور ہستیاں جن میں ذرا برابر بھی غرور تکبر کا شائبہ تک نہیں تھا۔ سب سہیلیوں کی طرح گفتگو، قہقہے اور مزیدار چٹکلے چھوڑ رہی تھیں۔

اور بھی بہت سی رائٹرز تھیں جنہیں دور دور سے دیکھا مگر ملاقات نہ ہوسکی۔ کھانا بے حد شاندار تھا۔ اپنے لوگوں کا انتظام اور پھر سب کو فرداً فرداً پوچھنا بہت بڑی ذمے داری ہے لیکن سب کام احسن طریقے سے ہوگئے۔ حیران کن بات یہ بھی تھی کہ اس تقریب کے مووی میکر حنا فوٹو اسٹوڈیو کی فیملی بھی پاکیزہ کی فین تھی۔

مہمانوں کی گرمجوشی جہاں ان کی محبت کا اظہار تھا وہاں دولہا بھی تمام حاضرین سے بڑے اچھے طریقے سے مل رہے تھے۔ سب کا انہوں نے شکریہ ادا کیا۔ عمیر کی یہ پوری کوشش تھی کہ وہ ہر مہمان کے پاس خود جائے۔ (ماشاءاللہ)

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جوڑے کو ساری خوشیاں عطا فرمائے اور انہیں اپنے والدین کے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔ (آمین)

عمیر کا ولیمہ

شگفتہ شفیق

میں اور شفیق یہ خوب صورت تقریب اٹینڈ کرنے کے لیے وقت مقررہ پر موجود تھے۔ سامنے ہی انجم انصار باجی کھڑی تھیں۔ کالی خوب صورت کامدار ساڑی میں ہمیشہ کی طرح بے حد گریس فل اور پُروقار لگ رہی تھیں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انجم باجی بے حد ملنسار ہیں جو ایک بار بات کرلے وہ گرویدہ ہوجاتا ہے اور جوان سے ایک بار مل لے تو پھر وہ ان کو بھول نہیں سکتا۔ عمیر کے ولیمے میں لکھاریوں کا ماشاءاللہ جم غفیر موجود تھا۔ جن میں سے بیشتر کے سیریل، ٹیلی فلمز اور ڈرامے کسی نا کسی ٹی وی چینل پر چل رہے ہیں یا چلنے والے ہیں۔ مدتوں کے بعد اتنی اچھی شادی اٹینڈ کرکے بے حد لطف آیا۔

رضوانہ پرنس، عذرا رسول اور ان کی بھابیوں کے ساتھ آئی تھیں۔ عذرا رسول بے حد چچ رہی تھیں۔ رضوانہ الگ قیامت ڈھا رہی تھیں۔ عظمیٰ آفاق، اجیہ آفاق، آرزو عظیم ہر ایک بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہمارے برابر میں شائستہ عزیز اور سیما مناف تھیں جن سے تمام وقت دلچسپ گفتگو رہی۔ رخ چوہدری اور نابیدہ چوہدری کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں لیکن دل سے نزدیک تھیں۔ رفعت سراج ایک زبردست رائٹر تو ہیں ہی اس کے ساتھ بولتی بھی بہت اچھا ہیں۔ شمع حسین سے چلتے وقت ملاقات ہوئی تب وہ کہنے لگیں کہ ارے، آپ ہیں شگفتہ شفیق۔ آپ کینیڈا آئی تھیں تو ہمارا سیل نمبر کیوں نہیں لے کر گئی تھیں۔ بہت اچھا لگتا اگر ہماری وہاں بھی ملاقات ہوتی۔ عقیلہ حق اور فرحت جمال سے بھی ملاقات رہی۔

اسٹیج پر ایک بڑی ایل سی ڈی پر عمیر کی شادی کی مووی چل رہی تھی۔ ہال کی سجاوٹ قابلِ دید تھی۔ کھانے کا مینیو زبردست اور ذائقہ بہترین تھا۔ وہ ساں بہت ہی پیارا لگا جب دولہا دلہن اور دلہن کی سہیلیاں بینڈ باجے کے ساتھ پنڈال میں آئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے اور انجم باجی کو ان کی خوشیاں دکھائے۔ (آمین) دولہا اور دلہن دونوں بہت ینگ اور پیارے لگ رہے تھے۔

مزہ آیا

رفاقت جاوید

میرا ضروری کراچی آنا بھی کئی ماہ سے ٹل رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ انجم انصار کے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کرنے جانا ہے۔ اگر پہلے ہوآئی تو اتنی جلدی دوبارہ کراچی شاید نہ جاپاؤں۔ انجم سے میری ملاقات اسلام آباد میں کئی بار ہوچکی تھی..... اور اب مجھے اس شادی میں جانا تھا جہاں بہت ساری مصنفات نے آنا تھا اور مجھے سب سے ملنے کی خواہش تھی۔

15 فروری کی شب میں ایک جگمگاتے ہوئے میرج گارڈن میں موجود تھی۔ میرے ساتھ میرے شوہر بھی تھے۔ یہ ایک پُرہجوم تقریب تھی۔ انجم انصار کو پہلی مرتبہ میک اپ میں دیکھا۔ کالی شیفون کی کامدانی ... ساڑی اور لائٹ میک اپ میں وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔ پھر میں نے مصنفات کو دیکھا، سب سے جا کر خود ملی مگر مجھ سے آکر خود ملنے والی شخصیت عذرا رسول کی تھی۔ وہ مجھے اس محفل کی میزبان نظر آرہی تھیں۔ وہ رائٹرز کو کھانے کے لیے خود پلیٹیں دے رہی تھیں۔ ان کو کھانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ ایک ایسی ذمے دار مہمان جسے اپنے مہمانوں کا خصوصی خیال ہو۔ میرے شوہر نے از راہِ مذاق ان سے کہا بھی کہ ہم تو انجم انصار کے مہمان ہیں تو انہوں نے کہا یہ میری اپنی تقریب ہے اور میں واقعی میزبان ہوں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بے حد اچھا لگا کہ پاکیزہ واقعی ایک ایسا ادارہ

ہے جہاں کا ہر فرد ایک دوسرے کا خیال رکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے محبتیں حقیقی جہاں دکھاوے اور بناوٹ کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

مجھے وہاں سکینہ فرخ، سعدیہ رئیس، شگفتہ شفیق، نگہت عبداللہ اور سیما مناف سے مل کر بہت اچھا لگا۔ بعض مصنفات مجھے کم سخن سی بھی لگیں۔ مگر میں نے ہر ایک سے خود بات چیت کی۔ دولہا عمیر اور دلہن ثمینہ بھی بہت اچھے لگے۔ زیادہ تر شادیوں میں اور اسٹیج دولہا نظر آیا کرتے ہیں کہ اپنے مسائل سے نمٹ کر شادی کیا کرتے ہیں۔ ایسے میں جوان لڑکے کی شادی دیکھ کر اچھی بھی لگی اور خوشی بھی ہوئی..... ثمینہ کے والد اور اسمارٹ سی ثمینہ کی امی سے بھی ملی۔ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ فیملی ہے۔ جوانی بیٹی کے شاندار ولیمے پر بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ کراچی قیام کے دوران میری دیگر مصروفیات بھی تھیں..... مگر انجم تمہارے بیٹے کی شادی میں جا کر مجھے واقعی بہت مزہ آیا اور سکینہ فرخ اور عذرا رسول سے مل کر اچھا لگا۔

رائٹرز کے دیدار کے لیے

ستارہ شیخ

پہلے ہمارے میکے میں شادیوں کا سلسلہ چلا اور پھر سسرال میں شادیوں کا سیزن گزرا..... اور میں گنجے دولہاؤں کو دیکھ دیکھ کر دل برداشتہ ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کپکی عمر والے دولہا... دیکھ دیکھ کر تھک گئی۔ کم عمر جو دولہا تھا وہ بھی 32 سال سے کم کا نہ تھا اور لگتا وہ 36 کا تھا۔ ایک دن تو میں نے اپنے میاں سے کہہ ہی دیا تھا کہ اگر کم عمر لڑکی کی شادی ہوسکتی ہے تو کم عمر لڑکوں کی شادیاں کیوں نہیں ہوا کرتیں۔ جس کا جواب ان کے پاس یہ تھا کہ ایسا فلموں میں ہوتا ہے۔ لڑکوں پر ذمے داریاں بہت ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی جلدی کرکے بیٹھ جائیں تو گھر کے کام کیسے ہوں گے..... اور جب ہم انجم باجی کے بیٹے عمیر کے ولیمے میں گئے تو ایسا خوب صورت اور کم عمر دولہا دیکھا کہ دل خوش ہوگیا۔ میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں۔ کبھی کبھار پاکیزہ میں تبصرہ بھی شائع ہوجاتا ہے۔ مجھے جب معلوم ہوا کہ عمیر کا ولیمہ ہونے والا ہے تو رائٹرز کے دیدار کے لیے میں نے باجی سے ریکویسٹ کی کہ آپ مجھے بھی اپنے ہاں مدعو کرلیں۔ تو انجم باجی نے ہامی بھرلی۔ میں جب ہال میں داخل ہونے والی ہی تھی اس وقت دولہا، دلہن پھولوں سے سجی بگھی سے اتر رہے تھے اور ہیرو دولہا لگ رہے تھے۔ عظمیٰ آفاق نے بڑی خوب صورت ساڑی پہنی تھی اور واقعی دلہا کی بہن لگ رہی تھیں۔ میں رفعت سراج، نگہت عبداللہ سیما مناف سے ملی۔ عذرا رسول کو قدرے قریب سے دیکھا۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اگر انہوں نے پوچھ لیا کہ تم کون ہو تو میں کیا جواب دوں گی اور گھر آکر افسوس بھی ہوا کہ میں نے ان سے بات کیوں نہیں کی۔ انجم باجی آپ کے مہمان اتنے پیارے پیارے سے تھے کہ مجھے تو ایسا ہی لگا کہ ہر مصنفہ اس تقریب میں موجود ہے۔ میں نے شمع حسین کو پہچان لیا تھا..... میں نے ان کو جا کر سلام کیا مگر وہ اپنی باتوں میں شاید اتنی مصروف تھیں کہ انہوں نے میری جانب نہیں دیکھا۔ انجم باجی آپ سیاہ کامدار ساڑی میں بے حد سوبر سی لگ رہی تھیں۔ ایسی شاندار تقریب میں نے تو شاید پہلی مرتبہ ہی دیکھی تھی جس میں بے شمار لوگ تھے۔ سیما رضا کو میں اس لیے پہچان گئی کہ وہ ٹی وی پر نظامت کیا کرتی تھیں۔ افسوس صرف یہی رہا کہ میں آٹو گراف بک لے جانا بھول گئی تھی۔ سیما رضا، رفعت سراج، سیما مناف، عذرا رسول اور دیگر رائٹرز سے دیکھو کب ملاقات ہوپاتی ہے۔

پاکیزہ ڈائجسٹ

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

خالقِ کائنات ہے مالک دو جہاں ہے تو
میری زمیں بھی ہے تو ہی اور میرا آسماں ہے تو
جلوہ نما ہے تیری ذات وہ ہو مکاں کہ لامکاں
تیرا کرم محیط ہے ہر سو جہاں، جہاں ہے تو
مانگے بغیر دے دیا ذرے کو کیا بنا دیا
شکر تیرا ادا کروں دل میں مرے نہاں ہے تو
بھید ترا نہ پاسکے عقل و خرد کسی طرح
آنکھ کہے کہاں ہے تو دل یہ کہے یہاں ہے تو
کُن ہی سے کائنات کو کیا کیا ثمر عطا کیے
مدح کریں شجر حجر، خالقِ این و آں ہے تو

شاعرہ: ذکیہ غزل
مرسلہ: عنبرین خان، نارتھ کراچی

نعت رسول ﷺ

خدا نے میری دلجوئی کا کچھ ایسا سبب رکھا
نبیؐ کی یاد میں دل کو ہمیشہ مضطرب رکھا
انہیؐ کی یاد میں قلب و نظر فکر و زباں ڈوبے
انہیؐ کا تذکرہ ہونٹوں نے اکثر روز و شب دیکھا
خدا کا عشق اور اس کے نبیؐ کا عشق مل جائے
فقط اس کے سوا ہم نے کوئی احساس کب رکھا
خدا اپنی جگہ پر ہے نبیؐ اپنی جگہ پر ہیں
ادب سے جب جسے لکھا تو پھر پاسِ ادب رکھا
وہ نامِ پاک جب آیا کہیں ہونٹوں پہ ہو یا رب
تو ان ہونٹوں نے خود ہی چومنے کو لب پہ لب رکھا
انہیؐ کے در سے پا کر ان کے آگے پیش کرتا ہوں
مری نعتوں کا گلدستہ بھی ہے حسبِ طلب رکھا
خدا اور محسنِ انسانیتؐ سے مجھ کو نسبت ہے
تبھی تو نام محسن ہاشمی میرا نسب رکھا

شاعر: محسن علوی
مرسلہ: نورافشاں، شکارپور

مسلمانوں کی آبرو کا حق

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص کسی مسلمان کو ایسے موقع پر ذلیل و بے آبرو کرے گا جہاں اس کی ہتک ہو یا اس کی عزت میں کچھ کمی آئے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے مقام میں ذلیل و بے آبرو کرے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا طلب گار ہوگا اور جو شخص کسی ایسی جگہ کسی مسلمان کی مدد کرے گا جہاں اس کی بے عزتی اور ہتک ہوتی ہو تو اللہ ایسے مقام پر اس کی مدد کرے گا جہاں اسے اللہ کی مدد درکار ہوگی۔“

(سنن ابوداؤد)

مرسلہ: سعدیہ سلیم، سڈنی

مسکین کا حق

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے میری مخلوق میں سے کسی ایسے کم زور کے ساتھ بھلائی کی جس کا کوئی کفایت (کفالت) کرنے والا نہیں تھا تو اپنے بندے کی کفایت و کفالت کا میں ذمے دار ہوں۔“

مرسلہ: ناہید بنت نور، واہ سینٹ ورکس

اللہ کا خوف

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں دو خوف یا دو تحفظ کسی ایک بندے میں جمع نہ کروں گا یعنی اگر کوئی بندہ دنیا میں مجھ سے ڈرتا رہے گا تو میں قیامت کے دن اسے محفوظ رکھوں گا اور اگر کسی نے دنیا میں خوف نہ کیا تو قیامت کے دن اسے مبتلائے خوف رکھا جائے گا۔ نیز ارشاد فرمایا جو حق تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے ساری دنیا ڈرتی ہے اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ ہر شے سے خائف رہتا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا تم میں سے جو خائف ترین ہے وہی عاقل ترین ہے اور فرمایا جو خوفِ خدا سے روتا ہے دوزخ کی آگ اس کے قریب نہیں جاسکتی۔“

مرسلہ: انیلا ناہید، لیہ

غلاف یعنی پردہ

کعبہ پر غلاف اس لیے ہے کہ پتا چلے یہ کوئی عام گھر نہیں اللہ کا گھر ہے۔ قرآن پر غلاف اس لیے ہے کہ پتا چلے یہ کوئی عام کتاب نہیں بلکہ اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح مسلمان عورت کو پردے کا حکم ہے تاکہ پتا چلے یہ کوئی عام عورت نہیں ایک مسلمان عورت ہے۔ اپنی نظروں کو جھکا کر چلا کرو اے مومنو تاکہ پتا چلے یہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی جارہا ہے، سبحان اللہ!

مرسلہ: قمرشمس الحق، جھنگ صدر

پیاری باتیں

حضرت بی بی فاطمہ زہراؓ کا قول ہے۔ ”جب ایک عورت گھر میں کام اور بچوں کی تربیت کررہی ہوتی ہے تو اس وقت وہ اللہ سے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔“

حضرت علیؓ کا قول ہے۔ ”دوستی کی زینت ایک دوسرے کو برداشت کرنے میں ہے۔ بے عیب دوست تلاش مت کرو ورنہ اکیلے رہ جاؤ گے۔“

مرسلہ: سیدہ نور جہاں نقوی، کراچی

سالگرہ

سالگرہ کی شام مبارک
شام کے لب پر
میری یاد.....!
مچلتی رہنے دینا
اپنے حصے کی سب شمعیں
گل کردینا.....لیکن
میرے نام کی آدھی شمعیں
جلتی رہنے دینا

شاعر: محسن نقوی
مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

شادی

☆ شادی ایک ایسا بندھن ہے جس میں دو شریف شہریوں کو خوامخواہ ایک دوسرے سے لڑنے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔

☆ شادی کرنے کا ایک فائدہ فری کی ملازمہ مل جاتی ہے مگر جس کی فرمائشیں پوری کرنے میں پانچ اچھے ملازموں کی تنخواہ سے زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے۔

مرسلہ: شگفتہ ناصر، فیصل آباد

آزمائش

اگر آپ کے گھر چھٹیوں میں آپ کی کوئی کزن چند دن رہنے کے لیے آئے اور آپ اسے چاہتے بھی ہوں لیکن اظہارِ محبت نہ کرسکیں تو ایک منٹ میں پتا چل

سکتا ہے کہ وہ بھی آپ کو چاہتی ہے یا نہیں۔ باورچی خانے میں اگر وہ کھانا بنا رہی ہو تو آپ چپکے سے اس کے قریب جائیں اور اس کے شانے پر ہلکی سی چپت لگادیں۔ اگر وہ آپ کو دیکھ کر مسکرادے تو سمجھ لیں کہ وہ آپ کی ہے اور وہ بھی آپ کو چاہتی ہے لیکن اگر لڑکی غصے سے گھور کر دیکھے تو آپ تالی بجا کر کہیں۔ ”آہا...... باجی ڈر گئیں ......باجی ڈر گئیں۔“

تحریر: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

ایک کہانی

چاند نے کہا: روتا ہے کس لیے
میں نے کہا: دل ٹوٹا ہے اس لیے
چاند نے کہا: چاہت میں تو ایسا ہوتا ہے
میں نے کہا: چاہت بھی تو اِک دھوکا ہے
چاند نے کہا: بھول جا اسے
میں نے کہا: تو میری زندگی لے جا
چاند نے کہا: دنیا میں اور بھی چہرے ہیں
میں نے کہا: دل پہ اس کی یادوں کے پہرے ہیں
چاند نے کہا: ہر طرف ویرانی ہے
میں نے کہا: دنیا بھی تو اِک کہانی ہے

مرسلہ: اینہ عندلیب، سلانوالی

نمکین باتیں

پہلی بار جب میں سسرال گئی تو میں کچھ گھبرا رہی تھی۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک ہی تھا مگر جب اچانک میری نظر اپنی درجن بھر نندوں پر پڑی تو مجھے بڑی پریشانی ہوئی پھر میری ایک دوست نے مجھے علیحدہ گھر لینے کا مشورہ دیا۔ علیحدہ گھر لینے سے نہ صرف نندوں سے نجات بلکہ ساس کی بے جا نصیحتوں سے بھی چھٹکارا ہوگا۔ آج جب میں علیحدہ گھر میں رہ رہی ہوں تو مجھے اپنی نندوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ واقعی علیحدہ گھر نے کام کر دکھایا۔

مرسلہ: سمعیہ ممتاز شیخ، لالیاں

بیٹیاں

بیٹیاں تو رحمت ہیں
بیٹیاں محبت ہیں
اس پُرآشوب دور میں لوگو
یہ خدا کی بڑی عنایت ہیں
یہ تو پھولوں کی طرح پیاری ہیں
بڑی بے بس ہیں یہ بے چاری ہیں
اپنی ہستی مٹا کے ہر دم یہ
سب کے کہنے کی لاج رکھتی ہیں
ان کو دیکھو تو پیار سے دیکھو
ان سے بولو تو میٹھا تم بولو
کبھی آنکھوں کو ان کی نم نہ کرو
کبھی ان کو ہراساں تم نہ کرو
آئینہ دل جو توڑ بیٹھے تم
ان کا ہر مان ٹوٹ جائے گا
پھر سکھ چین تم سے چھوٹے گا
اور الفت کا ناتا ٹوٹے گا

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

لڑکیاں

لڑکیاں رزق کی طرح ہوتی ہیں۔ اپنی ہوں تو ہمیشہ خوشی اور شکر کی نگاہ ڈالو، لفظوں میں مت تولو، نگاہوں اور دل سے ان کی سلامتی چاہو۔ دوسروں کی ہوں تو نگاہیں جھکالو، بات کرو تو کوئی گدلا خیال نگاہ اور دل کو آلودہ نہ کرے۔ تمہارا ہونا تحفظ کا احساس دلائے نہ کہ سامنے والے کو اپنی عزت کی فکر پڑ جائے۔

مرسلہ: نیر فہیم خان، کراچی

میرا انتخاب

آمنہ حماد

محبت شاعری کی اساس ہے اور شاعر محبت کے پیامبر ہیں...... شاعر ان پیغامات کو خوب صورت لفظوں میں پرو کر غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں مگر محبت اندھیروں اور بربادیوں کی نامہرباں دیوی ہے جس کی زد میں آنے والے زندہ تو رہتے ہیں مگر تاعمر دل وجاں کا نشاں نہیں پاتے......فیض احمد فیض کے کلام میں بھی یہ تاثر ملتا ہے جسے فائزہ رحمٰن نے سیالکوٹ سے منتخب کیا ہے۔

آرزو

مجھے معجزوں پہ یقین نہیں
مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
ترے در پہ آکے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب
تو ترے حضور میں آرہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم
میں پھر ایک بار روانہ ہوں

کچھ پل...... کچھ لمحے زندگی میں امر ہو جاتے ہیں۔ اس ایک پل کے خیال سے نکلنا بھی چاہیں تو آزاد نہیں ہو سکتے...... کیونکہ اس ایک لمحے کی اسیری میں ہی زندگی کی خوشیاں پنہاں ہوتی ہیں...... پروین شاکر کی سالگرہ بھی اس ایک لمحے کی یاد میں لکھی گئی اک خوب صورت نظم ہے۔ ارم کا انتخاب، کراچی سے۔

سالگرہ

یہی وہ دن تھا
جب آج سے چار سال پہلے
اسی روش پر
بنفشی بیلوں کے نرم سائے میں ہم ملے تھے
وہ لمحہ جب کہ ہمارے جسموں کو اپنے ہونے کا
حیرت آمیز، راحت افزا
نشاط اثبات مل سکا تھا
ہماری روحوں نے اپنا، اپنا نیا سنہری جنم لیا تھا
وہ ایک لمحہ
ہماری روحوں کو
اپنے دستِ جمال سے چھو رہا ہے اب تک
نظر کو شاداب کر رہا ہے
اور ہم کو ماہتاب کر رہا ہے
ہم اس کے مقروض ہو چکے ہیں
سو آؤ اب اس عظیم لمحے کے نام
کوئی دعا کریں ہم
اٹھائیں ہاتھ
اور محبتوں کی تمام تر شدتوں سے چاہیں
کہ جب بھی نیا آفتاب نکلے
تو ہم اسے ایک ساتھ دیکھیں
بہت سے لوگ زندگی میں ملتے ہیں

اور بچھڑ جاتے ہیں

مادی زندگی کی ضرورتوں سے قطع نظر دل انسان کو اپنی ضرورتوں کو عجب طریقے سے احساس کراتا ہے۔ اس کے اپنے ہی تقاضے ہیں آوازوں کے شور میں ایک آواز ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی کی سختیوں اور مصائب پر ہماری غمگساری کرتی ہے وہ صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے۔ حمیرا کا انتخاب لاہور سے۔

غزل

میں نے کہا کہ میرے لیے کچھ دعا کرو
اس نے کہا دعا پہ نہ تکیہ کیا کرو
میں نے کہا کہ کام ودھن بے مزہ سے ہیں
اس نے کہا کہ حافظ و غالب پڑھا کرو
میں نے کہا کہ دوست نبھائیں گے میرا ساتھ
اس نے کہا کہ وقت پہ یہ تجربہ کرو
میں نے کہا کہ ڈوبتی جاتی ہے نبضِ وقت
اس نے کہا کہ کوئی غزل ابتدا کرو
میں نے کہا کہ اصل کی مجھ کو تلاش ہے
اس نے کہا کہ اپنا تعاقب کیا کرو
میں نے کہا کہ شہر میں تشہیر ہوگئی
اس نے کہا کہ اپنی حدوں میں رہا کرو
میں نے کہا کہ بہشت حقیقت ہے یا مجاز
اس نے کہا کہ غور نہ اتنا کیا کرو
میں نے کہا کہ مشورہ رباب و میکشی
اس نے کہا کہ ذاتِ کشیدہ پیا کرو
میں نے کہا کہ خدمتِ احباب کا صلہ
اس نے کہا کہ صحبتِ بد سے بچا کرو

فیصلے کا سفر لفظوں کی نرم چھاؤں میں نہیں
کٹتا..... محبت کے دشت بے برگ میں واپسی کا
کوئی رستہ نہیں ہوتا۔ اعتبار ساجد بھی اپنی اس نظم
میں فیصلے اور محبت کی کش مکش میں مبتلا نظر آرہے
ہیں۔ تانیہ کا انتخاب کوئٹہ سے۔

موسم گل کا آخری پیغام

جب یہ سوچو کہ بھر چکا ہے دل
میری چاہت میری رفاقت سے
خود کو وقف عذاب مت کرنا
لمبا چوڑا خطاب مت کرنا
کارڈ بھی انتخاب مت کرنا
ایک سوکھا ہوا گلاب کا پھول
بس لفافے میں بھیج دینا تم
میری تشنہ محبتوں کے نام
موسم گل کا آخری پیغام

شادی کی سالگرہ

”پیارے میاں جانی

سلام محبت!

آپ مجھے اکثر یاد آتے ہیں اتنے یاد آتے ہیں کہ آپ کی تصویر گود میں رکھ کر خوب باتیں کرتی ہوں درست کہتے ہیں بزرگ اصل محبت دور رہ کر ہوتی ہے۔ جب ہم پاس تھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ کتنا اچھا ہوا کہ آپ باہر چلے گئے آپ کے جانے کے بعد ہی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کتنے اچھے ہیں مگر آپ نے خط میں لکھا ہے کہ پردیس میں دل گھبراتا ہے اور وطن آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ یہ گھر آنے کی پٹی کس دشمن نے پڑھادی۔ یہاں کے لوگ باہر جانا چاہ رہے ہیں اور آپ اچھے خاصے باہر ہیں۔ لوگ عقیدت اور رشک سے مجھے دیکھتے ہیں اور آپ یہاں آنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس عمر میں تو آپ کو یہاں ملازمت ملنے سے رہی یہاں جو لوگ ملازم ہیں وہ اپنی ملازمتوں سے طرح طرح کے بہانوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ میرے دونوں بہنوئی رضا کارانہ اسکیم کے تحت اپنی اپنی نوکریوں سے بے دخل کر دیے گئے۔ اچھے خاصے صبح سویرے بغیر ناشتے کے اپنے آفس جاتے تھے آپا اور باجی کی قسمت میں چین ہی چین تھا۔ آپا اور باجی سارا دن خوب گھومتی پھرتی تھیں۔ چونکا جہیز اور پیو بھائی کی بُری ہماری بہنوں نے ساتھ جا کر خرید وائی تھی حالانکہ محلے کا معاملہ تھا اور ہمارے محلے والے کرائے داروں سے میل ملاپ بڑھانے میں ہچکچاتے تھے مگر ہماری بہن تو سب کے کام آنا جانتی ہیں غرض ہماری بہنوں کی قسمت میں چین ہی چین تھا۔ دونوں بہنوئی رات گئے گھر آتے تھے مگر اب تو ہمہ وقت گھر میں پڑے پڑے، اینڈتے رہتے ہیں۔ اب میں کیسے کہوں کہ بدتمیز شوہروں کو چوبیس گھنٹے افورڈ کرنا کوئی آسان بات ہے بھلا۔ دونوں بہنوں کو ایک ایک طلاق تو ہوگئی ہے کہ بہنوئیوں کی زبانیں ان کے کندھوں پر لگی ہوئی ہیں۔ ہر بات میں مادری فادری کرنے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ماہ بڑی آپا کا پندرہ پونڈ وزن کم ہوا اور باجی کا تیں پونڈ اور سب سے بڑی بات کہ میری بہنوں کے مزاج میں ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ خدا کی پناہ .....میں جب بھی انہیں فون کرتی ہوں تو میری آواز سن کر خوب روتی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ لٹی تو بہت قسمت والی ہے۔ تیرا میاں ملک سے باہر ہے ہماری بھی کوئی زندگی ہے میاں نہ صرف ملک میں ہو بلکہ ہر وقت اپنے گھر میں ہو اور زندگی ضیق کر کے رکھ دے۔ باجی کے میاں تو کسی بُری قسم کی ساس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ ہر وقت ہماری آپا پر چیختے ہیں، یہ باورچی خانے میں برتنوں کی برات کیوں لگی ہوتی ہے، ٹیلی فون پر ہر وقت اپنے میکے باتیں کیوں کرتی ہو، روزانہ بازار کی روٹیاں کیوں منگواتی ہو گھر میں روٹیاں کیوں نہیں پکاتی ہو، نوکرانی پر گھر چھوڑ کر محلے میں کیوں چلی گئیں، اتنے مہنگے تحائف اپنے میکے والوں کو کیوں دیتی ہو..... ظاہر ہے کہ باجی کو غصہ تو آنا ہی تھا انہوں نے بھی کہہ دیا کہ

تحائف محبت کرنے والوں کو ہی دیے جاتے ہیں جو لوگ منہ دیکھے کی محبت کرتے ہیں ان کو اپنی جوتی بھی نہ دوں۔ باجی کے سارے کے سارے سسرالی اک نمبر کے عیار ہیں ہماری باجی کیوں انہیں منہ لگائیں گی۔ ان کو کتنا ہی دے دو ان کی نیت ہی نہیں بھرتی۔ باجی کی ساری نندیں نوچنے کھسوٹنے والی ہیں اب پرسوں ان کے گھر آئیں تو واپسی پر پھولوں کے گملے ہی اٹھا کر لے گئیں کہ تمہارے ہاں یہ مرجھا رہا ہے میرے ہاں اس میں پھول آئیں گے اس پر ہماری باجی نے ان کی طبیعت صاف کی تو ان کے میاں جی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ میاں ملک سے باہر ہو تو ایسے مسائل بے چاری بیوی خود ہینڈل کرتی ہے اور میاں خوامخواہ پریشان بھی نہیں ہوتا۔ اب جیسے گزشتہ ماہ آپ کی بہنوں نے میری چوڑیاں دیکھ کر کہا تھا کہ بھائی سے کہو کہ ہمیں چاندی کی چوڑیاں ہی بنا کر دے دیں تو میں نے انہیں اتنی سنائی تھیں کہ آپ کی دو بہنیں تو مکاری سے بے ہوش ہونے کی اداکاری کرنے لگی تھیں مگر میں انہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی وہ تو بعد میں پتا چلا کہ پرانے پڑوسی ان کو اپنی گاڑی میں انہیں گھر چھوڑنے گئے تھے وجہ صرف یہ تھی کہ بی پڑوسن کو دوسروں کے معاملات میں ہمیشہ کودنے کا شوق رہا ہے (اور انہوں نے اپنی تسکین کر لی ہوگی) ہاں لوگ کتنا غلط کہتے ہیں کہ پردیس میں بجن ہوں تو عید نہیں ہوتی۔ شاعر اس موضوع پر اپنے قلم خوامخواہ گھس دیتے ہیں حالانکہ جن کے بجن ملک سے باہر ہوں اور سال، سال بھر اپنی شکل نہ دکھائیں۔ اصل تہوار، سکھ اور طمانیت تو ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہاں میں آپ کو آپ کی ماں کی قسم دے رہی ہوں کہ باہر کی ملازمت چھوڑ کر ہرگز نہیں آیئے گا۔ یوں بھی مجھے اکیلے رہنے کی عادت ہوگئی ہے اور آپ جب بھی آتے ہیں ویسے نہیں رہتے جیسے فون پر ہوتے ہیں۔ سچی کہہ رہی ہوں کہ آپ کے آنے سے مجھے عجیب وحشت سی ہونے لگتی ہے اور کچھ نہیں تو الٹیاں کر کر کے ہی جی ماندہ سا ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی پر نظر لگا رہے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ ہم آپس میں محبت اور الفت سے رہیں کہ یہ یقیناً ہمارے دشمنوں کی ہی چال ہے کسی طرح ہماری آپس میں دھانسو قسم کی لڑائیاں ہوں اور ظاہر ہے کہ وہ اسی صورت میں ہو سکتی ہیں کہ آپ اپنی لگی لگائی ملازمت چھوڑ کر وطن آ جائیں اور صبح شام مجھ میں اور میرے کاموں میں کیڑے نکالیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں......؟ میری بات کا یقین نہیں ہے تو اپنی کزن نگہت کی حالتِ زار پر غور کر لیں کہ جب تک اس کا میاں ملک سے باہر رہا دونوں کی ذہنی ہم آہنگی اے ون رہی اور جیسے ہی وہ وطن واپس آیا پندرہ دن کے بعد ہی وہ لڑ کر میکے جا بیٹھی۔ میاں جانی آپ یہ بات بہ خوبی جانتے ہیں کہ آپ کے گھر میں تو مسائل کے ٹوکرے کے ٹوکرے بھرے رکھے ہیں جو اسی صورت میں حل ہوں گے کہ جب آپ باہر سے اندر نہ آنے کا سوچیں۔ ہاں اپنا ڈرافٹ ہر مہینے میرے نام بھیجتے رہیں اگر بوریت زیادہ ہو رہی ہے تو کہیں اوور ٹائم کر لیں اس سے دماغ میں پراگندہ خیالات نہیں آئیں گے اور آپ کی طبیعت بھی ہشاش بشاش رہے گی۔ ہاں جانو اس ماہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے مگر آپ ہرگز، ہرگز وطن نہیں آئیں گے۔ سالگرہ اگر علیحدہ رہ کر منائی جائے تو زیادہ لطف آئے گا کہ محبت جدا رہ کر ہی پنپتی ہے یہ دانشورانہ قول سو فی صد میرا ہے۔ ہاں شادی کی سالگرہ پہ خصوصی تحفہ کیا بھیجیں گے......؟

فقط آپ کی راج دُلاری بیگم
لبنیٰ جوہر"

ایک خط

پیارے میاں جانی!

سلامیاں......

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ پر اتنے دورے کیوں پڑنے لگے ہیں۔ پورا سال ہو گیا ہے پاکستان صرف چند دنوں کے لیے آتے ہیں اور آ کر ابھی آپ کا سوٹ کیس بھی صحیح طرح نہیں کھل پاتا کہ آپ پر پھر دورہ پڑ جاتا ہے اور آپ دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ آپ ابنِ بطوطہ تو نہیں ہیں تو پھر اتنے کھوجی کیوں بن گئے ہیں خیر...... یہ آنا جانا آپ کی دفتری مصروفیات کا ایک حصہ ہیں مگر میں کیا کروں، کہاں تک ٹی وی دیکھوں، کہاں تک شوبز کے رسائل چاٹوں ہمارے ملک میں تو سلیبرٹی کے اسکینڈل بھی اتنے سامنے نہیں آتے کہ بندہ اپنی پریشانیوں کو بھول کر ان کی کہانیوں میں کھو جائے۔ ثانیہ مرزا اور شعیب کی شادی کے گانے بھی تمام چینلز سے آنے بند ہو گئے ہیں۔ ورنہ انہیں دیکھ کر اور سن کر طبیعت میں کچھ شگفتگی سی تو آ جاتی تھی۔ یقین کیجیے میں سو سو کر تھک گئی ہوں مگر میرا وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ آپ کی اماں، بہنیں جو پکا دیتی ہیں، میں اپنے کمرے میں ہی کھا لیتی ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ ان کے بدمزہ کھانوں میں کوئی برائی نکالوں وہ کچھ بھی پکا لیں کھانے کا ذائقہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے جیسے فضائی سروس کے کھانوں سے ایک عجیب قسم کی بساندھ آتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے۔ ایسی صابر بیوی کس کی ہو سکتی ہے جو چپ چپاتے بازار سے کھانے منگوا کر خاموشی سے کھا کر شکریہ آپ کی بہنوں کا ادا کرتی ہوں کہ کیسے کیسے بدمزہ کھانے کی وہ ماہر ہیں۔ یقیناً کہیں سے جا کر ضرور سیکھے ہوں گے۔ میرے ممی ڈیڈی کچھ علیل ہیں اس لیے میں ان کو اپنے گھر لے آئی ہوں، آپ کی بڑی آپا کا... کمرا ان کو دے دیا ہے۔ بڑی آپا کا کیا ہے وہ تو آپ کے کمرے میں بھی سو سکتی ہیں مگر مہمانوں کا تو خیال رکھنا چاہیے۔ آپ تو جانتے ہیں ڈیڈی بغیر گاڑی کے نہیں رہ سکتے اور ان کی گاڑی آج کل سروس پر گئی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کے بہنوئی کی گاڑی لے لی ہے کہ ایسا کرنے کو آپ نے کہا ہے۔ گاڑی گو خاصے پرانے ماڈل کی ہے اور ڈیڈی اس کو چلا کر بھی خاصی شرمندگی محسوس کر رہے ہیں مگر کیا کریں وہ جب تک روزانہ اندھا دھند گاڑی نہ چلائیں انہیں چین ہی نہیں پڑتا۔ آج بھی وہ دو دفعہ باہر سے گاڑی مار کر لائے ہیں اور کہہ رہے تھے کہ تمہارے نندوئی کی ذلیل سی گاڑی مہا ذلیل ہو گئی ہے۔ میں نے کہا آپ پروا مت کیجیے، ان کی یہ کھٹارا تو ہزاروں چوٹیں کھائی ہوئی ہے۔ نندوئی بے چارے کا شغل ہی یہی ہے کہ آئے دن اپنی گاڑی کے ڈینٹ صحیح کرواتے رہیں۔ چھوٹی نند پارلر چلاتی ہیں۔ چہروں کے ڈینٹ دور کرتی ہیں اسی وجہ سے ان دونوں میاں بیوی میں خوب ذہنی ہم آہنگی ہے۔ مجال ہے ایک دوسرے کو مذاق میں ہی سہی مگر برا بھلا کبھی نہیں سناتے۔ ہاں کل آپ کے کوئی دوست اصغر آئے تھے اور ڈھائی لاکھ دے گئے ہیں کہ انہوں نے آپ سے لیے تھے، میں فوراً جا کر اپنے لیے سونے کا سیٹ لے آئی کہ آج کل سونا کس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے جب تک آپ آئیں گے ڈھائی لاکھ کا سیٹ تین لاکھ کا ہو چکا ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کے گھر والوں کا کیسا خیال رکھتی ہوں تو خوش ہو جائیں جس دن میں اپنے لیے سیٹ لائی اسی دن میں گھر میں مٹھائی بھی لے کر آئی تھی اور آپ کے سب گھر والوں کو کھلائی۔ آپ کی اماں میرا سیٹ دیکھ کر پوچھ رہی تھیں کہ کتنے کا خریدا میں نے انہیں صدمے سے بچانے کے لیے کہا یہ میرے ڈیڈی، ممی میرے لیے لائے ہیں اور پانچ لاکھ کا ہے اس پر وہ بہت خوش ہوئیں۔ دیکھا، میں سب کی خوشیوں کا کتنا خیال رکھتی ہوں اسی خوشی میں جلدی سے میرے نام ڈرافٹ بھیجیں......فوراً۔

آپ کی بیگم ثریا۔"

☆☆☆

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆شہلا رضا.....راول پنڈی

دردِ فرقت سہا نہیں جاتا
لیکن اُن سے کہا نہیں جاتا
جی رہا ہوں کہ مر نہیں سکتا
مر رہا ہوں جیا نہیں جاتا

☆پروین شکو.....لاہور

شبنم کی ایک بوند تھی پھولوں کی کائنات
وہ بھی نہ بچ سکی ہوس آفتاب سے

☆نیلا ذوالفقار.....کراچی

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن

☆صبیحہ انور.....راول پنڈی

میرا اعزاز کیا کم ہے کہ میں حوا کی بیٹی ہوں
مثال موسم الفت تیری بستی سے گزری ہوں

☆زہرہ ناز.....اسلام آباد

پھولوں سے تو فریب بہت کھا چکا ہوں میں
تو مجھ کو چاہتا ہے تو پتھر تلاش کر

☆عظمیٰ.....فیصل آباد

افسردگی زیست کی تردید کیجیے
ہاں مسکرایئے، مری تائید کیجیے

☆نسرین یاسین.....حیدرآباد

محبتوں کا مقدر ہے بدگمانی بھی
کہ تیرے ساتھ رہوں اور ڈر نہ جائے کہیں

وفا کا چاند یہیں پانیوں میں اترا ہے
یہ میرے خواب کا منظر بکھر نہ جائے کہیں

☆راجعہ اسلم.....رحیم یار خان

آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

☆آصفہ ستار.....فیصل آباد

گھر موم کا پہلے تو بنایا نہیں جاتا
بن جائے تو سورج سے بچایا نہیں جاتا

اب تم ہو مقابل تو مجھے ہارنا ہوگا
تم کو تو میری جان ہرایا نہیں جاتا

☆نذیراں بی بی.....بھکر

ہجوم اپنی جگہ تاریک جنگل کے درختوں کا
پرندے پھر بھی اپنا آشیانہ یاد رکھتے ہیں

☆نمرہ تبسم.....ساہیوال

میں تیری ذات سے آگے نہ کچھ بھی سوچ سکوں
میں کیا کروں کہ یہ دل کا معاملہ ٹھہرا

☆نغمہ اختر.....خانیوال

پتوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں
گرتے ہوئے شجر بھی سخی انتہا کے تھے

☆مسز خدیجہ.....جعفرآباد

اسے گنوا کے میں خود بھی بچھڑ گیا طالب
وہ اِک شخص تو ہر پل تھا آئینہ میرا

☆حرا شریف.....فیصل آباد

نیند سے تعلق ہی نہیں برسوں سے میرا
خواب آ آ کر میری چھت پر ٹہلتے کیوں ہیں
میں نہ جگنو ہوں نہ دیا، نہ کوئی تارا
روشنی والے پھر نام سے میرے جلتے کیوں ہیں

☆نوشین اقبال نوشی.....بدر مرجان

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں

☆شائلہ انجم.....سرگودھا

جھیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا سی بات پر
ذہن میں الفاظ جم جاتے ہیں کائی کی طرح

☆امینہ عندلیب.....سلانوالی

کتنے نگر ہیں جو کبھی اجڑے کبھی بسے
اجزا جو ایک بار یہ دل پھر بنا نہیں

☆عالیہ طاہر رفیقی.....لاہور

کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کہ کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا

☆مس امینہ احمد.....لاہور

ملگجا اندھیرا تھا سوگوار خاموشی
عمر اس طرح بیتی شام ڈھل گئی جیسے

☆انیس فاطمہ.....سیالکوٹ

تم ہم سفر ہوئے تو ہوئی زندگی عزیز
مجھ میں تو زندگی کا کوئی حوصلہ نہ تھا

☆نغمہ اختر.....اوکاڑہ

کاش دنیا کے مصائب کو سمجھنے کے لیے
تم نے کچھ دن میری دنیا میں گزارے ہوتے

☆قرۃ العین قرۃ.....لیہ، کراچی

آتے جاتے سارے موسم اس سے نسبت رکھتے ہیں
اس کا چہرہ خزاؤں جیسا اس کا قرب بہاروں جیسا

☆سعدیہ آصف.....ملتان

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

☆عالیہ مشتاق.....راول پنڈی

ہر اِک سے کون محبت نباہ سکتا ہے
کہ سب سے دوستی یاری تو کی وفا نہیں کی

☆حرا طارق.....کراچی

اِک نگاہ خود شناس مجھ سے ہوئی جو روشناس
اپنے ہر اِک سوال کا خود ہی جواب ہوگئی

☆فرزانہ نرگس.....سرگودھا

محبتوں کے کھلے جب گلاب آنکھوں میں
کسی کے خواب رہے بے حساب آنکھوں میں

☆قرۃ العین.....لاہور

زندگی ختم ہوئی دوست جہاں ختم ہوئے
رہ گئی عمر تو چاہے وہ جہاں تک پہنچے

☆سعدیہ.....لاہور

دل اک خون کے قطرے سے زائد نہ تھا مگر
آنسوؤں نے اس کو بھی طوفاں بنا دیا
وہ قیس تھا کہ جس نے بیاباں کو گھر کیا
ہم نے تو اپنا گھر ہی بیاباں بنا دیا

☆فہمیدہ.....میاں چنوں

اس سے پہلے کہ رُت بدل جائے
اپنے سارے گلاب لے جانا

☆نگہت.....کوئٹہ

فراز تم بھی ملتے ہیں نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

☆یاسمین سحر.....کراچی

بھری بہار میں اب کے عجیب پھول کھلے
نہ اپنے زخم ہی مہکے نہ دل کے چاک سلے

☆ناہید.....اسلام آباد

یہ مصلحت وقت ہے یا کرب کی شدت
ہونٹوں پہ ہنسی آنکھوں میں اشکوں کے بجائے

☆ربیعہ ظہیر.....سیالکوٹ

میری خطاؤں میں میری سمجھ کا دخل نہیں
میں جو بھی کرتا ہوں بے اختیار کرتا ہوں

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں

دھی کا کیک

اشیا: ترش پھلوں کا رس، پون کپ۔ جیلاٹن پاؤڈر۔ ایک کھانے کا چمچ۔ انڈے کی سفیدی، تین عدد۔ دہی، دو تہائی کپ۔ سبز کچے سنگترے کا چھلکا، ایک عدد۔ آم، ایک عدد۔ کیوی فروٹ، دو عدد۔ کچے انگور، دس سے بارہ عدد۔ لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب..... پھلوں کے رس کو گرم کریں اور جیلاٹن پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح حل کرلیں۔ ایک پیالے میں انڈے کی سفیدی کو پھینٹیں ساتھ ساتھ لیموں کے چھلکے اور دہی ڈالتے جائیں۔ اسی آمیزے میں جیلاٹن اور پھلوں کے رس کا آمیزہ بھی ڈال کر پھینٹ لیں یہاں تک کہ تمام اشیا اچھی طرح سے پھینٹ جائیں۔ آمیزے کو جیلی کے سانچے میں ڈال کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ سانچہ ایسا ہو جو درمیان سے خالی اور اطراف سے رنگ کی شکل کا ہو۔ تیار شدہ جیلی کیک کو پلیٹ میں نکال کر فریج میں رکھ دیں۔ آم کو چھیل کر گٹھلی نکال لیں اور گودے کے ٹکڑے کرلیں۔ کیوی فروٹ چھیل کر ٹکڑے کرلیں، انگور بھی دو ٹکڑے کرلیں۔ کٹے ہوئے پھلوں کو پیالے میں ڈال کر اوپر سے لیموں کا رس چھڑک کر چمچ سے مکس کریں۔ سارے پھلوں کو کیک کے درمیانی خالی حصے میں ڈال دیں۔ مرسلہ:۔ سائرہ منیر، کراچی۔

شلجم کا قورمہ

اشیا: گوشت، آدھا کلو۔ شلجم، آدھا کلو۔ گھی، تین چمچ۔ نمک۔ لونگ، دس عدد۔ الائچی، چار عدد۔ لہسن، ایک گٹھی۔ پیاز کے لچھے، آدھا پاؤ۔ ادرک، ایک گرہ۔ دھنیا بھنا ہوا، دو تولہ۔ سرخ مرچ پسی ہوئی۔ حسب ضرورت۔ لیموں کا رس، حسب ذائقہ۔ جاوتری، ذرا سی۔ دار چینی، تھوڑی سی۔ کالی مرچ، ایک عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ جائفل، ذرا سا۔

ترکیب: پہلے شلجم چھیل کر بڑے بڑے ٹکڑے کرکے کسی نوکدار چیز سے گودلیں پھر انہیں گھی میں الائچی ڈال کر سرخ کرکے نکال لیں اور پیاز کے آدھے لچھے گھی میں سرخ کرکے نکال لیں۔ بقیہ پیاز کو مسالے کے ساتھ ملالیں۔ لہسن، پیاز کے آدھے لچھے، ادرک، دھنیا اور سرخ مرچ ایک ہی بار پیس لیں اور گھی جو شلجم تلنے اور پیاز سرخ کرنے سے بچ گیا ہے اس میں پانچ لونگ اور دو سبز الائچی ڈال کر کڑکڑائیں پھر گوشت کو دھو کر اس میں ڈال دیں اور بھون کر سرخ کرلیں۔ اس کے بعد باقی مسالے اور نمک حسب ضرورت ڈال کر بھونیں اور پانی ڈال کر گلنے کے لیے چڑھا دیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی جل جائے تو آدھا پاؤ دہی ڈال کر خوب بھونیں اگر ہو سکے تو ایک لیموں کا رس بھی ڈال دیں تاکہ تتلے بھی گل جائیں۔ آخر میں لال کی ہوئی پیاز، جائفل، جاوتری، دار چینی، لونگ، کالی مرچ، ہری الائچی پیس کر ڈال دیں اور کیوڑے کا عرق بھی ملا دیں تاکہ خوشبو آئے۔ مرسلہ:۔ ذکرہ طاہر، کراچی۔

☆☆☆

سندیسے

پاکیزہ بہنیں

سالگرہ مبارک

صبح کی کرن بولی
اٹھو دیکھ یہ انظارہ ہے
میں نے کہا
رک پہلے
ایس ایم ایس تو کرلوں
اس دوست کو جو
صبح سے بھی
پیارا ہے
سالگرہ مبارک

مرسلہ: عنبر یسم، گوجرانولہ

عنیزہ سید کے نام

قلم جن کے ہاتھوں میں آکر فخر کرے کہ اب لفظوں کے وہ موتی بکھیرے جائیں گے کہ جن کو سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر کر قارئین مالا مال ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو خدا ایسی صلاحیتوں سے نوازتا ہے کہ جب وہ اپنی ان خوبیوں کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو پھر ہر طرف ان کا ہی چرچا ہوتا ہے۔ عنیزہ سید اک ایسا ہی نام ہے جسے دیکھتے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ اب ہم کوئی ایسی تحریر پڑھنے والے ہیں جو دھیرے دھیرے سحر طاری کردے گی اور کچھ وقت کے لیے ہم ارد گرد کو بھول کر ان کرداروں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ محبت کے نرم و گداز موضوع کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں معاشرے کی تلخ حقیقتیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اُن کی تحریر کا خاصہ ہے۔ اللہ ان کے قلم کو اور طاقت دے۔

مرسلہ: سدرہ رضوان، راول پنڈی

عمیرہ احمد کے نام

عمیرہ آپی، آپ ہم سب کی موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ ہم سب سہیلیاں آپ کی تحریروں کی دیوانی ہیں۔ آپ کوئی وی واوں نے بہت مصروف کردیا ہے۔ آپ کے ڈرامے بھی شوق سے دیکھے جاتے ہیں پر آپ کی تحریر پڑھتے ہوئے تو نشہ سا چھا جاتا ہے۔ آپ خوب زیادہ زیادہ لکھا کریں۔ لوگ آپ کے ناول دل و جان سے پڑھتے ہیں۔ بتائیں لفظوں کے یہ خزانے آپ نے کہاں سے تسخیر کیے ہیں۔ اِک عام سے منظر کو آپ کا انداز بیاں خاص بنادیتا ہے۔ آپ کا کوئی پیراگراف پڑھ کر ہی پتا لگ جاتا ہے کہ یہ عمیرہ احمد ہی ہیں۔ آج کے دور کی منفرد ترین رائٹرز میں آپ سرفہرست ہیں۔ اللہ آپ کو لمبی عمر عطا کرے اور قلم سے رشتہ ہمیشہ مضبوط رہے، آمین

مرسلہ: ناہید جبیں، اٹک

پیاری بہوؤں کے نام ایک مفید پیغام

آج کل اکثر گھروں کا یہ مسئلہ ہے کہ مائیں بہت خوشی خوشی بیٹے کی شادی کرکے بہو کو گھر لاتی ہیں لیکن بیٹا اگر ذرا سا ہنس بول لے، بیوی کو لے کر کہیں گھومنے پھرنے ..... چلا جائے بس ماں کو فوراً پریشانی شروع ہو جاتی ہے اور بہو کا جینا دوبھر کردیتی ہیں اور بیٹے کو بھی بیوی سے بدظن کردیتی ہیں۔ ان بچیوں کے لیے جو شوہر اور ساس سے بہت پریشان ہیں 7 بار بسم اللہ الرحمن الرحیم، یا

سیوح یا قدوس یا غفور یا ودود پڑھ کر پانی پر دم کرلیں اور ساس اور شوہر کو پلائیں ساتھ اپنا رویہ بھی درست رکھیں شوہر کی ماں آپ کی ماں ہے ان کی عزت کریں، محبت اور خدمت کریں شوہر کی اطاعت کریں پھر کرشمہ دیکھیں۔

ماخوذ: حقوق الرجال

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

اقبال بانو کے نام

ہماری پیاری اقبال بانو آپ بہت کم کم نظر آتی ہیں..... مسلسل غائب رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو پتا ہے ہم لوگ آپ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ میں اور میری بہن اسکول کے زمانے سے آپ کی کہانیوں کے فین ہیں۔ آپ کے ناول اور افسانے کسی بھی رسالے کی جان ہوتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں اس دھرتی کی مٹی کی خوشبو میں بسی ہوتی ہیں۔ آپ کے لفظ لفظ میں اپنی ثقافت بولتی ہے۔ یہی کھرا پن اور سادگی آپ کو سب سے ممتاز کرتی ہے۔ پاکیزہ کے صفحات میں جلدی جلدی آیا کریں۔ محبت کے موضوع پر لکھتے ہوئے آپ سرتاپا محبت اوڑھ لیتی ہے یہی چادر پڑھنے والے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

مرسلہ: طلعت جبیں نیاز، کراچی

رفعت سراج کے نام

رفعت آپی کہاں غائب ہیں آپ.....؟ اپنی چاہنے والی بہنوں کی پکار پر لوٹ آئیں۔ آپ کی اچھوتی تحریریں پڑھنے کو ہم بے تاب رہتے ہیں۔ لفظوں کی بازی گری سے وہی جادو بکھیر دیں جو قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ آپ کی دل موہ لینے والی کہانیاں آپ کا بے ساختہ پن اور چھوٹے افسانے میں بڑی بات کہہ دینا یہ سب ہم یاد کرتے ہیں۔ آپ کے طویل ناولز پڑھتے ہوئے دل چاہتا ہے کہ بس پڑھتے ہی جائیں۔ آپ نئے نئے افسانے اور ناولز منظر عام پر لائیں لوگ مشتاق ہیں پڑھنے کے لیے۔ اپنی مصروفیات میں سے قارئین کے لیے وقت نکالیں اور اپنے منفرد قلم سے رنگ بکھیر دیں۔

مرسلہ: جویریہ فاطمہ، زیارت

سن تو سہی

سنو!
کبھی ناراض مت ہونا
کبھی ایسا جو ہو جائے کہ
تیری یاد سے غافل کسی لمحے جو ہو جاؤں
بنا دیکھے تیری صورت
کسی شب میں جو سو جاؤں
تو سپنوں میں چلے آنا
مجھے احساس دلا جانا
سنو ناراض مت ہونا
کبھی ایسا جو ہو جائے جنہیں کہنا ضروری ہو
وہ مجھ سے لفظ کھو جائیں
انا کو بیچ مت لانا میری آواز بن جانا
کبھی ناراض مت ہونا

مرسلہ: شگفتہ ناز ملک، علی پور

تمام مصنفات کے نام

اس نئے سال کی کوکھ سے
پہلی نوزائیدہ رات کی
ان چھوئی مہکتی ساعتوں میں
تم نے اتنے خوب صورت انداز میں
مجھ سے دوستی کا اقرار کیا کہ
میری آنکھوں میں آنسو آ گئے
نئے سال پر اس سے سچا
اور انمول تحفہ
اور کیا ہو سکتا تھا

شاعرہ: پروین عذرا نشہ، کراچی

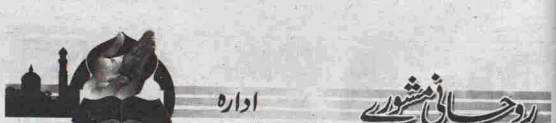

روحانی مشورے

ادارہ

یا سلامُ کے معنی اور اس کے خواص

(سب عیوب و آفات سے سالم، سب نقائص اور کمزوریوں سے پاک، سلامت و بے عیب ذات)

خواص

☆جو ہمیشہ صبح کی نماز کے بعد ایک ہزار (1000) بار اس اسم کو پڑھے گا اس کا علم زیادہ ہوگا۔

☆اگر کوئی اس اسم کو ایک سو اکتیس (131) بار یا ایک سو اکسٹھ (161) بار پڑھ کر بیمار پر دم کرے گا تو بیمار صحت پائے گا۔

☆جو اس اسم کو کثرت سے پڑھے یا لکھ کر پاس رکھے وہ دشمن سے بے خوف رہے گا۔

☆بیمار یا خائف اگر ایک سو گیارہ (111) بار پڑھ کر دم کرے تو بیماری اور خوف سے محفوظ رہے گا۔

☆جو کوئی کثرت سے اس اسم کو پڑھتا رہے گا انشاءاللہ تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

☆یہ اسم مبارک چھ سو نوے (690) بار شیرینی پر پڑھ کر دشمن کو کھلائے تو دشمن مہربان ہو جائے۔

☆اگر کوئی ایک سو اکیس (121) بار یہ اسم اور (سَلٰمٌ قَولًا مِّن رَّبٍّ رَّحِیم) کسی مریض پر پڑھے تو مریض شفا پائے گا یا کم از کم اس کے مرض میں کمی ہو گی۔

☆اگر کوئی شخص مریض کے پاس اس کے سرہانے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ اسم سو چھتیس (136) بار اتنی بلند آواز سے پڑھے کہ مریض سن لے تو انشاءاللہ اس کو شفا ہو گی۔

☆ہر نماز کے بعد پندرہ (15) مرتبہ (اَللّٰھُمَّ یَا سَلَامُ سَلِّمْ) پڑھنا ہر طرح کی سلامتی کے لیے مفید ہے۔

☆جو کوئی ایک سو پندرہ (115) مرتبہ یہ اسم پڑھ کر بیمار پر دم کرے گا اللہ اس کو صحت و شفا عطا فرمائے گا۔ انشاءاللہ!

چھوٹے بچوں کے مسائل اور ان کا حل

اگر دودھ پیتے بچے کا پیٹ خراب ہو جائے تو 1/2 چائے کا چمچ عرق گاؤزبان 1/2 چائے کا چمچ سونف کے عرق میں ملا کر نیم گرم کر کے چند دانے چینی شامل کر کے دن میں دو تین دفعہ بچے کو پلا دیں۔

☆اگر بچہ بلاوجہ الٹیاں کر رہا ہو تو لیموں کے اندر سے دو عدد بیج نکا کر چھلکا اتار میں پھر بیج میں رکھ کر چمچ کے الٹے سرے سے پیس لیں پھر چمچ میں رکھ کر ہلکا سا پانی ملا کر دے دیں۔ انشاءاللہ دو تین دفعہ دینے سے آرام آ جائے گا۔

☆سفید کنیر کے پھول لے کر دھو کر سکھا لیں، اس طرح سکھائیں کہ ایک سفید ململ کا کپڑا نیچے بچھائیں اور اوپر پھول رکھ دیں اور ایک سفید ململ کا کپڑا اوپر ڈال دیں، سوکھ جائیں تو صاف گرائنڈر یا کوٹڑی میں باریک پیس کر چھان لیں۔ جس بچے کو بہت زکام ہو..... ایک ٹوتھ پک کے سرے پر جتنا پاؤڈر آتا ہے وہ ایک ایک دونوں نتھنوں میں لگا کر آنکھوں پر کپڑا رکھ کر (بچے کی) پھونک مار دیں۔ چند چھینکیں آ کر سارا ریشہ باہر نکل آئے گا۔ دن میں دو دفعہ کر لیں۔

شوابے ہومیو کلینک

from Nature for Health

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

موٹاپا اور کمر درد

میری عمر 38 سال ہے۔ میں زیادہ کھاتی بھی نہیں لیکن پھر بھی موٹاپا ہے۔ اس کے علاج کے لیے کافی ادویات استعمال کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں کمر کے مرض بھی مبتلا ہوں، جس کی ادویات بھی استعمال کر رہی ہوں۔ اور اس مرض کی وجہ سے کوئی ورزش بھی نہیں کر سکتی۔ برائے مہربانی کوئی اچھی دوائی بتائیں جس سے موٹاپا کم ہو جائے۔

آپ کی دکھی بہن۔۔۔! فرحت ضلع بھکر

جواب: فرحت آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کا قد کتنا ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ صبح دوپہر اور رات کھانے میں کیا اور کتنا لیتی ہیں، شادی شدہ ہیں یا نہیں اور کتنے بچے ہیں، کمر کی تکلیف کیا ہے اس کی کوئی رپورٹس کروائی ہیں؟ ماہواری کے متعلق بھی بتائیں۔ ان سب چیزوں کے بعد آپ کو یقیناً پھر اچھی دوا تجویز کی جا سکتی ہے۔ جب تک آپ یہ تفصیلات ہمیں روانہ کریں اس وقت

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

مئی 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ....

پتا: ....

تک یہ احتیاطیں کریں۔

1۔ میٹھی + مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں (اس میں شربت کولڈ ڈرنک بریانی شامل ہیں)

2۔ چہل قدمی کی عادت ڈالیں ابتدا دس منٹ سے کریں۔

3۔ ہر کھانے سے پہلے ایک گلاس پانی ضرور پئیں کھانے کے ساتھ اور بعد بالکل بھی نہ پئیں۔

4۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Calc Carb 200 ہر ہفتہ ایک خوراک استعمال کریں۔

Rhustox30 اور Bryonia 30 5,5 قطرے صبح دوپہر شام استعمال کریں

Phytolacca berry Q کے 10 قطرے دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

☆......☆......☆

لنگڑی کا درد اور چہرے کے دانے

میں آپ کا یہ کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں آپ کے پاس اپنا مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں اس امید پر کہ مجھے آپ کی دی ہوئی دوائی سے ضرور افاقہ ہوگا۔

میرا مسئلہ نمبر ا یہ ہے کہ میری الٹی ٹانگ میں گھٹنے کی سائیڈ پر درد ہے۔ میں اگر ٹانگ کو.... موڑلوں تو درد ہوتا ہے اور کھنچاؤ سا محسوس ہوتا ہے ٹانگ کو سیدھا کروں تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اگر میں کھڑی ہو جاؤں تو ایک دم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۲: میرے چہرے پر دانے نکل رہے ہیں جو کہ پہلے سرخ ہوتے ہیں پھر اس میں سے مواد پیلا نکلتا ہے بعد میں اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ میری 4 ماہ بعد شادی ہے۔ اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ این بہاولپور

جواب: قد اور وزن نہیں لکھا کتنا ہے، درد کتنے عرصے سے ہے؟ گرنے کے بعد یا چوٹ لگنے کے بعد یا کوئی چیز اٹھانے کے بعد ہوا تھا۔ دانے کب نکلتے ہیں ماہواری سے پہلے دوران، بعد میں lumbo-sacral X-Ray Spine ضرور کروائیں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد حال بتائیے گا۔

Calc Sul 30، Gnaphilum30 اور Rhustox30 کے 5,5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک کپ پانی میں ڈال کر استعمال کریں اور وزن اٹھانے سے پرہیز کریں۔

☆......☆......☆

بچوں کا قد

میرا بیٹا عمر تقریباً 19 سال، بیٹی عمر تقریباً 16 سال دونوں کا قد نہیں بڑھ رہا مہربانی فرما کر کوئی اچھی سی دوائی تجویز فرمائیں۔ بیٹے کا قد پانچ فٹ ساڑھے 6 انچ بیٹی کا قد پانچ فٹ 1 انچ۔ مہربانی فرما کر کوئی تیز اثر دوائی تجویز

فرمائیں۔ دونوں کی عمومی صحت اچھی ہے۔
والسلام والدہ شہریار۔ عدینہ میانوالی)

جواب: محترمہ والدہ صاحبہ یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ قد کا تعلق ماں اور باپ کے خاندان سے ہے دوسرا ٹین ایج تک قد بڑھتا ہے۔ سوم ورزش، متوازن غذا اور اچھا ماحول اس میں معاون بنتے ہیں۔ عام جسمانی صحت کیسی ہے اس کا بھی بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

بہر حال دونوں بچوں کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Baryta carb 30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ½ کپ پانی میں استعمال کرائیں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ بتائیں۔

☆......☆......☆

بے اولادی و ماہواری کی خرابی

میری ہمشیرہ جس کی عمر 35 سال ہے شادی شدہ ہے۔ 6 سال شادی کو ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد سے محروم ہے۔ ماہواری صحیح نہیں آتی۔ 3 دن ٹانگوں اور کمر میں شدید درد ہوتا ہے۔ تھوڑا سا خون آتا ہے۔ وہ بھی کالے رنگ کا۔ کھل کر ماہواری نہیں آتی۔ ڈاکٹروں کو چیک کروایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ٹیوبیں بند ہیں آپریشن کروائیں۔ لیکن ہم نے آپریشن نہیں کروایا۔۔۔ مہربانی کر کے میری ہمشیرہ کے مسئلے کا حل بتائیں (ماہواری کا مسئلہ 8 . 9 سال سے ہے) بہت پریشان ہے۔ ایسی دوا تجویز کریں کہ میری ہمشیرہ کی ماہواری صحیح ہو جائے۔ اور وہ اولاد کی نعمت سے بھی فیض یاب ہو سکے۔ (خاوند کو چیک کروایا ہے۔ وہ بھی صحیح ہے) (رپورٹس ہمارے پاس نہیں ہے) ثمینہ طاہرہ کبیر والا

جواب: 35 سال عمر ہو گئی ہے۔ مسئلہ 8/9 سال پرانا ہے شادی کو 6 سال ہو گئے۔ بے پروائی میں یہ دن کیوں گزارے اس کا علاج شروع کیوں نہیں کروایا، رپورٹس ضرور بھیجیں اس کے بغیر دوا کی تجویز ممکن نہیں ہے۔

Color dopler pelvis CBC
Urine D/R اور Profile وقتی طور پر ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Pulsatilla 30 کے 5 قطرے اور Aletris Farinosa Q کے 10 قطرے ½ کپ پانی میں 3 مرتبہ دن میں لیں۔

☆......☆......☆

قد بڑھ رہا ہے موٹی نہیں ہو رہی

امید ہے کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ یہاں میں اپنی بیٹی کا مسئلہ لکھ رہی ہوں جو کہ 15 سال کی ہے۔ اس کا مسئلہ پہلا یہ ہے کہ اس کا منہ پک جاتا ہے اوپر کی طرف۔ مہینے میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ کمزور ہے، قد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ پتلی لگتی ہے۔ میں نے دو سال پہلے ''الفا الفا Q'' استعمال کرایا تھا مسلسل 3 ماہ تک لیکن کچھ فرق نہیں پڑا۔ پھر میں نے حکیم سے دوائی لی کہ تھوڑا سا جسم موٹا ہو لیکن کچھ فرق نہیں ہوا۔ لیکوریا کی تکلیف بھی ہے لیکن کم۔ آپ کوئی

ایسی دوا تجویز کردیں کہ اس کا جسم موٹا ہو جائے۔ دوا استعمال کرنے سے ایک دو ماہ کے لیے جسم کچھ بھاری ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد کمزوری ہو جاتی ہے۔ آپ ضرور جواب دیں۔ رابعہ خان خیبر پختون خواہ

جواب: بچی کا قد بڑھ رہا ہے تو اس کو بڑھنے دیں، وزن نہیں لکھا کہ کتنا ہے۔ بچی کی عمومی صحت کا خیال رکھیں۔ موٹا ہونے پر نہ جائیں، متوازن غذا کھلائیں، ورزش کرائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Borax 30 اور Mercsol 30 کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ½ کپ پانی میں دیں۔ ساتھ میں U/s pelvis اور CBC کی رپورٹ بھیجیں۔

☆......☆......☆

الرجی، ٹینشن

میں ماہنامہ پاکیزہ کی پرانی پڑھنے والی ہوں۔ اس میں دیے گئے صحت کے بارے میں مشورے بھی پڑھتی رہی ہوں لیکن اب پہلی دفعہ اپنی صحت کے بارے میں قلم اٹھا رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور جواب دیں گے۔ میری صحت سے متعلق مندرجہ ذیل مسائل ہیں۔

1۔ ہائی بلڈ پریشر (11 سال سے)

2۔ تقریباً 20 سال پرانی الرجی جو کہ کبھی کبھی کھانسی یا دمہ کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے، بلغم نکلتا بھی ہے اور گلے پر بھی گرتا ہے۔ کبھی ناک بند ہو جاتی ہے کبھی چھاتی بند ہو جاتی ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔

3۔ تیسرا مسئلہ ڈپریشن اور اعصابی کمزوری ہے۔ ایلو پیتھک علاج کے لیے ڈاکٹر اسپیشلسٹ آزما چکی ہوں۔ کافی عرصے علاج بھی کرتی رہی ہوں۔ بلڈ پریشر تو کافی حد تک کنٹرول ہو جاتا ہے دوائیوں سے۔ کبھی کبھی ٹینشن سے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ البتہ الرجی بہت تکلیف دیتی ہے۔ احتیاط بھی بہت کرتی ہوں۔ کمزوری ہو گئی ہے۔ نیند بھی نہیں آتی۔ میں 1993ء سے ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ 4 بچے ہیں عمر 44 سال ہے۔ اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر ٹینشن ہو جاتی ہے اور طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ شوہر سخت مزاج کے ہیں۔ بچے بھی تنگ کرتے ہیں..... پہلے تو معمول کے مطابق زندگی گزارتی رہی، اب برداشت نہیں ہوتا اور میں بیمار ہو جاتی ہوں۔ شمع ناز راجن پور

جواب: ذہنی ٹینشن انسان کو بیمار بنا دیتی ہے اور بیماری کو ٹھیک نہیں ہونے دیتی۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے گھریلو ماحول کو بہتر بنائیں، شوہر کو دوست بنائیں اور اس کی دوست بنیں۔ اچھے میاں بیوی اچھے ماں باپ ہوتے ہیں اور ان کے بچے بھی اچھے ماحول میں تربیت پائیں گے بصورت دیگر بچے بھی خراب ہوں گے۔ نیند کی گولی اور اعصابی سکون کی ادویات کا استعمال بند کر دیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Arsenic 30
Antimoniumtart - 30

اور Kaliphos 30 کے 5، 5 قطرے ½ کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور رات کو سونے سے پہلے Passiflora - Q کے 10 قطرے ½ کپ پانی میں لیں۔ نمک کم سے کم کھائیں، مرغن و میٹھی اشیا سے پرہیز کریں، چہل قدمی کیا کریں، گہرے سانس لیا کریں۔

☆.....☆.....☆

گرم موسم کی خصوصی احتیاطیں

جن کو اختیار کر کے آپ موسم گرما کو انجوائے کر سکتے ہیں۔

1۔ گرم ٹھنڈا یا ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ یعنی گرم جگہ سے ایک دم ائرکنڈیشنڈ میں نہ جائیں یا ٹھنڈی جگہ سے گرم جگہ نہ جائیں، اسی طرح نہا کر فوراً پنکھے یا ائرکنڈیشنڈ میں نہ آئیں یا باہر لو میں نہ نکلیں۔

2۔ گرمی کی شدت کے حساب سے پانی کا استعمال کریں لیکن یاد رکھیں پیاس کتنی بھی لگ رہی ہو گرمی سے آ کر فوراً پانی نہ پئیں خصوصاً ٹھنڈا بلکہ پہلے ہاتھ منہ دھو کر خود کو ٹھنڈا کریں اس کے بعد پانی پئیں، دن میں کم سے کم 10 سے 12 گلاس پانی پئیں، بچوں کو 6 سے 8 گلاس پانی پلائیں دن میں لیکن یاد رہے کہ کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں پئیں۔ نہار منہ، کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو سے ڈھائی گھنٹے بعد پانی کا استعمال صحت و ہاضمہ کے لیے مفید ہے۔

3۔ مصنوعی شربتوں، سے ہر قسم کی کولڈ رنک سے دور رہیں، ہاں لسی، ستو (سنت بھی ہے) بیل گیری، فالسہ انناس، کیری، آم، لیمو کے تازہ جوس و شربت حقیقی صحت اور تازگی کے لیے مفید ترین ہیں۔

4۔ موسمی پھل اور سبزیوں کا استعمال آپ کی صحت کو بحال رکھے گا۔

5۔ اسی طرح گرمی کی مناسبت سے کپڑوں کا استعمال بھی کرنا چاہیے۔ سر کو گرمی سے ضرور بچائیں۔

6۔ پسینے کو کبھی ٹھنڈ یا ہوا نہ لگائیں، اس طرح جسم کے پٹھے اکڑ سکتے ہیں، ان میں درد ہو سکتا ہے، دل کی حرکت بند ہو سکتی ہے یا فالج کا اثر ہو سکتا ہے۔

7۔ صفائی کا خیال رکھیں، روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور نہائیں۔

8۔ باہر لُو چل رہی ہو یا گرمی کی شدت ہو تو کم از کم ایک گلاس پانی لے کر گھر سے نکلیں۔

9۔ جلد کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے سن بلاک والا فیس واش لوشن استعمال کریں، ہم سے بھی منگوا سکتے ہیں۔

10۔ یاد رکھیں یہ وہ احتیاطی تدابیر ہیں جن کو اختیار کر کے آپ اپنی موجودہ صحت کو مزید بہتر کر سکتے ہیں۔ بیماریوں سے اور گرم موسم کی شدت سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

Dr. Willmar Schwabe , Germany.
Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores